READING SECTION
Online Library For Pakistan

READING SECTION
Online Library For Pakistan
WWW.PAKSOCIETY.COM

نئے افق کراچی

aanchalnovel.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

READING SECTION
Online Library For Pakistan

READING SECTION
Online Library For Pakistan

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

ماہنامہ

حجاب کراچی

ماہنامہ حجاب نومبر ۲۰۱۶ء کے شمارے کی ایک جھلک

صدف آصف، نادیہ فاطمہ کی قسط وار کہانیاں

مکمل ناول میں پڑھیں نازیہ کنول نازی، ندا حسنین، اریشہ غزل

شازیہ مصطفیٰ، عشنا کوثر سردار

سیدہ ضوباریہ، عائشہ ناز علی، سمیرا شریف طور، صائمہ قریشی، فاخرہ گل، نائلہ طارق

کے قلم سے خوب صورت ناولٹ

افسانوں کے ساتھ حاضر ہیں اقبال بانو، تمثیلہ زاہد، حنا اشرف، موناشاہ قریشی

صباء عیشل، فرحین اختر، نظیر فاطمہ، سعدیہ عزیز آفریدی، افشاں شاہد، رفاقت جاوید

قارئین کے ذوق کے عین مطابق مستقل سلسلوں میں پڑھیے

بزم سخن، کچن کارنر، آرائش حسن، عالم میں انتخاب

شوخئ تحریر، حسن خیال، ہومیو کارنر، شوبز کی دنیا، ٹوٹکے

پرچہ نہ ملنے کی صورت میں رجوع کریں/
0300-8264242
021-35620771/2

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

ماہنامہ

نئے اُفق

مدیر اعلیٰ
مشتاق احمد قریشی
مدیر
اقبال بھٹی
مدیر معاون
طاہر احمد قریشی
مُزین
نورالدین

جلد	40
شمارہ	12
نومبر	2016

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹر
رکن چیمبر آف کامرس

NAEYUFAQ
PUBLICATION

پاکستان (فی پرچہ)..........50 روپے
پاکستان (سالانہ)..........500 روپے

اشتہارات اور دیگر معلومات
0300-8264242

aanchalpk.com
aanchalnovel.com
f naeyufaqonlinemagzine
aanchal.com.pk/blog
onlinemagazinepk.com/recipes
editorufaq@aanchal.com.pk

Downloaded From
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

دستک 10

گفتگو 12

اقرأ 28

انٹرویو 30

خدا گواہ 42

ابدی حیات 60

ایک سو سولہ چاند کی راتیں 78

انتقام 104

سنہرے دن 110

قافلہ شہیدوں کا 118

مرگ قبل از مرگ 132

پبلشر مشتاق احمد قریشی پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

دفتر کا پتا: 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ صدر کراچی

عذاب مسلسل 138
خمیازہ 144
پس پردہ 156
راستہ 168
حسن دوآتشہ 174
سزا 194
فن پارے 199
کرن 236
ذوق آگہی 246
خوش بوئے سخن 250
ڈیول 254

خط و کتابت کا پتہ: " نئے افق " پوسٹ بکس نمبر 874 کراچی 74200 فون: 021-35620771/2
فیکس: 021-35620773 یکے از مطبوعات نئے افق پبلی کیشنز۔ ای میل editorufaq@aanchal.com.pk

دستک

مشتاق احمد قریشی

پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا......!!

پاکستان نے مہمان نوازی کی نئی تاریخ رقم کی ہے گزشتہ 26 برسوں سے افغان مہاجرین کو نہ صرف پناہ دی ہے ان کی رہائش و آسائش کا بھی بندوبست کر رہا ہے پاکستان کی مہمان نوازی اور نرمی کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے افغان مہاجرین پورے پاکستان میں پھیل گئے اور خوب پیر جمالیے اس کے باوجود احسان فراموشی افغان صدر اشرف غنی کو ذرا غیرت نہیں آئی ذرا شرم نہیں آئی وہ بھارتی آشیر واد پاکر پاکستان کے خلاف ہرزہ سرائی کر رہے ہیں دھمکا رہے ہیں۔ بھارت جو پاکستان کا ازلی دشمن ہے اور موجودہ وزیر اعظم نریندر مودی جو خود ایک دہشت گرد تنظیم کے سربراہ اور محرک ہیں وہ اپنے ہی ملک میں مسلمانوں کا وجود برداشت نہیں کرتے ان کا مزاج ہی اسلام دشمنی سے بنا ہوا ہے۔ اب جبکہ بھارت نے افغان صدر اشرف غنی کی بھارت یاترا کے موقع پر پاکستان کے گرد گھیرا تنگ کرنے کی مذموم سازش کے تحت کابل کو ایک کھرب پانچ ارب روپے سالانہ امداد دینے کا معاہدہ کیا ہے اس کے ساتھ ہی بلوچستان میں بغاوت کو ہوا دینے اور چند سو بلوچ باغیوں کی سرپرستی کرنے کے لیے براہمداغ بگٹی اور ان کے ساتھیوں کو بھارتی شہریت بھی دے رہا ہے۔ نواب اکبر بگٹی جو ایک محب وطن بلوچ سردار تھے ان کا ناراض پوتا اب جنیوا جاکر بھارتی پاسپورٹ حاصل کرے گا۔ اس طرح خود بھارتی حکمرانوں نے اپنی جلد بازی میں بلوچستان میں بھارتی مداخلت کا نہ صرف اقرار کرلیا ہے اور دنیا کو یہ بھی بتادیا ہے کہ پاکستان کے بارے میں ان کا آئندہ کیا پروگرام ہے بھارتی بنیا کبھی نقصان کا سودا نہیں کرتا (یقیناً اتنی بڑی رقم اسے اس کام کے لیے امریکا ہی فراہم کر رہا ہوگا) بھارتی حکومت کا ہر سال ایک بڑی رقم افغانستان کو دینے کا مقصد حکومت افغانستان کو براہ راست اپنے دباؤ میں رکھنا اور پاکستان کے خلاف اپنی کارروائیوں کے لیے میدان حاصل کرنا اور افغان حکومت کو پاکستان کے مدمقابل لاکر دوست کی جگہ دشمن بنا کر سامنے کھڑا کرنا ہے بھارت نے افغانستان سے اس کی فضائی حدود استعمال کرنے کا بھی معاہدہ کیا ہے تاکہ نہ صرف پاکستان کی پوری طرح نگرانی کی جاسکے اور براہمداغ اور اس کے ساتھیوں سے رابطے کی سہولت حاصل کی جاسکے۔ بھارت افغانستان کو مہلک ہتھیار بھی فراہم کر رہا ہے۔ افغان صدر اشرف غنی نے بھارت کی شہہ پر پاکستان کو دھمکی دی ہے اور کہا ہے اگر پاکستان نے کابل اور دہلی کے راستے بلاک کیے تو پاکستان خود بلاک ہوجائے گا۔

افغان اور بھارت معاہدوں نے بھارتی سازش جس کے تحت انہوں نے ایران سے چہابہار کا معاہدہ کیا ہے وہ بھی بے نقاب ہوگیا ہے بھارت پاکستان کی نفی کر کے اپنی تجارتی اشیا اور اسلحہ اور دیگر ساز و سامان براہ راست ایرانی بندرگاہ چہار بہار سے افغانستان لے جانا چاہتا ہے۔ ایرانی بندرگاہ فی الحال اس حالت میں نہیں ہے کہ وہ بھارتی جہاز رانی کا بوجھ اٹھا سکے لیکن بھارت جسے امریکی پشت پناہی حاصل ہوچکی ہے وہ امریکی شہہ پر سی پیک منصوبہ جو دراصل امریکا اور بھارت دونوں کے ہی حلق میں پھنس کر رہ گیا ہے دونوں ہی چاہتے ہیں کہ اسے کیسے روکا جائے تعمیر ہی نہ ہونے دیا جائے اس کے لیے وہ ہر سطح پر ہر حد کو پار کرنے کو تیار ہیں امریکا جو پاکستان کو بھی اپنی پالیسیوں سے ناراض نہیں کرنا چاہتا اور وہ چین کا بھی پاکستان میں داخل ہونا پسند نہیں کرتا چین سے دو دو ہاتھ کرنے سے براہ راست گریز بھی کر رہا ہے بھارت کو قربانی کے بکرے کے طور پر استعمال کرنے کے لیے ہی بھارت کی پشت پر ہاتھ رکھا ہے۔ بھارتی بنیے کے مزاج کو وہ اچھی طرح سمجھ چکا ہے بھارتی بنیے کو اگر نالی میں پڑا ایک پیسے کا سکہ بھی نظر آجائے تو وہ اسے حاصل کرنے کے لیے خود کو نالی میں گرانے سے بھی نہیں چوکتا۔ اب جبکہ پاکستان اور چین کے مشترکہ منصوبے سی پیک کو ناکام بنانے کے حوالے سے اسے ایک بہت بڑی رقم بھارت کو مل رہی ہے اور ساتھ امریکی مقبوضہ افغانستان میں براہ راست رسائی بھی میسر آرہی ہو تو

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں پھر یہاں تو معاملہ چپڑی اور دو دو کا ہے، بھارت جو پاکستان دشمنی میں خود کسی طرح کم نہیں اسے ایک بڑی بلکہ بہت ہی بڑی سپر پاور کی حمایت حاصل ہو گئی تو اس نے بکھرتی سسکتی روسی سپر پاور جس سے اس کا دیرینہ تعلق تھا کی بھی پروا نہیں کی اور آنکھیں بند کر کے امریکی حمایت پر کود پڑا ہے اسے اب خواب میں بھی بلی کی طرح چھیچھڑے ہی چھیچھڑے نظر آ رہے ہوں گے۔ پاکستان پر اپنی سرحدوں کی سمت سے قدم بڑھائے نہ بڑھائے اب وہ افغان سرحد کی جانب سے امریکہ اور افغان شرکت کے ساتھ اپنی مذموم کارروائیاں با آسانی کر سکتا ہے جبکہ خود بلوچستان کے کچھ باغی جن کو اب بھارتی شہریت بھی دی جا رہی ہے انہیں ہر طرح کی سہولیات دے کر واپس بلوچستان میں ان کے ٹھکانوں پر بھیجا جائے گا وہ مٹھی بھر باغی اپنے اثر و رسوخ سے بلوچستان میں ہنگامہ آرائی قتل و غارت گری کی آڑ میں دراصل سی پیک منصوبے کو روکنے اور اسے تعمیر نہ ہونے دینے کے مشن کی تکمیل کریں گے حالانکہ بھارت نے امریکی مقبوضہ افغانستان تک رسائی کے لیے ہی اور سی پیک کے مقابلے میں ایران سے چابہار کا معاہدہ کیا ہے چونکہ امریکا نہیں چاہتا کہ سی پیک کسی بھی طرح پایہ تکمیل تک پہنچے اس لیے وہ ہر طرح سے ہر طرف سے پاکستان پر دباؤ ڈال رہا ہے لیکن پاک چین دوستی امریکی دوستی اور مفادات کے مقابلے میں کہیں زیادہ مضبوط و مستحکم ہے پاکستانی حکمرانوں کو بھی مستقبل میں اس کے فائدے اور پاکستان کی ترقی و تعمیر میں سی پیک کا اہم کردار صاف نظر آ رہا ہے بلوچستان جو اپنی پسماندگی اور غربت کے باعث تمام دیگر صوبوں کے مقابلے میں کہیں پیچھے رہ گیا ہے اس کی اصل وجہ سرداروں کا ذاتی مفاد اور اقتدار ہے وہ مرکز سے ملنے والے فنڈز کو عوامی بہتری کے کاموں میں مصروف کرنے کے بجائے ذاتی استعمال میں خرچ کرتے رہے ہیں۔ اس لیے بلوچستان ہمیشہ زبوں حالی کا شکار رہا ہے اب کچھ امید بندھ رہی ہے۔ وہ بلوچ سردار جو محب وطن ہیں اب اپنی کوتاہیوں کا ازالہ کرنے پر کمربستہ نظر آ رہے ہیں کچھ مفاد پرست جو باغی براہمداغ کے حامی بھی ہیں جو سمجھتے ہیں کہ سردار اکبر بگٹی کا قتل غیر قانونی غیر آئینی غیر اخلاقی تھا اس لیے بلوچ روایات کے تحت براہمداغ کا اپنے دادا کے قتل پر ردعمل درست ہے یہی وہ وجہ ہے جس سے بھارت امریکا فائدہ اٹھانا چاہ رہے ہیں۔ اس طرح وہ پاک چین راہداری کی تعمیر میں رخنہ ڈالنا چاہتے ہیں پاکستان کی ترقی و استحکام کوئی بھی غیر مسلم حکومت برداشت نہیں کرتی اس لیے کہ پاکستان جو جوہری صلاحیت بھی رکھتا ہے اگر وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو جاتا ہے تو وہ تمام غیر مسلم دنیا کے لیے ایک بڑا خطرہ بن سکتا ہے اگر تمام اسلامی ممالک پاکستان کے ساتھ کھڑے ہو جاتے ہیں تو وہ ایک ناقابل تسخیر قوت بن جائے گا اس لیے بھی تمام غیر مسلم قوتیں پاکستان کو کمزور رکھنے کمزور کرنے میں ہمہ وقت مصروف ہیں۔ کلیسا اپنی تمام توانائیوں کے ساتھ پاکستان کو مسلم دنیا کو ٹھکانے لگانے کے خواب دیکھتی رہتی ہے اور کوشش کرتی رہتی ہے وہ اربوں ڈالر سالانہ اپنی اس مذموم کوشش پر خرچ کر رہی ہے پاکستان تو اللہ کا انعام عظیم ہے اس کی حفاظت اللہ خود کر رہا ہے۔ دشمن کی پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا۔

اللہ تعالیٰ پاکستان کی اہل پاکستان کی حفاظت فرمائے، آمین

گفتگو

اقبال بھٹی

> ''حضرت انسؓ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں۔ فرمایا کہ جس شخص میں تین باتیں ہوں گی وہ ایمان کا مزہ پائے گا۔ ایک یہ کہ اللہ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اس کو سب سے زیادہ ہو، دوسرے یہ کہ صرف اللہ کے لیے کسی سے دوستی رکھے، تیسرے یہ کہ دوبارہ کافر بننا اسے اتنا ناگوار ہو جیسے آگ میں جھونکا جانا۔''
> (البخاری، باب حلاوۃ الایمان)

عزیزان محترم...... سلامت باشد اور سال نو مبارک ہو۔

شروع اس رب رحیم کے نام سے جس کے قبضہ قدرت میں اس پوری کائنات کی ڈوریں ہیں جو دنیا بھر میں ہر سانس لینے والی مخلوق کو بغیر کسی تخصیص کے رزق دیتا ہے۔ جو رنگ نسل اور مذہب کا لحاظ کیے بغیر بارش برساتا ہے دریاؤں کی روانی کو برقرار رکھتا ہے۔ جس کے پاس نہ کسی گورے کو فضیلت حاصل ہے نہ کسی کالے کو دھتکارا جاتا ہے اس کے پاس فضیلت ہے تو صرف کردار کی، محبت کی، ایمان کی وہ اسی کو پسند کرتا ہے جو اس کی مخلوق سے پیار کرتا ہے جو اس کی حکم عدولی کرے وہ راندہ درگاہ ہو جاتا ہے۔ جو کہتا ہے میں اپنے بندوں سے ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرتا ہوں اور یہ پیار وہ کسی مذہب رنگ نسل اور فرقے کی بنیاد پر نہیں کرتا اس نے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر پیغمبر آخرالزماں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ تک تمام انبیا کو محبت کا پیغام دے کر ہی بھیجا ہے لیکن ہم آج کیا کر رہے ہیں ہم اس کی ساری ہدایت کو فراموش کر کے ایک دوسرے کو رنگ نسل اور فرقہ کی بنیاد پر قتل کر رہے ہیں اپنے پڑوسی کو کافر قرار دے کر مار رہے ہیں اسلام تو دین محبت ہے جو کچرا پھینکنے والی عورت سے بھی نفرت کے اظہار کی اجازت نہیں دیتا پھر ہم اللہ کے محبوب کے امتی کیوں ایک دوسرے کو قتل کر رہے ہیں، فرصت کی گھڑیوں میں سے چند لمحے کشید کر کے اس پہلو پر ضرور سوچیے گا۔

اب آیئے اپنے تلخ و شیریں ناموں کی طرف۔ پہلا خط ہے ساہیوال سے احسن ابرار رضوی کا آپ لکھتے ہیں۔

آداب! اپنے خط کا آغاز اس دُعا کے ساتھ کرتا ہوں کہ جہاں رہیں، اللہ تعالیٰ اپنے حفظ و امان میں رکھے، کوئی بیماری بھولے سے پاس بھی نہ بھٹکے، دُشمنوں سے محفوظ اور صحت سلامتی کے ساتھ پُر امن زندگی بسر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ وہ نیلے آسمان والا سب کو سیدھے راستے پر چلنے اور اپنے احکامات بجالانے کی توفیق دے آمین۔ سال نو بہت بہت مبارک۔ کچھ ساتھی حیران ہوں گے کہ اکتوبر میں سال نو کی مبارک بیچارے انگریزی روایت کو پکڑے ہوئے ہیں اور قمری یعنی اسلامی سال کو بھول گئے ہیں۔ جدت آتی گئی اور دین اسلام کے احکامات پس پردہ ہوتے گئے۔ غور و فکر کرنے کی بجائے دوسروں کے پیچھے بھاگنے لگے ہیں۔ اللہ تعالیٰ حضرت محمد ﷺ کے اسوہ حسنہ کی پیروی کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین! ماہ اکتوبر کا نئے افق تمام تر رعنائیوں کے ساتھ موصول ہوا۔ ٹائٹل خاص نہیں تھا۔ دستک میں محترم مشتاق احمد قریشی صاحب حقیقت سے پردہ اُٹھا رہے ہیں اور امریکا اور بھارت کی سفاکیاں بتا رہے تھے۔ ان گیدڑوں کو سمجھ نہیں آتی کہ پاکستان کی حفاظت تو اللہ تعالیٰ نے کرنی ہے اور وہ کرتا بھی آ رہا ہے۔ اِس کو مٹانے والے خود مٹ جائیں گے انشاءاللہ! گفتگو کی محفل ہنستے مسکراتے دوستوں کے ساتھ سجی تھی اور ہر طرف خوشبوؤں نے رقص شروع کر رکھا تھا، ریاض حسین قمر غیر حاضری کے بعد خوبصورت اِنٹری کرتے ہیں۔ مجید احمد جائی خطوط کا شہنشاہ کہوں تو مضائقہ نہیں ہوگا، ہر ماہ باقاعدگی سے لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں، اِن کے پاس الفاظ کا ذخیرہ ہے اور یہ لفظوں سے خوب کھیلتے

ہیں۔ اللہ سلامت رکھے آمین جاوید احمد صدیقی کبھی کبھار محفل کی رونق بنتے ہیں۔ صائمہ نور بھی قابل تحسین ہیں، عمدہ لکھتی ہیں، سید عبداللہ توفیق بہت بہت شکریہ، خواجہ حسین، پرنس افضل شاہین، عبدالغفار عابد بھی خود ہی روٹھے خود ہی لوٹے۔ اللہ تعالیٰ ان کی والدہ ماجدہ کو جوار رحمت میں اعلیٰ مقام عطا کرے، مسکان کبھی پرچے پر سیر حاصل تبصرہ بھی کیا کریں، ریاض بٹ خوبصورت خط کے ساتھ حاضر تھے۔ میاں کرامت حسین بھی چند ناموں کے گرد اپنے نامہ کو گھما رہے ہیں، برادر دُنیا بہت بڑی ہے، دُنیا کی رونقوں سے لطف اُٹھائیں، خامیاں ڈھونڈنے سے اپنی خامیوں پر پردہ پڑتا ہے جو بہت بُرا عمل ہے۔ اپنی خامیاں چھپانے سے نیکی کرنے کے راستے بند ہو جاتے ہیں۔ دوسروں کی عیب جوئی سے بہتر ہے اپنے اندر جھانکیں۔ محمد رفاقت مختصر خط کے ساتھ شامل حال تھے، عبدالغفار رومی انصاری زبردست سیر حاصل تبصرہ کر رہے تھے۔ حسین جاوید، فلک شیر ملک کے خط بھی اچھے تھے۔ اقراء لکھ کر طاہر قریشی بھائی نے احسان کیا، انٹرویو عشنا کوثر سردار کے بارے جاننے کا موقع ملا، کہانیوں میں دوستی، احمقوں کا ٹولہ پسند آئی، بکرا کہاں ہے طنز و مزاح پر لاجواب تحریر تھی۔ میلے ہاتھ، روشن اندھیرے، آخری رشتہ، آب اور آتش بھی اچھی رہی، مس کال، بے خودی بھی کمال کی کہانیاں ہیں، چھوٹے تمام سلسلے لاجواب ہیں، اب اجازت۔

ایم اے راحیل ...... السلام علیکم! اُمید کرتا ہوں مزاج بخیر ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق اور حق سچ کی آواز بلند کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔ جو حق کا ساتھ دیتے ہیں وہ وقتی مشکلات کا شکار تو ہوتے ہیں لیکن اُن کا دل، ضمیر مطمئن ہوتا ہے اور آخرت بھی سنور جاتی ہے' آیئے دُنیا کے ساتھ ساتھ آخرت کی بھی تیاری کریں۔ اکتوبر 2016 کا نئے اُفق کچہری چوک سے خرید۔ سرورق عامیانہ سا تھا، عورت کو ننگے سر دکھانے کی روایت ختم نہیں ہوئی، جو دکھتا ہے وہ بکتا ہے کی پالیسی پر عمل کیا جا رہا ہے۔ دستک میں محترم مشتاق احمد قریشی امریکا کی کارستانیاں سنا رہے ہیں اور بھارت جو امریکا کی کٹھ پتلی بنا ہوا ہے، روس کے تلوے چاٹ رہا ہے، استعمال کر رہا ہے۔ بھارت بھی اندھے بکرے کی طرح چھری کی طرف بڑھ رہا ہے۔ گفتگو کی محفل میں پہنچا تو کبھی دوست مشورے دے رہے تھے، میں ایک مہینے کی غیر حاضری کے بعد پھر سے آیا ہوں، وجہ یہی تھی کہ میں حق سچ کہنے کا عادی ہوں اور انصاف کے لئے آواز بلند کرنے والا ہوں، ادارہ کا منی آرڈر کیوں نہیں پہنچا میں نہیں جانتا، لیکن ممبر شپ جاری کرنے کا کہا گیا، اُس پر بھی کان نہیں دھرے گئے۔ ریاض حسین قمر نے بالکل بجا فرمایا لیکن اِنسان خطا کا پتلا ہے، غلطیاں سرزد ہو جاتی ہیں اور غلطی کو مان لینا مومن کی نشانی ہے۔ مجید احمد جائی، میں کیوں جلوں، میں ناانصافی پسند نہیں کرتا۔ صائمہ نور لیجئے ہم غصہ نہیں کرتے اور محبت سے پھر سے خط لکھ رہے ہیں، اب خوش۔ پرنس افضل شاہین تین بار ایڈریس دیا، آپ کی فرمائش پر پھر سے ایڈریس دے رہا ہوں، حسین جاوید آپ کی فرمائش کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے لوٹ آیا ہوں اور ہاں انعام کی رقم کو نہیں دیکھا جاتا، انعام ایک روپے کا بھی کیوں نہ ہو، حقیر نہیں ہوتا۔ انعام ہمارا حق ہوتا ہے اور حق کے لئے لڑنا لڑائی نہیں ہوتا۔ بہت شکریہ۔ بہرحال تمام دوستوں کی پُرزور اپیل پر لوٹ آیا ہوں، اور اُمید ہے مستقل رہوں گا، میرے کچھ خصوصی دوست ضرور خوش ہوئے گے کہ ایم اے راحیل نئے اُفق سے رخصت ہو گیا میرے بھائی، آپ کی محبتیں اپنی جگہ، لیکن اِن دوستوں کو دیکھیے جن کو ایک ماہ کی غیر حاضری بھی اچھی نہیں لگی۔ لہٰذا دوسروں کی ٹانگیں کھینچنے کی بجائے اپنے قدم جمانے کی کوشش کریں، کامیابی ملے گی۔ اُمید ہے سمجھ گئے ہوں گے۔ گفتگو میں تمام خطوط اعلیٰ تھے اور محبت کا پرچار کرتے نظر آئے سوائے مسکان بھٹی اور میاں کرامت حسین کے۔ مسکان بھٹی کے لفظوں سے یوں لگتا ہے جیسے مسکان کے کندھوں پر بندوق رکھ کر دُشمنی نکالی گئی ہو، دلیری اِسی میں ہوتی ہے کہ بندہ خود سامنے آ گئے، گیدڑ کی زندگی جینے سے بہتر ہے شیر کی ایک دن کی زندگی جیا جائے۔ میاں کرامت حسین، آپ کی ٹانگیں اب قبر میں ہیں، آخرت کی سوچیں، کن خرافات میں پڑے ہیں۔ اقراء نے متاثر کیا، انٹرویو میں عشنا کوثر سردار کے بارے میں بہت سی معلومات، بہت شکریہ دوستو۔ کہانیوں میں بے خودی، احمقوں کا ٹولہ، آخری رشتہ، دوستی، روشن اندھیرے

قتل خوب تھیں، بکرا کہاں ہے، کھلکھلاتی، تیر سینے میں پیوست کرتی تحریر تھی، باقی تمام سلسلے خوب رہے۔

عبدالحمید...... کھلابٹ ٹاؤن شپ۔ محترم مشتاق احمد قریشی صاحب ودیگر اسٹاف کو السلام علیکم و رحمتہ اللہ وبرکاتہ۔ اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کو صحت کاملہ عطا فرمائے، تندرست اور توانا رکھے اور تمام آفات سے محفوظ رکھے، آمین۔ اس مرتبہ پرچہ بہت دیر سے ملا ہے قاسم دانش بک ڈپو کھلابٹ ٹاؤن کے صبح وشام پھیرے لگانے کے بعد 25 تمبر کو پرچہ دستیاب ہوا سب سے پرلے دستک پڑھی آپ نے بھارت، امریکا اور افغانستان گٹھ جوڑ کو بے نقاب کیا مودی ایک دہشت گرد تنظیم کا سربراہ بھی ہے امریکا اس سے بڑا دہشت گرد ہے پدی کا شوربہ افغان صدران کا چمچہ بنا ہوا ہے۔ دراصل یہ سی پیک منصوبے کے خلاف ناکام سازش ہو رہی ہے جو ان شاء اللہ کبھی کامیاب نہیں ہوگی، سی پیک منصوبہ پایہ تکمیل تک ضرور پہنچے گا۔ چین ہمارا ہمالہ سے بلند اور سمندر سے گہرا دوست ہے ہر مشکل گھڑی میں اس نے ہمارا ساتھ دیا ہے اب وہ دہشت گردوں کے آگے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ پاکستان کو اپنی امان میں رکھے اور ان تینوں کے ٹولے کو ذلیل وخوار کرے، آمین۔ قریشی صاحب پرچے کو اپنی ڈگر پر لائیں تاکہ ہمیں بروقت مل جایا کرے دیر سے آنے کی وجہ سے دل جوئی سے نہیں پڑھ سکتے ہیں اور نہ ہی اس پر تبصرہ کر سکتے ہیں۔ بکرا کہاں ہے ایک مزاحیہ کہانی ہے جبکہ قتل انگریزی سے ترجمہ کیا گیا ہے جو کہ تفتیشی کہانی ہے ٹائٹل میں بہتری آ رہی ہے۔ گفتگو میں لکھاریوں کی تعداد ۱۹ ہے ریاض حسین قمر ایک بھرپور تبصرے کے ساتھ آئے ہیں سب سے پرلے تو میں ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے میرے تبصرے کو پسند کیا اور میرے متعلق اچھے خیالات کا اظہار کیا اللہ تعالیٰ آپ کو صحت کاملہ عطا فرمائے اور ہر ناگہانی آفت سے محفوظ رکھے، آمین۔ مجید احمد جائی بھی پورے سج دھج کے ساتھ آئے ہیں قربانی کے متعلق انہوں نے کیا خوب لکھا ہے ان کے لکھنے کا انداز، لفظوں کا چناؤ، بڑا خوب سورت ہوتا ہے حالات حاضرہ پر گہرہ نظر رکھتے ہیں بہت خوب صورت تبصرے لکھتے ہیں اللہ کرے قلم زیادہ میرے تبصرے کو پسند کیا شکریہ جاوید احمد صدیقی کا تبصرہ بھی زبردست ہوتا ہے لکھنے کا انداز بہت اچھا ہوتا ہے ہر لفظ موتیوں میں پرویا ہوتا ہے میرے ایدھی صاحب کے متعلق تبصرے پر آپ نے مجھ پر طنز کیا ہے کہ میں نے نوے فیصد ان کے متعلق لکھا ہے اس وقت ہر اخبار اور رسائل میں ان کے ہی تذکرے آ رہے تھے۔ محترمہ صائمہ نور دلچسپ تبصرے کے ساتھ تشریف فرما ہیں ان کے تبصرے بہت اچھے ہوتے ہیں ان کا لکھنے کا انداز منفرد ہوتا ہے پرچے پر ان کی گہری نظر ہوتی ہے ہر چھوٹی اور بڑی بات کو اجاگر کرتی ہے، میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو تندرست وتوانا رکھے اور ہر آفات سے محفوظ رکھے آمین، میرا تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ احسن ابرار رضوی ایک خوب صورت تبصرے کے ساتھ حاضر ہوئے ہیں، تبصرہ ماشاء اللہ مدلل اور جاندار ہے سید عبداللہ توفیق نے بھی بہت اچھا تبصرہ کیا ہے خادم حسین ظالم نے مختصر تبصرے میں ظلم کی حد کر دی۔ حاجی عمران ساگی بھی مختصر تبصرے کے ساتھ جلوہ گر ہیں افضل شاہین نے تبصرے میں اپنے دل کی بھڑاس نکال دی گویا کوزے میں دریا بند کر دیا جو کچھ لکھا ہم بھی ان کی تائید کرتے ہیں، بہت اچھا لکھا ہے عبدالغفار عابد عرصہ بعد محفل میں تشریف فرما ہوئے ہیں، والدہ کی جدائی کے سبب آپ بہت ڈسٹرب ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی والدہ کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے ان کے درجات بلند کرے اور آپ لوگوں کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین۔ سردار اویس اوپی کا تبصرہ گو کہ مختصر تھا مگر بھرپور اور بہت اچھا تھا جو کچھ کہنا چاہتے وہ کہہ دیا میرا تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ، مسکان ظفر بھٹی نے بھی مختصر تبصرے میں اپنا مقصد بیان کر دیا مجموعی طور پر ایک اچھا اور مکمل تبصرہ تھا ریاض بٹ جب بھی آتے ہیں ایک بھرپور تبصرے کے ساتھ آتے ہیں۔ ان کی پرواقعہ ہر گہری نظر ہوتی ہے وہ لکھتے ہیں تو ان کے قلم کی روانی میں تیزی آتی ہے کسی ایک لفظ کو لکھتے ہیں تو دوسرا لفظ قلم کی نوک پر آ جاتا ہے پھر ان کا قلم نہیں رکتا لکھتا ہی چلا جاتا ہے اس وقت تک جب اینڈ نہیں ہوتا میرا تبصرہ پسند کیا شکریہ۔ محمد رفاقت بھی بہت اچھے تبصرہ نگار ہیں۔ مختصر تبصرے میں سب کچھ سمو دیتے ہیں میرا تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ، میاں کرامت حسین نئے افق کے ایک دیرینہ قاری ہیں۔ بہت اچھا تبصرہ کیا ہے آپ

کھل اپنا معافی الضمیر بیان کر دیا ہے عبدالجبار رومی انصاری بہت اچھے تبصرہ نگار ہیں ان کے تبصرے بھرپور ہوتے ہیں فلک شیر ملک اپنے گلے شکوؤں کے ساتھ آئے ہیں ملک صاحب اتنا غصہ ٹھیک نہیں ہے آپ نے گلہ کیا اور قریشی صاحب نے آپ سے معذرت کر لی انہوں نے آپ کا ناول الف لام میم پرچے میں لگا دیا تھا۔ حسین جاوید کا تبصرہ بھی اچھا تھا فریدہ جاوید فری ایک مختصر خط کے ساتھ تشریف لائی ہیں یہ نئے افق کی ایک پرانی قاری ہیں نئے افق ان کا فیورٹ میگزین ہے پہلی بار خط لکھا ہے وہ بے حد بیمار ہیں یہ خط انہوں نے اسپتال سے لکھا ہے اور دعا کی اپیل کی ہے ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو صحت کاملہ عطا فرمائے آمین۔ آپ بھی ان کے لیے دعا کریں، محترمہ عشنا کوثر ایک منجھی ہوئی مصنفہ ہیں ان کا تعارف بھرپور تھا محترمہ نے ہر ایک کے سوال کا مدلل جواب دیا۔ ریاض بٹ کی احمقوں کا ٹولہ ایک فنٹاسٹک تفتیشی کہانی ہے سب سے پہلے میں اسی کو پڑھتا ہوں کیونکہ یہ میرے فیورٹ لکھاری ہیں ان کی تفتیشی کہانیوں میں سسپنس، جاسوسی، مزاح اور وہ سب کچھ ہوتا ہے جو قاری پسند کرتا ہے ان کی کہانی پڑھتے ہوئے ایک سحر طاری ہو جاتا ہے ان کی بعض کہانیوں میں ایک ایسا موڑ بھی آ جاتا ہے کہ واردات ہو جاتی ہے اور مجرم آنکھوں سے اوجھل ہوتا ہے پھر وہ مجرم کو پھانسنے کے لیے ایک ایسا نادیدہ جال پھیلاتے ہیں کہ مجرم جال میں پھنس جاتا ہے موجودہ شمارے میں احمقوں کا ٹولہ ایک بہترین تفتیشی کہانی ہے استدعا ہے کہ ہر کہانی ایسی لکھا کریں اگر ایسا نہیں ہو سکتا تو ابتدائی کہانیوں کو دوبارہ شروع کر دیں۔ محمد شعیب کو نئے افق میں آمد پر خوش آمدید۔ پہلی مرتبہ آئے ہیں پہلے ہی ناول آب اور آتش لکھ کر اپنے آپ کو منوا لیا بہترین ناول لکھا ہے میں نے ایک ہی نشست میں پڑھا ہے آپ نے ایک اچھوتے موضوع پر خوب صورت ناول لکھا یہ سچ کہ آب اور آگ کا ملاپ کبھی نہیں ہو سکتا، یہ ایک دوسرے کے دشمن ہیں، کبھی آگ پانی کو بھاپ بنا کر اڑا دیتی ہے کبھی پانی آگ پر حاوی ہو جاتا ہے۔ کے ایم خالد ایک مزاحیہ اور چلبلی کہانی بکرا کہاں ہے لائے ہیں۔ جو شروع سے آخر تک پڑھنے والوں کے چہرے پر مسکراہٹیں بکھیرتی رہی خاص طور پر آخری چار سطریں تو قہقہے لگانے پر مجبور کر دیتی ہیں حسیب جواد علی بے خودی لائے ہیں جہاد کے موضوع پر ایک خوب صورت کہانی جو کہ چار صفحات پر محیط ہے عارف شیخ مس کال کے ساتھ حاضر ہوئے ہیں یہ ایک منجھے ہوئے قلمکار ہیں شروع میں نئے افق میں لکھا کرتے تھے دوبارہ نئے افق میں لکھنا شروع کیا ہے ان کی موجودہ کہانی مس کال نے ایک نوجوان شجاع کی جان لے لی، انسپکٹر احمد خان اور سب انسپکٹر فرید شاہ کی دوڑیں لگ گئیں، عنبرین اختر کی کہانی آخری رشتہ ایک بدنصیب بیٹی کی سرگزشت ہے جس کو اس کی ماں نے ایک جنونی سے بیاہ دیا، خلیل جبار کورٹ میں جو بھی کیس ہوتے ہیں انتہائی سنسنی خیز ہوتے ہیں اس مرتبہ وہ دوستی کے ساتھ حاضر ہوئے ہیں یہ ایک گروہ کی کہانی ہے جو اپنے ساتھ عورتوں کو ملا کر نوجوانوں کو لوٹتے ہیں سلیم اختر کی کہانی میلے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی غلطی سے بسا بسایا گھر اجڑ رہا تھا۔ مگر عین وقت پر ڈاکیہ ایک خط لاتا ہے ان کی غلط فہمی دور ہو جاتی ہے اور ان کا گھر دوبارہ آباد ہو جاتا ہے۔ عشنا کوثر سردار کے ناول ایک سو سولہ چاند کی راتیں اور زریں قمر صاحبہ کے ناول ابھی نہیں پڑھی۔

مجید احمد جائی...... ملتان شریف۔ مزاج گرامی! اُمید واثق ہے خیریت سے خیر بانٹتے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ تمام ٹیم، اسٹاف، قارئین، لکھاریوں کو اپنی حفظ و امان میں رکھے' آمین ثم آمین۔ دستک میں جناب صدر محفل محترم عزیزم مشتاق احمد قریشی صاحب بھارت اور امریکا کی بے غیرتیاں واضح کر رہے ہیں۔ یہ مینڈک کھانے اور گائے کا پیشاب پینے والے کبھی حق بات نہیں کریں گے۔ یہود اور ہنود تو مسلمان کے دوست ہو ہی نہیں سکتے۔ امریکا ہو، روس ہو یا بھارت کسی کی جرأت نہیں کہ وہ پاکستان کو نقصان پہنچا سکے۔ تاریخ گواہ ہے جنگیں جذبے والوں نے جیتی ہیں۔ یہود و ہنود ڈرپوک ہوتے ہیں اور اِس کی عمدہ مثال بھارت کی افواج ہے جو مسلسل کہہ رہی ہے، پاکستان کے ساتھ پنگا نہ لینا۔ اب تو اُن کا میڈیا بھی یہ خبریں شائع کرنے لگا ہے۔ مودی دہشت گرد تنظیم کا سربراہ ہے اور بلوچستان میں دہشت گردی کروا رہا ہے۔ پاکستان کے ساتھ کوئی ملک بھی نہ ہو تو

اُسے پروا نہیں کیونکہ اِس ملک کا رب رکھوالا ہے۔ اور جسے رب رکھے اُسے کون چکھے۔ دُشمنوں کا منہ کالا ہوگا اور پاکستان کا بول بالا ہوگا۔ ان شاء اللہ! گفتگو میں ہمارے مدیر صاحب قربانی کی باتیں کر رہے ہیں تو عرض ہے جناب یہاں تو ایسے ایسے صاحب بھی ہیں جو تین تین بکرے اور گائے کی قربانی کرتے ہیں اور ساتھ والے گھر میں آلو پک رہے ہیں۔ نفرتوں کی یہ دیواریں جانے کب ختم ہوں گی۔ اہل مسلم قربانی کا اصل مقصد ہی فوت کر دیتے ہیں۔ فریج، فریزر گوشت سے لبالب بھرے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے پاس گوشت جاتا ہے نہ کہ خون۔ وہ تو نیتوں سے خوب واقف ہے۔ دوسری بات لوگ ناک نہ کٹ جائے کے ڈر سے قرض لے کر قربانی کرتے ہیں۔ کیا دینِ اِسلام اس بات کی اجازت دیتا ہے؟۔ عجیب وغریب رواج چل نکلے ہیں، لوگ اپنے مفاد کے لئے اپنی طرف سے فتویٰ فرما رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں معاف فرمائے۔ ایک قربانی گزر گئی دوسری قربانی سامنے ہے۔ اُمید ہے ہم دونوں قربانیوں میں سُرخرو ہوں گے۔ جناب عمران احمد قریشی صاحب نئے اُفق، آنچل کے ساتھ ملے، کوئی مضائقہ نہیں لیکن خط بھیجنے کی آخری تاریخ تو بڑھا دیں۔ تین کی بجائے آخری تاریخ ہر ماہ کی دس ہونی چاہیے۔ ریاض حسین قمر دوستوں کی محفل کی صدارت کر رہے تھے۔ میرے خط کو پسندیدگی کی سند سے نوازا، ممنون ہوں اور بہترین تبصرے پر مبارک باد قبول کریں۔ جاوید احمد صدیقی آپ کا خط مختصر ضرور تھا مگر مزہ دے گیا۔ ممنون ومشکور ہوں۔ صائمہ نور گہری باتیں کر رہی تھیں۔ احسن ابرار رضوی کچھ جذباتی جذباتی نظر آئے۔ سید عبداللہ توفیق آپ کی محبتوں کا مقروض ہوں۔ سلامت رہیں اور اپنا ایڈریس بھی سینڈ کریں۔ ننھے منے دو خطوط، خواجہ حسین ظالم، حاجی عمران خان ساگی حاضر تھے۔ پرنس افضل شاہین، شکریہ، سردار اویس اویسی، آپ کی محبتیں، میں تو چاہتوں، محبتوں کا پیاسا ہوں، میری پیاس بجھا دو۔ ریاض بٹ مدلل اور شاندار تبصرے کے ساتھ حاضر تھے۔ آپ کی فون کالز میرا ایروں خون بڑھا دیتی ہیں۔ جیتے رہیں، سلامت رہیں۔ محمد رفاقت بہت شکریہ، عبدالجبار رومی انصاری مدلل خط لکھنے پر مبارک باد اور دیدار کرانے پر چاہتوں بھرا اسلام۔ آپ میرے غریب خانہ پر آئے دل باغ باغ ہوگیا۔ حسین جاوید، آپ کے سخن داد کا شکریہ فلک شیر ملک کا خط بھی عمدہ تھا۔ اب میں بات کروں گا میاں کرامت حسین کے خط کی۔ عرض کروں گا صاحب ستر کی دہائی میں پرنچ چکے ہیں، بچوں والی باتیں کرتے ہیں اور نئے اُفق کبھی کبھی پڑھتے ہیں۔ اوّل تو صائمہ نور نئے اُفق کی لکھاری ہے اور صائمہ مجید نئے اُفق میں نہیں سچی کہانیاں میں لکھتی ہیں۔ اِسی طرح صائمہ قریشی بھی نئے اُفق میں لکھتی ہیں کہیں اُن کو میرے ساتھ نہ جوڑ دینا' رہی بات ای میل کرنے کی، برادر جدید دَور ہے، اپنی پسماندہ سوچ کو بدلیں اور اپنی سوچ وافکار میں جدت لائیں۔ دماغ کو وسعت دیں۔ مثبت سوچیں، منفی نہیں۔ منفی سوچ بہت سی بیماریوں کی جڑ ہے۔ اور اس بات کا کیا ثبوت دے سکتے ہیں کہ یہ خط آپ نے ہی لکھا ہے' آپ کے پاس علم نجوم ہو سکتا، یا الہ دین کا چراغ جس سے آپ قیاس آرائیاں کر سکتے لیکن ادارے کو کیا معلوم یہ خط میاں کرامت نے لکھا ہے یا کسی سہیلی سے لکھوایا ہے۔ رہی بات کہانیوں کی تو نئے لوگوں کی حوصلہ افزائی کرنا چاہیے حوصلہ شکنی نہیں۔ مثبت تنقید کریں۔ جن کہانیوں پر آپ نے بات کی ہے اگر مشورے صادر فرما دیتے کہ اِن کو کیسے بامقصد بنایا جا سکتا ہے تو لکھاری سیکھ سکتا۔ اُمید ہے میرے باتوں کو مثبت لیں گے۔ سلامت رہیں۔ اقراء پڑھ کر دل ودماغ کی کھڑکیاں روشن ہوئیں۔ اللہ تعالیٰ عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین! انٹرویو میں عشنا کوثر سردار سے ملاقات خوب رہی، کسی بھی سوال کرنے والے نے اُن سے اُن کے نام کا مطلب نہیں پوچھا اور اس نام کی تفصیل بھی۔ انٹرویو بہت خوب تھا۔ کہانیوں میں جرم وسزا کی کہانی ''احمقوں کا ٹولہ'' پڑھی، بغور پڑھنے کے بھی کوئی جھول نہ ملا۔ بہت خوب۔ ریاض بٹ اب تک آپ کی پچاس کے قریب کہانیاں پڑھ چکا ہوں، آپ اپنی کہانیوں کو کتابی صورت کیوں نہیں لاتے، یا ادارہ ہی آپ کی کہانیاں کتابی صورت میں لے آئے۔ ''بکرا کہاں ہے'' فہرست میں لکھاری کا نام کے۔ ایم خالد اور کہانی کے نیچے عنبرین اختر' حالانکہ مزاح کے شہنشاہ کے ایم خالد ہی ہیں' کہانی بہت زبردست تھی، مزاح کے ساتھ ساتھ خوبصورت پیغام دیا گیا ہے۔ ویری ویلڈن خالد بھائی

۔ اس کے علاوہ آخری رشتہ، دوستی، قتل، روشن اندھیرے، آب اور آتش، بے خودی، مس کال اور قسط وار ایک سو سولہ چاند کی راتیں کی دوسری قسط نے اپنے سحر میں جکڑ لیا۔ فن پارے کی تمام تحریریں خوب تھیں، ذوق آگہی، خوش بوئے سخن، ڈیول، زرین قمر بہت اعلیٰ۔ خوب، زبردست، اس بار تمام پرچہ بہت اعلیٰ تحریروں کے ساتھ مزین تھا۔ اب اجازت۔ رہی زندگی تو ہوگی ملاقات' اللہ حافظ!

صائمہ نور...... ملتان 'آداب! اُمید کرتی ہوں خوشگوار زندگی بسر کرتے ہوں گے اور دوسروں کی خوشیوں کا سبب بنتے ہوں گے۔ جب میں یہ سطور لکھ رہی ہوں، دِل مغموم سا ہے، آنکھیں نم ہیں اور اُداسی کا ماحول ہے۔ محرم الحرام کی آمد ہے، سال نو شروع ہونے والا ہے۔ قمری سال کا آخری مہینہ بھی قربانی کا اور پہلا مہینہ بھی قربانی کا۔ کیا ہوا ہم قربانی کا حق ادا نہیں کرتے۔ ابھی سے سکیورٹی پلان تشکیل دیئے جا رہے ہیں۔ کیسا المیہ ہے ہم اپنے ہی بھائیوں سے محفوظ نہیں ہیں، مسلک کی لڑائی لڑ رہے ہیں اور بھارتی سورما ناپاک ارادوں سے پاکستان کی سرزمین پر نظریں جمائے ہوئے ہے، کبھی سندھ طاس کی خلاف ورزی تو کبھی کنٹرول لائن کی خلاف ورزی اور روتا چیختا بھی وہی ہے، دُم دبا کر کبھی امریکا بھاگتا ہے تو کبھی اقوام متحدہ' آج کل بھی حالات کشیدہ چل رہے ہیں، بس دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ دُشمنوں کو نیست و نابود کرے اور اسلام کا بول بالا فرمائے، پاکستان اور اس میں بسنے والے ہر شہری کی حفاظت فرمائے آمین۔ ماہ اکتوبر 2016 کا شمارہ لیٹ ملا اور لیٹ ملنے کی وجہ عمران احمد قریشی بھائی نے بتا بھی دی۔ شکریہ وضاحت کر دی۔ سرورق خوفناک سا بنایا گیا لیکن تحریریں ہر موضوع کی شامل ہیں، طنز و مزاح، لو، اخلاقی، اصلاحی وغیرہ۔ ٹائٹل کو لے کر چلیں تو سرورق کہانی بھی ہونی چاہیے۔ دستک میں جناب محترم انکل مشتاق احمد قریشی نے نہایت خوبصورتی سے امریکا کی بھارت پر مہربانی کیوں؟ لکھا۔ امریکا کو صرف اپنے مفادات سے غرض ہے وہ کسی کو بھی استعمال کر سکتا ہے۔ لیکن اُس کے اندرون خانہ حالات کا جائزہ لیا جائے تو وہ خود قرضے میں ڈوبا ہوا ہے اور ظاہری طور پر دھاڑتا ہے مگر اندر سے کھوکھلا ہو چکا ہے اور وہ وقت قریب ہے جب روس کی طرح اس کے بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے اور بھارت کو بھی سبق لینا چاہیے کہیں روس کی تاریخ پھر سے نہ دہرائی جائے۔ گفتگو میں ریاض حسین قمر کا خط بازی لے گیا، خط بہت خوبصورت تھا، بھائی یاد رکھنے کا شکریہ، مجید احمد جائی بھی کمر کسے ہوئے ہیں اور ہمیشہ اوّل نہیں دوئم ضرور آتے ہیں۔ گہرے جملے بازی کرتے ہیں اور خط بھی شاندار ہوتا ہے۔ جاوید احمد صدیقی کبھی کبھی جلوہ گر ہوتے ہیں، اور کمال کر دیتے ہیں۔ احسن ابرار رضوی اپنا حق ادا کر رہے ہیں، سید عبداللہ توفیق بھائی، میرا اصل نام یہی ہے "صائمہ نور" اور مجھے اصل نام سے لکھتے ہوئے بہت اچھا لگتا ہے۔ آپ کی محبتیں ہیں کہ ایک بہن کو اِن القابات سے نواز رہے ہیں۔ الحمدللہ! میں اپنے نام کا مطلب خوب جانتی ہوں، صائمہ کا مطلب ہے صبر کرنے والی، شاکر، اور نور روشنی کو کہتے ہیں، مزید وضاحت کروں تو بات کہیں اور چلی جائے گی، آپ سمجھدار ہیں خود ہی عقل کی کسوٹی پر کھ لیں۔ خواجہ حسین ظالم۔ "ظالم" بھائی یہ کیا ماجرا ہے۔ پرنس افضل شاہین، کا خط زبردست تھا، ریاض بٹ دلائل کے ساتھ حاضر ہوتے ہیں اور اِن کی جرم و سزا پر کہانیاں زبردست ہوتی ہیں جیسے ابھی احمقوں کا ٹولہ تھی۔ کرامت حسین ادیب ہیں، پاگلوں والی باتیں کیوں کر رہے ہیں، کوئی صائمہ نور سے لکھے یا صائمہ قریشی، آپ کس شک میں مبتلا ہو رہے ہیں، کہو تو اپنا آئی ڈی کارڈ ادارہ کو بھجوا دوں اور نکاح نامہ بھی۔ محمد رفاقت، عبدالجبار رومی انصاری، حسین جاوید، اور فلک شیر کے تبصرے خوب تھے۔ اقراء پڑھ کر دل کو سکون ملا، انٹرویو کا سلسلہ بہت خوب ہے۔ اور ہو سکے تو پاکستان کی سیر کے حوالے سے کسی نہ کسی شہر کا تعارف بھی دیا جائے، کہانیوں میں ملیے ہاتھ، مس کال، روشن اندھیرے، قتل، آخری رشتہ، دوستی، بے خودی، احمقوں کا ٹولہ، آب اور آتش زبردست تھیں، "بکرا کہاں ہے" طنز و مزاح پر مبنی سبق آموز تحریر تھی، مزاح مزاح میں بہت گہرا سبق دیا گیا ہے۔ ذوق آگہی، خوشبوئے سخن، فن پارے خوب تھے، ڈیول زریں قمر نے عمدہ لکھی، اور ایک سو سولہ چاند کی راتیں اپنے جادو میں قید کرنے لگی ہے۔

ریحانہ سعیدہ...... لاہور۔ آداب۔ امید ہے سب عیدالضحیٰ رب کی رضا کے مطابق منا چکے ہوں گے۔ اور خوب گوشت کھا کے اچھی صحت بنالی ہوگی۔ رب کی رضا تو اس عید کو بھی عیدالفطر کی طرح منانے میں ہے سو عید پر انہیں اپنے دوستوں رشتے داروں کو دینے کی بجائے تین حصے کر کے ایک حصہ ان غریبوں کا ہے جو اس قربانی کی استطاعت نہیں رکھتے سفید پوش ہیں اور کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے۔ اس قربانی کے بعد اگلا ماہ انسانی قربانی کا ہے۔ کہ اللہ کی راہ میں اور باطل کے سامنے کون سینہ سپر ہو سکتا ہے کون اپنی معصوم جان لٹا سکتا ہے اور یہی سبق ہے ایک مسلمان کی زندگی کا کہ کلمہ حق کے لئے گردن نہ جھکائیں اور گردن کٹوا دیں۔

غریب و سادہ و رنگین ہے داستان حرم
نہایت ہے اس کی حسین ابتدا ہے اسماعیل

لیکن آج کل ہمارا سارا فوکس نیازیں بانٹنے پر کالے کپڑے پہن کر ماتم کرنے پر یا ایک دوسرے کی ضد میں فساد کرنے پر ہے۔ جبکہ حسینی سنت تمام مسلمانوں کے لئے ہے کسی ایک فرقے کے لئے نہیں منافقانہ طرز عمل چھوڑ کے ان کی سنت اپنائیں یہی آج کی ضرورت ہے اب ہو جائے تبصرہ جناب پر لے تبصرہ کیا پر لے نمبر پر آیا پر حسرت ان غنچوں پر ۵۰۰ لئے بنا مرجھا گئے۔ خیر میرے لئے یہی کافی ہے کہ دوستوں تک بات پہنچ گئی۔ سرورق پر چھپی تصویر میں لڑکی خوبصورت پر چالاک لگ رہی تھی بیک گراؤنڈ کسی ہارر مووی کا سین لگ رہا تھا، نام کا اثر ہوتا ہے پر اتنا بھی نہیں جتنا محمد شعیب صاحب نے دکھا دیا کہانی اچھی تھیم کے ساتھ تھی پر غیر ضروری لمبی کر دی۔ میلے ہاتھ اچھی کہانی تھی آئیڈیل تو بس جی فلموں میں ہی اچھے لگتے ہیں لڑکی کی ایک آواز پر پہنچ جاتے ہیں چھ سات بندے گرا دیتے ہیں جبکہ لڑکیاں گھر میں سو آوازیں بھی دیں تو لڑکوں کے کانوں پر جوں نہیں رینگتی۔ ریاض بٹ تو جی اچھی اچھی کہانیاں پولیس والوں کی سنا کر ہمارے دلوں میں ان کے لئے عزت پیدا کر رہے ہیں ورنہ تو جی ہم اسٹوڈنٹ لائف میں انہیں چھلڑ کہتے تھے۔ ایک سو سولہ چاند کی راتیں سلو ہے پر لے نئے افق کی قسط وار کہانیاں اتنی پر تجسس ہوتی تھیں کہ میری اور طاہرہ کی باری لگ جاتی تھی پر اب اتنی سلو کہانیاں ہیں کہ پر لے باقی کہانیاں پڑھ کے پھر قسطیں پڑھتے ہیں، بے خودی کوئی خاص کہانی نہیں تھی مس کال بھی پرانے ٹاپک پر ایوریج سی کہانی تھی۔ آخری رشتے کا کوئی سر پیر نہیں تھا۔ دوستی کہانی آجکل کے دور کے مطابق ہے کیونکہ ہوس پرستی اور مفاد پرستی نے عمر کا حساب ختم کر دیا ہے نہ رشتوں کا تقدس رہا نہ عمر کا۔ مہتاب خان کی کہانی اچھی تھی حقوق العباد کو نمایاں کرتی ہوئی حج چھوڑ دیا اور ایک جان بچالی اور اللہ ایسے لوگوں کو حج اکبر کا ثواب دیتا ہے۔ بکرا کہاں ہے ایسا ہی مزاح تھا جیسے آجکل کے سٹیج ڈراموں کا ہے قتل مزے کی کہانی تھی، قتل پر لکھنے والے لکھاری بھائیوں اور بہنوں آپ کی بھی حقیقت ایسی تو نہیں ہے نا۔ فن پارے میں کچھ کہانیوں نے دل کو چھوا تو کچھ بس پھیپھڑوں تک ہی پہنچ سکیں جبکہ آپ نے لکھا تھا دل کو چھو لینے والی کہانیاں اس میں اگر عصمت چغتائی سعادت حسن منٹو اور کرشن چندر کی مختصر کہانیاں ہوں تو بہتر ہے۔ خوش بوئے سخن اچھا تھا ڈیول بھی اچھی شروعات ہے اب اجازت تبصرہ کہانیوں کے حوالے سے ہے ورنہ آپ سب میرے لئے محترم ہیں۔

عائشہ خواجہ...... منچن آباد۔ السلام علیکم عمران انکل میں پہلی بار حاضر ہوئی ہوں محفل میں امید کرتی ہوں ویلکم کریں گے دور حاضرہ میں مجھے نئے افق کا کوئی ثانی نظر نہیں آتا یہ ایک لاجواب اور منفرد شمارہ ہے انکل مشتاق بہت عمدہ لکھتے ہیں اور انکل طاہر لاجواب محفل گفتگو میں آج کل بہت لڑائی ہو رہی ہے اس کو ذرا کنٹرول کریں ذوق آگہی شاندار سلسلہ ہے اور مجھے بہت پسند ہے تمام بہن بھائی بہت اچھا لکھتے ہیں خداوند کریم شمارے کو دن دگنی ترقی عطا فرمائے آمین۔

ممتاز احمد...... سیٹلائٹ ٹاؤن، سرگودھا۔ السلام علیکم اکتوبر کا شمارہ پچیس ستمبر کو موصول ہوا
دستک میں محترم مشتاق احمد
قریشی صاحب نے امریکا کی

بھارت پر مہربانی کیوں کے عنوان سے ایک فکر انگیز اور مدلل تجزیہ پیش کیا بھارت پر جتنی بھی مہربانیاں ہو جائیں جتنا بھی گٹھ جوڑ کر لے اس کے نتیجے میں کبھی بھی ان کو مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہوں گے۔ ان شاء اللہ ہر محاذ پر بھارت نہ صرف منہ کی کھائے گا بلکہ اپنے ناپاک ارادوں اور عزائم کی تکمیل کبھی نہیں کر پائے گا۔ گفتگو میں محترم ریاض حسین قمر اپنے سیر حاصل تبصرے اور خوب صورت افکار کے ساتھ کرسی صدارت پر رونق افروز تھے۔ آپ کو میرے خیالات پسند آئے بہت شکریہ، نائب صدارت کی کرسی پر مجید احمد جائی اپنی محبتوں اور چاہتوں کے پھول بکھیر رہے تھے آپ کی مبارکباد اور کہانی پسند کرنے کا بہت شکریہ، جاوید احمد صدیقی نے بہت عمدہ تبصرہ لکھا میری کہانی پسند کرنے کا شکریہ۔ ریاض بٹ کا تبصرہ بہت شاندار اور نمبرون تھا۔ محترم ریاض بٹ آپ نے میری کہانی پر مفصل تبصرہ لکھا کہانی کو پسند فرمایا یقین جانیے آپ جیسے مایہ ناز اور منجھے ہوئے لکھاری کے تبصرے اور حوصلہ افزائی نے ہمت بڑھائی جس سے مزید اچھا اور بہتر لکھنے کی جستجو پیدا ہوئی ہے آپ کا بے حد ممنون اور شکر گزار ہوں کرامت حسین جہلم سے گفتگو میں تشریف لائے۔ خوش آمدید جی میرے محترم آپ نے پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کے انٹرویوز شائع ہونے پر اپنے خیالات کا اظہار کیا تو اس ضمن میں کچھ وضاحت کرنا چاہوں گا پہلی بات تو یہ ہے کہ انٹرویو کوئی کہانی یا افسانہ تو ہے نہیں جو ایک میگزین میں چھپ جائے تو دوسرے میں شائع نہیں ہو سکتا دوسرا یہ کہ ان کے کئی انٹرویوز اس سے پیشتر ملک کے بے شمار میگزینز اور ادبی مجلوں میں شائع ہو چکے ہیں اور اہل دانش ارباب نے ان کو بہت سراہا ہے اور آج تک کسی نے یہ اعتراض نہیں کیا کہ ایک سے زیادہ میگزین میں کیوں شائع ہوئے ہیں۔ پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کا شاگرد ہونے کا مجھے اعزاز حاصل ہے وہ میرے گھر کے قریب رہتے ہیں میں اکثر ان کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل کرتا رہتا ہوں سہ ماہی ”صدائے دل“ کے لیے ان کا انٹرویو ریکارڈ کرنے کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور چار گھنٹے ان کے قدموں میں بیٹھ کر گزارے تمام سوالات جو اپنی طرف سے کیے ان کے جوابات لکھے اسی طرح نئے افق کے لیے انٹرویو ریکارڈ کرنے محترم عمران احمد صاحب مدیر ماہنامہ نئے افق کی پیشگی اجازت سے دوبارہ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور یہ انٹرویو تھوڑا مختلف تھا انٹرویو کے ساتھ ادارہ نئے افق کو ڈاکٹر صاحب کی آٹھ کتابیں بھی ارسال کیں علاوہ ازیں ان کی ذات اور شخصیت پر لکھا ہوا بہت سارا مواد بھی انہوں نے خود فراہم کیا میں نے ان کا انٹرویو نہ تو کہیں سے نقل کیا اور نہ کاپی کی براہ راست ان سے سوالات کیے اور جوابات حاصل کیے اب اگر ان کے دس انٹرویو اور بھی شائع ہوں تو جو معلومات ان کی بہترین شخصیت، حقائق ان کی خدمات اور کیے گئے رفاحی، اصلاحی کام ہیں تو وہ وہی ہوں گے ان میں کوئی تبدیلی تو نہیں آئے گی، یہ میرے دل کی ان سے محبت، پیار، عقیدت اور احترام ہے کہ صدائے دل اور نئے افق کے قارئین کرام تک ان کی خوب صورت شخصیت کے مختلف پرلوؤں اور ان کی بے شمار خدمات کو انٹرویو کی شکل میں پہنچانے کی کوشش کی کہ لوگ جان سکیں کہ ایک بے بصر شخص نے کس قدر ہمت، حوصلے اور جواں مردی سے آنکھیں رکھنے والوں سے بڑھ کر کام کیے کامیاب زندگی گزاری ادب کی بے پناہ خدمت کی۔ مقصد ان کی خدمات اور شخصیت کو خراج تحسین پیش کرنا تھا۔ اب ان شاء اللہ کچھ اور میگزینز میں بھی ان کے انٹرویو نئے انداز میں شائع کرانے کا ارادہ ہے باقی آپ کو میری کہانی پسند نہیں آئی تو بات یہ ہے کہ مجھے مطالعے اور لکھنے کا جنون کی حد تک شوق ہے ابھی لکھنے کی پہلی سیڑھی پر پہلی منزل ہے مجھے تو ابھی صحیح طرح سے قلم پکڑنا بھی نہیں آیا لکھنا سیکھ رہا ہوں یوں کہہ لیں طفل مکتب ہوں تو یقیناً مجھ نئے لکھاری کی تحریر میں بے شمار خامیاں ہوں گی تو اس سلسلہ میں اپنے سینئر اور منجھے ہوئے لکھاریوں سے رہنمائی لیتی ہے آپ کی تنقید میرے لیے اصلاح کا درجہ رکھتی ہے۔ صائمہ نور، احسن ابرار رضوی، سید عبداللہ توفیق، خواجہ حسین، حاجی عمران سانگی اور پرکس افضل شاہین نے بہترین اور شاندار خطوط، تبصرے لکھے آپ سب دوستوں کی خدمت میں خلوص بھرا اسلام قبول ہو، مسکان ظفر بھٹی کو صرف اتنا ہی کہوں گا کہ حسد اور بغض کی آگ میں جل جل کر کوئلہ بننا چھوڑ دو۔ محمد رفاقت، عبدالجبار رومی انصاری، حسین جاوید اور فلک شیر ملک کے خطوط بھی بہت شاندار تھے۔ اب

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
ایڈ فری لنکس

ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر

کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !
All Done
Liked
Message
Get Notifications
Add to Interest Lists...
Unlike
IN YOUR NEWS FEED
See First
See new posts at the top of News Feed
Default
See posts as usual
Unfollow

i. Open Paksociety Page.
ii.Click Liked.
iii.Select Get Notifications.
iv.Select See First.

بات ہو جائے کہانیوں کی تو سب سے پہلے اپنے فیورٹ رائٹر جناب ریاض بٹ کی احمقوں کا ٹولہ پڑھی بلاشبہ کہانی نمبر ون اور بہترین تھی بہت پسند آئی دوسرے نمبر پر عارف شیخ کی مس کال پڑھی مصنف نے ایک مس کال کے نتیجے میں ہونے والی بات چیت اور بڑھتے بڑھتے ایک جوان لڑکے جو کہ اپنی ماں باپ کی آنکھ کا تارا تھا کی المناک موت پر ختم ہوئی۔ عنبرین اختر کی آخری رشتہ بہت سبق آموز اور شاندار کہانی تھی، عنبرین اختر اتنا اچھا لکھنے پر آپ کو بہت بہت مبارکباد قبول ہو، صفحہ نمبر 81 پر آپ کا مختصر تعارف شائع ہوا مختلف صفحات پر آپ کی شاعری کو زینت بنایا گیا آپ ایک اچھی نثر نگار ہونے کے ساتھ ساتھ بہت اچھی شاعرہ بھی ہیں ویلڈن اللہ رب العزت آپ کو اور زور قلم عطا فرمائے، آمین۔ خلیل جبار دوستی کے عنوان سے بہت اچھی اور سبق آموز کہانی لے کر آئے آج کل اس طرح کی آنٹیاں ٹڈی دل کی طرح پھیلی ہوئی ہیں اللہ ان بے حیا آنٹیوں کے شر سے ہر شخص کو بچائے، روشن اندھیرے، بکرا کہاں ہے اور قتل بہت اچھی کہانیاں تھیں شمارہ ابھی زیر مطالعہ ہے ذوق آگہی میں عائشہ ملک اعوان، گل مہر، عبدالجبار رومی انصاری، محمد یاسر اعوان، محمد رفاقت، فلک شیر ملک اور خواجہ حسین کے انتخاب بہت شاندار تھے خوش بوئے سخن میں ریاض حسین قمر، دستگیر شہزاد اور محمد یاسر اعوان کا کلام بہت عمدہ تھا پسند آیا، فریدہ جاوید فری کے لیے بہت سی دعائیں اللہ کریم ان کو صحت تندرستی اور شفا عطا فرمائے، آمین۔ اب آخر میں بات کروں گا محترم القام واجب الاحترام جناب ریاض حسین شاہد کی قسط وار پل صراط عشق کی، سب سے پہلے دل کی گہرائیوں سے آپ کو اتنا اچھا لکھنے کی ڈھیر ساری مبارکباد پیش کرتا ہوں سچ پوچھیے تو پل صراط عشق نئے افق کی جان تھی عشق حقیقی کو لیے یہ خوب صورت انجام کے ساتھ اختتام پذیر ہوئی۔ ریاض شاہد آپ نے قلم اور لکھنے کا حق ادا کر دیا نوجوان نسل کے لیے آپ کی یہ تحریر مینارہ نور ہے مجھ جیسے نئے لکھنے والے آپ کی تحریروں سے بھرپور استفادہ کر سکتے ہیں اللہ رب العزت آپ کو نظر بد، حاسدوں کے حسد اور شرپسندوں کے شر سے محفوظ رکھے آمین۔ آپ دنیا ادب کا ایک درخشندہ چمکتا، دمکتا ستارہ ہیں۔ اللہ آپ کو صحت تندرستی کے ساتھ سلامت رکھے اور آپ اسی طرح شاہکار تحریریں اور ناول تحریر کرتے رہیں، آمین اپنے ان ٹوٹے پھوٹے الفاظ کے ساتھ اب اجازت چاہوں گا ان شاء اللہ اگلے ماہ حاضری ہوگی اگر زندگی نے وفا کی تو اللہ رب العزت سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے سب کی خیر ہو۔

ریاض بٹ...... حسن ابدال۔ السلام علیکم ماہ اکتوبر کا شمارہ اس بار کافی تاخیر سے ملا بہر حال یہ جان کر تسلی ہو گئی کہ آئندہ شمارہ انہی تاریخوں میں آنچل کے ساتھ ملا کرے گا سرورق ہمیشہ کی طرح خوب صورت ہے دستک میں مشتاق احمد قریشی صاحب کا تجربہ کار قلم اس بار امریکا کی بھارت پر مہربانی کے حوالے سے لکھ رہا ہے چین اب حد سے زیادہ امریکا کی آنکھوں میں کھٹک رہا ہے۔ بھارت امریکا کی گود میں بیٹھ کر دنیا کو ایک اور عالمی جنگ میں جھونکنا چاہتا ہے یا آئے دن پاکستان کو بھی دھمکیاں دیتا رہتا ہے اور پاکستان کی بہادر فوج اسے منہ توڑ جواب دے رہی ہے ہماری دعا ہے کہ خدا دشمنوں کے ناپاک عزائم کو خاک میں ملا دے اور ہمارے پاک وطن کی حفاظت فرمائے، آمین۔ اب بڑھتے ہیں خطوط کی طرف ریاض حسین قمر بھائی کرسی صدارت پر بیٹھے ہیں ویل ڈن، بڑا سندر اور بے باک تبصرہ ہے میری کہانی اور خط پسند کرنے کا بے حد شکریہ اور یہ آپ اعلیٰ ظرفی اور شوق ہی ہے جو آپ میری تحریر سب سے پہلے پڑھتے ہیں شکریہ، آپ اب رو بصحت ہیں خدا آپ کو ہمیشہ ہر بلا سے محفوظ رکھے، آمین۔ مجید احمد جائی کیسے ہو، آپ کے خیالات بھی خوب صورت اور مدلل ہیں میری کہانی اور خط ہمیشہ کی طرح پسند کرنے پر مہربانی نوازش واقعی ساحل سے اندازہ طوفان نہیں ہوتا بہر حال اگر کبھی موقع ملا تو ان شاء اللہ ضرور ملتان آؤں گا احسن ابرار رضوی میرا خط پسند کرنے پر یہ بندہ ناچیز مشکور و ممنون ہے سید عبداللہ توفیق میں جو کوشش گفتگو میں شریک قارئین کے لیے کرتا ہوں۔ اس کو آپ نے سراہا شکریہ خواجہ حسین ظالم یہ بھی ظالم کیا ہوا براہ مہربانی اس کو اپنے نام سے ہٹائیں، ویسے آپ کا اور حاجی عمران خان ساگی کا مختصر تبصرہ محفل میں آپ کی موجودگی کو ظاہر کر رہا ہے بہر حال

چراغوں میں اور تیل ڈال لیے تا کہ محفل میں آپ کے دم سے زیادہ روشنی ہو۔ یہی بات میں مسکان ظفر بھٹی سے بھی کہتا ہوں، پرنس افضل شاہین کیا خوب اشعار لکھتے ہیں اور کیا عمدہ تبصرہ کیا ہے الطاف حسین کو کون لائے گا اور سزا دے گا یہ ایک ایسا سوال ہے جو ہر محب وطن پاکستانی کے ذہن میں ہے عبدالغفار عابد آپ کا خط بھی پسند آیا آپ نے میری تحریر کردہ کہانی پر جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ میرے لیے باعث اطمینان اور تقویت ہے کہ میں جس مقصد کے لیے تفتیشی کہانیاں لکھتا ہوں وہ پورا ہو رہا ہے میرا مقصد ہے قانون کا احترام سکھانا اور لوگوں کے لیے سبق کا سامان مہیا کرنا ہے یہی بات میرے روحانی استاد محترم ابن صفی (مرحوم) بھی فرمایا کرتے تھے محمد رفاقت آپ کا شعر اور خط پسند آیا یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے عبدالجبار رومی انصاری آپ نے کشمیر کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ قابل غور ہے آپ کا لکھا ہوا قطعہ اور لفظوں کا استعمال خوب ہے حسین جاوید آپ کا خط بھی اچھا ہے لیکن یہ بات اچھی نہیں ہے کہ آپ آئندہ خط نہیں لکھیں گے اس فیصلے کو تبدیل کریں فلک شیر ملک بھائی ایڈیٹر صاحب کی بات سے آپ کو اطمینان ہو جانا چاہیے میرا خط اور کہانی پسند کرنے کا شکریہ رہی بات ناصرہ کو قتل کرنے کی تو اس بابت آپ نے آخری سطروں میں پڑھا ہو گا کہ آفتاب کوئی گواہ نہیں چھوڑنا چاہتا تھا پھر ناصرہ نے تو اس کے لیے عقبی کھڑکی کھول دی تھی بہر حال میری کہانی پوری توجہ سے پڑھنے کا شکریہ، اب اپنے پڑوسی جاوید احمد صدیقی سے بات ہو جائے بھائی آپ میرے خط کی چودویں لائن کو دوبارہ ملاحظہ فرمائے میں نے آپ کا ذکر کرتے ہوئے آپ کا موبائل نمبر مانگا تھا اس لیے آپ کا شکوہ بے جا ہے ہم آپ کو کیسے بھول سکتے ہیں۔

ہم اسے بھول گئے ہائے یہ اس کی سادہ دلی
کیا کبھی کوئی طائر بھی بھولا ہے نشیمن اپنا

آپ کا اس بار کا خط بھی اپنے اندر ایک گہرائی لیے ہوئے ہے اللہ کرے زور قلم اور زیادہ میری کہانی پسند کرنے کا شکریہ۔ صائمہ نور بہن کیسی ہو، آپ کو بھی میرا خط اور کہانی پسند آئی بہت مہربانی، شکریہ۔ میں بار بار یہ بات لکھتا ہوں کہ آپ بہن بھائیوں کی حوصلہ افزائی ہی میرے اندر لکھنے کی جوت جگائے ہوئے ہے۔ فریدہ جاوید فری خوش آمدید، آئندہ ذرا بھرپور تبصرے کے ساتھ آئیں، جو کہانیاں اب تک پڑھ سکا ہوں ان پر تبصرہ ہو جائے میلے ہاتھ محمد سلیم اختر کی ایک سبق آموز تحریر ہے کبھی کبھی انسان سمجھتا کچھ ہے ہوتا کچھ ہے عنبرین اختر کی کہانی آخری رشتہ بھی خوب رہی، خلیل جبار کی دوستی ایک سبق آموز کہانی ہے آنٹی ماہ لقا جیسی عورتیں آج کل کے دور میں بہت ہیں بس ان سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ بکرا کہاں ہے بڑی مزیدار تھی فقرے برجستہ تھے تھکے ذہنوں کے لیے اکسیر کا درجہ رکھتی تھی، ذوق آگہی میں عائشہ ملک اعوان، گل مہر، پرنس افضل شاہین، عبدالجبار رومی انصاری، محمد رفاقت، فلک شیر ملک اور محمد کاشف کا انتخاب خوب تر ہے راؤ تہذیب حسین تہذیب کا قطعہ بھی حسب حال ہے خوش بوئے سخن میں ریاض حسین قمر، عامر شہزاد تشنہ، پرنس افضل شاہین، حسین جاوید، عامر زمان عامر کا انتخاب اچھا ہے۔

عائشہ اے بی...... جھڈو، سندھ۔ السلام علیکم میں عائشہ اے بی پہلی دفعہ نئے افق کی محفل میں آئی ہوں میرا اور نئے افق کا ساتھ کئی سالوں یا مہینوں کا نہیں ہے میں نے نئے افق کا پہلی دفعہ مطالعہ جون 2016ء میں کیا جو کہ ایک بہترین دوست نے مجھے لاہور سے بھیجا تھا شکریہ دوست، رسالہ کیونکہ پہلی دفعہ پڑھا تھا تو دو تین نام دیکھ کر میں دنگ گئی کہ یہ لوگ یہاں ہیں؟ جناب عبدالجبار رومی اور پرنس افضل شاہین میں جناب عبدالجبار رومی انصاری کو گزشتہ تین سالوں سے بچوں کے رسالے میں پڑھتی آئی ہوں اور مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ یہاں بھی لکھتے ہیں جناب آپ کو شادی کی بہت بہت مبارک ہو، اللہ آپ کو خوش رکھے، آمین۔ دوسرے جناب بھائی پرنس افضل شاہین میں آپ کو غائبانہ تعارف سے جانتی ہوں آپ آپی پروین کی باتوں میں ہمیشہ آ جاتے ہیں آپ سوچ رہے ہوں گے کہ مجھے یہ بات کیسے معلوم تو بھائی آپ کو بتا دوں میرا اور آنچل کا چھ سال پرانا تعلق ہے

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

تو آپ آنچل میں غیر حاضر ہو کر بھی حاضر ہو جاتے ہیں ہمارے یہاں نئے افق نہیں ملتا اور ہاکر صاحب لا کر نہیں دیتے میں کیا کروں، اسی لیے کہانیوں پر تبصرہ ادھار رہے گا مونا شاہ قریشی آپ بہت اچھی ہو، اللہ سے دعا ہے کہ وہ آپ کو ہمیشہ شاد و آباد رکھے حیران مت ہونا کہ میں کون ہوں ارے بہنا آپ کی آئی ڈی فرینڈ حیا بلوچ ہوں کیونکہ آئی ڈی فرضی نام سے ہے امید ہے سمجھ گئی ہوں گی اجازت چاہوں گی اس دعا کے سنگ کہ سب لوگ ہمیشہ ہنستے مسکراتے رہیں اور زندگی کے رنگوں سے خوشیاں کشید کرتے رہیں، حوصلہ افزائی ہوئی پھر تو آؤں گی اور اگر نہ ہوئی پھر بھی آؤں گی کیونکہ میں عائشہ اے بی اپنے نام کی ایک ہوں۔

عمر فاروق ارشد...... فورٹ عباس۔ السلام علیکم! عمران بھیا کیسے ہیں امید کرتا ہوں کہ خیریت سے ہوں گے اکتوبر کا شمارہ کافی دیر سے موصول ہوا آج کل نئے افق لیٹ مل رہا ہے اب نجانے اس کی کیا وجوہات ہیں بہرحال مجھے مسلسل تین چار ماہ کھڈے لائن لگائے جانے کے باعث میں شرکت سے محروم رہا البتہ کسی بھی دوست قاری نے ذرا بھی نوٹس لینا گوارا نہیں کیا، اس دنیا کا یہی دستور ہے خیر، اس دفعہ کا سرورق کسی صاحب نے دل لگا کر بنایا تھا سو ہمارے دل کو چھو گیا، خاص طور پر حسینہ کے دراز سیاہ بال دیکھ کر ہمیں اپنی آنجہانی ساہیوال نسل کی بھینس یاد آ گئی۔ خدا بخشے بڑا ہی وافر دودھ دیتی تھی قریشی صاحب کی دستک ہمیشہ کی طرح آنکھیں کھولنے والی تھی، ان کا تجزیہ بالکل درست تھا کیونکہ اب میں یہ سطور لکھ رہا ہوں تو تازہ ترین اطلاعات کے مطابق دونوں ممالک (پاکستان اور بھارت) اپنی جنگی تیاریاں مکمل کر چکے ہیں، بھارت کی روایتی جارحیت پسندی اس کو لے ڈوبے گی قریشی صاحب میں آپ کی دستک پر پچھلے چار ماہ سے تبصرہ کرنے کی سعادت سے محروم رہا ہوں تو اس کی وجہ صرف اور صرف عمران بھائی ہیں، آپ ان سے ضرور پوچھیے گا کہ یہ بغیر اطلاع کے لکھاریوں کو جبری رخصت پر کیوں بھیج دیتے ہیں گفتگو بھی اپنے جوبن پر ہے میں کافی عرصے سے محسوس کر رہا ہوں کہ کچھ ساتھی گفتگو کی محفل کو سیاسی اکھاڑہ سمجھ کر اپنی بصیرت کے موتی بکھیرنا شروع کر دیتے ہیں اور پورے تبصرے میں شمارے پر کوئی بات نہیں ہوتی، یہ غیر ذمہ داری ہے براہ مہربانی اس سے اجتناب کریں بے شک سیاست اور معاشرتی برائیوں پر قلم کشائی ضرور کریں لیکن اتنا جذباتی مت ہوں کہ آپ خود کسی آسمانی فرشتے کی مانند بن جائیں کہ جو سب خامیوں سے ماورا ہو، میاں کرامت صاحب نے اپنی گفتگو میں بہت اہم باتوں پر آپ سے وضاحت مانگی مگر آپ نے کوئی قابل ذکر وضاحت نہیں دی سخت ایکشن نہ ہونے کی وجہ سے نئے افق میں گروپ سازی زور پکڑتی جا رہی ہے۔ میں نے پہلے بھی اس پر بات کی تھی مگر وہ خط ضبط کر لیا گیا تھا عمران بھیا براہ کرم اس رجحان کو نئے افق سے ختم کریں دیگر ساتھیوں کے تبصرے بھی عمدہ تھے جہاں تک کہانیوں کی بات ہے تو میرے خیال میں معیار کافی بہتر ہو چکا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے پرانے لکھاریوں کو واپس بلانے کا جو سلسلہ شروع کیا ہے وہ خاصا کامیاب رہا ہے جیسے کہ عشنا کوثر صاحبہ جو ناول لے کر آئی ہیں وہ دل کی دھڑکنیں اتھل پتھل کر دینے والا ہے۔ نہایت ہی منفرد موضوع اور کہانی پر گرفت مضبوط ہے جو یقیناً ان کے وسیع مطالعے کا حاصل ہے اللہ کرے زور قلم اور زیادہ ابتدائی صفحات پر بھی عمدہ ناول موجود تھا۔ مصنف کا نام اگرچہ نیا ہے تاہم ناول اچھا تھا دیگر کہانیوں میں سلیم اختر سرفہرست رہے، میلے ہاتھ بہت ہی بہترین کہانی تھی سلیم صاحب کافی دیر بعد آئے اور بالکل درست آئے، آخری صفحات پر زریں قمر کا ناول کوئی خاص تاثر چھوڑنے میں کامیاب نہیں ہو سکا دراصل یہ کافی گھسا پٹا موضوع ہے اور پاکستان میں اس موضوع کی اچھی خاصی یخنی بن چکی ہے۔ خیر، اب یہ یخنی نوش تو فرمانا پڑے گی، دیکھتے ہیں شاید آگے چل کر ذائقہ بہتر ہو جائے مجموعی طور پر شمارہ بہترین تھا لیجیے عمران بھائی اجازت دیجیے ابھی بہت ساری چیزیں تشنہ رہ گئی ہیں لیکن وقت کی قلت کے باعث اتنا کافی ہے یہ حاضری بھی اس لیے لگوائی ہے کہ کہیں محترم قارئین ہمیں بالکل ہی نہ بھول جائیں کیونکہ ہم اپنے چار سالہ کیریئر میں خون کی سیاہی سے لکھے گئے تبصروں کو اپنی سستی اور ہڈ حرامی کی وجہ سے ضائع ہوتے نہیں دیکھ سکتے آخر میں بتا دوں کہ ٹونی فضلو سیریز کی نئی کہانی ان شاء

اللہ جلد آپ کو پڑھنے کو ملے گی، والسلام

مسکان ظفر بھٹی...... شام کے بھٹیاں۔ السلام علیکم تبصرہ حاضر خدمت ہے۔ سرورق کی بھولی بہنا پتا نہیں کس چیز کو محویت سے دیکھ رہی ہوں۔ انکل مشتاق احمد قریشی کا اداریہ دل کے پھپھولے تھے ہر جگہ غرض کو مدنظر رکھا جاتا ہے گفتگو میں ایم اے راحیل کو انعام نہ ملنے پر کچھ لوگ افسردہ تھے ریاض حسین قمر نے کھری سنائی جبکہ مجید جانی، صائمہ نور اور احسن ابرار رضوی حوصلہ دیتے نظر آئے بھائی مجید جانی کہانی شائع نہ ہونے کی وجہ سے پریشان ہیں پلیز کسی ایک ہی رسالے میں شائع کرانا ورنہ بعد میں معذرت کرنا پڑے گی۔ بابا میاں کرامت حسین ادب کی دنیا کی ڈکشنری ثابت ہوئے ایسے بزرگوں کا دست شفقت ضرور سر پر ہونا چاہیے ایسے تلخ حقائق آج کل کہانیاں شائع کرانے کے شوقین ادیبوں کے پاس کہاں اقرا میں مختصر مگر جامع تفسیر تھی دنیا کی ہر چیز قدرت الٰہی کی نشانی ہے قران مجید قیامت تک ہدایت کا سرچشمہ ہے، آب و آتش میں رانو پر ماں کی سختیاں سگی ماں کی بجائے شاہین اور باپ کی نصیحت رحمان کی محبت کتنا ہی کچھ سادہ الفاظ میں جامعیت کے ساتھ بیان کیا احمقوں کا ٹولہ میں بستہ ب کے بدمعاش کمال چالاکی دیکھا گئے کیشیر طارق بھی حصہ دار تھا مگر آپ چھا گئے۔ عشنا کوثر فتح النساء اور نواب پٹوڈی کی نوک جھونک کے ساتھ برصغیر کی تقسیم پاک وطن کا قیام محبتوں کے لیے قربانیوں کا سلسلہ بڑی خوبی سے بڑھا رہی ہیں، بے خودی میں ایک مسلمان کے جذبات کو دکھ پہنچانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی اب تو اسلامیات کی کتابوں سے جہادی آیات بھی نکال لی گئی ہیں لیکن ادیب صاحب کی تسلی نہیں ہوئی، پتھروں کے بتوں کو پوجنے والے بڑے فخر سے ان کے آگے جھک رہے ہیں، ہم اپنے فرقہ کو سچا ثابت کرنے کے لیے اور دوسروں کو جھوٹا ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں مذہبی جذبات کو مجروح کرنے والی تحریریں شائع کرنے سے گریز کیجیے عارف شیخ نے مس کال کے انجام پر خوب روشنی ڈالی، عنبرین اختر کا آخری رشتہ اوپر سے گزر گیا دوستی بھی کوئی خاص تاثر نہ چھوڑ سکی، روشن اندھیرے مہتاب خان کی اس ماہ کی سرسید تحریر تھی ایک شفیق فرشتہ صفت ڈاکٹر نے صرف انسانی ہمدردی کے رشتے کو نبھانے کے لیے حج کا فریضہ بھی قربان کر دیا ایک انسان کو اس کی وجہ سے زندگی کیا ملی دونوں جہاں کی نیکیوں کا علم بردار بن گیا بکرا کہاں ہے عنبرین اختر نے احمد اقبال صاحب کی یاد تازہ کر دی ہر لفظ لائن صفحہ اور پوری کہانی ہائے داگودام سی قتل کی تحقیق سراغ رسانی پر مبنی اچھی تحریر تھی، خوش بوئے سخن میں عامر شہزاد، حرا نعیم، اقصیٰ سحر، ارشد فاروق، کوثر ناز، شفیق ندیم اور قدیر رانا کا کلام لاجواب تھا۔ ڈیول میں زریں قمر نے مافوق الفطرت صلاحیتوں کا خوب پرچار کیا، ایسی خوبی والے لوگوں سے بچ کر رہنا چاہیے۔

عبدالجبار رومی انصاری...... چوھنگ سٹی۔ اس دفعہ ٹائٹل کچھ خاص نہیں تھا دوشیزہ بھی مردہ سی بدروح لگ رہی تھی جو انڈیا کی طرح اپنی موت آپ مرنے والی ہو، اڑی حملہ کیا ہو گیا اس کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے اور بلا سوچے سمجھے اس کا الزام پاکستان پر لگا دیا عالمی سطح پر بھی انڈیا کی کوئی شنوائی نہ ہوئی تو مودی گیدڑ بھبکیوں کے ساتھ دھمکیوں پر اتر آیا پر حقیقت سے آنکھیں کیسے چرائے ساتھ نریندر مودی کو پاکستان کے ساتھ جنگ کے خیال سے ہی پسینے چھوٹ گئے اور لگے غربت مکانے کی باتیں کرتے۔ نہتے کشمیریوں پر تین ماہ سے ظلم کا بازار گرم کر رکھا ہے مسلسل کرفیو سے زندگی اجیرن کر رکھی ہے آئے روز شہدا کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے اور مودی کا ظلم ہے کہ رکنے کا نام نہیں لے رہا انڈیا خود جنگ کا جواز بنا رہا ہے اور یہ غلطی اسے بڑی مہنگی پڑے گی کشمیر تو آزاد ہو گا خود انڈیا کے بھی کئی پاکستان بن جائیں گے ان شاء اللہ ریاض حسین قمر کو صدارت پر دیکھ کر بہت خوشی ہوئی حادثے پر بہت افسوس ہوا تھا اور تبصرہ بہت اچھا لگا اس دفعہ مجید احمد جانی سے بالمشافہ ملاقات ہوئی بہت اچھا لگا آپ کا تبصرہ بھی ایک دم زبردست رہا باقی محفل میں تنقید و تعریف تو ہوتی رہتی جاوید احمد صدیقی کا محبت بھرا پیام بھی اچھا تھا صائمہ نور کی باتیں بھی اچھی لگیں آپ کے ہاں نوبہار نہر بھی دیکھی اس دفعہ جو آپ ذکر کر رہی ہیں۔ فریدہ جاوید فری کے لیے ڈھیروں دعائیں اللہ تعالیٰ آپ کو جلد سے جلد صحت عطا فرمائے، احسن ابرار رضوی پسندیدگی کا

شکریہ اور سید عبداللہ توفیق تو سوال کرتے نظر آئے یہ خواجہ حسین ظالم کب سے ہو گئے پرنس افضل شاہین آپ کا تبصرہ بھی نہایت عمدہ رہا، بہاولنگر آؤں گا تو آپ سے بھی ملاقات رہے گی یہ بھی اپنا سٹی ہے سردار اویسی نے بھی مختصراً اچھا لکھا مسکان ظفر بھٹی نے جو توجہ دلائی اس پر غور کریں پھر شاید تعریف کی صورت اس کے لبوں پر مسکان آ جائے مختصراً تبصرہ بہت عمدہ رہا، پاکستانی قوم محب وطن ہے اور اس میں غداروں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے ریاض بٹ کا بھرپور تبصرہ اثر انگیز رہا کانپتے ہاتھوں سے تبصرہ لکھا بابا میاں کرامت حسین زبردست دل جیت لیا بہت اچھا لگا حسین جاوید آپ نے آخری خط کیوں لکھا آئندہ بھی آتے رہو، انسان ٹھوکر کھانے کے بعد ہی سمجھتا ہے ورنہ جس کام میں وہ لگ جاتا ہے چاہے اس میں نقصان ہی ہو کسی کے منع کرنے پر بھی باز نہیں آتا سرفراز نے بھی محمود کی بات مانی ہوتی تو نقصان نہ اٹھاتا پھر بھی کچھ دوستی کی لاج تو رہ گئی آپ کو مرزا سے محبت نہیں، فتح النساء ہم نواب خاندان کی بیٹی ہیں اور ہمیں صرف فیصلوں پر سر جھکانا آتا ہے جاندار جملوں سے پروئی ایک سو سولہ چاند کی راتیں عشنا کوثر سردار کے قلم ہی کو زیب دیتی ہے آپ کا انٹرویو بھی زبردست لگا۔ انگلش اردو ادب پر کمال مہارت رکھتی ہیں، مس کال نے شجاع کی جان تو لی لیکن وہ بھی حادثے کی صورت میں اگر وہ تھوڑی ہمت سے کام لیتے تو شاید جان بچ جاتی اور رسوائی جھیلنی پڑتی مگر ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ انسان کا نام اس کی شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے اور آخر میں شائستہ نے عبدالرحمان کے لیے مسکرا کے ہاں کر دی، ورنہ پرلے وہ دشمن نہ کرے دوست نے وہ کام کیا ہے دوست نما دشمن سے دھوکا کھا چکی تھی محمد شعیب کا طویل ناول آب اور آتش بہترین رہا۔ حسیب جواد علی کی بے خودی اثر انگیز رہی، بس اتنا کہیں گے کہ گھر والوں کو اس طرح بے یار و مددگار نہیں چھوڑتے اور جہاد کے لیے حکومت وقت اعلان کرے تبھی جائیں ایک کے بعد دوسرا قتل آخر جلیمنگ کے جاسوسی ذہن نے لاشوں کا اشارہ پا کر مجرم راجر کو گرفتار کر ہی کر لیا، سید وجاہت علی کی تحریر بھی پرفیکٹ رہی، آخری رشتہ آیا تو اسی نے زہرہ کی جان لے لی اس کے امی ابو غریب لوگ تھے ورنہ وقاص کو الٹا لٹکوا دیتے کہ بتا کیوں زہرہ کی جان لی ہے عنبرین اختر کی کہانی نے قتل کی وجہ بتائے بغیر افسردہ کر دیا، باقی تعارف اور شاعری بھی زبردست رہی عنبرین کی، گاؤں کی پر نور جوانی کچے گھروندے سرسوں کی گندیں، مٹی کی سوندھی خوش بو اور برگد کی گھنی چھاؤں بھی افسانہ ہو گئیں، ساتھ میں بابا جی کی کہانی جنہوں نے بعد از مرگ چونکا دیا فن پارے بھی اپنی مثال آپ تھے ذوق آگہی سے تاراشاہ محمد یاسر اور ماہ جبین جبکہ خوش بوئے سخن سے حرم نعیم، کوثر ناز اور سلمیٰ غزل بہترین رہیں۔

شجاعت حسین شجاع بخاری...... تلہ گنگ۔ السلام علیکم عمران بھیا کیسے مزاج ہیں آپ کے امید کرتا ہوں کہ خیریت سے ہوں گے۔ آپ اور آپ کی پوری ٹیم اور قارئین کرام کو میری طرف سے سلام دستک میں مشتاق احمد قریشی صاحب کا کالم اچھا تھا کہانیاں اچھی تھیں، آب اور آتش محمد شعیب احمقوں کا ٹولہ ریاض بٹ اچھی تھی ایک سو سولہ چاند کی راتیں اچھی جا رہی ہے۔ عارف شیخ کی مس کال بھی اچھی تھی۔ باقی تمام تحریریں اچھی تھیں، اقرا میں طاہر قریشی کا مضمون پڑھ کر ایمان تازہ ہوا گفتگو میں عمران احمد صاحب نے جو احادیث انتخاب کی ہے بہت اچھی تھی۔ سب سے پہلا کا خط قمر صاحب کا تھا بہت خوب صورت گفتگو کی، ریاض حسین قمر السلام علیکم کیسے مزاج ہیں اس کے بعد مجید احمد جائی ملتان شریف، جاوید احمد صدیقی راولپنڈی سے سیر حاصل گفتگو کی۔ اس کے بعد آپی صائمہ نور ملتان شریف سے ملاقات ہوئی آپ کا مدلل خط تھا۔ احسن ابرار، سید عبداللہ، حاجی عمران، پرنس افضل، عبدالغفار، سردار اویسی نے خوب سیر حاصل گفتگو کی۔ مسکان ظفر بھٹی شام کے بھٹیاں سے پہلی بار ملاقات ہوئی سلام جی ریاض بٹ جی آپ کے کیا حال ہیں آپ کی تحریریں بہت اچھی ہوتی ہیں۔ میری طرف سے آداب وسلام، محمد رفاقت، عبدالجبار رومی، حسین جاوید، فلک شیر ملک نے بھی خوب گفتگو کی۔ ذوق آگہی میں تاراشاہ چکوال، پرنس افضل، گل مہر کے انتخاب اچھے تھے باقی تمام بھی اچھے تھے۔ خوش بوئے سخن میں تمام کلام اچھا تھا، بالخصوص ریاض حسین قمر، اریشہ فاروقی، سلمیٰ غزل، ریحانہ سعیدہ، سباس گل کا کلام اچھا تھا۔ فن پارے میں تمام

کہانیاں اچھی تھیں، آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ کشمیریوں کو جلد بھارتیوں سے آزادی عطا کرے پاکستان پائندہ باد پاک فوج زندہ باد۔

ریاض حسین قمر...... منگلا ڈیم۔ قابل احترام جناب عمران احمد صاحب سلام شوق اس دعا کے ساتھ کہ آپ کے رفقا کار اللہ رب العزت کی رحمت کی پناہ میں ہوں ماہ اکتوبر کا شمارہ اس بار بروقت مل گیا ٹائٹل کی سادگی میں بھی اک شان ہے معصوم چہرے والی حسینہ کے بال بکھرے ہوئے ہیں اور چہرے سے پریشانی آشکارہ ہے وہ نہ جانے کن سوچوں میں گم ہے، اشتہارات کی راہ سے گزرتے ہوئے فہرست پر نظر ڈالی تو بڑے بڑے قلمکاروں کے نام دیکھ کر طبیعت خوش ہوگئی کہ اس بار اچھی سے اچھی تحریریں پڑھنے کو ملیں گی۔ حسب معمول سب سے پہلے محترم و مکرم جناب مشتاق احمد قریشی صاحب کا دستک پڑھا اور ہنود کی ریشہ دوانیوں میں ڈوب کر سوچا کہ دشمن ہمیشہ دشمن ہی رہتا ہے چاہے وہ دوستی کے کتنے روپ بھی بھرے نانہجار بھارت روز اول سے ہمارا ازلی دشمن ہے ایک طرف اس کا مکار وزیر اعظم ہمارے وزیر اعظم سے بظاہر دوستی بڑھانے کے لیے سرپرائز ملاقاتیں کرتا رہا اور دوسری طرف کلبھوشن جیسے چالاک جاسوس کے ہاتھوں بلوچستان اور کراچی میں کھیل کھیلتا رہا اور اب بھی وہ اپنے کرتوتوں سے باز نہیں آیا میں نے اپنے گزشتہ ماہ کے خط میں لکھا تھا کہ ہم من حیث القوم بھولنے کی قبیح عادت میں مبتلا ہیں ہمیں بڑی سے بڑی تکلیف بھی پہنچے تو ہم چند دنوں میں اسے یکسر فراموش کر دیتے ہیں کلبھوشن یادیو نے ہمارے ملک کو کتنا بڑا نقصان پہنچایا وہ پکڑا گیا اب ہم اسے تقریباً فراموش کر چکے ہیں، ان کے وزیر اعظم نے اپنی گندی زبان سے پاکستان کے لیے کیا کچھ نہیں کہا اس کی دھمکیاں گیدڑ بھبکیاں نہیں ہیں مگر اس کو اپنے انجام کا بھی پتا ہے کہ پاک فوج نے کس طرح ان کی ٹھکائی کرنی ہے اسی لیے وہ جنگ سے غربت کے خلاف جنگ پر آ گیا دشمن خواہ دوستی کے ہزار روپ بھرے وہ دشمن ہی رہتا ہے بلکہ دوستی کے روپ میں وہ بدترین دشمن ثابت ہوتا ہے رب العزت ہمیں آنکھیں کھلی رکھنے کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے آمین۔ گفتگو کے آغاز میں آپ نے حسب روایت بڑی ہی پیاری اور حوصلہ افزا حدیث مبارک ہمیں عطا فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر عظیم عطا فرمائے اور ہمیں اس پر عمل پیرا ہونے کی توفیق بخشے آمین ثم آمین۔ محترم مجید احمد جائی ملتان سے ایک بہترین تبصرہ لے کر تشریف لائے ہیں۔ بھائی مجید احمد جائی غیر حاضری کی وجہ میرے اس ماہ چھپنے والے خط سے آپ کو معلوم ہوگئی ہوگی بہر حال بھائی مجھے یاد رکھنے اور میری کمی کو محسوس فرمایا یہ آپ کی میرے ساتھ محبت کو ظاہر کرتا ہے میں تہہ دل سے آپ کا شکر گزار ہوں، پیارے بھائی جاوید احمد صدیقی ایک بھرپور تبصرے کے ساتھ تشریف لائے ہیں صدیقی بھائی خدا آپ کو سلامت رکھے اور اسی طرح بھرپور تبصرے کے ساتھ تشریف لاتے رہیں۔ محترمہ صائمہ نور نے شاندار اور جاندار تبصرہ فرمایا صائمہ نور نے حکومت کے بارے میں جو کچھ فرمایا وہ ایک سو بیس فیصد درست ہے صائمہ جی حکومت ہی نہیں ہم عوام بھی اس کے ذمہ دار ہیں بھارت نے ان دنوں جس طرح پاکستان کو بدنام کرنے کا سلسلہ شروع کیا ہوا ہے ہم پھر بھی اسی بے غیرت بھارت کی فلمیں دیکھنا پسند کرتے ہیں ٹی وی پر بھارتی چینلز ڈھونڈتے ہیں اور انڈین گانے سننا پسند کرتے ہی اس پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ مگر گفتگو کے صفحات اس کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ فریدہ جاوید فری صاحبہ آپ کی علالت کا پڑھ کر بہت فکرمندی ہوئی رب لم یزل آپ کو مکمل صحت یابی عطا فرمائے، آمین۔ بھائی احسن ابرار رضوی نیک خیالات کے ساتھ تشریف لائے جو شکایات آپ کو اس جمہوری حکومت سے ہیں وہی شکایات قوم کی اکثریت کو ہیں مگر وہ اس پر کان دھرنے والے نظر نہیں آتے کوئی صور اسرافیل ہی ان کو اس خواب غفلت سے جگا سکتی ہے۔ میں اپنی غیر حاضری کی وجہ بتا چکا ہوں میرا نئے افق سے ایک ایسا ناتہ ہے کہ محفل سے میری غیر حاضری کی کوئی بہت بڑی وجہ ہی ہو سکتی ہے، بہر حال آپ نے مجھے اپنی یادوں میں رکھا اس کے لیے شکر گزار ہوں، سید عبداللہ توفیق بھائی ناچیز کے لیے آپ کی دعاؤں کا میں بڑا قدردان ہوں خداوند کریم آپ اور آپ کے اہلخانہ کو اپنی حفظ و امان میں رکھے،

ماشاء اللہ اب بالکل تندرست ہوں اور ان شاء اللہ ہر ماہ اب

جیسے مہربانوں سے ملاقات ہوتی رہے گی، خواجہ حسین ظالم کے ظلم کی تکرار کا شکریہ۔ اشعار سے مزین پرنس افضل شاہین کا تبصرہ شاندار بھی ہے اور جاندار بھی عبدالغفار عابد صاحب اچھے تبصرے کے ساتھ تشریف لائے سردار اویس اویسی اور مسکان ظفر بھٹی کے تبصرے اپنی اپنی جگہ خوب رہے محترم ریاض بٹ آپ کیا خوب کہانی لائے ہیں احمقوں کا ٹولہ بہت کوب رہی دلی مبارکباد اور آپ کا تبصرہ بھی خوب صورت تھا میاں کرامت حسین کا خط اور ادارہ کی طرف سے اس کا جواب پسند آئے، عبدالجبار رومی کے لبوں پر آنے والی شاعری جو نئے افق کا ٹائٹل دیکھ کر آئی بہت خوب تھی اور اسی طرح ان کا مدلل تبصرہ بھی اچھا رہا، حسین جاوید نے اپنے خط کو آخری قرار دیا وجہ نہ بتا کر سب قارئین کو سسپنس میں ڈال دیا۔ شاید ادارہ کو بتا کر ان کی ٹینشن دور کردیں فلک شیر ملک نے خوب صورت انداز میں تبصرہ کیا جس کے لیے وہ مبارک باد کے مستحق ہیں اس ماہ کا اقرا آنے والے اقرا کے مواد کی تمہید ہے امید ہے آنے والے مہینوں میں شائع ہونے والا اقرا ہمارے ایمانوں کو خوب تازگی بخشے گا محترمہ عشنا کوثر کا طویل انٹرویو ان کی زندگی کے مختلف گوشوں کو اجاگر کرتا بہت خوب رہا محترمہ عنبرین اختر کا تعارف اور کلام خوب رہے خوش بوئے سخن میں ایک سے بڑھ کر ایک آئٹم ہے اور ذوق آگہی میں سارا انتخاب بہت ہی خوب ہے آخر میں عرض کروں کہ ماہ اگست 2016ء کا شمارہ مجھ سے مس ہوا ہے کہیں سے نہیں ملا میری اپنے ساتھی قارئین سے گزارش ہے کہ کوئی ساتھی مجھے اگست 2016ء کا نئے افق بھیج دے اگر شمارہ نہیں بھیج سکتا تو گفتگو کے صفحات اور خوش بوئے سخن کے صفحات کی فوٹو کاپیاں مندرجہ ذیل ایڈریس پر ارسال فرما دیں میں زندگی بھر ان کا ممنون رہوں گا۔ پتا ریاض حسین قمر مکان نمبر C-3/3 لیفٹ بینک کالونی منگلا ڈیم نئے افق کے تمام عملہ اور نئے افق کے تمام قارئین کے لیے دعا گو۔

حسین جاوید...... منچن آباد۔ محبت کے امین سخن کے امام، پیارے عمران آپ کے حضور عرض ہے سلام۔ شمارہ اس بار بھی تعریفی القابات سے بے نیاز تھا مکری مشتاق احمد قریشی کی اک نظر کافی ہے وسعت دشت کے ڈبونے کو طاہر قریشی صاحب کہسار کو چلے ہیں میں تو صحرا کا مسافر تھا طاہر صاحب میں آپ کا ممنون ہوں، اہل قلم ریاض بٹ میں نے آپ کو کبھی بھی نظر انداز نہیں کیا۔ آپ کی بہت قدر ہے میرے نزدیک میسر رہتی ہے اہل قلم کی رفاقت ریاض قمر آپ نے میرا تبصرہ عرق ریزی سے دیکھا میرے لیے یہ بات باعث مسرت ہے، ریاض صاحب شاندار تبصرے کی بازی تو ہر دفعہ آپ لے جاتے ہیں اور سہرا میرے نام کردیا آپ کی اس نوازش کا بہت بہت شکریہ۔ جاوید احمد صدیقی اور احسن ابرار رضوی یاد کرنے کا شکریہ جاوید احمد صدیقی اور احسن ابرار رضوی یاد کرنے کا شکریہ عبدالغفار عابد میں آپ کے دکھ میں برابر کا شریک ہوں۔ رومی انصاری آپ میرے ساتھ اتفاق یہ ضروری تو نہیں، اہل دانش میاں کرامت آپ کی فکر رسا نے تو سن عمر کو شکست دیتے ہوئے اپنی فطری تازگی اور شگفتگی کو برقرار رکھا ہے۔ سید عبداللہ توفیق آپ کا تبصرہ مشعل راہ ہے۔ میرے لیے۔ بہن مسکان ظفر بھٹی اور جناب فلک شیر ملک آپ کے تبصرے جدید طرز احساس کے تحت فن پارے بوجھ صوبیہ احمد بلاعنوان صائمہ قریشی صاحبہ کمال کی تحریر تھی قتل سید وجاہت علی مس کال عارف شیخ، شاندار کہانی احمقوں کا ٹولہ ریاض بٹ۔ بہن زریں قمر ڈیول بہت عمدہ ذوق آگہی گل مہر تارا شاہ یاسر اعوان فلک شیر ملک نور شاہ۔ بہت خوب خوش بوئے سخن عامر شہزاد، ریاض حسین قمر، عنبرین اختر، عامر زمان عامر، ریحانہ سعیدہ، قدیر رانا، سلمیٰ غزل لاجواب، عمران صاحب رشتے کی حرمت پر جس سے حرف آئے میں ایسے سارے زخم چھپا کر رکھتا ہوں شاید کہ آپ کو اب میری ضرورت نہیں ویسے آپ کو میری ضرورت تو پہلے بھی نہیں تھی۔ (ہاہاہاہا) جناب عالی عرض ہے کہ اول تو آپ میری کہانی شائع کریں (سسکتے ارمان) اور (صبر کا دامن) یا کوئی مثبت جواب دیں عمران صاحب آپ کے ساتھ فون پر بات کرکے بہت اچھا لگا آپ بہت خوش اخلاق انسان ہیں مالک کی پاک ذات آپ کو خوش رکھے آمین، میں نے اپنی کہانیاں کمپوز کرا کر ارسال کی تھی اگر ادارہ سے میرا مواد گم ہوگیا ہے تو میں دوبارہ ارسال کردیتا ہو بشرط کہ ادارہ جلد شائع کرنے کا وعدہ کرے توجہ ادارے کے ساتھ میری وابستگی کو سال

ہونے والا ہے سرکار کچھ تو ہمارا حق بھی بنتا ہے معروف رائٹرز سرور شاذ کا دوست ہوں پرانے رائٹرز ماسٹر طاہر قریشی صاحب مخچن آباد والے میرے استاد ہیں میری کہانی کو اگر نا قابل اشاعت میں رہنا ہے تو پھر اتنی تمازت کس لیے آپ کے مثبت جواب کا طالب۔

ایم حسن نظامی ...... قبولہ شریف۔ السلام علیکم نئے افق کے رنگ وانداز میں قوس وقزا کے بھی رنگ نمایاں پائے کہیں ریاض حسین قمر کی صورت تو کہیں مجید احمد جائی کی شکل میں جاوید احمد صدیقی میں جلوہ گر ہوئے تو کہیں صائمہ نور اجاگر ہوئیں، احسن ابرار رضوی ظاہر ہوئے تو کہیں عبداللہ توفیق کی صورت میں۔ خواجہ حسین ظاہر ہوئے تو حاجی عمران خاں بھی سب میں موجود پائے پرنس افضل شاہین حاضر ہوئے تو عبدالغفار عابد بھی حتیٰ کہ سردار اویس، سکان ظفر بھٹی، ریاض بٹ، میاں کرامت حسین، محمد رفاقت، عبدالغفار رومی، حسین جاوید اور فلک شیر ملک بھی اپنے رنگوں میں ہنستے کھلکھلاتے پھلواری کو رونق بخش رہے تھے جن کی خوشبوؤں سے بھی پھول شرسار اور شادمانی دکھائی دے رہے تھے۔ ساتھیو گفتگو میں ایک دوسرے سے دکھ سکھ ضرور شیئر کریں مگر پرچے اور لکھاریوں کی تحریروں پر بھی کھل کر اظہار رائے کریں اس طرح کہ کسی بھی لکھاری کی دل شکنی نہ ہونے پائے۔ اب آتے ہیں پرچے کی طرف مشتاق احمد قریشی صاحب نے امریکا اور بھارت پر اپنے معیاری اور منفرد لفظوں سے روشنی ڈالی اور بہت سے حالات اور خطرات سے آگاہ فرمایا۔ محمد سلیم اختر بلاشبہ پایہ کے لکھاری ہیں وہ ہر موضوع پر طبع آزمائی کر سکتے ہیں ریاض بٹ نے جرم وسزا پر گہرے نشتر چلائے اور تحریر معیاری پائی۔ عشنا کوثر سردار نے وفاؤں کو تاریخی روشنی سے اجاگر کیا بلاشبہ وہ ایک اچھی لکھاری ہیں ان کے انٹرویو میں ان سے آگاہی ہوئی، مس کال اور بے خودی کو بھی اچھے حروف سے پیش کیا گیا دونوں تحریریں ایک دوسرے کے مقابل پائیں۔ عنبرین اختر کے قلم میں بے پناہ نکھار پایا بلاشبہ وہ شاعرہ ہونے کے ساتھ ساتھ عمدہ لکھاری بھی قرار پائیں ان کی شاعری پسند آئی۔ مہتاب خان روشن اندھیرے میں زندگی کی دمک لیے رونما تھے جو اچھے فقرات کی عکاس پائی۔ سید وجاہت نے رشتوں ناطوں کو عمدہ اور معیاری انداز تحریر سے پیش کیا رجر فورٹ کے کردار پر حیرت ہوئی۔ فن پارے کی بھی تحریریں لاجواب اور بے مثال پائیں خاص طور پر برگد، بوجھ اور اماں جنتے پسند آئیں ذوق آگہی، خوش بوئے سخن اور دستک بھی ہمارے من پسند اور اپنی نوعیت کے معیاری کالم ہیں۔ زرین قمر بھی لکھاریوں کی صف میں بہت بڑا نام ہیں وہ کرداروں اور واقعات کو خوش اسلوبی سے نبھانا جانتی ہیں۔ اس قدر اچھا معیاری اور منفرد مواد فراہم کرنے پر میری طرف سے پورے اسٹاف کو مبارکباد قبول ہو۔ آخر میں بھی دوستوں کی نذر ایک شعر۔

تمہارے گرد دائرہ ہے میری دعاؤں کا
تم میرے انتخاب کی اک مقدس لکیر ہو

ناقابل اشاعت کہانیاں:-

محنت صلہ دیتی ہے، خواب کی تکمیل، عشق زادے، روشنی کی لکیر، جیت رشتوں کی، چپ سی، خاک اور خون کا دوسرا منظر۔

◆

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

اقراء

ترتیب: طاہر قریشی

اللہ

(اسمِ ذات۔ اسمِ اعظم)

اللہ تعالیٰ سے مراد وہ بلند ترین ہستی ہے جو انسانی نگاہوں سے پوشیدہ ہے اور جس کی عظمتوں سے انسانی عقل وفہم حیران و پریشان رہ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ہستی وہ ہے جس کا اقتدار تمام عالموں پر قائم ہے اور جس کے چلائے سے یہ سارا نظامِ کائنات چل رہا ہے اور وہ ہر چیز ہر ذرّے تک پر چھایا ہوا ہے اور سب اس کی مخلوق اور اطاعت گزار ہیں۔ اللہ سے تعلق انسانوں کا اور دیگر تمام مخلوقات کا اس کی دی ہوئی بخشی ہوئی حیات سے ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی دیگر مخلوقات کے مقابلے میں انسان کو جو شرف و امتیاز بخشا ہے اس کے باعث وہ اس کی بہتری اور بھلائی کے لئے بار بار رہنمائی و ہدایت دے کر اپنے رسول و پیغمبر اور نبی بھیجتا رہا ہے تاکہ اگر انسان شیطان کے بہکائے میں آ کر راہِ حق کو چھوڑ بیٹھے اور گمراہی کی راہ اپنا لے تو اسے گمراہی اور جہالت سے بچانے کا پورا پورا انتظام و اہتمام اللہ نے کیا ہے۔

ترجمہ:۔ اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو ٹھہرنے کی جگہ اور آسمان کو چھت بنا دیا، اور تمہاری صورتیں بنائیں اور بہت اچھی بنائیں، اور تمہیں عمدہ عمدہ چیزیں کھانے کو عطا فرمائیں یہی اللہ تمہارا پروردگار ہے، پس بہت ہی برکتوں والا اللہ ہے سارے جہان کا پرورش کرنے والا۔ (المومن۔ ۶۴)

آیتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کو سمیٹ دیا گیا ہے۔ انسان کی پیدائش و پرورش سے لے کر کائنات کی تخلیق، نگہداشت و پرورش اور سب کی صورت گری سب ہی کچھ تو جمع کر دیا گیا ہے جو اللہ کی ذاتِ عالی کو زیب دیتا ہے۔

ترجمہ:۔ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ سب اللہ ہی کا ہے، یقیناً اللہ تعالیٰ بہت بڑا بے نیاز اور سزاوارِ حمد وثنا ہے۔ (لقمان۔ ۲۶)

یعنی سب کا خالق بھی وہی ہے، مالک بھی وہی اور مدبر و متصرف کائنات بھی وہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی شان بڑی بے پروا اور ہر چیز سے بے نیاز ہے، ہر چیز اُس کی محتاج ہے وہ کسی بھی طرح کسی کا محتاج نہیں ہے۔ ہر تعریف کا وہی مستحق ہے کہ اُسی نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے، اس نے جو کچھ بھی پیدا کیا ہے اور اُن کے لئے جو احکام نازل

فرمائے، اس زمین و آسمان میں صرف وہی ذاتِ عالی ہر قسم کی حمد و ثنا کی مستحق و سزاوار ہے۔

ترجمہ:۔ بے شک تمہارا رب اللہ ہی ہے۔ (الاعراف۔۵۴)

اللہ تعالیٰ کی ذاتِ عالی ہمیشہ سے زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہنے والی ہے۔ اللہ تعالیٰ ایک بے عیب و پاک شہنشاہوں کا شہنشاہ حاکموں کا حاکم ہے وہ قادرِ مطلق ہے وہی خالقِ العلمین ہے۔ وہی تمام عیبوں، مشکلات و پریشانیوں، سختیوں سے محفوظ رکھنے والا ہے اور سلامتی دینے والا ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ایک عظیم تر اور بزرگ ترین لاشریک ہستی ہے ہر قسم کے اختیار و اقتدار کا مالکِ کل ہے۔ اُسی ذاتِ عالی کو یہ قوت و ادراک حاصل ہے کہ وہ سب کو اور سب کچھ کو دیکھتا ہے۔ لیکن اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ قرآن حکیم کے مطابق ”وہ انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔“ (ق۔۱۶)

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے کس قدر محبت کرتا ہے اور ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ایک ایک معاملے سے کتنا گہرا اور قریبی تعلق رکھتا ہے کہ ان کو چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی ٹوکتا ہے، اس کی اطلاع، خبر ہمیں قرآنِ کریم کے ذریعے ملتی ہے۔ اللہ قرآنِ حکیم کے ذریعے انسان کی مختلف سرگرمیوں یعنی اعمال کے بھلے اور برے پہلو نمایاں کرتا ہے اور قدم قدم پر ہدایت دیتا ہے۔ وہ کہیں عدل، احسان اور اقربا سے محبت کی نصیحت کرتا ہے تو کہیں نفاق اور بزدلی، مفاد پرستی سے روکتا ہے۔ اور کہیں وہ مرد و زن کو گھر کی پاکیزہ فضاء قائم کرنے کا سبق دیتا ہے اور کہیں رضاعت اور میراث کے معاملات میں انسان کو پریشانیوں سے نکالتا ہے تو کہیں آدابِ مجلس سکھاتا ہے۔ اور کہیں حدود و تعزیرات اور قوانین معین کرتا ہے۔ الغرض دکھ درد میں وہ ساتھی اور مشکلات میں شفیق ترین استاد کا کردار ادا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کبھی اپنے بندوں کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑتا۔ یہ سب ایک اکیلے اللہ کے خواص اور صفات ہیں۔ قرآن کریم کے پیش کردہ تصورِ الوہیت اور اسماء الحسنٰی کو صفاتِ الٰہی سے تعبیر کرنے سے ذاتِ الٰہی کا ایک ایسا تصور قائم ہوتا ہے، جو ہر لحاظ سے مکمل، مرغوب، مطلوب اور انسانی ادراک و وجدان کے عین مطابق ہے۔

انٹرویو

فاروق انجم

یاسین صدیق

ایم فاروق انجم آج کل اخبار جہاں اور جاسوسی گروپ میں مستقل لکھ رہے ہیں۔ ماہنامہ نئے افق اور نیا رخ میں ایک عرصہ تک لکھتے رہے۔ بلکہ ادبی سفر کا آغاز اسی ماہنامے سے کیا، اب دوبارہ ایک کہانی سے انٹری دے چکے ہیں۔ بڑے مختصر عرصے میں انہوں نے اپنی پہچان بنائی ہے۔ نصف درجن کتابوں کے مصنف ہیں۔ زیادہ تر جرم وسزا، محبت ونفرت پر لکھتے ہیں۔ خوب لکھتے ہیں۔ اب تک اپنا ایک وسیع حلقہ قارئین بنا چکے ہیں۔ ہماری انٹریو کی درخوست انہوں نے قبول فرمائی۔ ہمارے انٹرویوز پینل (سرفراز قمر، شہباز اکبر الفت، عاصم سعید، قاری ابوبکر، نعمان عظیمی، ظفر علی، عدیل عادی، راقم) اور یاسین نوناری، صداقت حسین ساجد، ظہیر عباس، وقار حسین، تفسیر عباس بابر، اعجاز احمد راحیل، حمید اختر صاحب، ایم اکرم مہپال جیسے مخلص دوستوں نے اس انٹرویو میں میرا ساتھ دیا۔

(س) آپ کا اصل نام کیا ہے؟ کس نے نام رکھا تھا؟ جائے پیدائش کے بارے میں بتائیں؟

(ج) میرا اصل نام محمد فاروق ہے اور انجم میرا تخلص ہے فیصل آباد میں پیدا ہوا تھا۔ میرا نام میرے والد محترم نے رکھا تھا۔

(س) اپنے والدین کے تعارف میں ایک پیراگراف لکھیں؟

(ج) میرے والد محترم حاجی غلام رسول صاحب عمارتی لکڑی کا کاروبار کرتے تھے۔ وہ بہترین باپ ہیں اور میری والدہ تین سال پہلے اللہ کو پیاری ہو چکی ہیں۔

(س) آپ کے کتنے بہن بھائی ہیں؟۔ ان میں آپ کا نمبر کون سا ہے؟

(ج) ہم ماشاللہ چار بھائی اور ایک بہن ہیں میرا نمبر چوتھا ہے۔

(س) اپنے بچپن کے بارے میں بتائیں۔ کوئی ایک ایسا واقعہ جسے یاد کریں تو آج بھی چہرے پر مسکراہٹ بکھر جاتی ہو یا دکھی کر دیتی ہو؟

(ج) بہت سے واقعات ہیں۔ کیونکہ بچپن شرارتوں اور کرکٹ میں گزرا ہے۔ بچپن ویسے بھی حسین ہوتا ہے اب کس کس واقعے کا ذکر کروں۔ بچپن بہت اچھا گزرا۔ کوئی ایسی یاد نہیں ہے کہ سوچ کر دکھی ہو جاوں۔ مختصر میرا بچپن اور لڑکپن بہت زبردست گزرا ہے۔

(س) آپ نے ابتدائی تعلیم کہاں سے حاصل کی۔ اپنے اساتذہ کو خراج تحسین پیش کریں۔ آپ کی تعلیم کیا ہے؟

(ج) میں نے گورنمنٹ نیو ماڈل ہائیا سکول سے میٹرک کیا اور بی اے گورنمنٹ اسلامیہ کالج فیصل آباد

سے کیا۔ اسکول کے زمانے میں محترم فضل صاحب اسلم صاحب، ضیا الحق صاحب کے علاوہ اور بھی بہت اچھے اساتذہ تھے۔ اسکول کے زمانے میں تو استاد اور ان کے ہاتھ میں پکڑا مولا بخش ڈراتا رہتا تھا۔ کیونکہ ریاضی میٹرک تک مسلسل کمزور رہا ہوں۔ البتہ کالج کا دور بہت بھر پور تھا۔ کالج میں ارشد صاحب جیسے استاد تھے اللہ ان کو جنت نصیب کرے۔ میری زندگی پر دو اساتذہ کا زیادہ اثر ہے اسکول کے زمانے میں ہمارے محترم استاد ہوتے تھے ضیا الحق صاحب۔ بہت حلیم، نرم لہجہ، ٹھنڈا مزاج کہ کوئی غصے سے بھی بات کرتا تھا تو وہ انھیں نرمی مزاجی سے موم کر دیتے تھے...... کالج میں محترم ارشد صاحب تھے جو مسکراتے رہتے اور بات سے بات نکال کر شگفتہ مزاح پیدا کر دیتے تھے۔ ان دونوں کی شخصیات کی جھلک میرے اندر ہے بلکہ یہ کہہ لیں میں نے ان کی عادات اپنائی ہوئی ہیں۔

(س) بچپن میں والدہ یا والد کس کی طرف سے زیادہ پٹائی ہوتی رہی ہے۔ آپ کی شخصیت سازی میں زیادہ کردار کس کا ہے؟

(ج) بچپن میں کرکٹ زیادہ کھیلنے پر والد صاحب کے ہاتھوں پٹائی ہوتی تھی۔ کیونکہ کرکٹ میچ میں نماز نہیں پڑھ پاتا تھا اور والد صاحب کا سوال ہی یہاں سے شروع ہوتا تھا۔ نماز پڑھی۔۔؟ انکار پر مار پڑتی تھی۔ کردار سازی میں والد صاحب اور والدہ مرحومہ کا کردار برابر کا شامل ہے۔

(س) کوئی ایک فقرہ اپنے والدین کے لیے؟

(ج) والدین کی محبت شفقت اور ان کی قربانیوں کو اگر سامنے رکھ کر ایک فقرہ کہنا چاہیں تو شاید الفاظ ان کو خراج تحسین پیش نہ کر سکیں۔ بس اتنا کہنا چاہوں گا کہ والدین اپنے بچوں کے لئے سراپا محبت اور ایثار کا پیکر ہیں جو اپنی ذات کو نظر انداز کر کے صرف اپنے بچوں کا سوچتے ہیں۔

(س) آپ نے کتنی عمر سے مطالعہ شروع کیا۔ چند پسندیدہ لکھاریوں کے نام بتائیں۔؟

(ج) مطالعہ کا شوق اسکول کے زمانے سے تھا۔ بچوں کے رسائل پڑھتا تھا۔ اشتیاق احمد کے ناول تو چھوڑتا ہی نہیں تھا۔ پھر ابن صفی کے عمران سیریز کے سب ناول پڑھے۔ عبدالقیوم شاد کا پہلی بار سلسلہ اخبار جہاں میں پڑھا تھا۔ پھر اقلیم علیم، محمود مودی، ایم اے راحت، نواب صاحب اور شاید ہی کوئی رائٹر ہو جسے نہ پڑھا ہو۔ یہ سب لکھنے والے بہت اچھا لکھتے ہیں اور پہلا مکمل ناول نسیم حجازی صاحب کا پڑھا تھا

(س) آپ کس ادیب سے بہت زیادہ متاثر ہیں اور کس وجہ سے متاثر ہیں؟

(ج) اقلیم علیم صاحب؟ انوار علیگی صاحب اور محمود احمد مودی صاحب کو بہت پڑھا ہے۔ ان کے قلم میں بڑی روانی ہے۔ لیکن میں کسی اور لکھنے والے کو بھی نہیں چھوڑا اور وہ لوگ بھی اپنی اپنی جگہ ڈٹ کر لکھ رہے ہیں اور بہت اچھا لکھ رہے ہیں۔

(س) سب سے پہلے کونسی کہانی لکھی، کس میگزین میں شائع ہوئی؟ آپ نے کن رسائل میں لکھا؟

(ج) پہلے بچوں کے لئے لکھا پھر مزاحیہ رسالہ چاند میں لکھا اس کے بعد ماہنامہ رابطہ اور مسٹری میگزین' ایڈونچر' نیا رخ' نئے افق' سب رنگ' نازنین، اخبار جہاں، سرگزشت، جاسوسی، سسپنس، اردو ڈائجسٹ، سیارہ ڈائجسٹ، حکایت اور کیا کیا نام لوں اور یہ سفر ابھی جاری ہے۔

اسکول کے زمانے میں پہلی کہانی لکھی جو بچوں کے ایک رسالے میں شائع ہوئی اور وہ 1980 کی بات ہے۔

جب میں بچوں کے لئے لکھتا تھا تو وہاں سے بھاگ کر لاہور سے شائع ہونے والے رسائل میں لکھنے لگا۔ وہاں سے بھاگا اور کراچی کے ڈائجسٹ کی طرف دوڑ لگا دی سب سے پہلے کراچی میں مجھے نیا رخ نے خوش آمدید کہا اور میں نے نیا رخ میں بہت لکھا اور میری خوب حوصلہ افزائی ہوئی۔ وہ بند ہو گیا تو عمران بھائی اور طاہر بھائی نے میرے لئے نئے افق کا دروازہ کھول دیا اور اس طرح کراچی سے شائع ہونے والے دوسرے ڈائجسٹوں میں چلا گیا آگے بڑھنے اور کچھ نیا کرنے کی بھاگ دوڑ لگی ہوئی ہے کیونکہ آگے میڈیا بھی تو ہے۔

(س) کس موضوع پر کہانیاں آپ کو پسند ہیں؟ کیسا ادب وقت کی ضرورت ہے؟

(ج) یہ موڈ پر منحصر ہے کہ اس وقت مرڈر، ایڈونچر مزاح یا کیا پڑھنے کو دل چاہ رہا ہے۔ میرے خیال میں ہر طرح کی کہانیاں اور ناول لکھے جا رہے ہیں اور مزاح پر لکھنے کی کمی ہے۔ اس پر توجہ دینی چاہئے میرا مزاحیہ ناول کمال پور کا کمالا جب اخبار جہاں میں شائع ہوا تھا تو وہ سب سے زیادہ پسند کیا گیا تھا۔

(س) سر اب تک آپ کی کتنی کتابیں شائع ہو چکی ہے؟

(ج) میرے تیرہ ناول شائع ہو چکے ہیں ۲۰۰۷ء کو پہلا ناول تپش شائع ہوا تھا۔ پھر انگار، سرسراہٹ، دھواں، دھڑکن، چال، کمال پور کا کمالا، زنجیر اور تیزاب وغیرہ شامل ہیں۔

(س) آپ کی کہانیوں میں قدر مشترک؟

(ج) میری اکثر کہانیاں بارش سے شروع ہوتی ہیں ورنہ کہانی میں کہیں نہ کہیں بارش ہونے لگ جاتی ہے۔

جب میں شروع میں لکھا کرتا تھا تو والد محترم مجھے سمجھاتے تھے کہ تم کیا کاغذ سیاہ کرتے رہتے ہو، چھوڑ دو یہ کام۔ پھر ایک دن ہمارے ایک عزیز نے میرے والد صاحب کے سامنے میری ایک کہانی پڑھ کر اس وقت بہت تعریف کی جب خاندان میں ایک تقریب تھی۔

(س) اپنی کون سی کہانی سب سے زیادہ پسند ہے آپ کو؟ کیا اپنی زندگی پر کتاب لکھنے کی سوچ ہے؟ کیا نام ہوگا اس کتاب کا؟

(ج) سچ یہ ہے کہ ابھی وہ کہانی لکھ ہی نہیں سکا کہ بہت پسند بھی آئے اور مطمئن بھی ہو جاؤں۔ اس لئے خوب سے خوب تر کی جستجو میں ہوں۔ مجھے مزاح پڑھنا اور لکھنا پسند ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ مختلف موضوعات پر لکھتے ہوئے میرا پسندیدہ موضوع پیچھے رہ جاتا ہے۔ میں جب بھی اپنی زندگی پر کتاب لکھوں گا وہ مزاح کے رنگ میں لپیٹ کر لکھوں گا۔ کیونکہ میرا بچپن، لڑکپن پر لطف گزرا ہے جبکہ رواں دواں جوانی بھی ہنستے کھلتے گزر رہی ہے، رہا کتاب کا نام تو وہ اس وقت سوچ لوں گا۔ ویسے بھی میں ساری کہانی یا ناول لکھ لیتا ہوں اور نام بعد میں فائنل کرتا ہوں۔

(س) آپ کے خاندان میں اور کوئی ادیب ہے؟۔

(ج) میرے خاندان میں دور تک بلکہ بہت ہی دور تک کوئی ادیب شاعر نہیں گزرا اور خاندان میں آگے بھی کسی کے آثار دکھائی نہیں دے رہے بلکہ میں اکیلا ہی ہوں۔

(س) قلمی نام رکھنے کا سبب کیا ہے؟۔ کیا کسی اور نام سے بھی لکھا؟ کس نام سے؟

(ج) قلمی نام انجم میرے ایک عزیز دوست نے تجویز کیا تھا۔ جی میں ایک دوسرے نام سے بھی لکھتا ہوں۔

(س) عشق و محبت کی تعریف کیا یہ ایک ہی ہیں یا الگ الگ؟

(ج) عشق اور محبت کی تعریف ہر ایک کی دانست میں الگ الگ ہے میں تو ابھی عشق کے ع اور محبت کی م کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں

(س) آپ کی کوئی ایسی کہانی جس پر سرقہ، چربہ کاپی کا الزام لگا ہو؟

الحمد اللہ میری کسی کہانی پر بھی چربہ کا الزام نہیں لگا۔ کیونکہ میں نے یہاں تک پہنچنے کے لئے کبھی شارٹ کٹ اور کسی کے کندھے کا سہارہ نہیں لیا ہے

(س) آپ کے انداز بیاں میں کس کا رنگ جھلکتا ہے۔؟

(ج) یہ میرے پڑھنے والے بتا سکتے ہیں کہ میری تحریروں میں کس کا رنگ جھلکتا ہے لیکن میں پوری ایمانداری سے کہتا ہوں کہ میں کسی سے متاثر ہو کر نہ لکھتا ہوں اور نہ کبھی ایسی کوشش کروں گا۔

(س) اپنے ہم عصروں میں آپ کے پسندیدہ لکھاری۔ کس ادیب سے ملاقات کا موقعہ ملا؟

(ج) بہت سے لکھنے والوں سے مل چکا ہوں۔ علی سفیان آفاقی، امجد سلام امجد، یونس جاوید، عطاالحق قاسمی، اصغر ندیم سید، سلیمہ ہاشمی، امجد جاوید اور بھی کئی ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب نے بہت اچھا لکھا ہے اور لکھ رہے ہیں۔ جبکہ اللہ جنت نصیب کرے کاشف زبیر کو کہانی پر بڑی گرفت ہوتی تھی۔

(س) آپ اپنی سب سے بہترین کہانیوں یا ناولز کے بارے میں بتائیں جو مقبول ہوئی ہوں اور یہ کہاں شائع ہوئی تھیں۔

(ج) اخبار جہاں میں میرا ایک سلسلہ چلا تھا "راکھ" کے نام سے اور ایک مزاحیہ سلسلہ "کمال پور کا کمالا" شائع ہوا تھا۔ دونوں سلسلوں نے بہت مقبولیت حاصل کی تھی اور کتابی شکل میں شائع ہو کر بھی کامیابی ملی تھی۔ ڈر ڈائجسٹ میں "سرسراہٹ" کے نام سے سلسلہ شائع ہوا تھا جو انہوں کتابی شکل میں بھی شائع کیا تھا۔ وہ بھی خوب مقبول ہوا تھا۔ میرا کسی ڈائجسٹ کے لئے پہلا سلسلہ "زہر" بھی نئے افق میں شائع ہوا تھا اس نے ہی مجھے متعارف کروایا۔

(س) کیا کبھی کسی کہانی میں بولڈ سین لکھا اور سین لکھتے ہوئے خیال آیا کہ یہ پیرا مدیر سنسر کر دے گا

(ج) میں نے اپنے ایک ناول میں ضرورت کے تحت ہلکا سا بولڈ سین لکھا تھا۔ لیکن وہ بھی بس ایک اشارہ تھا اور اس کی واقعی ضرورت تھی۔ اس کے علاوہ میں نے کبھی ایسا سین نہیں لکھا کہ مجھے دھڑکا ہو کہ یہ سنسر ہو جائے گا

(س) خود آپ کو اپنا کونسا ناول زیادہ پسند ہے

http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

آبِ حیات
عُمیرہ احمد
WWW.PAKSOCIETY.COM

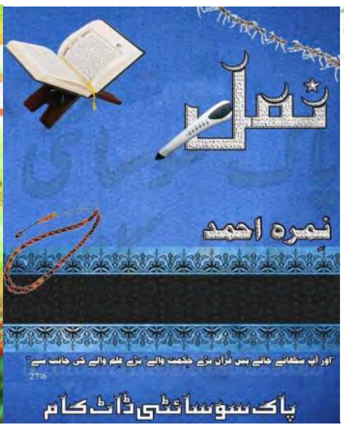
نمل
نمرہ احمد
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

مصحف
نمرہ احمد
WWW.PAKSOCIETY.COM

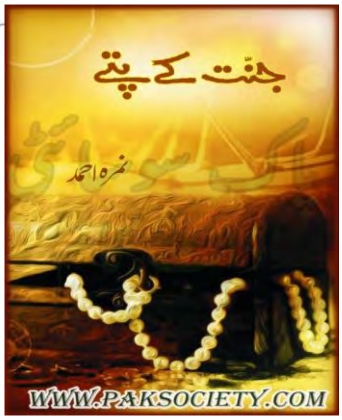
جنّت کے پتے
نمرہ احمد
WWW.PAKSOCIETY.COM

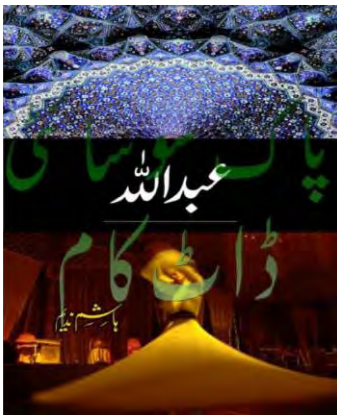
عبداللہ
ہاشم ندیم

بن روئے آنسو
فرحت اشتیاق
www.paksociety.com

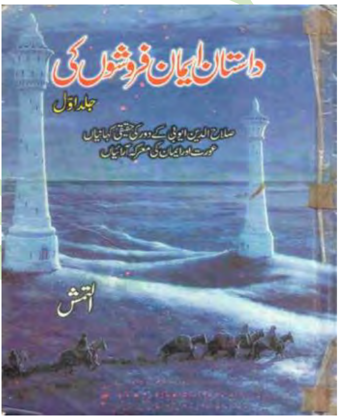
داستان ایمان فروشوں کی
جلد اوّل
التمش

ہم سفر
فرحت اشتیاق
http://www.paksociety.com

جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو
فرحت اشتیاق
WWW.PAKSOCIETY.COM

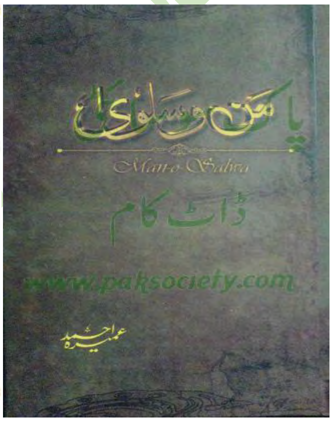
من و سلویٰ
Man-o-Salwa
www.paksociety.com
عمیرہ احمد

متاعِ جاں ہے تو
فرحت اشتیاق
WWW.PAKSOCIETY.COM

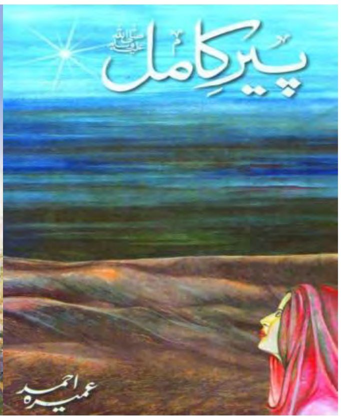
پیرِ کامل
عمیرہ احمد

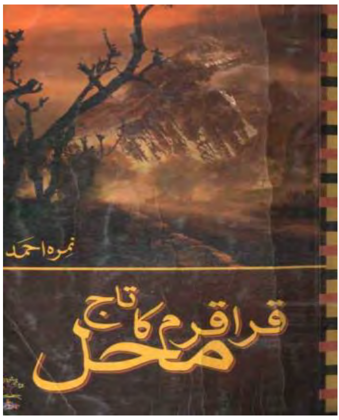
نمرہ احمد
قراقرم کا تاج محل

ٹوٹا ہوا تارہ
سمیرا شریف طور
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

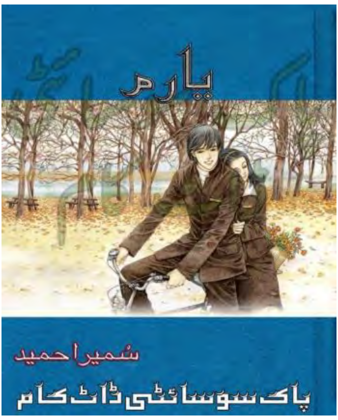
بارش
سمیرا حمید
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

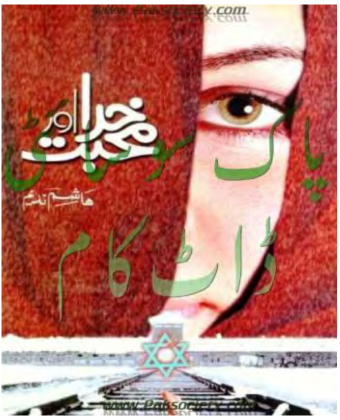
خدا اور محبت
ہاشم ندیم

(ج) ابھی جو بھی لکھا ہے اس سے اچھا لکھنے کی کوشش میں ہوں۔ اس لئے کہہ نہیں سکتا کہ میرا فلاں ناول مجھے پسند ہے۔ ہاں ایسا ضرور ہے کہ القریش پبلی کیشنز نے میرا ناول انگار شائع کیا تھا اس کا کردار علی گوہر مجھے ہی نہیں بلکہ پڑھنے والوں کو بھی پسند آیا تھا کیونکہ وہ ناول اخبار جہاں میں قسط وار شائع بھی ہوا تھا۔

(س) کون سا ڈائجسٹ آپ کے زیر مطالعہ رہتا ہے؟

(ج) جاسوسی، سسپنس، سرگزشت، نئے افق، اخبار جہاں یہ میرے مسلسل مطالعے میں رہتے ہیں اس کے علاوہ کوئی اور ڈائجسٹ بھی ہاتھ لگ جائے تو وہ بھی پڑھ لیتا ہوں۔

(س) بہت کم لوگ دیکھے ہی جو کسی مقام پر پہنچ جانے کے بعد نرم مزاج رہتے ہیں؟

(ج) اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں ثقیل اردو میں بات کروں تو اس طرح سوالوں کے جواب دے دیتا ہوں۔ بہر حال میں واقعی نرم مزاج ہوں

(س) ادب میں گروہ بندی کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں۔؟

(ج) گروہ بندی کسی بھی جگہ ہو اس کا نقصان ہی ہے۔ لیکن یہ گروہ بندیاں ادب کے ٹھیکے داروں کے ہاں دیکھنے کو ملتی ہیں

(س) لکھاری پیدا ہوتا ہے یا محنت و لگن سے بنتا ہے۔

(ج) ڈاکٹر، وکیل، بزنس مین، اداکار کا بیٹا اپنے باپ کے پیشے کو اپنا لے گا لیکن رائٹر پیدا ہی رائٹر ہوتا ہے۔ کسی کو ٹیوشن پڑھانے سے بھی رائٹر نہیں بنایا جا سکتا۔ یہ اللہ کی طرف سے تحفہ ہے۔ محنت اور لگن سے وہی رائٹر بن سکتا ہے جس کے اندر لکھنے کی صلاحیت ہو۔

(س) کیا کبھی کسی انگلش ناول کا ترجمہ کیا؟

(ج) میں نے آج تک جو بھی لکھا ہے وہ طبع زاد ہے اگر میری کسی کہانی میں مغرب سے کردار مستعار بھی لئے گئے تھے تو وہ کہانی میری ہی تھی

(س) آج کل جو رائٹر انگلش ناول کا ترجمہ کر رہے ہیں کیا گوگل ٹرانسلیٹر نے ان کا کام آسان نہیں کر دیا؟

(ج) اب میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ لوگ اس سہولت سے فائدہ اٹھا رہے ہیں کہ نہیں وہ خود محنت کر رہے ہیں یہ تو ٹرانسلیٹر ہی جانتا ہے۔

(س) کیا وجہ ہے کہ مغرب میں ادب کی ہر صنف کو سراہا جاتا ہے مثلاً ہیری پوٹر سیریز کی رائٹرز کو بھی انٹرنیشنل سطح پر سراہا گیا سیریز پر فلمیں بھی بنائی گئیں حالانکہ سیریز وہی ماورائی کہانیوں سے متعلق ہے؟

(ج) ہیری پوٹر کی مصنفہ جے کے رولنگ نے سات ناول لکھ کر اتنی دولت کمالی کہ اس کی نسلیں عیش کریں گی۔ وہاں تخلیق کار کی عزت ہے۔ اس کو اس کے کام کا پورا حق دیتے ہیں وہ لوگ بڑے پروفیشنل ہیں ہر کام بڑی تکنیک سے کرتے ہیں کہ ہیری پوٹر ماورائی سیریز بنا کر کامیاب ہو گئے۔

(س) اردو فکشن کا کیا مستقبل نظر آ رہا ہے؟

(ج) بہت سے ایسے نامور لکھنے والے تھے جو دنیا چھوڑ کر جا چکے تھے۔ ان کی جگہ اور رائٹر آ گئے جنھوں

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

نے اچھا لکھا اور نام بنایا۔ ان میں سے بھی کچھ چلے گئے۔ ہیں تو یہ سلسلہ رکے گا تو نہیں۔ اردو فکشن لکھنے والے بہت اچھے نام آگے آئے ہیں اور لکھنے والوں کے کارواں میں اچھے تخلیق کار ملتے رہیں گے

(س) اردو ادب میں تنقید ایک اصطلاح ہے۔ جس میں کسی بھی تحریر کے محاسن و نقائص پر بحث کی جاتی ہے؟

(ج) جو تنقید نگار فیس بک پر بیٹھ کر کہانی کی گہرائی کو جانے بغیر تنقید شروع کر دیتے ہیں ان کی کسی بات کا غصہ کرنا بے معنی ہے۔ عام طور پر جو تنقید ہوتی ہے وہ بغیر کسی ٹھوس وجہ کے ہوتی ہے۔ جیسے کہانی کے بارے میں لکھ دیا جائے کہ کہانی کا پلاٹ کمزور تھا۔ اب یہ نہیں بتایا جاتا کہ کمزور کیسے اور کیوں تھا۔ ایسی تنقید کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوتا ہاں اگر بات دلیل کے ساتھ کی جائے تو ایسی تنقید سر آنکھوں۔

(س) ادبی سرقہ کے حوالے سے آپ کی کیا رائے ہے؟

(ج) ایک تو ہوتی ہے نقل۔ ایک متاثر ہو کر لکھنا اور ایک یہ کہ کہانی تو لکھنے والے نے سوچ کر لکھی تھی۔ لیکن کسی دوسری کہانی سے مماثلت ہو گئی جس کا علم پڑھنے والوں سے ہوا۔ یہ بھی سچ ہے کہ کہانی پوری کی پوری چرالی جاتی ہے بالخصوص میڈیا میں ایسا عام ہونے لگا ہے۔ یہ بات بھی اپنی جگہ سچ ہے کہ نقل اور جھوٹ ایک دن اس کے پیروں تلے سے زمین کھینچ کر ہی رہتا ہے۔

(س) کیا چیز متاثر کرتی ہے خوبصورتی یا ذہانت؟

(ج) خوبصورتی سے بڑھ کر ذہانت ہے جو متاثر کرتی ہے۔

(س) کوئی ایسا لمحہ جو چاہتے ہیں واپس آ جائے؟

(ج) انتیس ویں روزے کو والدہ محترمہ کی طبیعت خراب ہوئی تو ان کو اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر قریبی ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا تھا لیکن وہ اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ وہ لمحے دل پر نقش ہیں۔ وہ لمحے واپس تو نہیں آ سکتے لیکن بھولتے نہیں ہیں۔

(س) کوئی ایسا لمحہ جب آپ نے خود کو بہت کمزور محسوس کیا ہو؟

(ج) جب والدہ محترمہ ایمرجنسی وارڈ میں تھیں اور ڈاکٹر صاحب نے کہا تھا کہ دعا کریں۔

(س) کبھی خود سے باتیں کی اگر کی تو خود سے باتیں کرنا کیسا لگتا ہے؟

(ج) لکھنے پڑھنے اور سوچنے میں اتنا مصروف رہتا ہوں کہ خود سے بات کرنے کا موقعہ ہی نہیں ملتا۔

(س) آپ کی شادی خاندان میں ہی ہوئی۔ والدین کی پسند کی تھی۔ کیا شادی سے پہلے بیگم کو دیکھا تھا۔ ان کی تعلیم کیا ہے۔ کیا وہ پڑھنے یا لکھنے کی شوقین ہیں۔ آپ کی شادی کب ہوئی۔ بیگم کے لیے چند الفاظ۔

(ج) میری شادی خاندان سے باہر ہوئی ہے۔ شادی سے پہلے ان کی تصویر دیکھی تھی۔ ان کی تعلیم بی اے ہے۔ وہ صرف پڑھتی ہیں لکھنے کی شوقین اس حد تک ہیں کہ سودا سلف کی لسٹ بہت اچھی لکھتی ہیں۔ والدین کے بعد بیوی سے ایک ایسا تعلق ہوتا ہے جس پر مان ہوتا ہے کیونکہ اولاد اپنی مصروف زندگی میں مصروف ہو جائے۔ شوہر بھی مصروفیت میں بیوی کو وقت نہیں دے پاتا لیکن شوہر جب بھی بیوی کو آواز دے گا وہ تھکی ماندی اٹھ کر آ جاتی میں تو سمجھتا ہوں کہ میرے لئے بیوی کا تعلق ایسا ہوتا ہے۔ جس پر شوہر مان کر سکتا

ہے کیونکہ وہ اپنی ذات مٹا کر شوہر کے ساتھ ہر حال میں کھڑی ہوتی ہے۔

(س) جب صنف نازک کے فون وغیرہ آتے ہیں تو بیگم کا ردعمل کیا ہوتا ہے؟

(ج) مجھے فون بھی آتے ہیں، میرے گھر بھی آجاتی ہیں اور ان بکس میں بھی اظہار خیال ہوتا رہتا ہے۔ فون پر میں بیگم صاحبہ کی بھی بات کرادیتا ہوں اور بیگم صاحبہ جانتی ہیں کہ میں ایک شریف شوہر ہوں اور یہ سب میرے کام کا حصہ ہے۔

(س) لکھتے وقت بچوں یا بیگم کی مداخلت کیسی لگتی ہے۔

(ج) آپ کو شاید حیرت ہو کہ میں تنہائی میں نہیں لکھ سکتا۔ میں اس کمرے میں لکھتا ہوں جہاں بیوی بچوں کی باتیں بھی ہو رہی ہوں اور آنا جانا بھی لگا ہو۔ اس لئے میرے لئے ان کی مداخلت سوہان روح نہیں ہوتی۔

(س) آپ کے بچے کتنے ہیں۔ ان کے نام وعمر اور گریڈ بتائیں۔ کون سا بچہ یا بچی مستقبل میں ادیب بن سکتا ہے

(ج) میرے دو بیٹے ہیں محمد عثمان فاروق جس نے ابھی میٹرک کا امتحان دیا ہے جبکہ محمد عمر فاروق آٹھویں کلاس کا طالب علم ہے۔ فی الحال دونوں لکھنے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے بلکہ چھوٹا بیٹا تو ہوم ورک لکھنے میں بھی دلچسپی نہیں دکھاتا۔

(س) آپ کا اپنے بچوں کے ساتھ کیسا رویہ ہے؟

(ج) ارے میں ایسا باپ ہوں کہ بچے میرے ساتھ گھلے ملے ہوئے ہیں۔ وہ میرے ساتھ کشتی بھی کرتے ہیں۔ میں نے ان کو کہہ دیا ہے کہ جو بات تم اپنے دوست سے کرنا چاہو گے وہ مجھ سے کرو کیونکہ باپ سے بڑھ کر اولاد کا کوئی دوست نہیں ہوتا۔ لیکن میں نے بچوں کو ایک حد تک آزادی دی ہے اور ان کے ساتھ دوستانہ نرم اور کبھی کبھی گرج چمک کے ساتھ والا رشتہ ہے۔

(س) بچپن کے چند ایسے دوستوں کے نام بتائیں جو اب بھی دوست ہوں۔

(ج) بچپن کے دوستوں میں میرا اہم نام فاروق، باسط، اعجاز، کامران اور بہت سے شامل ہیں اور اب بھی ہم دوست ہیں۔

(س) آپ کی خوب صورتی کا کیا راز ہے۔ بڑی سمارٹ لک ہے۔

(ج) کرکٹ خوب کھیلی اور ۹۲ کے ورلڈ کپ تک دیکھی بھی اور پھر رفتہ رفتہ اس میں دلچسپی ختم ہوگئی۔ اپنے آپ پر خوب توجہ دیتا ہوں اس لئے یہ لک ہے۔

(س) بہت سے مدیران سے آپ کا واسطہ رہا۔ بتائیں آپ نے انہیں کیسا پایا۔ ایک دو کو تو میں جانتا ہوں بڑے متکبر ہیں۔ اپنی بات کو حرف آخر سمجھتے ہیں۔

(ج) جی میرا ان سب کے ساتھ رابطہ رہتا ہے۔ میں نے کسی کو متکبر نہیں پایا۔ نئے افق کے طاہر بھائی اور عمران بھائی کے ساتھ بہت اچھے انداز میں بات ہوتی ہے۔ چیٹ بھی ہوتی ہے۔ کسی بات پر اختلاف بھی ہوجاتا ہے۔ لیکن ان کا رویہ بہت اچھا ہے۔ پرویز بلگرامی صاحب کے بات کرنے میں کوئی تکلف نہیں ہوتا

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

بڑی اپنائیت ہے ان میں۔ جاسوسی کی مدیرہ بھی بہت اچھے انداز میں بات کرتی ہیں۔ انوار علیگی صاحب تو استاد کا درجہ رکھتے ہیں۔ میرے ساتھ آج تک کسی مدیر صاحب نے مدیر بن کر کبھی بات نہیں کی۔ میں بھی ان لوگوں کے ساتھ کھل کر بات کرتا ہوں مجھے کبھی کسی کے ساتھ کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔

(س) ماحول میں کوئی خوشگوار یا ناخوشگوار واقعہ قلم ایک حساس انسان کو قلم اٹھانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ آپ کی زندگی میں ایسا کوئی واقعہ جس نے آپ کو قلم اٹھانے پر مجبور کر دیا ہو۔

(ج) بہت سی کہانیاں میں اردگرد کے ماحول سے لے کر لکھی تھیں ان کہانیوں نے جراحت کا کام کیا یا نہیں البتہ میں قلم اٹھا کر ضرور مطمئن ہوا تھا۔ کمال پور کا کمالا مجھے صرف ایک لائن نے لکھنے پر مجبور کر دیا تھا جب میں ایک گاؤں میں گیا تو وہاں ایک جگہ لوگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ جیدا شہر جا کر بڑا درزی بن گیا ہے اور ایک سوٹ کی سلائی تین سو روپیہ لیتا ہے۔ بس اس ایک لائن نے پورا ناول لکھوا دیا یہ الگ بات ہے کہ جیدے کا کردار پیچھے اور کمال کا کردار آگے آ گیا تھا۔

(س) رائٹر کے فرائض ادا کرنے کے علاوہ کیا مصروفیات ہیں۔ کہانیوں سے ہر ماہ کم از کم کتنا کما لیتے ہیں۔

(ج) میرا ایک چھوٹا سا یونٹ ہے جو کہ میرا کاروبار ہے۔ رہا سوال یہ کہ کہانیوں سے کتنا کما لیتا ہوں تو اللہ کا شکر ہے۔ یورپ میں تو لکھنے والا اس قدر خوشحال ہوتا ہے کہ اسے کچھ اور کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ یہاں ایسے بھی لکھنے والے ہیں جو اپنے گھر کا چولہا جلانے کے لئے دوسروں کے لئے لکھتے ہیں۔ لیکن یہاں لکھنے کی آمدن کے ساتھ کچھ کاروبار یا کوئی آمدن کا سلسلہ بھی ہونا چاہئے۔ ویسے میرا بزنس بھی ہے۔

(س) کوئی ایسا شعر سنائیں جو ہر دور میں آپ کو پسند رہا ہو۔ سدا بہار آپ کا پسندیدہ شعر

(ج)

ان کو دیکھ جو آ جاتی ہے چہرے پہ رونق
وہ سمجھتے ہیں بیمار کا حال اچھا ہے

(س) علامہ اقبال۔ غالب کے علاوہ بتائیں آپ کو کون سا شاعر پسند ہے۔

(ج) جون ایلیا اور جاوید اختر کی شاعری مجھے پسند ہے

(س) ڈرامہ لکھنے کے لیے کن باتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ ڈرامہ کی کامیابی کا انحصار کس بات پر ہے۔

(ج) ڈرامہ لکھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی کہانی کا ٹیمپو تیز ہو ڈرامہ کی کامیابی کا اب کوئی فارمولا نہیں ہے اگر ایک ڈرامہ اس لئے ہٹ ہو گیا کہ اس میں رونا دھونا بہت تھا تو پھر ٹرینڈ ہی رونے دھونے کا ہو جاتا ہے۔

(س) ایک کہانی آپ نے سوچی پلاٹ لکھا۔ اب اس موضوع پر سورس آف انفارمیشن کیا ہے آپ کا۔ معلومات کیسے جمع کرتے ہیں۔

(ج) ایک انٹرویو کے دوران کچھ ایسا ہی سوال محی الدین نواب صاحب سے بھی کیا گیا تھا۔ انہوں نے

کہا تھا کہ میں نیٹ پر بہت سے ممالک کی سیر کرتا ہوں اور اپنے لیے معلومات جمع کر لیتا ہوں میں نے یہ بات ان سے سیکھی ہے اور پھر میں وہی لکھتا ہوں۔ جس کے بارے میں مجھے مشاہدہ ہوتا ہے۔

(س) آپ نے کس کس ملک کی سیاحت کی ہے پاکستان کے کون کون مقامات دیکھے ہیں سیاحت سے کتنی دلچسپی ہے۔

(ج) میں ملک سے باہر تو نہیں گیا لیکن کراچی، اسلام آباد، لاہور، پشاور اور پاکستان کے بہت سے شہر گھوما ہوں۔

(س) آپ نے کوئی کتاب، کہانی دوبارہ پڑھی ہو جیسے میں نے بازیگر، دیوتا، گمراہ، داستان ایمان فروشوں کی دوبار پڑھی ہیں۔

(ج) میں نے میکسم گورکی کی ماں دوبار پڑھی ہے۔ ایک سلسلہ چلتا تھا حاضر غائب وہ میں نے دوبار پڑھا تھا۔ غلام عباس کے افسانے کئی بار پڑھے۔ اس کے علاوہ ابن انشا کی خمار گندم دوبار پڑھی تھی۔ خالی گھر بھی دوبار پڑھا تھا۔

(س) تم سے پیار دوبارہ کرتے کیسے کرتے؟ کوئی ایسی حسرت دل میں۔

(ج) بالکل بھی نہیں ایسی کبھی صورت حال پیدا نہیں ہوئی۔

(س) غصہ کس بات پر آتا ہے۔

(ج) غصہ کم آتا ہے لیکن اس وقت آتا ہے جب کوئی غلط بات بھی کرے اور اس پر ڈٹا بھی رہے۔

(س) اپنی اچھی اور بری ایک ایک عادت بتائیں

(ج) جو مجھے لگتا ہے کہ میرے اندر اچھی عادت یہ ہے کہ میں کسی کی ہمت توڑنے کی بات نہیں کرتا۔ بلکہ یہ کہتا ہوں کہ تم یہ کر سکتے ہو اسے کرو اور بری عادت یہ ہے کہ جو کہہ دیا اس پر ڈٹ جاتا ہوں۔ جس سے دوسرے ناراض بھی ہو جاتے ہیں۔

(س) اپنی کالج لائف کا ایک مزاحیہ واقعہ سنائیں جو بہت مزاحیہ ہو؟

(ج) میرا بہترین دور کالج کا دور تھا میں اپنی کالج لائف کے واقعات جمع کیے ہوئے ہیں جو کہ میں اپنے اصل دوستوں کے نام سے ناول کی شکل میں لکھنے کی منصوبہ بندی کر رہا ہوں بلکہ اس پر کام بھی کر رہا ہوں۔ میرا وہ ناول سچے اور شرارتوں سے بھرپور واقعات کے ساتھ کہانی کی آمیزش بھی ہوگی۔ تب پڑھ لیجیے گا۔

(س) موسیقی کون سی پسند ہے؟

(ج) مجھے نئے گانے بھی اچھے لگتے ہیں لیکن میں زیادہ پرانے گانے سنتا اور گنگناتا ہوں۔ چلو ایک بار پھر سے اجنبی بن جائیں۔ یاد نہ جائے بیتے دنوں کی۔ اک لڑکی کو دیکھا تو ایسا لگا۔ یہ گانے مجھے اچھے لگتے ہیں۔

(س) جب اداس ہوں تو کیا کرتے ہیں؟

(ج) جب میں اداس ہوتا ہوں تو چپ ہو جاتا ہوں پورے گھر والوں کو پتا چل جاتا ہے کہ میں اداس

ہوں اور خوش ہونے پر میری گنگناہٹ ہی ختم نہیں ہوتی۔

(س) دوسری شادی کب کر رہے ہیں؟

(ج) ایک اچھی بیوی اور بہت ہی اچھی بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری شادی کے بارے میں سوچنا ایسی حماقت ہے جیسے محنت سے کہانی لکھ کر پھاڑ دی جائے۔

(س) شاعری کی طرف کچھ رجحان ہے یا نہیں کبھی کوئی شعر کہا۔

(ج) جب ماہنامہ چاند میں لکھا کرتا تھا تو مزاحیہ شاعری کبھی کبھار کر لیا کرتا تھا۔ ویسے شاعری کی طرف اتنا رجحان ہے کہ اچھی شاعری پڑھتا ہوں۔

(س) کیا آج ایک رائٹر صرف کہانیاں لکھ کر اپنی فیملی کو اچھی طرح سپورٹ کر سکتا ہے کیا لکھنے کے کام کو بطور پیشہ اپنایا جا سکتا ہے مطلب کسی بھی اچھے رائٹر لکھنے کے علاوہ کوئی اور جاب نہ کرنی پڑے۔

(ج) اگر ادارے اچھا معاوضہ دیں تو ایک رائٹر ماہانہ اتنا کما سکتا ہے کہ وہ اپنے اخراجات پورے کر سکتا ہے اور پھر میڈیا کی بھی بھرمار ہے جو لکھنے والوں کو پرکشش معاوضہ دیتے ہیں۔

(س) پبلک مقامات پر لوگوں کا آپ سے ملنے کا انداز کیسا ہوتا ہے؟

(ج) میں ایک رائٹر ہوں جس کے کام سے اس کے پڑھنے والے واقف ہوتے ہیں لیکن چہرے سے نا آشنا ہوتے ہیں اس لئے پبلک مقام پر مجھے کوئی نہیں جان سکتا کہ میں کون ہوں۔ یہ خصوصیت صرف اداکار یا کیمرے کے سامنے کام کرنے والے لوگوں پر ہوتی ہے۔ البتہ خاندان میں شادی بیاہ میں جب شرکت کرتا ہوں تو کانا پوسی ہوتی ہے یہ ہے جو کہانیاں اور ناول لکھتا ہے......

(س) سڑک پر کام کرتی عورت؟

(ج) ہماری بے حسی یا حکومتی ناقص پالیسیاں۔ حضرت عمرؓ نے کہا تھا کہ میں بھوک سے مرنے والے کتے کا بھی ذمہ دار ہوں اور یہاں حکمرانوں کے آگے کسی غریب کی مجبوری کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔ ان سب کی ذمہ داری حکومت پر عائد ہے۔

(س) چند ایک چھوٹے لکھاری اپنے چھوٹے پن کی وجہ سے اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہیں اور زبردستی باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ نہ منہ نہ ناساں۔ میں وی کھاریاں جاساں۔ آپ کیا کہیں گے ان کے بارے میں۔

(ج) بالکل ایسا سمجھے بھی ہیں اور میرے مشاہدے میں بھی یہ بات ہے۔ وہ چند کہانیاں لکھ کر خود ہی اپنے رائٹر ہونے کی رٹ لگا دیتے ہیں لیکن سچ تو یہ ہے کہ میں خود کو ابھی رایٹر ہی نہیں سمجھتا میری منزل ابھی دور ہے۔

(س) کبھی اپنے گریبان میں جھانکا؟ کیسا لگا!

(ج) جی مجھے پتا ہے کہ میں کتنے پانی میں ہوں اس لئے کبھی اپنے قد سے زیادہ کی بات نہیں کی۔

(س) انسانی سوچ کی حد کیا ہے؟

(ج) آپ انسان کی کس سوچ کی بات کر رہے ہیں؟ منفی یا مثبت سوچ کی؟

انسانی سوچ کی اگر کوئی حد ہوتی تو وہ موٹر کار بنا کر بیٹھ جاتا' پھر جہاز نہ بنتا۔ انسان چاند پر نہ جاتا۔ نئی چیزیں اور حیران کن چیزیں وجود میں نہ آتیں اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ انسان کی سوچ کی کوئی حد نہیں ہے۔

(س) سوشل میڈیا کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

(ج) میں سوشل میڈیا کے کچھ گروپس میں ایڈ ضرور ہوں لیکن کبھی ایسی سرگرمیوں میں حصہ نہیں لیا۔ سوشل میڈیا واحد وہ جگہ جہاں آپ ڈاکٹر وکیل دانشور بن سکتے ہیں اور اس جگہ پر نقاد بننا تو دائیں ہاتھ کا کام ہے۔

(س) ہم فیس بک پر کوئی پوسٹ کیوں لگاتے ہیں۔ کہانی کیوں لکھتے ہیں؟

(ج) یہ تشہیر کا دور ہے بڑی بڑی کمپنیاں کروڑوں روپیہ اس پر خرچ کرتی ہیں۔ فیس بک ایک بہترین ذریعہ ہے کسی مصنف کی نئی کہانی آئی ہے۔ یا نئی کتاب شائع ہوتی ہے اور وہ اس کی پوسٹ لگا دیتا ہے تو دوسروں کے علم میں بھی یہ بات آجاتی ہے لیکن یہاں عجیب پوسٹیں لگتی ہیں جن کا سر نہ پیر ہوتا ہے۔

(س) سوشل میڈیا پر آپ کب سے ایکٹیو ہیں؟ فیس بک پر کتنے فرینڈز ہیں۔ ان میں سے ان کی تعداد کتنی ہے جو آپ کو پرسنل جانتے ہیں۔ سوشل میڈیا پر آپ جو وقت گزارتے ہیں اسے بامقصد یا بے مقصد گزارتے ہیں؟

(ج) سوشل میڈیا پر میں چھ سات ماہ سے ایکٹو ہوں اور میرے فرینڈ کی تعداد جو شو ہو رہی ہے وہ ایک ہزار سے زیادہ ہے ان میں جو مجھے بالکل ذاتی طور پر جانتے ہیں جو مجھے مل چکے ہیں جو میرے ساتھ ان بکس میں چیٹ ہیں ان کی تعداد بھی کافی ہے۔ میں کئی گروپس میں ایڈ ہوں پوسٹ میں اپنی نئی کہانی یا نئی کتاب کی لگاتا ہوں۔ لیکن وہ کسی گروپ کی بجائے اپنے فرینڈز میں لگا دیتا ہوں سوشل میڈیا پر جو وقت گزارتا ہوں۔ وہ ان بکس میں آنے والے سوالات کے جواب دینے اپنی پوسٹ کے کمنٹس پڑھنے اور کس گروپ میں کیا چل رہا ہے وہ پڑھنے میں گزارتا ہوں۔

(س) اس کی کیا وجہ کہ آج کی نوجوان نسل کتاب سے دور ہوتی جا رہی ہے؟

(ج) کتاب آج بھی بکتی ہے۔ کتاب سے دوری کی وجہ کتاب کی قیمت ہے جب کتاب میلہ لگتا ہے اور ڈسکاونٹ میں کتابوں کے اسٹال لگتے ہیں تو کتاب تک رسائی کے لئے آنے والوں کا کتنا رش ہوتا ہے۔ کتاب سے دوری کی وجہ انٹرنیٹ بھی ہے اور فکر معاش کے معاملات بھی حائل ہیں۔

(س) جب آپ ایک کہانی لکھتے ہیں تو کیا مکمل کہانی آپ کے ذہن میں ہوتی ہے یا آپ لکھتے جاتے ہیں اور کہانی بنتی جاتی ہے۔

(ج) میں کہانی کا خاکہ بناتا ہوں۔ کردار نگاری کرتا ہوں اور کہانی لکھنا شروع کر دیتا ہوں۔ کہانی بنتی رہتی ہے اور مکمل ہو جاتی ہے پھر جب اس کی ایڈیٹنگ کرتا ہوں تو کہانی کچھ کی کچھ ہو جاتی ہے اور پھر اسے بھیج دیتا ہوں۔

(س) کہانی کو لکھتے ہوئے کن باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے سب سے اہم کیا ہے؟

(ج) کہانی لکھتے ہوئے یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ جو موضوع چنا ہے کہانی اس کے اندر رہ کر ہی لکھی

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

کار ہی ہے۔ اچھی کہانی کے لئے اس کا پلاٹ کا مضبوط ہونا، کردار نگاری اور مکالموں پر توجہ کا ہونا ضروری ہے۔ کہانی ڈائجسٹ کے مزاج کے مطابق لکھی جاتی ہے ہر ڈائجسٹ کا اپنا مزاج ہے۔ اس کے مزاج کو مدنظر رکھا جائے گا۔ ہر ڈائجسٹ کی ریڈر شپ بھی الگ الگ ہے۔

(س) کیا مردوں کے میگزین تنزلی کا شکار ہیں؟

(ج) ایسا نہیں ہے۔ جو میگزین اپنے معیار کو برقرار رکھے ہوئے ہیں وہ آج بھی بڑی تعداد میں شائع ہوتے ہیں اور دنیا میں پڑھے جاتے ہیں۔

(س) نئے افق میں آپ نے کتنی کہانیاں لکھیں۔ سب سے پہلی کب لکھی اور اس کا نام کیا تھا اور اب تک آخری کب لکھی اور اس کا نام کیا تھا۔ اگر اب کہا جائے لکھنے کا تو......؟

(ج) نئے افق سے پہلے اسی ادارے کا ڈائجسٹ تھا نیا رخ اس میں لکھا کرتا تھا۔ پھر نئے افق میں لکھا۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ میری پہلی کہانی ان ڈائجسٹوں میں کب شائع ہوئی تھی۔ البتہ میں نئے افق میں بہت لکھا تھا۔ جون کے نئے افق میں میری کہانی فتور شامل ہے اور آئندہ بھی لکھوں گا۔ میں نے نئے افق کو چھوڑا نہیں ہے۔

(س) نئے افق میں سے پسندیدہ لکھاری کون ہے نئے افق نے حال میں ہی تبدیلیاں کیں کیسی لگیں۔ آنے والے دور میں نئے افق کو کس مقام پر دیکھ رہے ہیں۔ اس وقت آپ کے خیال میں نئے افق کا کیا معیار ہے۔ نئے افق۔ ادب کے افق پر چھا جائے مالکان و مدیر کو کیا کرنا چاہئے؟

(ج) نئے افق میں پہلی کہانی کب شائع ہوئی مجھے یاد نہیں ہے۔ شاید ۸۸ء میں شائع ہوئی تھی۔ نئے افق میں امجد جاوید بہت اچھا لکھ رہے ہیں۔ ان کا سلسلہ عورت ذات بہت دلچسپ سلسلہ ہے۔ نئے افق میں تبدیلیاں ہوا کے تازہ جھونکے کی مانند ہیں۔ نئے افق اس وقت اچھی پوزیشن پر کھڑا ہے اس کی مزید بہتری کے لئے نئے رائٹرز کے ساتھ پرانے لکھنے والوں سے بھی رابطہ کیا جائے تو ڈائجسٹ اور بھی اچھا ہو جائے گا۔ خامی یہ ہے کہ اس میں خواتین کے لیے مواد زیادہ ہوتا ہے۔ اسے خالصتاً مردانہ بنایا جائے۔ خواتین کے لیے آنچل وحجاب جو ہیں۔

(س) مستقبل میں کیا ارادے ہیں؟

(ج) بہت سے پلان ہیں جن پر وقت کے ساتھ ساتھ عمل کروں گا قبل از وقت کہنا مناسب نہیں ہے۔ ابھی تو حال کو اچھا کرنے کوشش کر رہا ہوں۔ جب حال اچھا ہو گا تو مستقبل کے لئے راستے خود بخود بن جائیں گے اور کچھ کرنے کے لئے ارادہ نہیں کرنا پڑے گا بلکہ اللہ اس کام کے لئے آسانی فرما دے گا۔ بہر حال میرے ارادے پر جوش اور توانائی سے بھرپور ہیں جو پڑھنے والے وقت کے ساتھ دیکھتے رہیں گے

◆

خدا گواہ

زرین قمر

برہان مظفر وانی کو برہان وانی کے نام سے بھی جانا جاتا ہے وہ آزاد کشمیر میں حزب المجاہدین کی جماعت کا گروپ کمانڈر تھا وہ کشمیریوں میں مقبول تھا اور سوشل میڈیا پر اس نے بہت سے فوٹو اور ویڈیوز اپ لوڈ کی تھیں جس میں انڈیا کے گھناؤنے چہرے کو دکھایا گیا تھا وہ انڈین سیکورٹی فورسز کے ساتھ ایک مقابلے میں مارا گیا جو جولائی 2016ء کو کشمیر میں اس کی موت پر احتجاج ہوا جو اب تک جاری ہے جس میں ہزاروں لوگ زخمی ہوئے ہیں اس صورت حال کو 2010ء کے بعد اس خطے میں خراب ترین صورت حال قرار دیا گیا ہے کشمیر میں چالیس دن تک کرفیو لگا رہا اور صورت حال اب تک خراب ہے۔ یہاں کشمیر کی جنگ ختم نہیں ہوئی ہے اب بھی بہت سے لوگ ہیں جو اس جنگ میں کشمیر کی آزادی چھپی دیکھ رہے ہیں ایک عورت ہے جو سیاہ چادر میں ملبوس اکثر برہان کی قبر پر آتی ہے اور ہر بار خدا کو گواہ کر کے برہان سے کیا ہوا وعدہ دہراتی ہے خدا اسے ہمت دے اور اس وعدے کو پورا کرنے میں اس کی مدد کرے۔

Downloaded From

Downloaded From paksociety.com

کشمیر کے بلند و بالا پہاڑوں کی چوٹیوں پر واقع اننت ناگ کے جنگل میں موسم بہار کی آمد آمد تھی ہر طرف ہرے بھرے درخت سر اٹھائے کھڑے تھے اور وادی میں سبزہ لہرا رہا تھا اور جنگل کے اس حصے میں جہاں خاموشی کا راج تھا چند مقامی بچے اپنے مقامی لباس شلوار اور ڈھیلے ڈھالے کرتے پہنے کھیلنے میں مصروف تھے ان کے ہاتھوں میں لمبی لمبی لکڑیاں اور درختوں سے توڑی ہوئی ٹہنیاں موجود تھیں وہ کبھی درختوں کے پیچھے چھپ جاتے کبھی جھاڑیوں کی آڑ لیتے اور کبھی کسی پہاڑی ٹیلے کی آڑ میں چلے جاتے وہ کھیل میں حصہ لینے کے ساتھ ساتھ ایک مقامی گیت بھی گاتے جا رہے تھے۔

”کرو تیار زادِ راہ سوئے فردوس اے ہمدم
ہے رستہ پر خطر پھر بھی سفر طے ہم کو کرنا ہے۔“

ان بچوں میں جو بچہ سب سے پیش پیش تھا جس نے یہ شعر پڑھا، اس نے ملٹی کلر کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ دوسرے بچے بھی اس کے ساتھ آواز ملا کر گا رہے تھے۔

”وانی! وہ...... شعر پڑھو...... وہ جنگ بدر والا۔“ دوسرے بچے نے کہا۔

”اٹھو اہل بدر اہل احد کے چاہنے والو
علم اب سر بلند اپنا لٹا کر جان کرنا ہے۔“

وانی نے شعر پڑھا اور بچوں نے پھر اس کے ساتھ آواز ملائی بچے محویت سے کھیل رہے تھے اور وہ بغور انہیں دیکھ رہا تھا اچانک کہیں قریب ہی سے کسی فائر کی گونج سنائی دی اور اس کی آنکھ کھل گئی تھی اس نے آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھا، وہاں کوئی نہیں تھا وہ اکیلا ایک درخت کے نیچے لیٹا تھا وہ اکثر یہ خواب دیکھتا تھا وہ اپنا بچپن نہیں بھولا تھا وہ اس طرح ان جنگلوں میں کھیل کر جوان ہوا تھا بچپن میں وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر کشمیر کی جدوجہد آزادی کی لڑائی کا کھیل کھیلتا تھا جس میں آدھے بچے کشمیری حریت پسند اور آدھے انڈین فوجی بنتے تھے اور کھیل شروع ہو جاتا تھا وہ کبھی درختوں کے پیچھے چھپتے کبھی ایک دوسرے پر اپنے ہاتھوں میں پکڑے ڈنڈوں اور ٹہنیوں سے بنی فرضی رائفلوں سے ایک دوسرے پر فائر کرتے تھے وہ چھوٹے تھے پر کشمیر کی آزادی کا خواب وہ بھی دیکھتے تھے۔

برہان وانی انہی میں سے ایک تھا اس کے والد مظفر احمد وانی اننت ناگ کے دادسارا گاؤں میں ایک ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے اور اس کی بیوی میمونہ مظفر اسی گاؤں میں بچوں کو قرآن شریف کی تعلیم دیتی تھی اس کے پانچ بچے تھے سب سے بڑا بیٹا خالد مظفر، برہان، بیٹی ارم مظفر وانی اور دو چھوٹے بھائی نوید اور عالم۔ یہ سب اسی گاؤں میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والدین نے غربت کے باوجود انہیں کبھی کسی چیز کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا تھا۔ ان بچوں میں کشمیر کے دوسرے بچوں کی طرح وطن سے محبت کا جذبہ موجود تھا جسے آئے دن ہونے والے انڈین افواج کے ظلم سے مزید تقویت ملتی تھی پھر انہی لکڑیوں ڈنڈوں اور ٹہنیوں سے لڑنے والے بچوں کے ہاتھوں میں رائفلیں اور پستولیں آ گئیں۔

اور وہ اپنے خواب کی تعبیر حاصل کرنے کے لیے کشمیری جدوجہد آزادی کا حصہ بننے لگے انہی میں برہان وانی کا بڑا بھائی خالد مظفر وانی بھی تھا جسے انڈین آرمی نے 13 April 2015 کو شہید کر دیا جب وہ اپنے تین دوستوں کے ساتھ اپنے والد سے ملنے جا رہا تھا۔ انڈین آرمی کا کہنا ہے کہ خالد دہشت گرد تھا اور ایک کارروائی کے دوران اپنے دوستوں کے ساتھ مارا گیا اس کے کچھ دوستوں کو آرمی نے گرفتار کر لیا اور کشمیری پولیس نے اس کی کوئی تصدیق یا تردید نہیں کی خالد کے دوست جہادی تھے یا نہیں لیکن اس کے والد اور محلے داروں نے تردید کی ہے اور کہا ہے کہ اس کی لاش پر کسی گولی کا نشان نہیں تھا اور اسے تشدد کر کے ہلاک کیا گیا۔

اچانک ہی فائر کی دوسری آواز گونج دی اور وہ اٹھ کر بیٹھ گیا پھر قریب ہی درختوں کے پیچھے اسے سرسراہٹ سی سنائی دی تھی اور وہ آواز کی سمت بڑھا دیا ابھی وہ چند قدم ہی گیا تھا کہ ایک درخت کی اوٹ سے اسے پیلے رنگ کا پھول دار دوپٹہ لہراتا نظر آیا اور وہ اس طرف بڑھ گیا۔

”اوہ ارم! تم پھر یہاں اکیلی آ گئی ہو؟“ برہان نے پیار بھری خفگی سے کہا۔

”بھیا! آپ کو پتا ہے کہ میں آپ کو دیکھے بغیر ایک دن بھی

نہیں رہ سکتی لیکن میں تو آج کئی دن کے بعد آئی ہوں۔" ارم نے پیار سے کہا۔

"میری پیاری گڑیا رانی..... دیکھو دشمن ہماری تاک میں لگا رہتا ہے کوئی بھی تمہارا پیچھا کرتا ہوا یہاں تک پہنچ سکتا ہے اور پھر میرے ساتھ دوسرے ساتھیوں کی زندگی بھی خطرے میں پڑ جائے گی..... تم صبر کیا کرو..... میں خود موقع دیکھ کر تم سے ملنے آجایا کروں گا۔"

"میں تو اس لیے بھی آئی تھی کہ آج ماں نے تمہاری پسندیدہ جوار کی روٹی بنائی تھی میں تمہارے لیے لائی ہوں۔" ارم نے ہاتھ میں پکڑی کپڑے کی پوٹلی کو کھولتے ہوئے کہا وہ زمین پر بیٹھ گئی تھی اور اس کے ساتھ برہان بھی بیٹھ گیا تھا۔

"تم صرف یہ روٹی لے کر اتنے خطرے سے گزر کر آئی ہو۔" برہان نے کہا۔

"خطرہ؟..... بھیا! خطرہ کہاں نہیں ہے ہم کشمیری تو گھروں کے اندر بھی محفوظ نہیں ہیں نہ ہمارے شہروں میں امن وسکون ہے اور نہ گھروں میں۔ ہر جگہ میدان جنگ بنی ہوئی ہے پتہ نہیں کب تک ہم اس صورت حال سے نمٹتے رہیں گے۔" ارم نے دکھ سے کہا۔

"اللہ سے بہتر کی امید رکھو وہ اپنے بندوں سے کبھی غافل نہیں ہوتا ایک نہ ایک دن ہمیں ضرور آزادی ملے گی ہماری جدوجہد رائیگاں نہیں جائے گی۔"

"آمین! اچھا اب آپ کھانا کھالیں اس نے روٹی اور ساگ برہان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا اور ایک گلاس میں لسی نکالنے لگی۔

"میں ایک شرط پر کھاؤں گا۔" برہان نے کہا۔

"وہ کونسی شرط؟"

"تم آئندہ اس طرح نہیں آؤ گی میرے کمانڈر کو پتہ لگ گیا تو وہ ناراض ہوگا یہاں مجاہدین سے ملنے کوئی نہیں آسکتا بہت سخت پابندی ہے۔ ہمارے ٹھکانے ہر کسی کو پتہ بھی نہیں ہیں۔"

"ٹھیک ہے بھائی میں خیال رکھوں گی۔" ارم نے جواب دیا پھر وہ جلد ہی رخصت ہوگئی تھی اور برہان جنگل میں اپنے کیمپ کی طرف روانہ ہوگیا تھا جہاں ان کی روزانہ کی تربیت کا آغاز ہونے والا تھا۔

* * *

داد سارا گاؤں کی چھوٹی سی آبادی میں صبح صادق کا وقت تھا۔ مساجد سے اذانوں کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں اور زندگی نئی صبح کا استقبال کرنے کے لیے انگڑائی لے رہی تھی۔ برہان کی ماں میمونہ بستر سے اٹھی سب سے پہلے اس نے وضو کر کے فجر کی نماز ادا کی اور اس کے بعد باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی تب تک اس کا شوہر مظفر وانی بیدار ہو کر اپنے دونوں چھوٹے بیٹوں نوید وانی اور عالم وانی کے ساتھ محلے کی مسجد میں جا چکا تھا میمونہ نے جلدی جلدی ناشتے کی تیاری کی آج گھر میں کوئی سالن بنا ہوا نہیں تھا اس نے گیہوں کے آٹے کی روٹی بنا کر اس پر گھی لگا دیا تھا اور ساتھ چائے تیار کر لی تھی کچھ ہی دیر میں بچے اور اس کا شوہر نماز پڑھ کر واپس آگئے تھے اور اس نے ان کے لیے ناشتہ بنا دیا تھا۔

"آج کوئی رات کا بچا ہوا سالن بھی نہیں ہے؟" مظفر وانی نے پوچھا۔

"نہیں کل بہت کم بنایا تھا وہ رات ہی ختم ہوگیا۔" میمونہ نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے کوئی بات نہیں میں اسکول سے آتے ہوئے پکانے کے لیے کچھ لیتا آؤں گا۔"

"امی..... آج گوشت بنالینا۔" سب سے چھوٹے بچے عالم نے کہا۔

"ہاں ہاں..... دیکھوں گی۔" میمونہ نے وعدہ نہیں کیا وہ جانتی تھی مہینے کی آخری تاریخیں تھیں اگر اس کے شوہر کی گنجائش ہوگی تو وہ خود لے آئے گا۔ اس نے شادی کے بعد سے آج تک مظفر وانی سے کبھی کوئی فرمائش نہیں کی تھی اور اس کی مختصر سی تنخواہ میں بڑی خوش اسلوبی سے گھر چلاتی رہی تھی۔

ناشتے سے فارغ ہو کر بچے اور مظفر اسکول کے لیے روانہ ہوگئے تھے اور میمونہ گھر کے کاموں میں مصروف ہوگئی تھی کیونکہ کچھ ہی دیر بعد محلے کے بچے اس کے پاس قرآن پڑھنے آنے والے تھے یہ وہ بچے تھے جو صبح اسکول نہیں جاتے

تھے ابھی کچھ ہی دیر گزری تھی کہ گاؤں میں شور برپا ہوگیا۔ لوگوں کی چیخ وپکار کی آوازوں سے اندازہ ہوگیا تھا کہ بھارتی سیکورٹی گارڈ یقیناً پھر زبردستی گھروں میں گھس رہے تھے یہ ان کا روزمرہ کا کام تھا جب جی چاہتا وہ گھروں کی تلاشی لینے کے لیے بلا اجازت گھروں میں داخل ہوجاتے اور گھر والوں پر تشدد کرتے وہ اکثر حریت مجاہدین کو تلاش کر رہے ہوتے تھے اور اس کا نام لے کر لوگوں سے اس کے بارے میں معلومات کرتے تھے اس دوران وہ لوگوں کو زدوکوب بھی کرتے تھے۔ عورتوں کی بے عزتی کرتے تھے۔

آج گاؤں میں ایک جلسہ ہونے والا تھا جس میں جدوجہد آزادی کے کئی رہنماؤں نے شرکت کرنا تھی ان کے ناموں کا اعلان ہوچکا تھا اور جلسے سے پہلے انڈین آرمی انہیں گرفتار کرلینا چاہتی تھی چنانچہ گاؤں کے گھروں میں سرچ آپریشن کردیا گیا تھا۔ میمونہ جلدی سے گھر کا دروازہ بند کرنے آگے بڑھی حالانکہ وہ جانتی تھی کہ دروازہ بند کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا انڈین فوجی دروازہ توڑ کر اندر آجائیں گے لیکن اس کے دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی دو فوجی رائفلوں کے بٹوں سے دھکا دے کر دروازہ کھولتے ہوئے اندر داخل ہوگئے تھے۔

”کہاں ہے......؟ کہاں ہے تمہارا بیٹا؟“ ایک انڈین فوجی نے للکارتے ہوئے میمونہ سے پوچھا اور اس کی پندرہ سالہ بیٹی ارم اپنے آپ کو چھپانے کے لیے ماں کے پیچھے چھپ گئی۔

”وہ گھر پر نہیں ہے۔“ میمونہ نے جواب دیا۔

”ہمیں پتہ ہے وہ دہشت گرد ہے...... ہمیں اس کی تلاش ہے اس کمینے دہشت گردوں ہی نے اپنے لیڈروں کو چھپایا ہوا ہوگا جو آج جلسے میں تقریر کرنے والے ہیں۔“ فوجی نے کہا اور اپنے دوسرے ساتھی کو گھر کی تلاشی لینے کا اشارہ کیا خود وہ رائفل سے میمونہ اور اس کی بیٹی کے سامنے کھڑا تھا اور للچائی ہوئی نظروں سے ارم کی طرف دیکھ رہا تھا جس کے چہرے پر خوف طاری تھا۔

”میں نے بتایا کہ گھر میں ہم دونوں کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔“ میمونہ نے دوبارہ کہا۔

”تم مسلمان جھوٹ بولتے ہو...... پہلے فساد کرتے ہو اور پھر انجام سے بچنے کے لیے جھوٹ بولتے ہو۔“ اس فوجی نے حقارت سے کہا۔

”جھوٹے تم ہو۔“ میمونہ نے للکارنے والے انداز میں کہا اور اس فوجی نے رائفل کا بٹ اس کے سر پر دے مارا وہ توازن برقرار نہ رکھ سکی اور نیچے گرگئی ارم اسے سنبھالنے کے لیے زمین پر بیٹھ گئی تھی تبھی اس فوجی نے ارم کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی طرف گھسیٹا تھا۔

”ہم اسے لے جارہے ہیں...... اپنی بہن کو چھڑانے تو آئے گا نا......“ اس نے غصے سے کہا۔

”ماں!...... مجھے بچاؤ......“ ارم چلا رہی تھی اس کی ماں تیزی سے اٹھی اور فوجی کی طرف بڑھی تبھی دوسرے فوجی نے اسے دبوچ لیا تھا جو گھر کی تلاشی لے کر واپس آرہا تھا۔

”آرام سے...... آرام سے...... اتنی بھی کیا جلدی ہے...... تم لوگوں نے بھی ہمارا جینا حرام کردیا ہے تمہارے اتنے اتنے سے بچے گاڑیوں پر پتھر مارتے ہیں ہمارے فوجیوں کو زخمی کرتے ہیں اب ہماری باری ہے...... کل تمہاری بیٹی کو دے جائیں گے۔“ اس کے لہجے میں ہوس جھلک رہی تھی اور نظریں بے غیرتی سے ارم کے ننگے سر اور جسم کا محاصرہ کیے ہوئے تھیں خود کو چھڑانے کی جدوجہد میں اس کا دوپٹہ سر سے ڈھلک کر نیچے گر گیا تھا اور دوسرا فوجی نے اسے گھسیٹتا ہوا باہر کی طرف لے جارہا تھا تب ہی مظفر وانی اپنے دونوں بچوں کے ساتھ گھر میں داخل ہوا۔

”یہ کیا ہورہا ہے؟“ اس نے چیخ کر کہا اور اس کے دونوں بچے صورت حال کا اندازہ لگا کر واپس بھاگتے ہوئے باہر چلے گئے۔

”چلو تم بھی آگئے...... اچھا ہے...... تم بتاؤ کہ تمہارا بیٹا برہان کہاں ہے؟“ فوجی نے پوچھا۔

”مجھے نہیں معلوم۔“ مظفر نے جواب دیا اور اپنی بیٹی کو چھڑانے کے لیے لپکا لیکن اس کے پیچھے موجود انڈین فوجی نے اس کے گھٹنے پر فائر کردیا اور وہ لڑکھڑاتا ہوا نیچے گر گیا اتنی دیر

میں میمونہ اٹھ کر اس فوجی کے پیروں سے لپٹ گئی تھی۔ جس نے ارم کو دبوچا ہوا تھا فوجی اس سے خود کو چھڑانے کی جدوجہد کرنے لگا اور ارم اس کی گرفت سے نکل کر دروازے سے باہر نکل گئی فوجی اس کے پیچھے لپکا تھا اور میمونہ اپنے زخمی شوہر کی طرف متوجہ ہوگئی تھی۔

باہر نکل کر ارم سڑک پر موجود مجمع میں گم ہوگئی تھی جہاں گاؤں کے لوگ جمع تھے اور انڈین فوجیوں کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔

"آزادی..... آزادی۔"

"لے کر رہیں گے آزادی۔"

"اپنی قوت اپنی جان۔"

"کشمیر بنے گا پاکستان۔"

لوگوں نے ہاتھوں میں پاکستان کے جھنڈے اٹھائے ہوئے تھے اور وہ کشمیر کی آزادی اور پاکستان کے حق میں نعرے لگا رہے تھے فوجی مظفر کے گھر سے نکل کر دوسرے گھروں کی طرف بڑھ گئے تھے لیکن اب ان کا سرچ آپریشن کمزور پڑ گیا تھا کیونکہ آبادی کے سارے لوگ سڑکوں پر آ گئے تھے اور نوجوان لڑکے اور بچے ہاتھوں میں پتھر لیے انڈین فوجیوں کا تعاقب کر رہے تھے۔

مجمع کے لوگ اسی انداز سے آگے بڑھتے ہوئے جلسہ گاہ کی طرف بڑھ رہے تھے لیکن پھر جلسہ شروع ہونے سے پہلے ہی انڈین سیکورٹی فورسز نے لوگوں کو پکڑ پکڑ کر اپنی گاڑیوں میں ڈالنا شروع کر دیا تھا ہر طرف افراتفری پھیل گئی تھی پولیس اور فوج کی فائرنگ سے کئی نہتے کشمیری زخمی ہو گئے تھے اس شام انڈین ٹی وی چینل سے اعلان کیا گیا تھا کہ کشمیر میں کرفیو لگا دیا گیا ہے اور لوگوں کو گھروں میں رہنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

…… …… ……

جنوبی کشمیر کے پہاڑی سلسلوں میں سرسبز پہاڑیوں کے درمیان ایک کچا راستہ موجود تھا یہ پگڈنڈی نما راستہ لوگوں اور جانوروں کی آمد و رفت کی وجہ سے قدرتی طور پر بن گیا تھا اس کے دونوں طرف بڑے بڑے پہاڑی پتھروں کی قطاریں تھیں جو مقامی لوگوں ہی نے بنائی تھیں اس راستے کے دونوں اطراف چناروں کے عمر رسیدہ لمبے لمبے درخت سر اٹھائے کھڑے تھے۔

کشمیر کے ان دور دراز اور نسبتاً ویران علاقوں میں مجاہدین کے کیمپ تھے جہاں ان کی عارضی پناہ گاہیں تھیں وہ اکثر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہتے تھے ابھی صبح کا وقت تھا اور حزب المجاہدین کا ایک دستہ اس کچی پگڈنڈی سے مارچ کرتا گزر رہا تھا ان کا انداز بالکل کمانڈو جیسا تھا وہ سب وردیوں میں ملبوس تھے ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں اور چہروں پر کالی نقاب جیسے ماسک تھے اس دستے کے آگے آگے ان کا لیڈر انہیں کے انداز میں مارچ کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا یہ ان کا روزانہ کا معمول تھا یہ مارچ ان کی تربیت کا حصہ تھا اس دستے میں برہان وانی اور اس کے قریبی دوست میں موجود تھے۔

دستہ آگے جا کر ایک اینٹوں سے بنے شیلٹر کے قریب رک گیا تھا یہ شیلٹر اس طرح بنایا گیا تھا کہ دور سے یا اوپر سے دیکھنے پر یہ پہاڑی پتھروں کا ایک ڈھیر محسوس ہوتا تھا لیکن اس میں کئی جگہوں پر سوراخ بنے تھے جو اندر سے باہر کا جائزہ لینے یا دشمن سے مقابلہ کرنے کے لیے استعمال ہوتے تھے اور وقت آنے پر اس کو ایک بنکر کے طور پر بھی استعمال کیا جا سکتا تھا۔

شیلٹر کے قریب پہنچنے کے بعد وہ دستہ ٹھہر گیا تھا اور پہلے موجود دوسرے دستوں کے ساتھ مل کر قطاریں بنالی گئی تھیں چند لمحے بعد اس شیلٹر میں سے ایک شخص مجاہدین کی وردی میں ملبوس برآمد ہوا تھا اور ان دستوں کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ فضا اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھی تھی اس کے دستوں کی پہلی قطار سے ایک مجاہد سامنے آیا تھا اس نے قرآنی آیات کی تلاوت کی تھی اس کا ترجمہ پیش کیا تھا اور پھر اپنی جگہ واپس چلا گیا تھا۔

"میرے جانباز مجاہدو!" سامنے کھڑے ان کے لیڈر نے انہیں مخاطب کیا۔

"اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں دشمن کے سامنے سرخرو کیا ہے کل کے واقعے میں انڈین سیکورٹی فورسز نے جن بے گناہ کشمیریوں کو گرفتار کیا تھا ہم نے انہیں سیکورٹی فورسز کے کیمپوں سے رہا کروالیا ہے۔"

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد
نمرہ احمد
فرحت اشتیاق
قُدسیہ بانو
نگہت سیما
نگہت عبدُاللہ
رضیہ بٹ
رفعت سراج

صائمہ اکرام
سعدیہ عابد
عفت سحر طاہر
تنزیلہ ریاض
فائزہ افتخار
سباس گُل
رُخسانہ نگار عدنان
اُمِ مریم

عُشنا کوثر سردار
نبیلہ عزیز
فائزہ افتخار
نبیلہ ابر راجہ
آمنہ ریاض
عنیزہ سید
اقراء صغیر احمد
نایاب جیلانی

اشفاق احمد
نسیم حجازی
عنایت اللہ التمش
ہاشم ندیم
مُمتاز مُفتی
مُستنصر حُسین
علیمُ الحق
ایماء راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

لیڈر سانس لینے کے لیے رکا تو فضا ”اللہ اکبر“ اور ”آزادی آزادی“ کے نعروں سے گونج اٹھی مجاہدوں کا جوش دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔

”آئندہ بھی ہماری کوشش ہوگی کہ ہم کسی بھی انسانی جان کا نقصان کئے بغیر اپنی جدوجہد جاری رکھیں آپ سب مجاہدین سے میری ایک درخواست ہے کہ آپ کے لیے جو اصول وضوابط بنا دیے گئے ہیں آپ ان پر عمل کریں دشمن پر بھی اس وقت وار کرنا ہے جب آپ کے لیے ناگزیر ہو میری دعا ہے اللہ تعالیٰ ہمارا حامی و ناصر ہو اور ہمیں قدم قدم پر جدوجہد آزادی کے عمل میں کامیابی نصیب ہو۔“

تقریر مکمل کر کے کمانڈو پیچھے ہٹ گیا تھا مجاہدین ایک بار پھر نعرے لگا رہے تھے اور پھر مختلف ٹکڑیوں میں بٹ کر منتشر ہوگئے تھے برہان بھی اپنے دو ساتھیوں سرتاج احمد اور پرویز ہاشمی کے ساتھ پتھروں سے بنے ایک شیلٹر میں چلا گیا تھا۔

”اللہ کا شکر ہے کہ تمام کشمیری آزاد کروا لیے گئے ہیں اور وہ اپنے اپنے گھروں پر پہنچ گئے ہیں۔“ برہان وانی نے ایک ہموار بڑے سے پتھر پر بیٹھتے ہوئے کہا جو اس شیلٹر میں رکھا ہوا تھا اور جسے وہ لوگ بینچ کے طور پر استعمال کرتے تھے ایک کونے میں ایک چٹائی بھی بچھی ہوئی تھی جسے ضرورت پڑنے پر کھانا کھانے، سونے یا بیٹھنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا اس شیلٹر میں ایک سمت ایک میز پر کمپیوٹر بھی موجود تھا یہ سہولت کسی اور شیلٹر میں نہیں تھی یہ برہان اور اس کے ساتھیوں کا شوق تھا وہ اپنے فارغ وقت میں اس کمپیوٹر کے ذریعے بیرونی دنیا سے رابطے میں رہتا تھا اس پر مختلف چینلز دیکھ کر تمام تازہ خبروں سے باخبر رہتا تھا اور اس نے پہلی بار کشمیر کی جدوجہد آزادی کو ایک نئے رنگ میں دنیا کے سامنے پیش کیا تھا پاکستان کے قیام سے لے کر اب تک دنیا نے انڈین میڈیا کی خبریں ہی سنی تھیں جن میں وہ کشمیر کے بارے میں اپنا موقف سامنے رکھتے ہوئے اظہار خیال کرتا رہتا تھا لیکن کشمیری عوام کی آواز دنیا تک پہنچانے والا کوئی نہیں تھا۔ برہان نے یہ کام شروع کیا کہ وہ اپنی اور اپنے مجاہدین کی سرگرمیوں کی ویڈیو بنا کر انٹرنیٹ پر اپ لوڈ کرتا تھا اور دنیا کو انڈین فورسز کا اصل چہرہ دکھاتا تھا وہ خود کو بھی ہائی لائٹ کرتا تھا جس کی وجہ سے اسے خاصی مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔

”کیا خیال ہے برہان رات تم نے کشمیریوں کی رہائی کی جو ویڈیو بنائی ہے وہ بھی انٹرنیٹ میڈیا پر اپ لوڈ کرو گے؟“ اس کے ساتھی پرویز ہاشمی نے پوچھا وہ پرسکون انداز میں چٹائی پر نیم دراز ہوگیا تھا۔

”ہاں، بس ابھی یہی کام کرنا ہے۔“ برہان نے کہا۔

”برہان! سوشل میڈیا پر تم جو ویڈیو لگا رہے ہو ان میں احتیاط کرو یہ ویڈیوز عوام تک رسائی کا بہترین ذریعہ تو ہے لیکن تمہیں شہرت حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ بہت زیادہ خطرہ بھی لاحق ہوگیا ہے۔“ سرتاج نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

”تم ٹھیک کہتے ہو لیکن یہ بھی میرے جہاد کا ایک حصہ ہے میں چاہتا ہوں کہ ہتھیاروں سے لڑائی کے ساتھ ساتھ ہمیں سوشل میڈیا کو بھی اپنے حق میں استعمال کرنا چاہیے جیسا کہ بھارت بہت عرصے سے کر رہا ہے۔“ برہان نے جواب دیا۔

”ہاں! لیکن اب تمہیں بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے کیونکہ تم انڈین آرمی کی نظر میں آچکے ہو تمہارے پوسٹر جگہ جگہ لگا دیے گئے ہیں اور تمہارے لیے انڈین گورنمنٹ نے بھاری انعام رکھا ہوا ہے۔“ پرویز نے فکرمندی سے کہا۔

”اللہ حفاظت کرنے والا ہے میری کوئی بری نیت نہیں ہے اپنے کشمیری بھائیوں کے لیے آزادی کی جدوجہد اپنے انداز میں کر رہا ہوں اگر ایسا کرتے ہوئے خطروں کا سامنا کرنا پڑتا ہے یا موت واقع ہو جاتی ہے تو اس کی مجھے پروا نہیں یہ میری زندگی کا مقصد ہے کہ میں مسلسل کشمیر کی آزادی کے لیے جدوجہد کروں۔“ برہان نے پرعزم انداز میں کہا۔

”ہمارا بھی مقصد یہی ہے۔“ پرویز نے کہا پھر چونک کر برہان کی طرف دیکھا۔

”برہان! ہم سب مجاہدین جو کشمیر کی آزادی کی جدوجہد کر رہے ہیں ان کے پیچھے کوئی نہ کوئی ایسا واقعہ ہے جس نے انہیں کشمیری جدوجہد آزادی کا حصہ بننے پر مجبور کیا تم نے یہ فیصلہ

کن حالات میں کیا جب کہ تمہارے والدین بوڑھے ہو چکے ہیں ایک جوان بہن اور دو چھوٹے بھائی موجود ہیں جنہیں کسی مضبوط سہارے کی ضرورت اور تمہارا بڑا بھائی شہید ہو چکا ہے تو تمہارے گھر والوں کو تمہاری زیادہ ضرورت ہے؟" پرویز نے پوچھا۔

"میں بھی پہلے اسی طرح سوچتا تھا۔" برہان نے کہا

"پھر......؟ پھر تمہاری سوچ کیسے بدل گئی؟" سرتاج نے پوچھا۔

"2010 میں میرا بڑا بھائی خالد وانی شہید کر دیا گیا اسے اور مجھے ایسے ہی ایک احتجاجی جلسے سے گرفتار کیا گیا تھا جیسے کہ کل ایک احتجاجی جلسے سے کچھ کشمیروں کو گرفتار کیا گیا جنہیں ہم نے رہا کرایا۔ ہمیں گرفتار کرنے کے بعد انڈین آرمی نے ہم سے مختلف سوالات کیے وہ ہم سے کشمیر میں ہونے والے مختلف تشدد کے واقعات کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہے تھے لیکن انہوں نے ہمارا یقین نہیں کیا پھر ان کی قید کے دوران ہی ان کے تشدد سے میرا بھائی خالد ہلاک ہو گیا اور انہوں نے مجھے تشدد ہی سے ادھ موا کر کے میرے گھر کے قریب ایک سڑک پر لا پھینکا وہ اس دوران میرے والدین کو بھی ہراساں کرتے رہے اور اب تک جب بھی کوئی ناخوش گوار واقعہ ہوتا ہے تو دوسرے کشمیری مجاہدین کی طرح میرا گھر بھی ان کی فہرست میں پہلے نمبر پر ہے وہ ہمارے گھروں میں پہلے چھاپے مارتے ہیں اور ہمارے گھروں کے افراد پر ظلم کرتے ہیں کل بھی انہوں نے میری والدہ اور بہن کے ساتھ زیادتی کی ہے اور میرے والد کے گھٹنے پر گولی ماری ہے۔" برہان نے کہا۔

"ہاں! یہ تو ہم مجاہدین کا مقدر بن گیا ہے کہ ساری جدوجہد کی سزا ہمارے گھر والے بھگتتے ہیں۔" پرویز نے کہا۔

"بس میرے دل میں جہاد کا جذبہ شروع ہی سے تھا میں بچپن سے انہی جنگلوں میں ہاتھ میں درختوں کی ٹہنیاں لیے فرضی جہاد کا کھیل اپنے دوستوں کے ساتھ کھیلتا تھا جو آج حقیقت میں تبدیل ہو گیا ہے میرے والد نے اپنے ہی اسکول میں مجھے تعلیم حاصل کرنے پر لگا دیا تھا میں نے میٹرک کیا پھر آگے تعلیم حاصل کی۔ کمپیوٹر میرا شوق تھا چنانچہ اس طرف نکل گیا چنانچہ ایک مجاہد بننے میں میرا شوق انڈین افواج کا تشدد اور جذبہ جہاد شامل ہے۔" برہان نے کہا اور سرتاج کی طرف دیکھنے لگا جو کچھ سوچ رہا تھا۔

"تم بتاؤ سرتاج! تم نے بھی تو آٹھویں کلاس سے تعلیم چھوڑ کر رضا کارانہ طور پر مجاہدین کی تنظیم میں شمولیت اختیار کی تھی؟" برہان نے پوچھا۔

"ہاں! برہان میں اس وقت پندرہ سال کا تھا جب آٹھویں کلاس سے اسکول چھوڑ دیا اور محنت مزدوری شروع کر دی میرے علاقے میں جو اسکول تھا وہ آٹھویں تک تھا میرے گھر کے حالات اچھے نہیں تھے چنانچہ آگے تعلیم حاصل کرنے کے بجائے میں نے سڑکوں پر سیمنٹ لادنے کی مزدوری کر لیتا تھا اس طرح میں نے بیس ہزار روپے جمع کر لیے جو میرے لیے ایک بڑی رقم تھی اور یہ رقم میں نے اپنے علاقے میں تعمیر ہونے والی ایک مسجد کو عطیہ کر دی۔" سرتاج نے کہا۔

"پھر تم جہادی تنظیم میں کیسے آئے؟" برہان نے پوچھا۔

"مذہب سے لگاؤ اور انڈین فوج کا مسلمان کشمیریوں پر ظلم اس کی وجہ بنے' میں کشمیر میں ہونے والے انڈین فوج کے ظلم و تشدد سے پریشان اور فکر مند تھا کہ میری ملاقات عادل شیخ سے ہو گئی وہ حزب المجاہدین میں ایک رضا کار تھا اور سیمنٹ کی ایک کمپنی سے وابستہ تھا میں ٹرکوں پر سیمنٹ لوڈ کرتا تھا وہیں میری اس سے ملاقات ہوئی اور اس کے ذریعے میں حزب المجاہدین میں شامل ہوا میرا اور اس کا ساتھ بہت کم عرصے رہا کیونکہ وہ انڈین آرمی سے ہونے والی ایک جھڑپ کے دوران شہید ہو گیا۔" سرتاج نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

"اور پرویز تم؟ تمہاری کیا کہانی ہے؟" برہان نے پوچھا۔

"میری کہانی بہت مختصر ہے میں اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا میرے والدین ایک حادثے میں ہلاک ہو گئے تھے میں تنہا زندگی گزار رہا تھا اپنے رشتہ داروں کے ساتھ میں نے محسوس کیا

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

کہ میں ان پر بوجھ ہوں دل میں مذہب سے محبت اور جہاد کا شوق تھا تو میں نے اپنی بے مقصد زندگی کو ایک مقصد دے دیا اور حزب المجاہدین میں شمولیت کر لی اب میں خوش ہوں۔“ پرویز نے کہا۔

ان باتوں کے دوران برہان نے رات کو کشمیریوں کی رہائی پر جو ویڈیو بنائی تھی وہ انٹرنیٹ سوشل میڈیا پر شیئر کردی تھی۔

”لو دیکھو میں نے ویڈیو اپ لوڈ کردی ہے۔“ برہان نے اپنا موبائل پرویز کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”حیرت کی بات ہے برہان کہ کشمیریوں کو آزاد کروانے میں عام لوگوں نے بھی ہمارا ساتھ دیا۔“ پرویز نے کہا۔

”ویسے اس ویڈیو میں ہماری پوری کارروائی دکھائی گئی ہے کہ ہم نے کس طرح کشمیریوں کو چھڑوایا اور اس کی مدد سے انڈینز کو ہمارا کارروائی کا طریقہ پتہ چل جائے گا اور آئندہ وہ ان معلومات کو ہمارے خلاف استعمال کریں گے۔“ سرتاج نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

”یہ ممکن ہی نہیں ہے، ہم اپنا طریقہ کار بدلتے رہتے ہیں۔“ برہان نے جواب دیا۔

”انڈین آرمی ہمیں نشانہ بنانے میں کئی بار ناکام ہو چکی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ عوام ہمارے ساتھ ہیں۔“ پرویز نے کہا۔

”ہاں کیونکہ ہم کشمیر کے عام آدمی کی لڑائی لڑ رہے ہیں۔“ برہان نے جواب دیا۔

برہان کی ویڈیو میڈیا پر نشر ہونے کے ساتھ ساتھ ہر طرف کھلبلی سی مچ گئی تھی۔ خاص طور سے انڈین ٹی وی چینلز نے اسے بہت اہمیت دی تھی اور بار بار دکھایا تھا پھر اس ویڈیو پر مختلف سیاسی اور حکومتی شخصیات کے تاثرات میں پیش کیے تھے اور برہان اور اس کے ساتھی خوش تھے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

* * *

”برہان! تمہارا آئیڈیا زبردست ہے دیکھو بھارتی حکومت کشمیر میں بین الاقوامی میڈیا کو بھی آنے کی اجازت نہیں دیتی ہے اور یہاں جو بھی کارروائی ہوتی ہے وہ اسے اپنے نقطہ نظر کے حساب سے نشر کرتی ہے ہم کشمیریوں کی فریاد کوئی بھی نہیں سنتا لیکن اب انٹرنیشنل میڈیا پر بھی انٹرنیٹ کے ذریعے ہماری آواز پہنچ رہی ہے اور دنیا کو ہماری مشکلات اور مسائل کا پتہ چل رہا ہے اب انشاءاللہ ضرور ہمارے مقصد کو فتح نصیب ہو گی۔“ سرتاج نے برہان سے کہا۔

”ہاں! اب کل میں ایک اور ویڈیو اپ لوڈ کروں گا۔“ برہان نے کہا۔

”اب کونسی ویڈیو اپ لوڈ کرو گے؟“ پرویز نے پوچھا۔

”وہ ایک پیغام ہوگا انڈین حکومت کے لیے اور سکھ یاتریوں کے لیے جو ہمارے علاقے میں اپنی مذہبی رسومات ادا کرنے آتے ہیں۔“ برہان نے جواب دیا۔

”لیکن برہان اس میں خطرہ بھی ہو سکتا ہے وہ تمہاری آئی ڈی سے تمہاری لوکیشن معلوم کرلیں گے اور تم تک پہنچ جائیں گے۔“ سرتاج نے بتایا۔

”میں جانتا ہوں مگر یہ ویڈیو میں ایک نئے اکاؤنٹ اور نئی لوکیشن سے اپ لوڈ کروں گا۔“ برہان کے جواب دیا۔

”تم نے سوچا تو خوب ہے برہان جسے حالات اور دشمن کا سامنا ہو اس سے اس ہی کے معیار پر جا کر لڑنا پڑتا ہے انڈین حکومت کے پاس سارا میڈیا ہے وہ اپنا موقف پوری دنیا کے سامنے کھل کر بیان کرتے ہیں لیکن ہمارے مسائل اور ہمارے حقوق کے بارے میں کوئی بھی نہیں جانتا۔“ پرویز نے کہا اس وقت ایک مجاہد خیمے میں داخل ہوا۔

”برہان! تمہیں کمانڈو عاطف نے بلایا ہے۔“ اس نے کہا تو برہان فوراً کھڑا ہو گیا۔

”چلو۔“ اس نے آگے بڑھتے ہوئے کہا آنے والا مجاہد بھی اس کے ساتھ ہی شیلٹر سے نکل گیا تھا۔

برہان دوسرے شیلٹر میں کمانڈو عاطف کے سامنے کھڑا تھا اور کمانڈو بغور اس کا جائزہ لے رہا تھا اسے برہان کی بہادری پر ناز تھا لیکن وہ ہمیشہ اسے محتاط رہنے کی ہدایت کرتا تھا۔

”برہان! تم نے کشمیریوں کی رہائی کی جو ویڈیو انٹرنیٹ پر ڈالی ہے وہ زبردست ہے پہلے میں نے تمہیں اس کام سے منع کیا تھا لیکن میرے خیال میں اپنی بات دنیا تک پہنچانے کے

لیے یہ طریقہ بہترین ہے میں نے ابھی ویڈیو دیکھی ہے ساتھ ہی انڈین میڈیا میں ہلچل مچ گئی ہے وہ گھبرا گئے ہیں میرا خیال ہے کہ تم اور تمہارے چند ساتھی مل کر مجاہدین کے لیے اس شعبے میں مزید کام کرو۔"

"جی کمانڈر میں کل ایک اور ویڈیو اپ لوڈ کروں گا۔"

"کونسی؟"

"وہ بھارتی گورنمنٹ اور سکھ یاتریوں کے لیے ہوگی جس میں سکھ یاتریوں کو اپنی مذہبی رسومات کشمیر میں آ کر ادا کرنے کی کھلے دل سے اجازت دوں گا تاکہ ساری دنیا کو پتہ چلے کہ ہم مذہب یا انسانیت کے دشمن نہیں ہیں بلکہ بھارت سے صرف اپنے انسانی حقوق مانگتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے......اب چونکہ بحیثیت کمانڈر میں تمہیں اس کام کو باقاعدہ کرنے کی اجازت دے رہا ہوں چنانچہ تم کوئی بھی ویڈیو اپ لوڈ کرنے سے پہلے مجھے دکھاؤ گے اور مجھ سے اس کے بارے میں تفصیل سے بات کرو گے اس سے ہماری جدوجہد آزادی میں تیزی آئے گی اور دشمن پریشان ہوجائے گا اور ہمارے ملکی اور غیر ملکی ساتھیوں کو بھی کشمیر کی صحیح صورت حال کا اندازہ ہوگا۔"

تم چند مجاہدین کا گروپ بنالو جو اس کام سے واقف ہو اور تمہاری مدد کرسکیں تم اس گروپ کے کمانڈر ہو گے مجھے امید ہے کہ تم محتاط طریقے سے کام کرو گے۔"

"اوکے کمانڈر۔" برہان نے کہا۔

"بیسٹ آف لک۔" کمانڈر نے کہا اور برہان وہاں سے رخصت ہوگیا۔ واپس اپنے شیلٹر میں آ کر برہان نے اپنے ساتھیوں کو خوش خبری سنائی تھی اور سرتاج اور پرویز کو بھی اس کام میں شامل کرلیا تھا اس نے تین اور مجاہدین کے نام بھی منتخب کیے تھے اور چھ مجاہدین کا یہ گروپ برہان کی سربراہی میں کام کرنے لگا تھا۔

برہان اور اس کے گروپ کے مجاہدین کشمیر کے جنوبی پہاڑی سلسلے میں ایک مخصوص علاقے میں ہی کارروائیاں کرتے تھے یہ علاقہ 135 کلومیٹر اور 32 کلومیٹر چوڑا تھا اور جنوبی کشمیر کے چار ڈسٹرکٹ پر مشتمل تھا اور انہیں یہاں کے

آپ دنیا کے کسی بھی خطے میں مقیم ہوں
ماہنامہ
نئے اُفق
کراچی
ہم بروقت ہر ماہ آپ کی دہلیز پر فراہم کرینگے
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے ہر کونے میں 600 روپے
امریکا' کینیڈا' آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے
6000 روپے
میڈل ایسٹ' ایشیائی' افریقہ' یورپ کے لیے
5000 روپے
رقم ڈیمانڈ ڈرافٹ' منی آرڈر' منی گرام
ویسٹرن یونین کے ذریعے بھیجی جاسکتی ہیں۔
مقامی افراد دفتر میں نقد ادائیگی کرسکتے ہیں۔
رابطہ: طاہر احمد قریشی...... 0300-8264242
نئے اُفق گروپ آف پبلی کیشنز
کمرہ نمبر 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی۔
فون نمبرز: +922-35620771/2
aanchalpk.com
aanchalnovel.com
circulationngp@gmail.com

لوگوں کی حمایت حاصل تھی۔

جب اس نے اگلی ویڈیو اپ لوڈ کی تو وہ اپنے گروپ کا کمانڈر بن چکا تھا اس ویڈیو میں اس نے مجاہدین کی طرف سے کشمیر آنے والے امرناتھ یاتریوں کو یقین دلایا کہ ان پر مجاہدین کی طرف سے حملے نہیں کیے جائیں گے جب کہ اس نے Saicnik Colonies پر حملوں کی دھمکی دی کیونکہ اس کو یقین تھا کہ اس سے وادی میں اسرائیل کی پالیسی بدل جائے گی اس نے کشمیری پنڈتوں کے لیے الگ کالونی کی بھی مخالفت کی اس نے کہا کہ وہ چاہیں تو یہاں آسکتے ہیں لیکن اسرائیلی پالیسی یہاں نہیں چلے گی اس نے کہا کہ فوجیوں کے خلاف مزید حملے بھی کیے جائیں گے اور پولیس کو الگ رہنے کی ہدایت کی اس نے کشمیریوں کو مجاہدین میں شمولیت کی دعوت بھی دی جب کہ اس پر کسی حملے میں شرکت کا الزام نہیں ہے لیکن اس جدوجہد آزادی کا ماسٹر مائنڈ کہا جاتا ہے۔

* * *

مظفروانی کے سیدھے پیر کے گھٹنے پر پٹی بندھی ہوئی تھی وہ کمرے میں پلنگ پر لیٹا تھا اس کے سامنے کی دیوار کے قریب ٹی وی رکھا تھا کمرے میں ایک چٹائی بچھی تھی۔ جس پر ارم اور اس کے چھوٹے بھائی بیٹھے تھے اور میمونہ قریب رکھی ایک کرسی پر بیٹھی تھی انہوں نے ٹی وی سے نشر ہونے والی برہان کی ویڈیو ابھی دیکھی تھی اور اب خبریں سن رہے تھے ان خبروں میں بھی اس ویڈیو کا ذکر تھا اور مختلف لوگوں کی اس ویڈیو کے بارے میں آراء بتائی جارہی تھیں سب بہت غور سے خبریں سن رہے تھے۔

"برہان نے حال ہی میں فیس بک پر مجاہدین کے لباس میں اپنی تصویریں اپ لوڈ کرنا شروع کی تھیں اور اسے شہرت حاصل ہوگئی تھی وہ اسمارٹ ہے خوبصورت ہے وہ جلد ہی لوگوں میں مقبول ہوگیا اور اسے عوام میں پذیرائی حاصل ہوئی وہ ایک نوجوان مجاہد کے طور پر ابھر رہا ہے اور اس کا کہنا ہے کہ کشمیر میں مسلمانوں کی اکثریت ہے تو اسے پاکستان کا حصہ ہونا چاہئے عرف عام میں اسے دہشت گردوں کے پوسٹر بوائے سے تشبیہ دی جارہی ہے۔"

نیوز اینکر خبریں پڑھ رہا تھا اور سب ہمہ تن گوش تھے کہ اچانک دروازے پر زور زور سے دستک ہوئی میمونہ دوڑ کر دروازہ کھولنے گئی بچے سہم گئے چند ہی لمحوں بعد جب میمونہ کمرے میں داخل ہوئی تو دو بھارتی پولیس افسر اس کے ساتھ تھے جو گھر میں ادھر ادھر جائزہ لے رہے تھے۔

"ہمیں اطلاع ملی ہے کہ وہ ادھر ہی آیا ہے۔" ایک پولیس افسر نے کہا۔

"نہیں وہ یہاں نہیں ہے۔" میمونہ نے جواب دیا۔

"تو پھر کہاں ہے؟" پولیس والا غصے سے دہاڑا جب کہ دوسرے پولیس افسر نے مظفروانی کو بازوؤں سے پکڑ کر کھڑا کردیا تھا اور وہ زخم کی تکلیف سے کراہ رہا تھا۔

"تمہیں ہمارے ساتھ تھانے چلنا ہوگا۔" پولیس افسر نے کہا۔

"کیوں؟ ہمارا کیا قصور ہے؟" میمونہ چیخی۔

"تمہارا یہ قصور ہے کہ تم نے آتنک وادیوں کو جنم دیا ہے تمہارا بڑا بیٹا بھی دہشت گرد تھا اور چھوٹا بھی دہشت گرد ہے۔" پولیس افسر نے کہا۔

"یہ جھوٹ ہے۔" مظفروانی بولا۔

"تم تو چپ ہی رہو ابھی تمہیں سزا نہیں ملی......اب تمہارا وہ حشر کریں گے کہ تم سب سچ اگل دو گے۔"

"ہم اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔" مظفروانی نے کہا۔

"یہ سب تھانے میں جا کر کہنا۔" پولیس افسر نے کہا اور مظفروانی کو دھکے دیتا ہوا گھر سے باہر لے گیا میمونہ اور بچے چیختے رہ گئے تھے لیکن ان لوگوں نے ایک نہ سنی تھی۔

تھانے میں انسپکٹر ایک جلاد کی طرح کرسی پر براجمان تھا اس کے چہرے سے رعونت ٹپک رہی تھی اس کے دونوں طرف دو پولیس افسر الرٹ کھڑے تھے اور اس کے سامنے رکھی کرسیوں پر چند کشمیری مسلمان بیٹھے تھے جنہیں مظفروانی ہی کی طرح پکڑ کر وہاں لایا گیا تھا۔

"سیدھے کھڑے ہوجاؤ۔" انسپکٹر کے قریب کھڑے پولیس افسر نے مظفروانی سے چیخ کر کہا جو گھٹنے کے زخم کی

تکلیف کے باعث لڑکھڑا رہا تھا تو وہ سیدھے کھڑے ہونے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔

”بتاؤ تمہارا بیٹا برہان کہاں ہے؟ اس نے تو آج کل سوشل میڈیا پر اودھم مچا رکھا ہے۔“ انسپکٹر نے حقارت سے کہا۔

”میں نہیں جانتا انسپکٹر صاحب آپ کو پتہ ہے کہ وہ گھر پر نہیں ہوتا۔“

”ہاں اور ہمیں یہ بھی پتہ ہے کہ وہ کن لوگوں سے ملا ہوا ہے اس کا تعلق آتنک وادیوں سے ہے وہ آج کل سوشل میڈیا پر ناپسندیدہ ویڈیوز لگا رہا ہے۔“

”میرا بیٹا کشمیری مسلمانوں کی آزادی کی جنگ لڑ رہا ہے وہ مجاہد ہے اور اس کا کوئی بھی ایک ٹھکانہ نہیں۔“ مظفر وانی نے کہا۔

”ہاں وہ ٹھکانے بدلتا رہتا ہے ہر ویڈیو وہ ایک نئی لوکیشن سے اپ لوڈ کرتا ہے۔“ انسپکٹر نے کہا۔

”میں یہ سب نہیں جانتا لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اس نے آج تک کسی کی جان نہیں لی وہ بے قصور ہے۔“

”ہاں بے قصور ہے..... علاقے میں دہشت گردی کرتا ہے پولیس کو دھمکی دیتا ہے اور بے قصور ہے۔“

”آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔“ وانی نے کہا۔

”غلط فہمی؟ یہ جو تمہارے پانچ چھ ساتھی بیٹھے ہیں یہ بھی غلط فہمی کی بنا پر یہاں لائے گئے ہیں تم سب اپنے بیٹوں کو کشمیری آتنک وادیوں میں شامل کرنے بھیج دیتے ہو اور پھر معصوم بن کر کہتے ہو کہ تمہیں نہیں پتہ کہ وہ کہاں ہے۔“ انسپکٹر کی غصے کی کیفیت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور وہ میز پر ہاتھ مار مار کر بات کر رہا تھا۔

”جب تمہارے چھتر پڑیں گے تب سب یاد آ جائے گا۔“ اس نے چیخ کر کہا۔

”یہ مت سمجھنا کہ تمہارے یا تمہاری اولادوں کے ساتھ کوئی رعایت برتی جائے گی پھر تمہاری کھالیں کھینچ لیں گے اور وہ تمہارے بہادر آتنک وادی وہ بھی مارے جائیں گے ہم نے ان کے گرد گھیرا تنگ کر لیا ہے۔“

”اللہ ان کا حامی و ناصر ہو۔“ مظفر وانی نے کہا۔ ”اگر میرا بیٹا مارا گیا تو مرنے والا وہ پہلا فرد نہیں ہوگا اس سے پہلے بھی کشمیر کے لیے بہت سے بیٹوں نے جان دی ہے اگر وہ اپنے اپنے لوگوں کی عزت کی رکھوالی کرتے ہوئے مارا گیا تو وہ شہید ہوگا۔“ مظفر وانی نے کہا اور انسپکٹر جھنجلا کر کھڑا ہو گیا۔

”انہیں سب کو لاک اپ میں ڈالو دو دن میں سب بک دیں گے۔“ اس نے غصے سے کہا اور کمرے سے نکل گیا کمرے میں موجود دوسرے پولیس افسروں نے وہاں کے سارے کشمیریوں کو لاک اپ میں ڈال دیا تھا۔

……

دادسارہ کے گاؤں کے ایک چھوٹے سے گراؤنڈ میں لوگ دائرے کی شکل میں جمع تھے اور چند کشمیری بچے اس دائرے کے درمیان میں ایک کھیل میں مصروف تھے آج کل کشمیر میں یہ کھیل بہت مقبول ہو رہا تھا کشمیری بچوں میں سے کچھ انڈین فوجیوں کا روپ دھارتے اور ان میں سے ایک برہان وانی بن جاتا باقی اس کے ساتھی اور پھر وہ ایک فرضی لڑائی کا منظر پیش کرتے تھے جس میں انڈین فوجی طرح طرح سے برہان اور اس کے ساتھیوں پر حملے کرتے اور وہ پینترے بدل بدل کے دشمن کا ہر وار ناکام بنا دیتے تھے ایسے کھیلوں میں برہان کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی تھی اور برہان بننے والے بچے کو خاصی داد ملتی تھی اس وقت بھی ایسا ہی ایک کھیل پیش کیا جا رہا تھا بچوں کے ہاتھوں میں بندوقوں اور رائفلوں کی جگہ ڈنڈے اور لاٹھیاں تھیں اس مجمعے میں برہان بھی موجود تھا جو بھیس بدل کر وہاں آیا تھا وہ مقامی لباس میں تھا اس کے چہرے پر گھنی داڑھی تھی اس نے سر پر ایک چادر اوڑھی ہوئی تھی جس نے اسے پوری طرح سے ڈھانپ لیا تھا۔

”پاکستان۔“ وانی کا کریکٹر کرنے والے بچے نے نعرہ لگایا۔

”زندہ باد۔“ اس کے دوسرے ساتھیوں نے نعرے کا جواب دیا اور انڈین فوجیوں کے کردار کرنے والے بچوں نے فرضی فائرنگ شروع کر دی برہان کے کچھ ساتھی زمین پر یوں ڈھیر ہو گئے جیسے انہیں گولی لگی ہو اور انڈین فوجی بنے بچوں نے خوشی کا اظہار کیا اسی وقت برہان کا کردار کرنے والا بچہ

آگے آیا اور ایک کشمیری جہادی نغمہ گانے لگا۔

کرو تیار زادِ راہ سوئے فردوس اے ہمدم
ہے رستہ پرخطر پھر بھی سفر طے ہم کو کرنا ہے
جہاں سے اب تلک خونِ شہیداں کی مہک آئے
ہمیں پھر سے اسی پرخار گھاٹی سے گزرنا ہے
اٹھو دل میں جلانا ہے عزائم کے چراغوں کو
بس اب ہر ایک مسلم کو ہمیں بیدار کرنا ہے
جہاں سے اہلِ جنت کے بھی تھے قافلے گزرے
اس میں پھر سے عزیمت کی انہی راہوں پر چلنا ہے
اٹھو اہل بدر اہل احد کے چاہنے والو
علم اب سربلند اپنا لٹا کر جان کرنا ہے

بچہ زور زور سے جذبے کے ساتھ نغمہ پڑھ رہا تھا اور وہاں موجود لوگ داد دے رہے تھے برہان تعریفی نظروں سے بچوں کو دیکھ رہا تھا اسے امید ہو چلی تھی کہ کشمیر کا مستقبل تابناک ہے کیونکہ اب نسل در نسل اس کے جیالوں میں آزادی کا جذبہ منتقل ہوتا چلا آرہا ہے وہ خاموشی سے وہاں سے ہٹ گیا تھا اس کے دو ساتھی سرتاج اور پرویز بھی اسی کی طرح بھیس بدلے ہوئے کچھ فاصلے پر کھڑے تھے برہان آج وادی میں ایک شخص شیخ طاہر سے ملنے آیا تھا ملنے کا تو محض بہانہ تھا دراصل وہ اسے ایک چھوٹا سا سبق دینا چاہتا تھا شیخ طاہر انڈین آرمی کا مخبر تھا اور برہان کو ایک دوست کی حیثیت سے بلا کر اس کا سمجھوتہ انڈین حکام سے کروانا چاہتا تھا لیکن یہ اس کی چال تھی جسے برہان سمجھ گیا تھا اس نے ایک ترکیب سوچی تھی اور سرتاج کے قریب جا کر سرگوشی کی تھی۔

"سرتاج تم خود مت جانا گاؤں کے کسی بچے سے کہو کہ شیخ طاہر کو جا کر بتائے کہ برہان دریائے جہلم میں لائف بوائے سے نہا رہا ہے وہاں جا کر اس سے مل لے یہ پیغام میرے نام سے ہی دیا جائے۔" برہان نے کہا تو سرتاج اثباتِ میں سر ہلاتا ہوا وہاں سے روانہ ہو گیا تھا۔ اور برہان وہاں سے پرویز کے ساتھ سداد کے ایک گھر کی طرف روانہ ہو گیا تھا جہاں اسے اپنی جان سے پیاری ایک ہستی سے ملنا تھا وہ گلناز تھی جو اس کے بچپن کی ساتھی تھی اس کے ساتھ بچپن گزارا تھا بے انتہا خوبصورت بہادر اور تعلیمی زیور سے آراستہ وہ ایک مقامی اسکول میں پڑھاتی تھی جب برہان اس کے گھر میں داخل ہوا تو وہ کوئی کتاب پڑھنے میں مشغول تھی۔

"اوہ برہان تم...... یوں اچانک؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں میں اپنے والد کو دیکھنے آیا تھا ان کے گھٹنے میں بھارتی فوجی نے گولی ماردی ہے اور اب پولیس کی حراست میں ہیں وہ انہیں گھر سے اٹھا کر لے گئے ہیں صرف یہ پوچھ گچھ کرنے کے لیے کہ میں کہاں ہوں وہ ان سے میرا ٹھکانہ پوچھنا چاہتے ہیں جب کہ وہ میرے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔"

"میرے لائق کوئی کام ہو تو بتاؤ۔" گلناز نے کہا وہ بچپن ہی سے اسے پیار سے ہانی کہتی تھی۔

"بس تم سے ملنے کو جی چاہ رہا تھا تو میں تم سے ملنے آ گیا تمہاری امی کہاں ہیں؟" برہان نے پوچھا۔

"وہ پڑوس میں گئی ہیں برابر کے گھر سے بھی ایک بچے کو بھارتی فوجی اٹھا کر لے گئے ہیں کہتے ہیں کہ اس کا تعلق دہشت گردوں سے ہے۔"

"یہ ہر مسلمان کو یہی کہتے ہیں اور اتنا تشدد کرتے ہیں کہ لوگ ان کے ظلم سے تنگ آ کر غلط قدم اٹھا بیٹھتے ہیں۔" برہان نے کہا۔

"برہان کیا تمہیں کبھی میری یاد نہیں آئی؟ کیا تم نے سوچا کہ ہماری کہانی کا انجام کیا ہوگا؟" گلناز نے پوچھا۔

"تم جانتی ہو گلناز کہ میں تمہیں پسند کرتا ہوں تمہاری ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھتا ہوں لیکن کشمیر کا جہاد میرے لیے زیادہ اہمیت رکھتا ہے میرا ملک آزاد ہو جائے تو پھر اپنی ذاتی خوشیوں کی طرف سے بھی دیکھوں گا۔"

"میں تمہارا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں جہادی تنظیموں میں خواتین بھی تو ہیں۔" گلناز نے کہا۔

"ہاں میں جانتا ہوں لیکن ابھی نہیں...... وقت آنے پر دیکھا جائے گا۔"

"تم ہمیشہ یہی کہہ کر بات کاٹ دیتے ہو۔"

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

”میں کیا کروں گلناز...... تم جانتی ہو میں خود بھی جنگ کو پسند نہیں کرتا چنانچہ میں نے بھی لڑنے کا اپنا طریقہ ایجاد کیا ہے میں دشمن سے اس کے طریقے سے ہی لڑ رہا ہوں میں نے سوشل میڈیا کو ہتھیار بنایا ہے۔“ برہان نے کہا۔

”اللہ تعالیٰ تمہیں اس نیک مقصد میں کامیاب کرے۔“ گلناز نے کہا کچھ دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی تھی اور سرتاج نے آ کر بتایا تھا کہ اس نے شیخ طاہر کو برہان کا پیغام پہنچا دیا تھا اور دریائے جہلم پر جس جگہ برہان نے بتایا تھا لائف بوائے صابن کی درجن بھر ٹکیاں ڈال کر آ گیا تھا یہ برہان کا شیخ طاہر کے ساتھ ایک مذاق تھا اس سے برہان ان کے چنگل میں پھنسنے سے بھی بچ گیا تھا اور انہیں یہ احساس بھی دلا دیا تھا کہ ان کے آس پاس ہی موجود ہے وہ جب چاہے وہاں آ سکتا ہے اور جب چاہے جا سکتا ہے۔“

”پھر کب آؤ گے ہانی!“ گلناز نے برہان کے رخصت ہوتے وقت اس سے پوچھا۔

”کچھ نہیں کہہ سکتا ہم پر بلاوجہ آبادی میں آنے جانے پر پابندی ہے پھر کوئی موقع ملا تو ضرور آؤں گا اپنا خیال رکھنا۔“ برہان نے اسے پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں جانتی ہوں ہانی سوشل میڈیا پر تم بہت مقبول ہو اور ہزاروں کشمیری لڑکیوں کے دل کی دھڑکن ہو وہ تمہارے حسن اور تمہاری بہادری سے بہت متاثر ہیں تمہارے نام کو اپنے خون سے اپنی کلائیوں پر لکھتی ہیں وہ تمہیں پانے کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہیں حسین ہیں دولت مند ہیں اور میں...... میں تو۔“ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے برہان نے جلدی سے اپنا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔

”ایسی باتیں مت کرو گلناز تم جانتی ہو میں کتنے مضبوط ارادے کا مالک ہوں میں وقتی تبدیلیوں سے متاثر نہیں ہوتا میرے دل میں تمہارے علاوہ کبھی کسی اور کا خیال نہیں آیا اور نہ آئے گا۔“

”اللہ تمہارا مددگار ہو۔“ گلناز نے اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔

”گلناز سے رخصت ہونے کے بعد برہان نے اپنے ساتھیوں سرتاج اور پرویز کو کچھ ہدایات دی تھیں جو کشمیریوں کی رہائی کے لیے تھیں جنہیں کشمیری پولیس نے پوچھ گچھ کے لیے تھانے میں بند کیا ہوا تھا اور خود واپس اپنے پہاڑی مورچوں کی طرف چلا گیا تھا اس شام مجاہدین کی پولیس سے جھڑپ ہوئی تھی دو پولیس والے اور تین مجاہدین مارے گئے تھے اور حکومت کی طرف سے یہ خبر نشر کی گئی تھی کہ برہان وانی اپنے ساتھیوں کے ساتھ مارا گیا جب کہ برہان اپنے ٹریننگ کیمپ میں موجود تھا اس خبر کے نشر ہونے کے فوراً بعد برہان نے سوشل میڈیا پر ایک ویڈیو لگائی تھی جس میں وہ ایک الاؤ روشن کیے اس کے گرد اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھا خوش گپیوں میں مصروف تھا 6 منٹ کی اس ویڈیو میں اسے اپنے ساتھیوں کے ساتھ کرکٹ کھیلتے اور ٹریننگ لیتے بھی دکھایا گیا تھا اس کے آخر میں برہان وانی کا بیان تھا جس میں اس نے انڈین فورسز کو تنبیہ کی تھی۔

”تمام وردی والے ہمارے نشانے پر ہیں ہم نے کہا تھا کہ ہمارے خلاف کارروائی نہ کریں لیکن وہ کر رہے ہیں اور ہمارے ساتھیوں کو نشانہ بنا رہے ہیں چنانچہ اب جو بھی ایسا کرے گا تو اس کے خلاف کارروائی ہو گی اگر انہیں اپنی جان پیاری ہے تو اپنی ڈیوٹی اپنے کیمپوں میں کریں سڑکوں پر نہ آئیں اور نہ ہی عوام کو پریشان کریں ورنہ ان کے ساتھ جو ہو گا اس کی ذمہ داری ان پر ہی ہو گی۔“

اس واقعے کے بعد مجاہدین کی طرف سے کئی بار انڈین آرمی پر حملے کیے گئے ہر بار کے حملوں میں برہان کا نام سر فہرست ہوتا تھا پھر آرمی نے اس کے ساتھیوں کو نشانہ بنانا شروع کر دیا ان کے دوستوں کو بھی چیک کیا جا رہا تھا ان کی نگرانی ہو رہی تھی اور ان کے گرد گھیرا تنگ کیا جا رہا تھا برہان نے اپنا علاقہ چھوڑ کر کوکرناگ میں نیا ٹھکانہ بنا لیا اور وہاں سے کارروائیاں کرنے لگا وہ ہر بار بچ جاتا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ کشمیر کے عوام اس کے ساتھ تھے اور وہ اسے موقع سے فرار کرنے میں اس کا ساتھ دیتے تھے وہ کارروائی کر کے بڑے آرام سے وہاں سے غائب ہو جاتا تھا اور پھر سوشل میڈیا پر اس

واقعے سے متعلق ویڈیو بھی اپ لوڈ کردیتا تھا جس سے انڈین حکومت بھی پریشان تھی بائیس سال کا یہ نوجوان کشمیر میں جدوجہد آزادی کا نشان بن چکا تھا وہ جنگل ہی میں رہتے ہوئے اپنے گروپ کی کمانڈ سنبھالتا تھا۔ ان واقعات کے بعد برہان وانی کے سر پر ایک ملین کا انعام رکھا گیا تھا اور اس کے گرد گھیرا تنگ کیا جانے لگا اس کی پل پل کی خبر رکھی جانے لگی اور اس کے موبائل کو ٹریس کیا جانے لگا انہی سارے حالات میں وہ اپنا مشن بھی پورا کررہا تھا جولائی کے مہینے میں اس نے اپنی آخری ویڈیو اپ لوڈ کی وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ اس کی آخری ویڈیو ثابت ہوگی اس میں اس نے براہ راست انڈین فوج کو حالات کا ذمہ دار قرار دیا۔

”ہماری آواز اور جدوجہد کو دبانے کے لیے بھارت اپنی کوششیں کررہا ہے اللہ کے کرم اور کشمیریوں کی دعاؤں سے انہیں منہ کی کھانی پڑی ہے ہمیں آئندہ بھی آپ کی مدد کی ضرورت ہے ہم نوجوانوں کو پیغام دیتے ہیں کہ وہ ہمارے ساتھ آئیں یا ہمارے ساتھی کسی طرح تعاون کریں اور دنیا اور آخرت کی بھلائی حاصل کریں قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

وہ چند لمحے کے لیے رکا اور پھر بولنے لگا۔

”اے ایمان والو کیا میں تمہیں ایسی تجارت نہ بتاؤں جو تمہیں دنیا اور آخرت کے عذاب سے نجات دے اور وہ یہ ہے کہ تم اللہ پر اللہ کے رسول ﷺ ایمان لاؤ اور اللہ کے لیے جہاد کرو اپنے گھر بار عزیزوں ماؤں بیٹیوں کو چھوڑ کر اس میدان میں آؤ تاکہ ہماری ماؤں بہنوں کی عزت قائم رہے اور کشمیر میں خلافت کا نظام قائم ہو۔ ہم لوگوں سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ہندوستان کا مکمل بائیکاٹ کریں ہم کشمیری بھائیوں کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے ہمارا ساتھ دیا ہم علماء سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ کشمیر کی موجودہ صورت حال کو درست طریقے سے دنیا تک پہنچائیں انہیں بتائیں کہ ہم کن حالات میں رہ رہے ہیں اور ہماری کیا ذمہ داری ہے۔“

”ہم کشمیر کے ان نوجوانوں سے کہنا چاہتے ہیں جو بھارتی فوجیوں کے مخبر بنے ہوئے ہیں کہ اگر ہم چاہیں تو ہم بھی انہیں بے سکون کرسکتے ہیں لیکن ہم ان کے لیے عام معافی کا اعلان کرتے ہیں ہمارا کہنا ہے کہ ہم ایک ملک کے رہنے والے ہیں ایک اللہ اور ایک رسول ﷺ اور ایک قرآن کے ماننے والے ہیں ہم ایسا کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے جس سے ان کے گھر والوں کو کوئی نقصان پہنچے بلکہ ہم اپنی ماؤں بہنوں کی طرح ان کی ماؤں بہنوں کی بھی حفاظت کریں گے۔“

آخر میں میں کہنا چاہتا ہوں کہ حق ضرور باطل کو ہرا دے گا اور اللہ کی مدد سے کشمیر کے نوجوان ضرور کامیاب ہوں گے ہمارے خون سے اسلام کو سربلندی ملتی رہے گی انشاء اللہ تعالیٰ۔“

جس شام برہان نے یہ ویڈیو سوشل میڈیا پر اپ لوڈ کی اسی رات شیخ طاہر کی طرف سے ایک پیغامبر اس کے پاس آیا اور اس کو اطلاع دی کہ اس کے والد کی حالت بہت نازک ہے وہ چند لمحوں کے مہمان ہیں ان کی ٹانگ میں لگنے والی گولی نے ٹانگ کو بے کار کردیا ہے اور زہر پورے جسم میں پھیل چکا ہے۔ آنے والے نے اپنا تعارف ایک عام کشمیری کی حیثیت سے کرایا اور خود کو برہان کا ہمدرد ظاہر کیا۔

”ٹھیک ہے میں کل کسی وقت آؤں گا۔“ برہان نے جواب دیا اور وہ شخص واپس چلا گیا دوسرے دن برہان اپنے دونوں قریبی ساتھی سرتاج اور احمد اور پرویز ہاشمی کے ساتھ اپنے گھر پہنچا اس کی باقاعدہ نگرانی کی جارہی تھی لیکن اسے اس بات کا علم نہیں تھا اس کی ماں اسے دیکھ کر خوشی سے دیوانی ہوگئی تھی۔

”میرا بیٹا......میرا سوہنا بیٹا۔“ اس نے خوشی سے کہا اور برہان اپنی ماں سے گلے ملا اس کے دونوں ساتھی اس کے گھر سے تھوڑے فاصلے پر اطراف پر نظر رکھے ہوئے تھے کچھ ہی فاصلے پر انڈین سیکورٹی فورسز کے لوگ سادہ کپڑوں میں موجود تھے اور عام شہریوں کی طرح مختلف کاموں میں مشغول تھے۔

”آؤ برہان بیٹھو تم کافی دن بعد آئے ہو؟ کیسے ہو؟“ اس کی ماں نے اسے پیار سے ایک پلنگ پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

”کچھ کھاؤ گے میں تمہارے لیے کچھ بناتی ہوں۔“ وہ

کچن کی طرف بڑھی۔

"نہیں نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے میں تھوڑی دیر کے لیے آیا ہوں ابو کی خیریت پتہ کرنے کے لیے مجھے اطلاع ملی ہے کہ ان کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔"

"نہیں وہ تو ٹھیک ہیں۔" اس کی والدہ نے کہا۔

"اس زخم کا کیا ہوا جو ان کے گھٹنے پر گولی سے لگا تھا؟" برہان نے پوچھا۔

"وہ تو ٹھیک ہے۔" ڈاکٹر نے کہا ہے کہ اب مزید پٹیوں کی بھی ضرورت نہیں ہے۔"

"ابو کہاں ہیں؟"

"وہ اندر کمرے میں ہیں۔" والدہ کے جواب کے پورا ہونے سے پہلے ہی برہان کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

"ابو......ابو۔" وہ آوازیں دیتا ہوا ان کے کمرے میں داخل ہوا۔

"ہاں برہان۔" اس کے والد اسے دیکھ کر پلنگ پر بیٹھ گئے۔

"آپ کی طبیعت کیسی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"میں ٹھیک ہوں......کیوں............تم اتنے کیوں پریشان ہو؟" اس کے والد نے پوچھا۔

"کچھ نہیں......بس میں آپ کی خیریت پتہ کرنے آیا تھا۔" برہان نے جواب دیا۔

"بیٹھو......میں ٹھیک ہوں۔" والد نے جواب دیا لیکن برہان نہیں بیٹھا وہ سوچ رہا تھا کہ اسے غلط بیانی کر کے بلایا گیا ہے ضرور یہ دشمن کی چال ہے اس کے سر پر بھی (ملین کا انعام ہے اس نے فیصلہ کیا اسے جلد از جلد یہاں سے واپس چلے جانا چاہیے وہ کمرے سے نکل کر سیدھا دروازے کی طرف بڑھا۔

"بیٹا! میں تمہارے لیے کھانا بنا رہی ہوں تم کہاں جا رہے ہو؟" اس کی والدہ نے پوچھا۔

"نہیں آپ کچھ نہ کریں میں پھر آؤں گا ابھی میں جلدی میں ہوں۔" برہان نے والدہ کے گلے لگتے ہوئے کہا۔

"کیا بات ہے میرے بچے تو پریشان نظر آ رہا ہے؟" والدہ نے پوچھا۔

آپ دنیا کے کسی بھی خطے میں مقیم ہوں
ماہنامہ آنچل
ماہنامہ حجاب کراچی
(ایک ساتھ منگوانے پر)
ہم بروقت ہر ماہ آپ کی دہلیز پر فراہم کریں گے
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے ہر کونے میں 700 روپے
امریکا' کینیڈا' آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے
7000 روپے
مڈل ایسٹ' ایشیائی' افریقہ' یورپ کے لیے
6000 روپے
رقم ڈیمانڈ ڈرافٹ' منی آرڈر' منی گرام
ویسٹرن یونین کے ذریعے بھیجی جا سکتی ہیں۔
مقامی افراد دفتر میں نقد ادائیگی کر سکتے ہیں۔
رابطہ: طاہر احمد قریشی 0300-8264242
نئے اُفق گروپ آف پبلی کیشنز
کمرہ نمبر 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی۔
فون نمبر: +922-35620771/2
aanchalpk.com
aanchalnovel.com
circulationngp@gmail.com

"نہیں نہیں، کچھ نہیں...... میں ٹھیک ہوں بس ذرا جلدی میں ہوں پھر آؤں گا۔" برہان نے کہا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا وہ بڑی عجلت میں وہاں سے باہر آیا تھا اور ایک مخصوص اشارہ کر کے سرتاج اور پرویز نے خطرے کا احساس دلایا تھا اور انہیں اپنے آپ سے دور رہنے کو کہا تھا وہ دونوں الگ الگ سمتوں میں آگے بڑھ گئے تھے اور برہان اپنے گھر سے نکل کر سیدھی شاہراہ پر آ گیا تھا جہاں سے اس نے رکشہ کیا تھا اور رکشہ ڈرائیور کو کوکرناگ کے علاقے بمبدرو چلنے کو کہا تھا۔ سرتاج اور پرویز بھی ایک رکشے میں بیٹھ گئے تھے اور اپنا رکشہ برہان کے رکشے کے پیچھے پیچھے روانہ کروا دیا تھا۔

……

وہ سات جولائی کی شام تھی جب برہان نے رکشا گلناز کے گھر کے سامنے رکوایا اس کا خیال تھا کہ گلنار کے بارے میں کوئی بھی نہیں جانتا تھا وہ وہاں ٹھہر کر اپنی اگلی کارروائی کا فیصلہ کر سکتا تھا سرتاج اور پرویز بھی اس کے ساتھ ہی وہاں پہنچے تھے اور پھر برہان کے ساتھ گلنار کے گھر میں داخل ہو گئے تھے برہان نے موبائل پر کسی کو فون کیا تھا کچھ ہی دیر میں کسی حادثے کے ہونے کے بعد شہر میں نوجوانوں نے پولیس اور آرمی کے لوگوں پر پتھراؤ شروع کر دیا تھا پھر بمبدورا کے علاقے کو پولیس اور انڈین فورسز نے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا اور کہا جا رہا تھا کہ علاقے میں کسی کتاب کی تقریب رونمائی ہونا ہے جس میں چیف منسٹر محبوبہ مفتی کو شرکت کرنا ہے اس لیے شہر میں حفاظتی انتظامات کیے جا رہے ہیں علاقے کو خالی کروا لیا گیا تھا اور پھر سیکورٹی فورسز نے تمام اہم مقامات پر پوزیشن سنبھال لی تھی گلنار کے گھر کو بھی چاروں طرف سے گھیر لیا گیا تھا۔

برہان کو جب اندازہ ہوا کہ ان لوگوں کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے تو اس نے وہاں سے بھاگنے کے بجائے خاموشی اختیار کی اور اپنے ذہن میں وہاں سے نکلنے کا کوئی نیا منصوبہ بنانے لگا وہ رات ایسے ہی گزر گئی ہر طرف خاموشی تھی کہیں قریب سے بھی کسی قسم کی آواز نہیں آ رہی تھی یوں محسوس ہو رہا تھا کہ سب خواب غفلت کے مزے لے رہے ہیں برہان نے یہ موقع غنیمت جانا اور وہاں سے نکلنے کا ارادہ کیا۔

اس وقت باہر جانا خطرناک ہے۔" گلناز نے اسے سمجھایا۔

"نہیں یہی موقع مناسب ہے اور دن چڑھ گیا تو فوجی گھر میں گھس جائیں گے اور میں نہیں چاہتا کہ تمہاری عزت پر حرف آئے۔" برہان نے اسے سمجھایا۔

"میں اپنی جان بھی تم پر قربان کر سکتی ہوں تم امتحان لے کر تو دیکھو۔" گلنار نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے لیکن تمہاری جان بہت قیمتی ہے۔"

"اور تمہاری جان؟ تم تو کشمیر کی جدوجہد آزادی کے ہیرو ہو۔" گلنار نے کہا۔

"لیکن تمہیں ایک اور اہم کام کرنا ہے گلناز۔" برہان نے کہا۔

"وہ کیا...... تم جو کہو گے میں کروں گی۔" گلنار نے کہا۔

"اگر مجھے کچھ ہو جائے......"

"اللہ نہ کرے۔" گلنار نے جلدی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"میری بات غور سے سنو۔" برہان نے اس کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا۔

"دیکھو جو صورت حال ہے وہ خطرناک ہے ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہے۔ ہم صرف تین ہیں اور ہمارے پاس ہتھیار بھی ناکافی ہیں اور ہمارے مقابلے پر انڈین سیکورٹی فورسز اور پولیس کے حکام ہیں جن کی تعداد یقیناً سیکڑوں میں ہو گی۔"

"اوہ میرے خدا...... میں کیا کروں؟" گلنار پریشان ہو گئی۔

"اس وقت ہمت کرنے کی ضرورت ہے میں جو کہہ رہا ہوں وہ غور سے سنو۔" برہان نے گلناز کا چہرہ ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا اور وہ رونے لگی۔

"اگر مجھے کچھ ہو جائے تو تم کسی کشمیری مجاہد سے ہی شادی کرو گی اور تمہارے جو بچے ہوں گے انہیں کشمیر کی آزادی کی جدوجہد میں حصہ لینے کے لیے وقف کر دو گی خدا کو گواہ جان کر

وعدہ کرو۔‘‘

’’میں خدا کو گواہ بنا کر وعدہ کرتی ہوں لیکن ساتھ ہی میں دعا بھی کرتی ہوں کہ اللہ تمہاری حفاظت کرے۔‘‘

’’اچھا اب ہم چلتے ہیں اس سے پہلے کہ دشمن ہوشیار ہوجائے۔‘‘ برہان نے کہا اور دروازے کی طرف بڑھا اس نے سرتاج اور پرویز کو بھی ساتھ آنے کا اشارہ کیا تھا۔

برہان نے دروازے سے سر نکال کر گلی کا دونوں طرف سے جائزہ لیا گلی سنسان پڑی تھی اور دور دور تک کوئی نظر نہیں آرہا تھا اس نے قدم باہر نکالا اور چند قدم آگے تک بڑھا اس کے پیچھے پیچھے سرتاج اور پرویز بھی نکلے وہ ابھی چند قدم ہی آگے گئے تھے کہ اچانک چاروں طرف سے فائرنگ ہونے لگی اور چار سے پانچ منٹ کے اندر اندر وہ لوگ زمین پر ڈھیر ہوگئے تھے فائرنگ کی آوازیں سن کر لوگ گھروں سے باہر آگئے تھے لیکن فوراً ہی فوج کی طرف سے کرفیو کا اعلان کردیا گیا تھا اور اس خبر کو چھپادیا گیا تھا۔

آٹھ جولائی کو دوپہر کے وقت برہان وانی اور اس کے دونوں ساتھیوں کی موت کا اعلان کیا گیا تھا اور کشمیر کے پولیس ڈائریکٹر جنرل کے راجندر رائے نے برہان کی موت کی تصدیق کی تھی اور عوام کو بتایا گیا کہ پولیس اور برہان کے درمیان ہونے والے ایک پولیس مقابلے میں برہان اور اس کے ساتھی مارے گئے۔

اس اعلان کے ساتھ ہی شہر میں ہنگامے شروع ہوگئے تھے مجاہدین نے اپنے ساتھیوں کی لاشوں کو تحویل میں لے لیا تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ گھروں سے باہر آگئے تھے اندازاً وہاں دو لاکھ لوگوں کا مجمع تھا۔ تاریخ میں یہ سب سے بڑا مجمع تھا برہان اور دونوں ساتھیوں کے جسم پاکستانی پرچم میں لپیٹے گئے تھے اور اس کی تدفین اس کے بڑے بھائی خالد وانی کی قبر کے قریب ہی کی گئی تھی اس موقع پر مجاہدین بھی موجود تھے انہوں نے چہروں پر سیاہ نقابیں پہنی ہوئی تھیں اور برہان اور ساتھیوں کی لاشوں کو اکیس گنوں کی سلامی دی تھی۔

اس حادثے کے بعد ہی کشمیر میں ہڑتال کا اعلان کردیا گیا تھا علاقے میں پولیس اسٹیشن اور سیکورٹی فورسز پر حملے ہونے لگے لوگوں کے ہجوم پولیس اور سیکورٹی فورسز پر پتھراؤ کرنے لگے اور بہت سے حصوں میں انٹرنیٹ سروس اور ٹرین سروس بند ہوگئی اور نیشنل ہائی وے بھی بند کردیا گیا۔

مشتعل مجمع نے اس گھر کو جلا دیا تھا جہاں یہ حادثہ پیش آیا تھا اور گلنار پہلے ہی وہاں سے کہیں چلی گئی تھی پھر شہر کے حالات خراب ہوتے چلے گئے اور پندرہ جولائی کو حکومت نے باقاعدہ کرفیو نافذ کردیا۔

پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی کے لیڈر مظفر حسین بیگ نے مطالبہ کیا کہ برہان کے قتل کی تحقیقات کے لیے کمیشن بنایا جائے جب کہ انڈین حکومت کا کہنا ہے کہ یہ دہشت گردی کا ایک واقعہ ہے اس لیے کمیشن بٹھانے کی ضرورت نہیں جب کہ ریاست کے سابق وزیر اعلیٰ عمر عبداللہ نے برہان کو ایک شہید کے نام سے پکارا اور اس کی موت کو مسلمانوں کے لیے ایک صدمہ قرار دیا ہے۔

برہان وانی کی شہادت کے بعد کشمیر میں جو ہنگامے شروع ہوئے ہیں وہ ابھی تک جاری ہیں وہاں اس کے نام پر کرکٹ ٹورنامنٹ منعقد کیے جارہے ہیں۔ بچے اسکولوں میں اس کی شہادت کے واقعے کو ڈرامے کی شکل میں پیش کررہے ہیں۔

برہان وانی کی شہادت کے پندرھویں روز ایک عورت سیاہ چادر میں ملبوس اس کی قبر پر آتی ہے اور کچھ پھول نچھاور کرتی ہے اس کے ہاتھ دعا کے لیے آسمان کی طرف اٹھتے ہیں اس کا آدھا چہرہ اس سیاہ چادر سے ڈھکا ہوا ہے اور اس کے لب آہستہ آہستہ تھرتھراتے ہیں۔

’’یا اللہ میں اپنا وعدہ دہراتی ہوں جو میں نے وانی سے کیا تھا میں کسی کشمیری مجاہد سے شادی کروں گی اور اپنے بچوں کو کشمیر کی آزادی کی جدوجہد کے لیے وقف کردوں گی تو گواہ رہنا اور میری مدد کرنا۔

◆

ابدی حیات

سلیم اختر

صابرین کے صبر کے آگے دنیا کی ہر تکلیف اور دکھ دم توڑ دیتا ہے۔ کوئی تیر و تفنگ ان کے ہونٹوں کی ملکوتی مسکراہٹ چھین سکتا ہے نہ اللہ کی رضا پر سر تسلیم خم، دل کی دھڑکنوں کو بے قرار کر دیتا ہے۔ ایسی ہی صابر ہستیوں کے لیے زندگی میں ہی جنت کی نوید آ جاتی ہے۔

ایک نوجوان لڑکی کا فسانہ وہ نہ صرف حسین و جمیل تھی بلکہ نیک و پاکیزہ بھی تھی۔

حالات کے آگے سپر ڈالنے والی خواتین کے لیے ایک رہنما تحریر

زوال و عروج کا سلسلہ ازل سے چلا آ رہا ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔ انسانی زندگی میں اتار چڑھاؤ، نشیب و فراز لازمی امر ہیں اور یہ نہ ہوں تو اس کی زندگی یکسانیت کا شکار ہو کے رہ جائے۔ زندگی میں صرف خوشیاں ہی ہوں تو ایک ہی ڈگر پر زندگی کا سفر طے کرتے ہوئے انسان اکتا جائے اس لئے قدرت نے اپنی کائنات کے نظام کی گنجائش رکھی ہے، خوشی کے ساتھ غم بھی ہے تاکہ وہ اس کی قدرت کو فراموش نہ کرے۔ جو لوگ اس کی طرف سے ڈالی گئی آزمائش کو اپنے اوپر عذاب نہیں سمجھتے بلکہ حوصلے اور بردباری سے اس کا مقابلہ کرتے ہیں، وہی صحیح معنوں میں اس کے نیک اور سچے بندے ہیں۔

عذرا ایک مخلص اور شریف لڑکی تھی شاید اسی لئے قدرت نے اسے حسن کی دولت سے مالا مال کر کے بہت بڑی آزمائش میں ڈال دیا تھا۔ ہمارے معاشرے کا یہ سب سے بڑا المیہ ہے کہ لڑکی بے حد حسین ہو تو اسے حاصل کرنے کی ہر کوئی تمنا کرتا ہے خواہ وہ تمنا یا خواہش جائز ہو یا نہ جائز...... قدرت نے کسی بھی انسان کو فرشتہ نہیں بنایا مگر اسے اتنی خوبیاں عطا کر دی ہیں کہ وہ تمام مخلوقات سے اشرف ہو گیا ہے۔ اب یہ انسان پر منحصر ہے کہ وہ دنیا میں آ کر اپنے نیک اعمال سے خود کو فرشتہ بھی کہلواتا ہے اور برے اعمال سے شیطان کی صفت میں شمار کیا جاتا ہے۔

عذرا بلاشبہ اس قدر حسین تھی کہ اسے دیکھ کر بڑے بڑے مستقل مزاج ڈگمگا جاتے تھے۔ جو بھی اسے دیکھتا تھا، بس ٹھنڈی آہ بھر کر رہ جاتا۔ وہ اتنی باحیا تھی کہ آج تک اس نے اپنے خاندان کے علاوہ کسی غیر مرد کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا تھا مگر اسے دیکھنے والے تو تھے۔ اپنے خاندان میں جو نوجوان لڑکے تھے، ان سے بھی وہ بہت کم بات چیت کرتی تھی۔ وہ اپنے بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی تھی۔ چودہ برس کی ہوئی تو اس کے رشتے آنا شروع ہو گئے حالانکہ وہ ابھی صرف نویں جماعت کی طالبہ تھی۔ پڑھائی کے معاملے میں بھی وہ اس قدر ذہین تھی کہ اب تک اپنے اسکول کے ہر امتحان میں ٹاپ کرتی آئی تھی۔ دینی علوم میں بھی وہ برتر تھی۔ جب وہ صرف دس برس کی تھی تب اس نے مکمل قرآن مجید حفظ کر لیا تھا، صوم و صلوٰۃ کی تو بچپن سے ہی پابندی تھی اور اب دنیاوی

Downloaded From

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ

ایڈ فری لنکس
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ کا ایک پیج پر
ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بُک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

i. Open Paksociety Page.
ii.Click Liked.
iii.Select Get Notifications.
iv.Select See First.

All Done

Liked
Message
Get Notifications
Add to Interest Lists...
Unlike
IN YOUR NEWS FEED
See First
See new posts at the top of News Feed
Default
See posts as usual
Unfollow

http://paksociety.com

تعلیم کے ساتھ ساتھ اس نے حدیث وفقہ کا مطالعہ بھی شروع کر دیا تھا۔ جس لڑکی میں اتنی ڈھیر ساری خوبیاں ہوں اسے بھلا کون اپنانا نہیں چاہے گا۔ یہی وجہ تھی کہ لڑکپن سے ہی اس کے رشتے آنا شروع ہو گئے تھے...... ایک روز اس کے والد جو ایک معمولی ٹیچر تھے، نے اس کی والدہ سے کہا۔

"دیکھو، ہاجرہ! میں یہ بات قطعاً پسند نہیں کرتا کہ جب بھی میں اسکول سے لوٹوں تو دو چار مرد یا عورتیں موجود ہوں یہ لوگ کیوں ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ کیا تم انہیں نہیں سمجھا سکتی ہو کہ ابھی تو عذرا سے بڑی رفعت اور عائشہ بھی کنواری بیٹھی ہیں......؟"

"ماسٹر کریم! جس گھر میں بیری ہوگی، وہاں پتھر تو آئیں گے ہی......" ہاجرہ نے کہا۔ "......اور یہاں تو ایک نہیں، تین تین ہیں۔ پھر میں کس کس کو سمجھاؤں، کس کو روکوں کہ وہ ہمارے گھر نہ آئے......"

ماسٹر کریم کو معلوم تھا کہ اس کی بیوی، رفعت اور عائشہ کے رشتوں کی وجہ سے پریشان رہتی ہے حالانکہ ان دونوں کی عمریں ابھی اتنی زیادہ بھی نہ ہوئی تھیں کہ ان کے رشتوں سے مایوس ہوا جائے۔ رفعت بائیس برس کی تھی اور عائشہ اکیس کے لگ بھگ تھی، دونوں نے میٹرک کے بعد تعلیم کا سلسلہ ترک کر دیا تھا۔ ماسٹر کریم کی آمدنی کے ذرائع محدود تھے، وہ دو ہزار روپے ماہوار تنخواہ پاتا تھا جس میں بمشکل اس کے گھر کی دال روٹی چلتی تھی۔ پھر اس تیزی سے بڑھتی ہوئی مہنگائی کے دور میں وہ چار بچوں کی تعلیم کا بوجھ کیسے برداشت کرتا، اسی لئے اس نے عائشہ اور رفعت کو میٹرک کے بعد اسکول سے ہٹا لیا تھا۔ ان دونوں سے چھوٹا ناصر فرسٹ ائیر میں تھا مگر باپ کا بوجھ بٹانے کے لئے وہ شام کے وقت ایک میڈیکل اسٹور پر بطور سیلز مین جاب کرتا تھا...... اس نے باپ سے کہا تھا۔

"ابو! آپ نے اپنے معاشی حالات کی وجہ سے آپا رفعت اور آپا عائشہ کو تو اسکول سے ہٹا لیا ہے مگر میں چھوٹی کے ساتھ ایسا نہیں ہونے دوں گا، میں اسے ہر حال میں گریجویشن کرواؤں گا......"

وہ عذرا کو پیار سے چھوٹی کہتا تھا، ان دونوں میں اتنی محبت اور انس تھا کہ وہ اسکول کے علاوہ ایک دوسرے سے دور نہیں ہوتے تھے۔ باپ نے جب اس کا بہن کے لئے اتنا جذبہ دیکھا تو اس نے فرط مسرت سے بیٹے کو گلے لگا لیا اور بولا۔

"بیٹا! مجھے تم پر بے حد فخر ہے کہ تم میرا ایک بازو بن گئے ہو۔ اب تم جو چاہو گے، وہی ہوگا۔"

وقت تیزی سے گزرتا رہا۔

رفعت اور عائشہ اب گھر میں ہی سلائی کڑھائی کا کام کرتی تھیں۔ لڑکی اپنی تعلیم مکمل کر لے تو تمام والدین کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ اس کے فرض سے جلد از جلد سبکدوش ہو جائیں اور اس کے بعد اپنی باقی ماندہ زندگی سکون اور اطمینان سے بسر کریں۔ ماسٹر کریم بخش اور ہاجرہ بی بی کی بھی یہی خواہش تھی کہ دونوں بیٹیاں گھر بار والی ہو جائیں۔ ناصر اور عذرا ابھی پڑھ رہے تھے اور انہیں مزید آگے پڑھنا تھا۔ فی الحال ان کی فکر نہیں تھی، فکر تو رفعت اور عائشہ کی تھی جنہیں اسکول چھوڑے چار سال ہو گئے تھے مگر ان کا کہیں بھی رشتہ طے نہ ہو سکا تھا۔ شکل وصورت تو ان کی بھی اچھی تھی مگر اپنی چھوٹی بہن عذرا کے مقابلے میں وہ قبول صورت ہی کہی جا سکتی تھیں۔ اگر کوئی ان کے رشتے کے لئے آتا تو وہ عذرا کو دیکھ کر ان دونوں کی طرف سے نظریں پھیر لیتا اور کہا جاتا۔

"بہن جی! ہمیں تو بس عذرا بٹیا ہی پسند آئی ہے، آپ اس کے لئے ہاں کہہ دیں۔ ہمیں جہیز کا بھی لالچ نہیں۔ عذرا بٹیا میں جو بے شمار خوبیاں ہیں، ان کے سامنے دوسری چیزیں بالکل ہیچ نظر آتی ہیں......"

"مگر عذرا تو ابھی بہت چھوٹی ہے۔ بہن! ہم اس کی شادی کا فی الحال کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ آپ رفعت یا عائشہ کی بات کریں۔" ہاجرہ بڑی متانت سے کہتی۔

"ہمیں تو اسی عمر کی لڑکی کا رشتہ چاہئے جتنی عذرا کی عمر ہے...... پتہ نہیں، لوگ لڑکیوں کو اتنی عمر تک گھر میں کیوں بٹھائے رکھتے ہیں......؟"

ہاجرہ حیران ہو کر کہتی۔ "اے، بہن! تمہیں کس نے کہا کہ میری بچیوں کی عمریں زیادہ ہو گئی ہیں؟...... ابھی تو ان کے اسکول کالج جانے کے دن ہیں، کیا ہوا جو ہم انہیں اپنی تنگ

دستی کی وجہ سے آگے نہ پڑھ سکے......"

"سب اسی طرح کہتے ہیں۔ لڑکی کی عمر سولہ سترہ بتاتے ہیں اور ان کی صورت دیکھو تو پتہ چلتا ہے جیسے پینتیس، چالیس کے درمیان ہیں...... نہ بی بی! ہمیں اپنی عمر کی بہو لے جانے کی ضرورت نہیں۔ ہم تو عذرا جیسی الہڑ عمر کی لڑکی کو بہو بنائیں گے......"

ہاجرہ بی بی ایسی ترش اور کڑوی کسیلی سننے کی عادی ہوگئی تھی اس لئے وہ اپنے گھر آئی کسی مہمان عورت سے کوئی بحث نہیں کرتی تھی بلکہ اسے دوٹوک الفاظ میں یہ جواب دیتی کہ وہ عذرا کی اتنی چھوٹی عمر میں شادی نہیں کرنا چاہتے۔ پھر جب ماسٹر کریم گھر آتا تو ہاجرہ اسے سارا دن کا دکھڑا سنا ڈالتی اور زچ ہوکر کہتی۔

"ماسٹر! میں تو اس روز روز کی جھک جھک سے عاجز آگئی ہوں۔ جو بھی آتا ہے عذرا کا مطالبہ کرتا ہے۔ رفعت اور عائشہ کا تو کوئی نام بھی نہ لیتا......"

اس روز تو ہاجرہ کی حیرانی کی انتہا نہ رہی جب ایک اونچے دولت مند گھرانے کی خاتون عذرا کو دیکھنے کے لئے ان کے گھر آئی۔ اتفاق سے اس روز ماسٹر کریم بخش کو بھی اسکول سے چھٹی تھی اور وہ گھر میں ہی تھا۔ جب اس دولت مند خاتون کی شاندار گاڑی ان کے دروازے کے سامنے آکر کھڑی ہوئی تو وہ دونوں میاں بیوی دروازے پر آگئے۔ خاتون نے ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ گلے میں خوبصورت لاکٹ تھا، ہاتھوں کی انگلیوں میں نصف درجن طلائی انگوٹھیاں تھیں جب کہ کانوں میں بھی بیش قیمت سونے کی بالیاں تھیں۔ اس کے اعلیٰ قیمتی لباس پر قیمتی پرفیوم اپنی خوشبو لٹا رہا تھا۔ ہاجرہ اور ماسٹر کریم بخش دروازے میں بالکل ساکت کھڑے تھے، شاید وہ اس خاتون کی امارت سے مرعوب ہوگئے تھے۔ انہیں تب ہوش آیا جب خاتون نے قریب آکر انہیں سلام کیا، تب ماسٹر کریم دروازے کی چوکھٹ چھوڑ کر ایک طرف ہوگیا اور وہ خاتون ہاجرہ کے ہمراہ اندر آگئی۔ دونوں میاں بیوی اس کی آؤ بھگت میں لگ گئے۔ خاتون نے باتوں ہی باتوں میں اپنا آنے کا اصل مقصد بیان کردیا۔

"میرا بیٹا، ماشاءاللہ حال ہی میں امریکہ سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے کر آیا ہے، اب یہیں جاب کرنا چاہتا ہے۔ میں اسی کے لئے آپ کے گھر آئی ہوں......"

"ہم کچھ سمجھے نہیں، بیگم وارث علی......!" ہاجرہ نے سمجھتے ہوئے بھی ناسمجھی کی بات کی۔

"دیکھو، بہن! اس میں کوئی سمجھنے سمجھانے والی بات تو ہے نہیں، یہ تو ایک سیدھا سا سوال ہے جس کا مجھے جواب چاہئے لیکن دیکھیں میں کم از کم آپ جیسے شریف اور مخلص لوگوں سے انکار کی توقع نہیں رکھ سکتی......"

"لیکن، بیگم صاحبہ! آپ سوال تو کریں......" اب کی بار ماسٹر کریم بخش نے بھی بے چینی اور اضطراب کا مظاہرہ کیا۔

"میں جانتی ہوں، آپ لوگوں کی تین بیٹیاں ہیں اور ان کا رشتہ مانگنے کے لئے بہت سے لوگ آپ کے پاس آتے اور پھر واپس چلے جاتے ہیں لیکن میں تو آج کسی ایک کے رشتے کی بات پکی کرکے ہی جاؤں گی......"

دونوں میاں بیوی جو ایک دولت مند خاتون کو اپنے گھر میں دیکھ کر مسرور تھے، اس کی زبان سے اپنی بیٹیوں کا ذکر سن کر ان کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہ رہا۔ دونوں کے دماغ میں ایک ہی بات تھی کہ خاتون بڑی رفعت یا اس سے چھوٹی عائشہ کا رشتہ طلب کرے گی اور وہ اتنے اونچے گھرانے کے ساتھ ساتھ یہ رشتہ جوڑنے میں دیر نہیں کریں گے۔ ان کی بیٹیوں کی تو قسمت جاگ اٹھی تھی...... خاتون نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"یوں تو آپ کی تینوں بیٹیاں خوبصورتی میں اپنی مثال آپ ہیں لیکن ان میں جو چھوٹی ہے، وہ مجھے سب سے زیادہ پسند آئی ہے اور میں یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوگئی ہوں کہ ہمارے بیٹے کی پسند لاجواب ہے......"

ہاجرہ اور ماسٹر کریم اس خاتون کی باتیں سن کر گویا سکتے میں رہ گئے۔ یہ بات کوئی نئی نہ تھی کہ اس امیر و کبیر خاتون نے ان کی بیٹی عذرا کو باقی دونوں پر ترجیح دی تھی اور اسے پسند کیا تھا مگر خاتون کی دوسری بات نے انہیں پریشان کردیا تھا، وہ کہہ رہی تھی کہ عذرا اس کے بیٹے کی پسند ہے اور یہ سن کر انہیں یوں لگ

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

رہا تھا جیسے امارت نے غربت کے منہ پر طمانچہ رسید کر دیا ہو۔ انہوں نے اپنی اولاد کی پرورش، تربیت اور نشوونما خالص مشرقی انداز میں کی تھی۔ بیٹیوں کو مذہبی روایات کے مطابق پردے کا پابند بنایا تھا۔ اس کے شعور میں یہ بات بٹھائی تھی کہ مشرقی عورت کا اصل مقام چار دیواری کے اندر ہے۔ وہ تینوں اتنی با حیا اور باپردہ تھیں کہ کبھی شاپنگ وغیرہ کے لئے بازار تک نہیں گئی تھیں، صرف اس وقت گھر سے باہر نکلتی تھیں، جب اسکول جاتیں لیکن تب بھی وہ چادر نما برقع میں اپنے جسم اور چہرے کو چھپائے رکھتیں۔ پردے کی اس سخت پابندی کی بدولت کسی غیر مرد نے ان کی صورت وشکل تک نہ دیکھی تھی اور عذرا تو ان سب سے زیادہ مذہب اور شریعت کی پابند تھی، والدین کو اس پر مکمل اعتماد تھا اور وہ خود بھی مشرقی شرم اور حیا کا لحاظ رکھتی تھی۔ پھر وہ اس خاتون کی باتوں پر بھلا کیسے یقین کر لیتے کہ ان کے بیٹے نے عذرا کو پسند کیا ہے۔ اس کا مطلب تو یہ تھا کہ ان کے بیٹے نے عذرا کو پسند کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ان کی بیٹی اب باپردہ نہیں رہی، تب ایک غیر اور اجنبی نوجوان نے اسے کہیں دیکھا ہے اور پسند کر لیا ہے...... اس کے ماں باپ اس خیال سے ہی اپنے آپ کو ذلت اور رسوائیوں کی گہری دلدل میں اترتے ہوئے محسوس کر رہے تھے۔ خاتون نے انہیں خاموش دیکھ کر کہا۔

"آپ شاید سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ میں کس مقصد کے لئے یہاں آئی ہوں؟...... بھئی، سیدھی سی بات ہے کہ میں اپنے بیٹے کے لئے آپ کی بیٹی عذرا کا رشتہ مانگنے آئی ہوں۔ امید ہے کہ آپ مجھے خالی دامن نہیں لوٹائیں گے۔"

ماسٹر کریم اور اس کی بیوی گم صم سے بیٹھے تھے، پھر کچھ توقف کے بعد ماسٹر نے اپنی بے ترتیب سانسوں کو یکجا کر کے کہا۔

"دیکھو، بہن! اول تو یہ کہ ابھی عذرا بیٹی سے بڑی دونوں کنواری ہیں، ہم پہلے ان کی شادی کریں گے اس کے بعد ہم عذرا کے متعلق سوچیں گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ عذرا کی عمر بہت کم ہے۔ وہ میٹرک کا امتحان دے رہی ہے اور مزید آگے پڑھنا چاہتی ہے......"

خاتون نے بات کاٹ کر کہا۔ "ماسٹر صاحب! ہمارے پاس کسی چیز کی کمی نہیں، ہم اسے خود پڑھالیں گے......"

"مگر پھر بھی ہم اتنی عجلت میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے...... یوں بھی رفعت اور عائشہ عذرا سے بڑی ہیں، ہم پہلے ان کی شادی کریں گے اور بعد میں عذرا کے متعلق سوچیں گے......"

ماسٹر نے گویا اپنا آخری فیصلہ سنا دیا۔ خاتون مایوس ہو کر واپس چلی گئیں۔ ہاجرہ کو اتنے اونچے گھرانے کا رشتہ کھونے کا بے حد افسوس تھا لہٰذا وہ خاتون کے واپس جاتے ہی اپنے شوہر پر برس پڑی۔

"میں پوچھتی ہوں! اس خاتون کو صاف انکار کرنے کی کیا ضرورت تھی؟...... اتنا اونچا رشتہ ٹھکرا کر آپ نے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری ہے۔"

"تم کیسی باتیں کرتی ہو، ہاجرہ......!" ماسٹر کریم نے قدرے تلخ ہو کر کہا۔ "یہ دولت یا مایا ہی سب کچھ نہیں ہوا کرتی، ہمیں اپنی بیٹیوں کا سکھ اور آرام چاہئے جو ان دولت مند گھرانوں میں نہیں ہوتا......"

"ماسٹر! دولت سے سب کچھ خریدا جا سکتا ہے۔ جب انہیں اتنی ساری آسائشیں حاصل ہو جائیں گی، تو پھر انہیں کون سا دکھ رہے گا...... پہلے ہی رفعت اور عائشہ کا کہیں رشتہ نہیں ہو رہا، ان کی اتنی عمریں ہو گئی ہیں۔" ہاجرہ کے لہجے سے مایوسی جھلک رہی تھی۔

"ایسی مایوسی کی باتیں نہ کرو، ہاجرہ!" ماسٹر کریم تیز لہجے میں بولا۔ "خدا کے گھر دیر ہے، اندھیر نہیں...... ذرا یہ سوچو کہ ہم نے اپنی اولاد کی تربیت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی پھر ہماری عزت پر یہ داغ کیوں لگ رہا ہے، ہماری شرافت اور نیکی پامال کیسے ہو رہی ہے؟"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی!" ہاجرہ نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

"وہ دولت مند خاتون کہہ رہی تھی کہ اس کے بیٹے نے عذرا کو پسند کیا ہے لیکن کہاں اور کیسے؟...... ہماری سب بیٹیاں اتنے سخت پردے میں رہتی ہیں کہ کوئی نامحرم ان کا ایک بال

بھی نہیں دیکھ سکتا۔ عذرا جب اسکول کی چار دیواری میں قدم رکھتی ہے، تب وہ برقعے کا نقاب چہرے سے ہٹاتی ہے۔ پھر اس خاتون کے بیٹے نے اسے کہاں دیکھ لیا، کیا عذرا اس کے سامنے بے پردہ......"

"نہیں، ماسٹر! ایسا کوئی لفظ ادا نہ کرو۔" ہاجرہ نے جلدی سے بات کاٹ کر کہا۔ "مجھے اپنی بیٹیوں کی شرافت اور باحیائی کا اتنا ہی یقین ہے جتنا کہ ایک ماں کو اپنے بطن سے پیدا ہونے والی اولاد کا ہوتا ہے، وہ کسی نامحرم کے سامنے بے پردہ ہونے کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتیں......"

"یہی بات تو میں تم سے کہنا چاہتا ہوں، ہاجرہ! وہ خود کسی غیر مرد کے سامنے بے حجاب نہیں ہوتیں مگر یہ ہوسکتا ہے کہ عذرا کسی مجبوری کے پیش نظر اس رئیس زادے کے سامنے گئی ہو......تم اس کی ماں ہو اور ماں بیٹی کے درمیان کوئی راز نہیں ہوتا، ذرا اس سے پوچھو کہ وہ اسکول کے علاوہ کہاں کہاں بے نقاب رہتی ہے۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو ہمیں کسی بہت بڑی بدنامی یا رسوائی کا سامنا کرنے سے پہلے ہی اسے اسکول سے اٹھانا ہوگا۔"

ہاجرہ نے جب بیٹی سے اس بابت پوچھا تو عذرا نے بتایا کہ وہ اسکول کی چار دیواری کے علاوہ کہیں بھی چہرے سے نقاب نہیں ہٹاتی مگر کئی روز سے وہ محسوس کر رہی تھی کہ اسکول جاتے اور آتے وقت ایک لڑکا مسلسل اس کا پیچھا کرتا ہے۔ وہ اپنی خاندانی شرافت اور شرم و حیا کی وجہ سے خاموش رہی تھی۔ والدین کو جب اس بات کا پتہ چلا تو انہوں نے عذرا کو اگلے روز اسکول جانے سے منع کر دیا حالانکہ ان دنوں عذرا میٹرک میں تھی اور امتحان بھی قریب ہی تھے مگر اس کے ماں باپ اس بات سے خائف ہوگئے تھے کہ کہیں ان کی عزت و وقار پر کوئی حرف نہ آجائے۔ عذرا نے جو شرم و حیا کی دیوی تھی، چپ چاپ ماں باپ کے فیصلے کو قبول کر لیا۔ اس نے والدین کی عزت اور غیرت کو اپنے مستقبل پر ترجیح دی تھی اور اس کا بھائی بھی والدین کے اس فیصلے پر احتجاج نہ کر سکا۔

☆☆☆☆☆

ماسٹر کریم بخش کا گھرانہ خالص مذہبی تھا، بیٹیوں کو کہیں آنے جانے یا گھومنے پھرنے کی اجازت نہ تھی۔ انہوں نے اپنی تینوں بیٹیوں کو دینی و دنیاوی تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا تھا لیکن اس کے باوجود رفعت اور عائشہ کا رشتہ ابھی تک طے نہ ہو سکا تھا حالانکہ تمام عزیز و رشتہ دار اور محلے والے ان کی شرافت کے قائل تھے۔ ان کا رشتہ نہ ہونے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اگر کوئی رشتہ مانگنے کے لئے ان کے گھر آتا بھی تو وہ عذرا کے حسن و جمال کو دیکھ کر رفعت اور عائشہ کو نظر انداز کر دیتا اور عذرا کا رشتہ طلب کرنے لگتا......ایک روز ہاجرہ اپنے خاوند سے کہنے لگی۔

"رفعت اور عائشہ کے رشتے میں سب سے بڑی رکاوٹ عذرا بیٹی ہے، ہر کوئی اس کا امیدوار بن کر آتا ہے...... کیوں نہ ہم پہلے اس کی شادی کر دیں تاکہ لوگوں کی نظریں اس سے ہٹ جائیں اور وہ ہماری دوسری بیٹیوں پر توجہ کرنے لگیں۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو، ہاجرہ بیگم؟" ماسٹر نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔ "اگر ہم پہلے عذرا بیٹی کو بیاہ دیں گے تو رفعت اور عائشہ شاید ساری زندگی ہماری دہلیز پر بیٹھی رہیں اور پھر لوگ تو یہی کہیں گے تاکہ ہم نے پہلے بڑی بیٹیوں کا نہ سوچا اور چھوٹی کی شادی اس لئے کر دی کہ وہ اپنی بہنوں سے زیادہ خوبصورت تھی......نہیں ہاجرہ! پہلے دونوں بڑی کی شادی ہوگی، اس کے بعد چھوٹی عذرا کی باری آئے گی۔"

"......اور اگر بڑی بیٹیوں کا رشتہ نہ آیا تو ان کے ساتھ تیسری کو بھی کنواری بٹھائے رکھنا۔" ہاجرہ نے جلے بھنے انداز میں کہا۔

"کیوں ایسی ناامیدی کی باتیں کرتی رہتی ہو......ہمیں خدائے بزرگ و برتر کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ جلد ہی ہماری ایک بیٹی کے لئے کہیں نہ کہیں سے بر ضرور آئے گا۔"

جب رفعت پیدا ہوئی تھی تب ہاجرہ کی بڑی بہن، سنجیدہ نے بہن سے کہا تھا کہ رفعت اس کی بیٹی ہے، وہ اپنے بیٹے فواد کے لئے رفعت کو مانگنا چاہتی تھیں لیکن تب ہاجرہ نے ملامت سے جواب دیا تھا۔

"سنجیدہ آپا! مجھے اور ماسٹر کو اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں

بلکہ مجھے تو خوشی ہے کہ اس رشتے کی بدولت ہم دو بہنیں آپس میں ہمیشہ جڑی رہیں گی لیکن اس معاملے میں ہمیں اتنی جلدی نہیں کرنی چاہئے۔ ابھی ہمارے بچے بہت کم سن ہیں، جب یہ بڑے ہوں گے یا رشتوں کو سوچنے سمجھنے کے قابل ہوں گے تو شادی ان کے خیالات بدل جائیں۔ ہمیں ان کی مرضی معلوم کئے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہئے۔“

سنجیدہ آپا نے قائل ہو کر کہا تھا۔ ”تم ٹھیک کہتی ہو، بہن! اولاد جوان ہونے کے بعد اگر باغی ہو جائے تو بڑوں کو اپنی زبان کا عہد نبھانا مشکل ہو جاتا ہے...... ہم بے شک یہ رشتہ ان کے بڑے ہونے پر ہی طے کریں گے مگر تم بھی میرے ساتھ ایک وعدہ کرو کہ اگر حالات اور وقت نے ہمارا ساتھ دیا تو تم اپنی رفعت کا رشتہ کہیں اور طے نہیں کرو گی، میں بھی تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ میرا فواد اگر میرے اختیار میں رہا تو میں اسے تمہارا ہی داماد بناؤں گی۔“

یوں ان دونوں بہنوں نے وعدہ کر لیا کہ وہ اس رشتے کو قائم رکھنے کی پوری کوشش کریں گی لیکن کچھ ہی عرصے بعد ان کی آپس میں ان بن ہو گئی، ایک معمولی سی بات پر ان دونوں کے درمیان اتنی دوریاں حائل ہو گئیں کہ ایک طویل عرصہ تک وہ ایک دوسرے سے دور رہ کر اپنی اپنی نفرت کا اظہار کرتی رہیں اس روز سنجیدہ آپا نے خود ہی اس نفرت کو ختم کرنے میں پہلی کی تھی۔ وہ اپنی بہن سے دوبارہ رشتہ مضبوط کرنے کے لئے اپنے بیٹے فواد کا رشتہ لے کر آئی تھیں، انہوں نے کہا۔

”بہن ہاجرہ! ہمارے درمیان جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئی تھیں، میں انہیں نہ صرف ختم کرنے آئی ہوں بلکہ ایک نیا رشتہ جوڑنے آئی ہوں۔“ اس نے قدرے توقف کیا، پھر بولی۔ ”تمہیں یاد ہو گا کہ جب رفعت پیدا ہوئی تھی تو ہم دونوں بہنوں نے ایک دوسرے سے ایک عہد کیا تھا۔“

یہ کہہ کر انہوں نے سوالیہ نظروں سے بہن کی طرف دیکھا...... ہاجرہ نے کچھ دیر سوچا پھر فوراً ہی سر ہلا کر بولی۔

”ہاں، ہم نے وعدہ کیا تھا...... کیا فواد اس رشتے پر راضی ہے؟“

ہاجرہ کی آنکھوں میں خوشی کی چمک آ گئی تھی۔ ماسٹر کریم کے بوڑھے چہرے پر بھی خوشی کی لہریں رقصاں تھیں۔ آج برسوں کے بعد ان کی مراد بر آئی تھی، رشتہ خود چل کر ان کے گھر آیا تھا۔ خدا تعالیٰ نے ان کی سن لی تھی...... سنجیدہ آپا نے بڑے فخر سے کہا۔

”فواد میرا بیٹا ہے اور مجھے اس پر پورا اعتماد ہے۔ اس نے آج تک مجھ سے حکم عدولی نہیں کی، پھر وہ میری اس خواہش کو بھلا کیسے رد کر سکتا ہے......؟“

”لیکن، سنجیدہ آپا! یہ تمہارے بیٹے کی زندگی کا بہت بڑا فیصلہ ہے۔ تمہیں اس کی رائے ضرور معلوم کرنی چاہئے...... ہو سکتا ہے، اس کے خیالات کہیں......“

سنجیدہ آپا نے ماسٹر کریم کی بات کاٹ کر فوراً کہا۔ ”بھائی صاحب! اگر میرے بیٹے نے میرے اس فیصلے کی مخالفت کی تو میں اسے اپنا دودھ نہیں بخشوں گی...... ویسے آپ کی اطلاع کے لئے عرض کر دوں کہ کچھ عرصہ پہلے جب فواد میرے منع کرنے کے باوجود آپ کے گھر چلا آیا تھا تو واپس جا کر وہ آپ کی بیٹیوں کی بہت تعریفیں کر رہا تھا اور مجھے مجبور کر رہا تھا کہ میں آپ لوگوں سے صلح کر لوں مگر تب نہ جانے میرے دماغ میں کہاں کا خناس سما گیا تھا کہ میں نے اس ناراضگی کو ختم کرنے کی بجائے الٹا اپنے بیٹے کو بھی ڈانٹ دیا اور اسے دھمکی دی کہ اگر وہ آئندہ آپ کے گھر آیا یا آپ لوگوں کے ساتھ کسی قسم کا تعلق رکھنے کی اس نے کوشش کی تو میں اس سے کبھی بات نہیں کروں گی...... اصل میں اس وقت میں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ خونی رشتے خواہ کتنے ہی ایک دوسرے سے دور ہو جائیں، ان میں کشش باقی رہتی ہے اور پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ وہ دوبارہ ایک دوسرے سے آ ملتے ہیں۔ آپ یقین کریں، ہمارے درمیان برسوں کی اس نفرت اور کدورت کو ختم کرنے میں میرے بیٹے فواد اور بیٹی یاسمین کا ہاتھ ہے، ان دونوں نے مجھے یہاں بھیجا ہے تاکہ میں آپ کو مناؤں اور اس غلط فہمی کو ختم کروں......“

اس کی باتیں سن کر ہاجرہ نے کہا۔ ”آپا! مجھے خوشی ہے کہ آپ کی اولاد اتنی نیک اور فرمانبردار ہے، انہوں نے دو بچھڑی ہوئی بہنوں کو پھر سے ملا دیا ہے۔ بہر حال، ہمیں رفعت اور فواد

کے رشتے پر کوئی اعتراض نہیں۔ آپ جب چاہیں اپنی بیٹی کو لے جائیں، یہ اب آپ کی امانت ہے......“

”سچ بہن! مجھے یہی توقع تھی، تم نے اپنا عہد پورا کردیا۔“

دونوں بہنیں ایک دوسری کو گلے لگا کر خوشی اور مسرت کا اظہار کررہی تھیں۔ پھر سنجیدہ آپا یہ کہہ کر اپنے گھر واپس چلی گئیں کہ وہ اپنے میاں کے ساتھ جلدی ہی آئیں گی اور باقاعدہ منگنی کی رسم ادا کریں گی۔

ماسٹر کریم اور اس کی بیوی بے حد خوش تھے، انہیں یوں لگ رہا تھا کہ جیسے بہت بڑا بوجھ ان کے سر سے اتر گیا ہو۔ ابھی صرف ایک بیٹی کے رشتے کی بات طے ہوئی تھی لیکن یہ بات بھی ان کے لئے بے حد اطمینان بخش تھی۔ ایک بیٹی کا فرض ادا ہونے والا تھا، اس کے بعد باقی دونوں کی رخصتی بھی آسان ہوتی دکھائی دینے لگی تھی۔ بوجھ خواہ کسی بھی قسم کا ہو، وہ اس وقت تک ہی بوجھ محسوس ہوتا ہے جب تک اس سے چھٹکارا حاصل نہ ہو اور اگر آدھے بوجھ سے بھی نجات مل جائے تو باقی کا بوجھ اتارنا سہل ہو جاتا ہے...... بہن کے جانے کے بعد ہاجرہ نے کہا۔

”ماسٹر! ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ بیٹھے بٹھائے یہ رشتہ مل جائے گا۔ ہماری بیٹی کے تو نصیب جاگ گئے ہیں۔ چلو، اب ایک فکر تو دور ہوگی...... دورہ جائیں گی تو ان کے لئے بھی کوئی فرشتہ رحمت بن کر آجائے گا۔“

”ہاجرہ بیگم! قسمت کی دیوی ہم پر مہربان ہے۔ اس خالق و مالک کا شکر ادا کرو جس نے ہماری لاج رکھ لی...... رہ گئیں عائشہ اور عذرا تو ان کا معاملہ بھی خدا پر چھوڑ دو مسبب الاسباب ہے، ان کے لئے کوئی سبب پیدا کرہی دے گا۔“

ادھر وہ دونوں میاں بیوی فرحاں و شاداں تھے اور ادھر سنجیدہ آپا جب اپنے گھر پہنچی اور اپنے بیٹے بیٹی کو بتایا کہ وہ بہن کے گھر گئی تھی اور فواد اور رفعت کے رشتے کی بات پکی کرآئی ہے تو یہ سن کر فواد حیران و پریشان رہ گیا۔ اس کی ماں بغیر اس کی مرضی کے ایک بہت بڑا فیصلہ کرآئی تھی۔ چند سال بیشتر جب وہ اپنی خالہ ہاجرہ کے ہاں گیا تھا تو وہاں عذرا کو دیکھ کر اپنے حواس میں نہ رہا تھا، اسے اپنا دل ڈولتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ تب سے ہی اس نے اپنے دل میں مصمم ارادہ کرلیا کہ وہ صرف عذرا سے ہی شادی کرے گا مگر گھر آتے ہی اس کی ماں نے اسے ڈانٹ دیا اور دھمکی دی کہ اگر وہ آئندہ اپنی خالہ کے گھر جائے گا تو ماں اور بیٹے کے درمیان سخت ناراضگی ہوگی۔ فواد نے عارضی طور پر ماں کی بات مان لی تھی مگر وہ اپنی بہن یاسمین کے ساتھ مل کر دونوں خاندانوں کو آپس میں ملانے کے منصوبے بنانے لگا، دونوں بہن بھائی رفتہ رفتہ اپنی ماں کے دماغ میں یہ بات بٹھانے لگے کہ ہاجرہ آنٹی ان کے اپنوں بلکہ قریبی رشتوں میں سے ہے، ایسے قریبی رشتوں سے اتنی جلدی دستبردار نہیں ہوا جاسکتا کیونکہ دکھ اور مصیبت کے وقت یہی کام آتے ہیں۔ سنجیدہ آپا نے بھی محسوس کیا کہ وہ اپنی بہن سے زیادہ عرصہ دور نہیں رہ سکے گی۔ اس کی اولاد جوان ہوگئی تھی اور ہر وقت اسے بہن کی محبت کا احساس دلاتی رہتی تھی، یوں بھی اسی نفرت اور رنجش کی ابتدا اس کی طرف ہوئی تھی چنانچہ اپنی اولاد کے احساس دلانے پر اس نے اپنی غلطی تسلیم کرلی اور پھر اس نے بہن کے پاس جاکر نہ صرف اپنی غلطیوں کی معافی مانگی بلکہ اس کی بیٹی رفعت کو اپنے بیٹے کے لئے مانگ کر اس رشتے کو مزید مضبوط کردیا۔ وہ صرف یہی سمجھتی تھی کہ اس کی اولاد اپنوں کے ساتھ تعلقات وابستہ کرنا چاہتی ہے چنانچہ اس نے رشتہ کرنے سے پہلے فواد کی رائے لینے کی ضرورت محسوس نہ کی مگر جب سنجیدہ آپا اپنی بہن کے گھر سے واپس آئی اور بیٹے بیٹی کو یہ خوشخبری سنائی کہ وہ فواد کے لئے رفعت کو مانگ آئی ہے تو یہ سن کر دونوں بہن بھائی گنگ رہ گئے۔ وہ انہیں حیرانی سے گھورتے ہوئے بولی۔

”تم دونوں خاموش کیوں ہوگئے ہو، کیا تمہیں اس بات کی خوشی نہیں ہوئی کہ میں نے تمہاری خواہش کے مطابق اپنی بہن سے دوبار تعلقات جوڑ لئے ہیں اور کبھی نہ ٹوٹنے والا رشتہ قائم کردیا ہے؟“

”لیکن، امی! یہ ہماری خواہش ضرور تھی مگر ہم نے یہ نہیں کہا تھا کہ آپ فواد بھائی کی مرضی کے بغیر رفعت آپا سے اس کا رشتہ طے کرآئیں......“ یاسمین نے شکوہ بھرے لہجے میں کہا۔

”آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ آپ کا یہ فیصلہ مجھے پسند آئے

گا اور ضروری نہیں کہ جو کچھ آپ سوچتی ہوں، وہی ہم بھی سوچیں۔ یہ ہماری زندگی ہے اور اس کے متعلق فیصلہ کرنے کا اختیار بھی ہم کو ہے۔"

سنجیدہ آپا پھٹی پھٹی نگاہوں سے بیٹے اور بیٹی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کی اولاد جس نے اس ٹوٹے ہوئے رشتے کو دوبارہ ملایا تھا، خود اس کی مخالف ہو جائے گی۔ انہوں نے اپنے منتشر حواس کو یکجا کر کے کہا۔

"یہ تم دونوں کہہ رہے ہو...... کیا تم جانتے ہو کہ تمہارے اس انکار سے کتنا بڑا طوفان کھڑا ہوگا اور میں جو اپنی بہن کو زبان دے آئی ہوں، اس کے پاس دوبارہ کس منہ سے جاؤں گی۔ وہ تو یہی سمجھے گی کہ میں نے اس سے دوبارہ رشتہ اس لئے جوڑا تھا کہ اسے رشتہ داروں، برادری میں ذلیل و خوار کروں...... نہیں، میں اب اپنی بہن سے کیا ہوا وعدہ نہیں توڑوں گی۔ مجھے اپنی زبان کے عہد کو ہر صورت نبھانا ہے اور تم لوگ سن لو کہ میں اور تمہارے پاپا اگلے جمعہ کو باقاعدہ منگنی کرنے جا رہے ہیں۔"

"کیا......؟" دونوں بہن بھائی بیک وقت بولے۔

"نہیں، یہ نہیں ہوگا۔ زندگی میں نے گزارنی ہے۔ پھر میں آپ کے اس فیصلے کو کیوں قبول کروں...... اگر آپ کو میری خوشیاں گوارا ہیں اور آپ مجھے ہنستے بستے دیکھنا چاہتی ہیں تو رفعت کی چھوٹی بہن عذرا کے ساتھ میری شادی کر دیں کیونکہ میں صرف اسے ہی پسند کرتا ہوں۔ اگر آپ نے میری بات نہ مانی تو اس کا جو انجام ہوگا، اس کی ذمہ دار آپ ہوں گی۔"

فواد نے جیسے قطعی انداز میں کہا، پھر غصے اور جوش میں باہر نکل گیا۔ یاسمین نے ماں کی چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ ماں کچھ کہنا چاہتی تھی مگر یاسمین بھی پاؤں پٹختی ہوئی اس کے کمرے سے نکل گئی...... سنجیدہ آپا، بیٹے اور بیٹی کے رویے پر بے حد پریشان تھیں، خصوصاً فواد کے انکار اور اس کی باتوں نے ان کے دماغ کو مفلوج کر کے رکھ دیا تھا۔ پھر انہوں نے یہ سوچ کر خود کو تسلی دے لی کہ بیٹے کا فیصلہ جذباتی ہے یہ سوچ کر خود کو اپنے جذباتی فیصلے پر نظرثانی کرے گا۔ یوں بھی وہ بہن اور بہنوئی کو زبان دے آئی تھی، اب اس سے انحراف کرنا خاندانی اصولوں کے خلاف تھا۔

فواد نے جب دیکھا کہ اس کی ماں کسی طور بھی اس کی شادی عذرا سے کرنے پر راضی نہیں ہو رہی ہے تو اس نے غصے میں اور جنون میں خواب آور گولیوں کی اچھی خاصی مقدار حلق میں انڈیل لی۔ پھر تھوڑی ہی دیر میں وہ نیم مردہ حالت میں اکھڑی اکھڑی سانسیں لینے لگا۔ یاسمین اس کے کمرے داخل ہوئی اور اس نے جب بھائی کی حالت غیر دیکھی تو گھبرا گئی اس وقت فواد کی باچھوں سے جھاگ پتلی سی لکیر کی صورت میں بہنے لگا تھا۔ یاسمین نے تیزی سے آگے بڑھ کر بھائی کے سرہانے رکھی ہوئی تپائی کی طرف دیکھا، وہاں ایک شیشی پڑی تھی جس کا ڈھکن کھلا تھا اور وہ خالی ہو چکی تھی۔ اس کا لیبل پڑھ کر یاسمین کو اپنی سانسیں رکتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ پھر وہ چیخ مار کر اپنی ماں کو آوازیں دیتی ہوئی باہر کی طرف بھاگی۔ آناً فاناً یہ خبر پورے محلے میں پھیل گئی کہ فواد نے خودکشی کی ناکام کوشش کی ہے۔ اسے بروقت اسپتال پہنچا دیا گیا جہاں کئی گھنٹے موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد وہ بالآخر زندگی کی طرف لوٹنے میں کامیاب ہو گیا۔ سنجیدہ آپا تو بالکل ہی حواس باختہ ہو گئی تھیں۔ اگر ان کے بیٹے کو نئی زندگی نہ ملتی تو بیٹے کے ساتھ ساتھ شاید وہ بھی جان دے دیتیں۔ فواد کی صحت یابی پر انہوں نے سجدہ شکر ادا کیا۔ ہاجرہ کو فواد کی علالت کی خبر دی گئی مگر اسے یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ فواد نے خودکشی کی ناکام کوشش کی ہے۔ وہ اپنی دونوں بیٹیوں عذرا اور عائشہ کو ساتھ لے کر آئی تھی اور یہاں آ کر ہی اسے صورت حال کا علم ہوا تھا۔ عذرا کو دیکھتے ہی فواد کی تمام بیماری دوری ہو گئی، وہ بستر علالت سے اٹھ بیٹھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی خزاں رسیدہ زندگی میں اچانک بہار آ گئی ہو۔ اس نے عذرا کی چاہت میں اپنے آپ کو ختم کرنے کی کوشش کی تھی اور اب اسے یوں سامنے دیکھ کر اپنے آپ کو بھی بھول گیا۔ عذرا کو فواد کی چاہت کے متعلق کچھ علم نہیں تھا۔ جب باقی لوگ دوسرے کمرے میں چلے گئے اور فواد کے کمرے میں صرف عذرا ہی رہ گئی تو اس نے خود ہی فواد کو مخاطب کر کے پوچھا۔

"آپ نے خودکشی کی کوشش کیوں کی تھی......؟"

فواد نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا، پھر معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔ ”مجھے خود بھی معلوم نہیں میں نے یہ قدم کیوں اٹھایا؟...... شاید میں اس وقت پاگل ہو گیا تھا۔“

”ہاں، ایسا تو کوئی پاگل ہی کر سکتا ہے......“

وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ اس کی ہنسی میں ترنم تھا۔ فواد کا جی چاہا کہ وہ اس طرح اس کے سامنے بیٹھی ہنستی رہے۔ وہ اسی کے سامنے اپنی محبت کا اظہار کر دینا چاہتا تھا مگر اتنا بڑا قدم اٹھانے کے بعد بھی اسے جرأت نہ ہو رہی تھی کہ وہ عذرا کو اپنے جذبوں سے آشنا کرے۔ اس دوران اس کے گھر والوں کو اس کی خودکشی کا سبب معلوم ہو گیا اور یاسمین نے عذرا کو بھی ساری حقیقت بتا دی جسے سن کر وہ دم بخود رہ گئی۔ اسے یقین نہ آ رہا تھا کہ فواد اسے اس قدر دیوانگی سے چاہتا ہے کہ اس کے بغیر زندہ رہنے پر اس نے موت کو ترجیح دی تھی۔ عذرا سلجھی ہوئی لڑکی تھی مگر اب اسے اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑا کہ محبت ایک شفاف اور پاکیزہ جذبہ ہے اور کسی سے سچی محبت کرنا گناہ نہیں...... اس نے فواد کو کہا۔

”میں حیران ہوں کہ تم نے اتنی معمولی سی بات پر خودکشی کا فیصلہ کیوں کیا...... بہر حال، میں تمہارے جذبے کی قدر کرتی ہوں لیکن کیا یہ میری خود غرضی نہ ہو گی کہ میں اپنی بہن کا حق اس سے چھین رہی ہوں؟“

”نہیں، عذرا محبت میں خود غرضی یا کسی کا مفاد نہیں دیکھا جاتا، صرف اپنے دل کی بات مانی جاتی ہے۔“ فواد نے اک ذرا توقف کیا، پھر کہنے لگا۔ ”ہمارے مذہب میں لڑکے اور لڑکی کو اپنی پسند یا مرضی کے اظہار کا پورا اختیار حاصل ہے۔ پھر بھلا ہم کیوں کسی کا غلط فیصلہ تسلیم کریں؟“

”لیکن یہ تو ہمارے بزرگوں کا فیصلہ ہے، فواد! وہ رفعت کے ساتھ تمہاری شادی کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ہم ان کے فیصلے سے روگردانی کریں گے تو نافرمان کہلائے جائیں گے...... تم یہ بات اچھی طرح جانتے ہو کہ میں ایک مشرقی لڑکی ہوں، اپنے والدین سے بغاوت کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ اس میں ان کی عزت کا بھی سوال ہے۔ میں تمہاری محبت کی خاطر ان کی عزت داؤ پر نہیں لگا سکتی......“

”ٹھیک ہے، عذرا! اگر تمہارا یہی فیصلہ ہے تو میں بھی تمہیں مجبور نہیں کروں گا لیکن ایک بات طے ہے کہ میں اپنے والدین کو اس رشتے پر راضی کرنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔ اگر وہ نہ راضی ہوئے تو میں رفعت سے بھی شادی نہیں کروں گا اور نہ ہی آئندہ تمہاری زندگی میں آؤں گا......“

فواد نے سپاٹ لہجے میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔ عذرا شش و پنج میں پڑ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنے خاندان کی عزت کو بچانے کے لئے فواد کی سچی محبت سے منحرف ہو جائے یا بہن کا دامن کانٹوں سے بھر کر اپنی مانگ میں سہاگ کا سیندور رچا لے۔

سنجیدہ آپا بھی بیٹے کی خودکشی کے قدم کی وجہ سے کچھ بجھ سی گئی تھیں۔ وہ اب فواد کی زندگی کا فیصلہ اس کی پسند اور مرضی کے مطابق ہی کرنا چاہتی تھیں۔ اسی لئے انہوں نے ہاجرہ کو ساری صورت حال بتا دی پھر بڑی عاجزی سے بہن کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے بولیں۔

”دیکھو، بہن میرا اس میں کوئی قصور نہیں۔ تم جانتی ہی ہو کہ فواد بیٹے نے جذبات میں آ کر خودکشی جیسا انتہائی قدم اٹھایا۔ میرا ایک ہی بیٹا ہے، اگر اسے کچھ ہو جاتا تو میں تمام زندگی اپنے آپ کو معاف نہ کرتی۔ اب حالات کا تقاضا یہی ہے کہ ہم اولاد کی خوشیوں کی خاطر اس کی پسند کو ترجیح دیں۔ اس لئے میں رفعت کی بجائے عذرا بیٹی کے رشتے کا مطالبہ کر رہی ہوں، امید ہے کہ تم پہلے طرح میرا مان ضرور رکھو گی۔“

ہاجرہ بیگم مقدر سے لڑتے لڑتے تھک گئی تھی، اس نے یہ سمجھ لیا تھا کہ وہ مقدر کے لکھے کو ٹال نہیں سکتی اور اس کا فیصلہ پتھر کی لکیر ہوتا ہے۔ عذرا کے حسن و خوبصورتی اور خوب سیرتی کی بدولت ہر کوئی اسے اپنانا چاہتا تھا۔ ماسٹر کریم اور ہاجرہ بیگم کی کوششوں کے باوجود ان کے مقاصد پورے نہ ہو رہے تھے چنانچہ انہوں نے اس فیصلے کو تقدیر کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیا لیکن ایک شرط رکھ دی کہ ہاجرہ کے بیٹے ناصر کا نکاح فواد کی بہن یاسمین سے کیا جائے۔ اس رشتے کو بھی سب نے قبول کر لیا چنانچہ عذرا اور فواد کی شادی کے ساتھ ہی یاسمین اور ناصر کا نکاح کر دیا گیا، یوں وہ دونوں گھرانے رشتوں کی مضبوط ڈوری میں

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

بندھ گئے۔ کوئی فاصلہ اور دوری نہ رہی۔ سب آپس میں خوش اور مطمئن تھے۔ پھر چھ ماہ بعد ہی یاسمین کی رخصتی بھی کر دی گئی۔

دوسال مزید گزر گئے۔

عذرا اور فواد کی زندگی جنت کا نمونہ بن گئی تھی۔ انہوں نے جو سوچا تھا، وہ پورا ہو گیا تھا۔ وہ زندگی کی بھرپور مسرتوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے مگر ان کے گلشن میں کوئی پھول نہ کھل سکا۔ اس محرومی کو عذرا بھی محسوس کرتی تھی مگر وہ بھی جانتی تھی کہ یہ سب کچھ قدرت کے اختیار میں ہے۔ اگر اسے منظور ہوا تو اس کا دامن مراد ضرور بھرے گا، وہ اس ذات باری تعالیٰ کی رحمتوں سے مایوس نہیں تھی۔ اس کمی کو اس کی ساس اور نند نے بھی محسوس کیا تھا اور دبے دبے لفظوں میں اس کا اظہار کرتی رہتی تھیں لیکن بے چاری عذرا بھلا اس سلسلے میں کیا کر سکتی تھی، وہ تو اس محرومی کو تقدیر کا لکھا سمجھتی تھی۔ پھر ساس نے پیروں فقیروں کے پاس جا کر اس کے لئے تعویذ گنڈے کروائے، مزاروں پر جا کر منتیں مانیں، چڑھاوے چڑھائے مگر عذرا کی گود سونی کی سونی رہی۔

دوسال مزید گزر گئے۔

ان گزرے چار برس میں فواد کے سر سے عشق کا بھوت اتر چکا تھا اور اب وہ بھی اپنی ماں اور بہن کے اشارے پر چلتا تھا۔ ان ہی دنوں یاسمین دوسرے بچے کی ماں بننے والی تھی، زچگی کے دن قریب تھے اس لئے وہ اپنے میکے آئی ہوئی تھی۔ وہ دونوں ماں بیٹی صبح و شام اٹھتے بیٹھتے عذرا کو طعنے دیتیں۔ وہ کہتیں کہ اگر عذرا کی میڈیکل رپورٹس ٹھیک ہیں تو پھر چار سال گزر جانے کے باوجود بھی اس کی کوکھ خالی کیوں ہے۔

عذرا ان کے طعنے اور کوسنے خاموشی سے سنتی اور اندر ہی اندر سلگتی رہتی۔ اس نے خالص مشرقی تہذیب اور اسلامی ماحول میں پرورش پائی تھی، دینی احکامات کی بھرپور پیروی کرتی آئی تھی لہٰذا وہ ساس یا نند سے کوئی ایسا لڑائی جھگڑا نہیں کرنا چاہتی تھی جس سے اس کے کردار پر کوئی حرف آتا یا بہ الفاظ دیگر وہ گستاخ یا منہ پھٹ، زبان دراز ٹھہرائی جاتی۔ وہ صبر و تحمل کا بھرپور مظاہرہ کرتی البتہ وہ ان کے رویئے پر حیران ضرور تھی، اسے یقین نہیں آتا تھا کہ خونی رشتے ایسے بے حس اور بے مروت بھی ہو سکتے ہیں۔ شوہر جیسے مٹی کا مادھو بنا ہوا تھا، وہ کچھ سنتا تھا اور نہ دیکھتا تھا۔ عذرا اس کے سامنے اس کی بہن اور ماں کا شکوہ بھی نہ کرتی تھی کہ شکوہ چغلی اور غیبت کے زمرے میں آتا تھا۔ پھر بھی ایک روز اس نے ڈرتے ڈرتے شوہر سے پوچھا۔

”کیا آپ دوسری شادی کر رہے ہیں؟“

اس سوال پر فواد نے اسے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا، پھر بے پروائی سے شانے اچکا کر بولا۔ ”ہاں...... لیکن تمہیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔“

یہ سن کر عذرا کا دل بیٹھ سا گیا، وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ فواد کی محبت اتنی جلدی نفرت میں بدل جائے گی۔ وہ تو اس کے بغیر اپنے آپ کو ادھورا سمجھتا تھا اور اس کے بغیر زندگی پر موت کو ترجیح دیتا تھا مگر آج اس کا رویہ دیکھ کر عذرا کے اعتماد کا نازک آبگینہ چکنا چور ہو گیا۔ وہ اسے مجازی خدا سمجھتی تھی مگر اس کا ایک ہی جملہ سن کر عذرا نے اپنے دل میں اس کی شخصیت کا جو بت تراشا تھا، وہ پاش پاش ہو گیا...... فواد کی آواز اس کے پردہ سماعت سے ٹکرائی۔

”میں جانتا تھا کہ میرے اسے فیصلے سے تمہیں بہت دکھ پہنچے گا لیکن میں ایسا کرنے پر مجبور ہوں...... امی اور ابو کی خواہش ہے کہ ہمارے گھر بھی ایک آدھ چراغ روشن ہو، انہیں اس آنگن کی اداسیاں اور ویرانیاں اچھی نہیں لگتیں اور تم یہ بات بھی بخوبی جانتی ہو کہ ہمیں اپنے خاندان کا نام لیوا چاہیے جو ہمارے بعد شناخت ہو۔“

عذرا اپنے اندر کی ٹوٹ پھوٹ پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے بمشکل تمام اپنے دل کی بے ترتیب دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”میں ہر حال میں آپ کی اور آپ کے خاندان کی عزت اور نیک نامی چاہتی ہوں، بے شک اس کے لئے مجھے ایک سوتن کا وجود ہی کیوں نہ گوارہ کرنا پڑے مگر میری ایک گزارش ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ لیڈی ڈاکٹر نے میرا میڈیکل چیک اپ کیا اور اس نے جو رپورٹ دی وہ سو فیصد پازیٹو ہے، کوئی ایسا نقص یا خرابی نہیں جس کی

وجہ سے میں ماں نہ بن سکوں۔ یہ تو بہر حال قدرت کا فیصلہ ہے کہ وہ ہمیں اس نعمت سے خالی رکھنا چاہتی ہے لیکن اس کی نعمت حاصل کرنے کے لئے ہمارا بھی کچھ فرض بنتا ہے۔ ہمیں صرف اس کی ذات پر الزام عائد نہیں کرنا چاہئے بلکہ اپنی جستجو بھی جاری رکھیں......"

"تم کہنا کیا چاہتی ہو؟" فواد نے تیز نظروں سے اسے گھورا۔

اس کے چہرے پر ناگوری کے تاثرات دیکھ کر عذرا نے جلدی سے کہا۔ "بخدا، آپ مجھے غلط نہ سمجھیں۔ میں جو بھی کہہ رہی ہوں، وہ آپ کی بھلائی کے لئے ہے...... میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ممکن ہے جو نقص یا خامی مجھ میں نہیں وہ آپ میں ہو۔ آپ بھی اپنی اور میری بلکہ سب گھر والوں کی تسلی کے لئے ایک مرتبہ اپنا میڈیکل چیک اپ کروالیں شاید......"

"کیا......" فواد اس کی بات کاٹ کر زور سے دہاڑا۔ "اب تم مجھے قصوروار ٹھہرانا چاہتی ہو؟"

"میں یہ نہیں کہہ رہی ہوں کہ اس میں قصور آپ کا ہے۔ میں تو صرف یہ چاہتی ہوں کہ آپ بے شک اپنے اطمینان کی خاطر ہی سہی، ایک دفعہ اپنا چیک اپ ضرور کروائیں۔" عذرا نے نہایت ہی صاف گوئی سے کہا۔

فواد شاید اس بات پر کبھی راضی نہ ہوتا مگر اس کی ماں نے اسے مجبور کردیا کہ وہ بھی اپنا چیک اپ کروالے تاکہ عذرا کو تسلی ہوجائے، پھر وہ بے شک عذرا کو اپنے راستے کا کانٹا سمجھ کر ہٹا دے اور دوسری شادی کرلے۔ فواد کو اپنے آپ پر بھرپور اعتماد تھا لہٰذا اس نے سوچا کہ چیک اپ کروانے میں کیا حرج ہے...... انسان بڑا خود فریب ہے۔ اپنے آپ کو فریب دیتا رہتا ہے کہ اس کی طاقت کا مقابلہ کوئی نہیں کرسکتا۔ اس طاقت کے غرور میں وہ یہ بھی بھول جاتا ہے کہ خدا سے بڑی طاقت کوئی نہیں۔ خدا ایسے مغرور کو جب منہ کے بل گرنے پر مجبور کر دیتا ہے تو اس کی ساری طاقت دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ وہ جو باہر سے اپنے آپ کو طاقتور مرد کہتا ہے، اندر سے بالکل کھوکھلا ہوتا ہے...... فواد نے جب اپنا چیک اپ کروایا تو انکشاف ہوا کہ وہ اولاد پیدا کرنے کی صلاحیتوں سے محروم ہے۔ اس تلخ انکشاف نے فواد کو ہلا کر رکھ دیا، اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ جو عذرا میں نقص نکالتا تھا، خود اس صلاحیت سے محروم ہوگا۔ تصورات میں اسے عذرا کے بھیانک قہقہے سنائی دے رہے تھے، ایک عورت کے سامنے اس کی مردانگی مجروح ہورہی تھی اور وہ اپنی بیوی اور گھر والوں کے سامنے اتنی بڑی شرمندگی برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ اس سے بچنے کا ایک ہی راستہ تھا کہ وہ گھر والوں اور عذرا کو حقیقت نہ بتاتا اور اس نے ایسا ہی کیا۔ ماں نے جب اس بابت دریافت کیا تو اس نے کہا کہ وہ ڈاکٹر کے پاس گیا تھا۔ ڈاکٹر نے مثبت رپورٹ دی ہے۔

"میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ اس پیڑ سے پھل کی توقع نہ رکھ۔" سنجیدہ آپا نے نفرت اور تلخی سے کہا۔ "ارے وہ تو تیرے سر پر عشق کا بھوت سوار تھا...... خیر، اب چھوڑو ان باتوں کو، مجھے صرف ایک پوتے یا پوتی کی ضرورت ہے، اس کے لئے اگر مجھے عذرا کو طلاق بھی دلوانا پڑی تو میں وہ بھی کر گزروں گی۔ آخر ہم اسے کب تک برداشت کریں کہ جس نے ہمیں ایک ذرا سی بھی خوشی نہیں دی۔"

"امی! یہ بھی تو سوچیں کہ عذرا کو طلاق دینے سے میری بہن کا گھر بھی اجڑ جائے گا......" فواد نے اپنے اضطراب کو چھپاتے ہوئے کہا۔

"میری بات سمجھنے کی کوشش کرو......" ماں نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی۔ "یاسمین تو پہلے بھی اس گھر میں خوش نہیں۔ وہاں نہ ڈھنگ کا کپڑا پہننے کو ملتا ہے اور نہ پیٹ بھر کر کھانا نصیب ہوتا ہے بلکہ اسے کبھی دوسرے گھر والوں کے ساتھ کئی کئی روز کے فاقے کاٹنے پڑتے ہیں۔ اس سے تو بہتر ہے کہ وہ بھی ہماری بیٹی کو طلاق دے ڈالیں۔"

وہ کیسی بے حس اور سنگدل ماں تھی جو بیٹے کی خوشیوں کے لئے بیٹی کا گھر برباد کرنا چاہتی تھی۔ یہ صرف اس کی ہی خواہش نہ تھی بلکہ یاسمین بھی یہی چاہتی تھی کہ وہ اس مذہبی گھرانے کی پابندیوں سے آزاد ہوجائے۔ ماسٹر کریم کے گھر میں عورت کو چاردیواری سے نکل کر گھومنے پھرنے کی اجازت نہ تھی اس لئے وہ ہر وقت اپنے شوہر اور ساس نندوں سے لڑتی جھگڑتی

RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

رہتی اور کبھی ان سے ناراض ہو کر میکے آجاتی۔ وہ سسرال کے ماحول میں خود ایڈجسٹ نہ کر پائی تھی۔ دونوں گھروں کے ماحول میں اچھی خاصی تلخی پیدا ہو چلی تھی۔ یاسمین اپنے میکے آکر عذرا کی زندگی اجیرن کر دیتی تھی، مگر آفرین ہے عذرا پر جس نے آج تک شکوے کا ایک لفظ بھی زبان پر نہ آنے دیا تھا۔ اس کے صبر وضبط کی داد دینی چاہئے کہ وہ ان لوگوں کے طعنے اور جلی کٹی سن کر بھی شکوہ نہ کرتی بلکہ عجز وانکساری سے کہتی تھی کہ اگر اس سے کوئی گستاخی ہو گئی ہو، تو اسے معاف کر دیا جائے۔ ایسا وہ اس لئے کرتی تھی کہ ان کی ناراضگی سے اسے شوہر کی ناراضگی کا خوف تھا اور شوہر تو مجازی خدا تھا…… عذرا یہ سمجھ رہی تھی کہ خدا نے اسے آزمائش میں مبتلا کیا ہے، وہ ایک روز ضرور سرخرو ہو گی۔ اسی آس میں وہ سسرال کے تلخ رویے کو چپ چاپ برداشت کرتی رہی۔ اب تو اس کی ساس اور نند کے ساتھ شوہر بھی اسے بانجھ ہونے کے طعنے دینے لگا تھا۔ ان لوگوں نے مل جل کر خوب پریشان کیا بلکہ اس کا جینا دوبھر کر دیا۔ شوہر ذرا ذرا سی بات پر لڑنے لگتا اور ساس کہتی کہ یہ ہم پر بوجھ بنی ہوئی ہے، اسے آزاد کر دو۔ نند طعنہ دیتی کہ عورت کی عزت اس کے بچے سے ہوتی ہے، بے اولاد کو گھر میں رکھنے سے بہتر ہے کہ کوئی پھل دار درخت گھر میں لگا لیا جائے۔

انہوں نے عذرا کا جینا دوبھر کر دیا تھا۔ اتنے طعنے سن کر بھی وہ ان سے شکوہ نہیں کرتی تھی اور نہ ہی ان کے خلاف دل میں کوئی میل رکھتی تھی۔ ایک فطری سا ردعمل فواد کی جانب سے یہ بھی تھا کہ ان کے ازدواجی تعلقات نہ ہونے کے برابر رہ گئے تھے اور ایک کمزور سے لمحے میں فواد کے منہ نکل گیا تھا کہ اس کی میڈیکل رپورٹ حوصلہ افزا نہیں، وہ اولاد پیدا کرنے کی نعمت سے محروم ہے۔ عذرا نے جھجکتے ہوئے کہا۔

”آپ سے مجھے کوئی شکوہ نہیں مگر کم از کم میں آپ سے اتنا پوچھنے کا حق تو رکھتی ہوں کہ آپ نے حقیقت مجھ سے کیوں چھپائی، پھر گھر والوں کو بھی اس کا علم نہیں اسی لئے وہ بات بات پر مجھے طعنے دیتے ہیں……“

فواد نے اسے خونخوار نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”نہیں، عذرا! میں کسی کی نظروں میں ذلیل نہیں ہونا چاہتا۔ میری ماں، میرا باپ، میری بہن سب اس حقیقت سے ناواقف ہیں اور یہ یاد رکھو، اگر تم نے ان کے سامنے اپنی زبان کھولی تو اس کا انجام بہت برا ہوگا۔“

اس دن کے بعد سے عذرا کو مارنے پیٹنے بھی لگا۔ کبھی وہ اسے یہ طعنہ دیتا کہ اس کے کسی غیر مرد سے ناجائز تعلقات ہیں۔ اس کی ماں اور بہن بھی یہی کہتی رہتیں کہ عذرا کا تو کسی اور کے ساتھ یارانہ تھا مگر بدقسمتی سے اس کی شادی فواد سے ہو گئی۔ عذرا انہی گندے چھینٹوں سے اپنا دامن کو بچاتی آئی تھی لیکن اب تو اس کے صبر کی بھی انتہا ہو گئی تھی۔ ایک روز اس نے اپنی صفائی میں کچھ کہہ دیا پھر وہ اس کی مار کھاتے کھاتے بے ہوش ہو گئی۔ جب ہوش میں آئی تو فواد نے اس کے ہاتھ میں طلاق کے کاغذ پکڑا کر اسے گھر سے نکال دیا۔ وہ اپنے ارمانوں کے لاشے کو گھسیٹتی ہوئی والدین کی دہلیز پر پہنچی تو اس کی ماں اسے اجڑی ہوئی حالت میں دیکھتے ہی اپنے حواس کھو بیٹھی۔ باپ بھی اس المیے پر اندر ہی اندر خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ بھائی کو پتہ چلا تو اس کا خون کھول اٹھا، وہ غصے سے بولا۔

”ان لوگوں نے ہماری شرافت سے ناجائز فائدہ اٹھایا ہے لیکن اب میں بھی انہیں چین اور سکون سے نہیں جینے دوں گا، میں بھی یاسمین کو طلاق دے دوں گا۔“

”نہیں، ناصر بھائی! آپ ایسا نہیں کریں گے۔“ عذرا نے فوراً ہی اسے ٹوکا۔ ”ان لوگوں نے تو مجھے صرف اس لئے طلاق دی ہے کہ میں ماں نہ بن سکی تھی مگر یاسمین بھابی تو اب ماشاء اللہ دو بچوں کی ماں ہے۔ کیا تم ان بچوں کو بھی ماں کے سائے سے محروم کر دو گے؟“

”میں جانتا ہوں کہ بچے میرے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ہیں مگر انہوں نے بھی تو تم پر ظلم کیا ہے، اس ظلم کی سزا انہیں ملنی چاہئے۔“

”مگر اس معاملے میں بچوں کا تو کوئی قصور نہیں۔ تم انہیں ان کی ماں سے چھینو گے یا خود ان سے محروم ہو جاؤ گے، معصوم کسی ایک کے سائے میں پروان چڑھیں گے تو دوسرے کی کمی محسوس کریں گے۔ عذرا کے لہجے میں کرب تھا۔ اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”بھائی! میں تمہیں ان بچوں پر ظلم

کرنے کی اجازت نہ دوں گی اور نہ ہی ایک اپنے جیسی عورت کے ماتھے پر طلاق کا لیبل سجنے دوں گی۔ خدا نے اگر مجھے اس آزمائش میں ڈالا ہے تو میں کیوں خواہ مخواہ دوسروں کی زندگی اجیرن کروں۔ خدا ہمیں صبر کرنا سکھاتا ہے اور مجھے بھی صبر کرنا چاہئے۔“

واقعی وہ صابر وشاکر تھی۔ اس پر اتنی بڑی قیامت آ کر گزر گئی تھی مگر وہ یہی کہتی تھی کہ یہ سب کچھ میری قسمت میں تھا۔ یاسمین کے والدین اور بھائی نے بھی کوشش کی کہ ان کی بیٹی کو بھی طلاق ہوجائے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے اپنی بیٹی کو کئی ماہ تک اپنے گھر بٹھائے رکھا مگر عذرا نے ان کی طلاق کی خواہش پوری نہ ہونے دی۔ دراصل وہ انہیں سمجھانا چاہتی تھی کہ ظلم کا جواب ظلم ہی نہیں ہوتا۔ یہ اس کے صبر کی انتہا تھی کہ وہ ان کے ظلم وستم سہہ کر بھی ان کی بیٹی کا بھلا سوچ رہی تھی۔ اگرچہ وہ بہت زیادہ صبر وضبط کا مظاہرہ کر رہی تھی مگر آخر کو وہ بھی ایک عورت تھی، اس کے اندر کسی گوشے میں ہلکا سا احساس محرومی تھا یا شاید لاشعور میں یہ بات چھپی ہوئی تھی کہ وہ ٹھکرائی گئی ہے۔ ٹھکرائے جانے کا احساس اسے اندر ہی اندر کچوکے لگاتا رہتا تھا۔ اس احساس نے اسے مرد ذات سے بدظن کردیا تھا۔ زندگی کا یہ تلخ تجربہ اس کے دل ودماغ پر گہرے اثرات چھوڑ گیا تھا اور اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ اب تمام زندگی شادی نہیں کرے گی۔ اب اس کی ایک ہی خواہش تھی کہ وہ اپنی باقی زندگی دوسروں کے لئے وقف کردے۔ وہ کوئی چھوٹی موٹی ملازمت کرکے خود کو مصروف رکھنا چاہتی تھی۔ ادھر جب اس کے گھر والوں کو علم ہوا کہ وہ ملازمت کرنا چاہتی ہے تو باپ نے کہا۔

”بیٹی! ہمارے خاندان میں لڑکیوں کو تعلیم تو دلوائی جاسکتی ہے مگر ان کا کہیں نوکری کرنا نہایت ہی معیوب سمجھا جاتا ہے کیونکہ نوکری کرنے کے لئے گھر کی چار دیواری سے باہر قدم رکھنا پڑتا ہے اور پھر غیر مردوں سے بھی واسطہ پڑتا ہے جبکہ ہم عورت کو بے حجاب ہونے یا اس کے کسی نامحرم سے تعلق رکھنے کو سخت برا سمجھتے ہیں۔“

عذرا نے جواب دیا۔ ”ابو! میں اپنے خاندان کے اصولوں

آنچل کی جانب سے ایک اور آنچل
ماہنامہ
حجاب
کراچی
اگلا شمارہ ان شاء اللہ
سالگرہ نمبر ہوگا

ملک کی مشہور معروف قلمکاروں کے سلسلے وار ناول، ناولٹ اور افسانوں سے آراستہ ایک مکمل جریدہ گھر بھر کی دلچسپی صرف ایک ہی رسالے میں موجود جو آپ کی آسودگی کا باعث بنے گا اور وہ صرف ”**حجاب**“ آج ہی ہاکر سے کہہ کر اپنی کاپی بک کرالیں۔

سالگرہ نمبر میں شامل ہونے کیلئے بہنیں جلد از جلد اپنی نگارشات ادارے کو بذریعہ ڈاک یا ای میل بھیجیں۔

خوب صورت اشعار منتخب غزلوں
اور اقتباسات پر مبنی مستقل سلسلے

اور بہت کچھ آپ کی پسند اور آرا کے مطابق

Infoohijab@gmail.com
info@aanchal.com.pk
کسی بھی قسم کی شکایت کی صورت میں
021-35620771/2
0300-8264242

کو سمجھتی ہوں، بخدا میں ایسا کوئی قدم نہ اٹھاؤں گی جو آپ لوگوں کی گردنیں دوسروں کے سامنے جھکا دے۔" اس نے اک ذرا توقف کیا۔ پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔

"ہمارے ہاں عام دفاتر میں خواتین بھی مردوں کے ساتھ شانہ بشانہ کام کرتی ہیں لیکن میں اپنے خاندان کی عزت و ناموس کی خاطر کسی ایسی جگہ کام نہیں کروں گی جہاں غیر مردوں سے واسطہ رکھنا پڑے...... میں ٹیچنگ کا باعزت شعبہ اختیار کرنا چاہتی ہوں۔"

والدین اسے کہیں بھی ملازمت نہیں کروانا چاہتے تھے۔ انہیں لوگوں کے طعنوں کا خوف تھا، وہ بیٹی کی کمائی کو اپنے اوپر حرام سمجھتے تھے لیکن بیٹی کی ضد کے آگے بالآخر انہیں ہتھیار ڈالنا ہی پڑے۔ عذرا نے میٹرک کے بعد پی ٹی سی کا کورس کیا تھا چنانچہ اس نے ایک پرائمری سکول میں سروس جائن کر لی۔ اس دوران یاسمین کو خاندان والے سمجھا بجھا کر گھر لے آئے تھے۔ یاسمین نے عذرا پر ظلم کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی اور اسے طلاق دلوانے میں بھی اسے کا ہاتھ تھا، اب وہ اپنے رویئے پر سخت نادم تھی اور اپنی غلطی پر پچھتا رہی تھی۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ عورت کی اصلی جگہ اس کے شوہر کے قدموں میں ہوتی ہے۔ وہ عذرا کی محبت اور اعلیٰ ظرفی کی قائل ہو گئی تھی جس نے خود ظلم برداشت کیے تھے مگر اس کا گھر نہیں اجڑنے دیا تھا۔ عذرا نے اس کی تمام زیادتیوں اور غلطیوں کو معاف کر دیا تھا اور اسے سینے سے لگاتے ہوئے کہا تھا۔

"میری بہن! عورت کا اصل مقام شوہر کی چار دیواری کے اندر ہے اور شوہر ہی اسے تحفظ دے سکتا ہے۔"

جس قصبے کے اسکول میں عذرا کی تعیناتی ہوئی تھی وہ اس کے گھر سے کم از کم تیس پینتیس کلومیٹر کے فاصلے پر تھا اور اسے وہاں روزانہ آنے جانے میں اچھی خاصی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا لہٰذا اس نے قصبے کے نمبردار کے گھر میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ نمبردار اسے اپنی بیٹی ہی سمجھتا تھا۔ اس کا ایک ہی بیٹا تھا۔ جب سے عذرا نے اس کے گھر میں رہائش اختیار کی تھی، نمبردار نے بیٹے کو حکم دیا تھا کہ وہ مال مویشیوں والی حویلی میں جا کر رہے اور اگر اسے گھر آنا بھی ہو تو اجازت لے کر آئے کیونکہ عذرا پردہ کرتی تھی۔

وقت کا پنچھی اپنی سمت میں محو پرواز رہا۔ عذرا نے اب تمام زندگی دوسری شادی نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور اسی لئے اس نے ملازمت اختیار کی تھی کہ وہ اپنے گھر والوں پر بھی بوجھ نہ بنے اور اپنی باقی ماندہ زندگی نئی نسل کو علم کی روشنی دینے میں صرف کر دے۔ اس دوران اس کی دونوں بہنوں کی یکے بعد دیگرے شادیاں ہو گئی تھیں اور وہ اپنے اپنے گھروں میں خوش و خرم زندگی بسر کر رہی تھیں۔ اب اس کے والدین عذرا کے لئے فکرمند تھے کیونکہ وہ اب بھی خوب صورت اور بھرپور جوان تھی۔ اسے دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہتا تھا کہ وہ طلاق یافتہ ہے۔ والدین کو یہ ڈر تھا کہ جوان بیٹی دوسری جگہ جا کر ملازمت کرتی ہے اور غیروں کے پاس رہتی ہے، کہیں دنیا والے اس کے متعلق غلط رائے نہ قائم کر لیں۔ اسی لئے والدین نے سوچا کہ وہ اس رسوائی کا سامنا کرنے سے پہلے ہی عذرا کی شادی کر دیں۔ اس کا رشتہ ڈھونڈنے کی انہیں ہرگز ضرورت نہ تھی کیونکہ اب بھی عذرا کے بہت سے طلب گار تھے حالانکہ وہ ایک مطلقہ تھی۔ اس کے لئے بڑے بڑے گھرانوں کے رشتے آتے مگر اس نے اپنے والدین کو صاف طور پر کہہ دیا کہ وہ اب دوسری شادی کر کے کوئی اور تلخ تجربہ نہیں کرنا چاہتی۔ اس کا انکار سن کر والدین بے چارے خاموش ہو جاتے مگر آخر کب تک خاموش رہتے؟ ہفتہ دس دن کے بعد جب بیٹی گھر آتی تو اسے دیکھ کر وہ اپنے سینے پر ایک بھاری بوجھ محسوس کرنے لگتے، اس کے حسن و جوانی سے انہیں خوف سا محسوس ہونے لگتا۔ وہ جب بھی گھر آتی تھی یا پھر واپس اپنی ڈیوٹی پر جاتی تو اکثر تنہا ہی ہوتی۔ والدین کو ڈر تھا کہ کہیں راستے میں اس کے ساتھ کوئی غیر معمولی بات نہ ہو جائے جو جوان کی بدنامی اور رسوائی کا باعث بنے کیونکہ زمانے کی نیت بدلتے دیر نہیں لگتی۔ یہی خیال ماں باپ کے لئے جان لیوا تھا، آخر عذرا کے انکار کے باوجود اس کے ماں باپ نے یہ قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ اگرچہ یہ بات خلاف شریعت ہے کہ لڑکے یا لڑکی کی مرضی کے بغیر اس کی شادی کی جائے مگر عذرا کے والدین بدنامی کا طوق گلے میں پہننے سے پہلے ہی اپنی عزت کو تحفظ دینا

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

چاہتے تھے اور عذرا کو یہ تحفظ ایک شوہر کی چار دیواری میں ہی مل سکتا تھا...... نمبر دار رحمت اللہ جس کے گھر میں عذرا نے عارضی رہائش رکھی ہوئی تھی، اسے اپنی بیٹی کہتا تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کے لئے عذرا کے والدین کو پیغام بھجوایا۔ اگلی مرتبہ جب وہ چھٹی گزارنے کے لئے گھر آئی تو انہوں نے اسے پاس بٹھالیا۔ ماں نے بیٹی کو سمجھانے کے انداز میں کہا۔

”دیکھو، میری بیٹی ! عورت بغیر مرد کے سہارے کے ادھوری ہوتی ہے۔ وہ خواہ کتنا ہی خود کو طاقتور سمجھنے لگے مگر وہ پھر بھی کمزور ہی رہتی ہے اور خود کفیل ہونے کے باوجود اسے کسی مرد کے مضبوط سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ اس کے سہارے کے بغیر نہ تو عزت سے جی سکتی ہے اور غیر محفوظ بھی ہوتی ہے......“

”دیکھو، بیٹی! ہم اپنی عمر کی اس اسٹیج پر پہنچ گئے ہیں جہاں بڑھاپا بھی دم توڑ جاتا ہے اور موت قریب تر دکھائی دیتی ہے۔ ہمیں اب اپنے آپ پر بھروسہ نہیں رہا، نجانے کب اجل نامہ آجائے لیکن اس سے پہلے ہی تمہاری طرف سے مطمئن ہونا چاہتے ہیں۔“ باپ نے بھی اسے باتوں ہی باتوں میں سمجھانے کی کوشش کی۔

”آپ لوگ کہنا کیا چاہتے ہیں......؟“ عذرا نے الجھے ہوئے انداز میں باری باری دونوں کی طرف دیکھا۔

ہاجرہ بی بی ایک طویل اور گہری سانس لے کر بولی۔ ”بیٹی! ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ تمہاری ہی بہتری کے لئے ہے۔ ہماری دلی خواہش ہے کہ تمہارا گھر بس جائے۔ تم تنہا کب تک حالات کا مقابلہ کروگی۔ تمہارے سامنے پہاڑ سی زندگی ہے، تم اکیلی یہ کیسے گزاروگی...... تمہارا بھائی اور بھاوج جواب تم سے اپنائیت اور چاہت کا اظہار کرتے ہیں، ممکن ہے کہ ہماری آنکھیں بند ہوتے ہی وہ بھی تم سے نظریں پھیر لیں۔ پھر تم تنہا کہاں جاؤگی۔ بھیڑیوں کے جنگل میں اپنے آپ کو کیسے محفوظ رکھ سکوگی......؟“

”میں آپ کا کوئی بھی حکم نہیں ٹال سکتی۔ پہلے بھی میں نے آپ کے فیصلے کو بسروچشم قبول کیا تھا، اب دوسری دفعہ بھی اسے قبول کرلوں گی لیکن نتیجہ کیا ہوگا، وہ بھی آپ اچھی طرح

آنچل کی جانب سے ایک اور آنچل

ماہنامہ
حجاب
کراچی

اگلا شمارہ ان شاء اللہ
سالگرہ نمبر ہوگا

ملک کی مشہور معروف قلمکاروں کے سلسلے وار ناول، ناولٹ اور افسانوں سے آراستہ ایک مکمل جریدہ گھر بھر کی دلچسپی صرف ایک ہی رسالے میں موجود جو آپ کی آسودگی کا باعث بنے گا اور وہ صرف **”حجاب“**
آج ہی ہاکر سے کہہ کر اپنی کاپی بک کرالیں۔

سالگرہ نمبر میں شامل ہونے کیلئے بہنیں جلد از جلد اپنی نگارشات ادارے کو بذریعہ ڈاک یا ای میل بھیجیں۔

خوب صورت اشعار منتخب غزلوں
اور اقتباسات پر مبنی مستقل سلسلے

اور بہت کچھ آپ کی پسند اور آرا کے مطابق

Infoohijab@gmail.com
info@aanchal.com.pk

کسی بھی قسم کی شکایت کی صورت میں
021-35620771/2
0300-8264242

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

آبِ حیات
عمیرہ احمد
نمل
نمرہ احمد
مصحف
نمرہ احمد
جنّت کے پتے
نمرہ احمد
عبداللہ
ہاشم ندیم
بن روئے آنسو
فرحت اشتیاق
داستان ایمان فروشوں کی
جلد اول
التمش
ہم سفر
فرحت اشتیاق
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو
فرحت اشتیاق
من و سلویٰ
عمیرہ احمد
متاعِ جاں ہے تو
فرحت اشتیاق
پیرِ کامل
عمیرہ احمد
قراقرم کا تاج محل
نمرہ احمد
ٹوٹا ہوا تارہ
سمیرا شریف طور
یارم
سمیرا حمید
خدا اور محبت
ہاشم ندیم
WWW.PAKSOCIETY.COM
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com

http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com

جانتے ہیں...... ہم عورتیں کٹھ پتلیاں ہوتی ہیں جو کبھی حالات کے ہاتھوں ناچتی ہیں اور کبھی مرد کی خواہشات انہیں نچاتی ہیں۔"

"سب مرد ایک جیسے نہیں ہوتے، عذرا بیٹی......!" باپ نے اصل مدعا بیان کرنے کے لئے تمہید باندھی۔ "جس طرح ہاتھ کی پانچ انگلیاں برابر نہیں ہوتیں اسی طرح تمام مرد برے نہیں ہوتے۔ کسی میں خامیاں ہوتی ہیں اور کسی میں اچھائیاں ......ایسے ہی ایک اچھے انسان نے تمہارا رشتہ مانگا ہے۔" اس نے ایک ذرا توقف کیا، پھر کہا۔ "نمبردار رحمت اللہ نے اپنے بیٹے کے لئے پیغام بھیجا ہے مگر تم یہ بھی جانتی ہو کہ ہم یہ رشتہ تمہاری رضامندی کے بغیر کریں گے۔ جو ہوا، اسے بھول جاؤ، ضروری نہیں کہ ہر دفعہ تمہارے ساتھ یہی سلوک ہو...... بیٹی! اگر تم ہمیں زندگی کے اس مقام دکھ دینا چاہتی ہو تو بے شک اپنی مرضی کرو، ہم تمہیں مجبور نہیں کریں گے لیکن ہماری ایک بات یاد رکھو کہ اچھے رشتے روز روز نہیں ملتے۔ ہمارا تو اب چل چلاؤ کا وقت آ گیا ہے۔ زندگی کا یہ کٹھن سفر تمہیں ہی طے کرنا ہے۔ خوب ٹھنڈے دل سے سوچ لو۔ اگر تم یہ چاہتی ہو کہ ہم سکون سے موت کو گلے لگائیں اور بعد ازاں تم بھی سکون سے اپنی بقیہ زندگی گزارو تو نمبردار کے بیٹے کبیر اللہ کا رشتہ قبول کرلو ۔ ہم تمہیں یقین دلاتے ہیں کہ وہ زندگی کی آخری سانسوں تک تمہیں خوش رکھے گا۔"

عذرا خاموش ہوگئی اور بالآخر اس کی ضد پر والدین کی بوڑھی خواہشات غالب آگئیں، اس نے کبیر اللہ کے رشتے کے لئے ہاں کہہ دی۔

☆☆☆☆☆☆

انسان کو ملتا وہی ہے جو اس کے مقدر میں لکھا ہوتا ہے، اس سے زیادہ کی اگر وہ خواہش بھی کرے تب بھی محروم رہتا ہے کیونکہ یہ سب کچھ اس کی قسمت میں نہیں لکھا ہوتا۔ بعض لوگ ساری زندگی خوشیوں سے مالا مال رہتے ہیں، غم یا دکھ نام کی کوئی چیز ان کے دامن کے قریب تک نہیں آتی اور کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو تمام زندگی خوشیاں اور راحتیں حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کرتے رہتے ہیں اور مگر ناکام و نامراد ہوتے ہیں...... عذرا نے دوسری شادی کی ہامی اس لئے بھری تھی کہ شاید اب اسے کسی کرب و اذیت سے نہ گزرنا پڑے اور اس کی باقی زندگی خوشگوار اور پرسکون گزرے۔ اسے وہ ازدواجی خوشیاں ملیں جن سے وہ پہلے محروم رہی مگر ایسا نہ ہو سکا، اس کے مقدر کی سیاہ رات ابھی باقی تھی۔ شادی کی پہلی رات ہی ایک قیامت اس پر ٹوٹ پڑی۔ سہاگ کی سیج اسے کانٹوں کا بستر معلوم ہونے لگی جب کبیر اللہ نے یہ انکشاف اسکے سامنے کیا۔

"عذرا! میں جانتا ہوں کہ میں نے تمہاری زندگی پر بہت بڑا ظلم کیا ہے۔ میں کبھی بھی ایسا نہ کرتا کیونکہ ایک پاک دامن عورت کے معصوم جذبات اور ارمانوں سے کھیلنے کا مجھے کوئی نہیں پہنچتا تھا لیکن میں بہت مجبور ہو گیا تھا۔ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہونے کی بنا پر میں ان کی خواہش رد نہ کر سکا اور نہ ہی انہیں یہ حقیقت بتا سکا کہ میں شادی کے قابل نہیں ہوں۔ میں نے انہیں ٹالنے کی بہت کوشش کی مگر وہ اپنی محبتوں اور چاہتوں کا حق طلب کرنے لگے اور پھر مجھے مجبور ہار ماننا پڑی...... عذرا! اس میں میرا قصور صرف اتنا ہے کہ میں اپنی شرمندگی کی وجہ سے انہیں اصل بات نہیں بتا سکا تھا اور پھر میں انہیں حقیقت بتا کر ان کی دل آزاری بھی نہیں چاہتا تھا۔ میں تم سے بھی نادم ہوں۔ اگر تم چاہو تو میں آج ہی تمہیں آزاد کر دیتا ہوں تا کہ میرے ضمیر کا بوجھ بھی ہلکا ہو جائے اور تم بھی ساری زندگی اس آگ میں نہ جلتی رہو......"

عذرا، جو اس تلخ انکشاف پر سن ہوگئی تھی، فوراً اس کی بات کاٹ کر بولی۔ "نہیں، اب میں دوسری دفعہ طلاق کا کلنک اپنے ماتھے پر نہیں سجاؤں گی۔ میں تمام زندگی آپ کی باندی بن کر رہوں گی اور آپ کی خدمت کروں گی مگر خدا کے لئے آئندہ مجھے اپنے قدموں سے دور کرنے والی بات بھی نہ کرنا۔ میرے پہلے شوہر نے حقیقت مجھ سے چھپائے رکھی اور مجھے ہی قصوروار ٹھہرا کر طلاق دے ڈالی۔ پھر آپ نے تو مجھ سے کچھ بھی نہیں چھپایا۔ مجھے اعتراف ہے کہ آپ ہی جیسے صاف گو اور حقیقت پسند شوہر کی مجھے تلاش تھی۔

یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ پھر وہ اسے اپنے

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

ماضی کا قصہ سناتے ہوئے بے اختیار ہو گئی۔ کبیر اللہ نے اسے سینے سے لگا لیا اور دلاسہ دینے کی کوشش کرنے لگا۔

☆☆☆☆☆☆☆

عذرا نے خود تو حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا مگر یہ خیال کبھی کبھی اسے ستانے لگتا کہ کیا پھر اسے رد کر دیا جائے گا؟ اس کے آگے اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفقود ہو جاتیں۔ وہ نماز پڑھنے کے بعد خدا کے حضور گڑگڑا کر اس آزمائش پر پورا اترنے کی دعا مانگتی...... پھر اس نے کڑے دل سے ایک فیصلہ کیا اور دبے الفاظ میں یہ کہنا شروع کر دیا کہ وہ بانجھ ہے اور کبھی بھی ماں نہ بن سکے گی۔ عذرا نے محض شوہر کی عزت اور وقار کی خاطر اتنا بڑا طوق اپنے گلے میں ڈالا تھا۔ کبیر اللہ اس وفا کی دیوی کے خلوص اور اعلیٰ ظرف کا گرویدہ ہو گیا تھا۔ وہ کہتا کہ تم نے نہ صرف مجھے زندگی کی حقیقی خوشیاں اور مسرتیں دی ہیں بلکہ میرے گھر والوں کے دل بھی جیت لئے ہیں۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ تم جیسی نیک پروین جس مرد کے گھر میں ہو گی، وہ خوش نصیب ہو گا اور اس کا گھر جنت کا نمونہ کہلائے گا۔

اس طرح ہنستے مسکراتے وہ زندگی کا زہر چپکے چپکے پیتے رہے، حالانکہ دونوں ایک دوسرے کے قریب رہتے ہوئے بھی دور تھے مگر انہوں نے کبھی ایک دوسرے سے ازدواجی خوشیوں سے محرومی کا گلہ نہ کیا تھا...... کئی ماہ و سال بیت گئے۔ اس دوران عذرا کے ساس اور سسر انتقال کر گئے۔ ان کی وفات کے بعد زمین کی دیکھ بھال اور گاؤں کی نمبرداری کے فرائض کبیر اللہ کے کندھوں پر آ پڑی تھی جس کی بدولت اسے اکثر کئی دن اور راتیں گھر سے باہر گزارنا پڑتیں۔ اس کی عدم موجودگی میں تنہا عذرا کو گھر کے در و دیوار کاٹ کھانے کو دوڑتے۔ کبھی کبھی اسے یوں محسوس ہوتا جیسے یہ تنہائی اس کے اندر یاسیت اور ویرانیوں کو جنم دے رہی ہے۔ وہ ایسی مایوس کن سوچوں کو ذہن سے جھٹکتی تھی کیونکہ اسے خدا کی ذات پر کامل یقین تھا وہ اسی پر اکتفا کرنا چاہتی تھی۔ وہ اپنے قلب کو پر سکون رکھنے کے لئے زیادہ تر عبادت میں مصروف رہتی۔

وہ رمضان المبارک کا آخری عشرہ تھا اور ستائیسویں کی شب...... عذرا نماز عشاء اور تراویح سے فارغ ہو کر نوافل ادا کرنے لگی۔ اس رات وہ گھر میں اکیلی ہی تھی۔ کبیر اللہ صبح کے وقت شہر گیا تھا اور جاتے ہوئے بتایا تھا کہ وہ اگلے روز واپس آئے گا۔ اس کے جانے کے بعد عذرا نے ملازمہ کو بھی چھٹی دے دی تھی۔ پھر نجانے رات کے کون سے پہر دو نوافل پڑھتے ہوئے سجدے کی حالت میں گئی تو دوبارہ نہ اٹھ سکی۔ کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ اس اللہ والی کا سجدہ قدرت کو اتنا پسند آیا ہے کہ اس نے اسے سجدے سے اٹھنے نہیں دیا بلکہ اپنے پاس ہی بلا لیا۔

اگلے روز جب اسے دفن کیا جا چکا تھا تو کسی نے اس کی قبر کے قریب سے گزرتے ہوئے ایک پر لطف سی خوشبو محسوس کی۔ پھر اس نے گاؤں آ کر بتایا کہ عذرا کی قبر سے خوشبو آ رہی ہے۔ ہر طرف اس عجیب و غریب معجزے کی دھوم مچ گئی، لوگ دور دور سے اس کی قبر کی زیارت کے لئے آنے لگے۔

کبیر اللہ اس وفا کی دیوی کے مرنے کے بعد اپنی زندگی میں بہت بڑا خلا محسوس کرنے لگا ہے۔ وہ ہر جمعرات کی شام اس کی قبر پر جا کر چراغاں کرتا ہے اور کلام پاک کی تلاوت کر کے اس کی روح کو ایصال ثواب پہنچاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہر ماہ رمضان کی ستائیسویں شب جب وہ عذرا کی قبر کے سرہانے قرآن پاک پڑھ رہا ہوتا ہے، اسے وہاں ویسی ہی خوشبو محسوس ہوتی ہے جیسی اس کی موت کے دوسرے روز محسوس کی گئی تھی۔ لوگ اسے پہنچی ہوئی ہستی کہتے ہیں۔ یہ کوئی بھی نہیں جانتا کہ اس کی زندگی کتنی تلخیوں اور مصائب و آلام کا سامنا کرتے ہوئے گزری لیکن اس نے ہر مقام، ہر آزمائشی مرحلہ میں حوصلہ نہیں ہارا بلکہ دکھوں اور مصیبتوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اس تحمل، بردباری اور صبر و استقامت کی وجہ سے وہ متقی اور پرہیز گاری ٹھہرائی گئی۔ اس کی قبر سے خوشبو اس کی پاکیزگی اور شرافت کی دلیل ہے۔

◆

عشنا کوثر سردار

یہ ناول 1947ء کی ایک کہانی پر مبنی ہے اس ناول کا پلاٹ، اس کے تمام کردار تقریباً 69 سال قبل کے یہ محبت کی ایک کہانی ہے جس نے Partition سے ایک سو سولہ دن قبل جنم لیا، انڈو پاک کی تقسیم جب ہونے جا رہی تھی اس محبت کی کہانی دوران اپنا سفر شروع کیا، جہاں ایک پاک سرزمین کی تاریخ رقم ہوئی ہمیں ایک آزاد مملکت کا احساس ملا وہیں محبت نے دلوں میں گھر بھی کیا، یہ سفر تب شروع ہوتا ہے جب ناول کے دو کردار پہلی بار 18 اپریل 1947ء کو پہلی بار ملے۔ اس سے آگے کی ایک سو سولہ راتیں ان کی ان کہی محبت کا ایک سفر ہے۔ جب تاریخ رقم ہو رہی تھی زمین ٹکڑوں میں تقسیم ہو رہی تھی تب خاموشی میں کہیں محبت دلوں کو جوڑ رہی تھی۔ زمین کی تقسیم نے دلوں کو تقسیم نہیں کیا تھا دلوں کو جوڑ دیا تھا اس تقسیم کی جو صعوبتیں ہماری ان نسلوں نے سہی تھیں ان کا اندازہ ہم نہیں کر سکتے مگر میں نے اس تکلیف کو اپنے اندر محسوس کیا ہے۔ میرے ناول کے کردار ان مصائب سے گزرے ہیں اور ان کے ساتھ میں نے بھی ان مصائب کی تکلیف کو محسوس کیا ہے وہ ڈر...... وہ خوف...... تمام احساسات میرے اندر کہیں مجھے محسوس ہوتے رہے ہیں۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

Downloaded From

Downloaded From paksociety.com

عین النور نے اپنے منگیتر کو دیکھا تھا حیدر اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا تھا۔

"تمہیں اگر اس بندے کی باتوں پر رتی بھر بھی یقین ہوگا تو تم روئے زمین پر بہت بڑی بے وقوف لڑکی ہوگی عین۔" جلال اس کے کان کے قریب منہ کر کے بولا تھا۔ عین نے حیدر سے نگاہ ہٹا کر بھائی کو دیکھا تھا۔

"آپ کو حیدر پر یقین نہیں۔" عین نے حیرت سے بھائی کی سمت دیکھا تھا،

"آپ انکل سراج کی سمت دیکھیے ان کی نظروں کی حیرت کیا بتاتی ہے، انہیں بھی اپنے بیٹے پر یقین نہیں ہے۔" جلال مسکرایا تھا۔

"مذاق مت کریں بھائی، حیدر اب اتنے برے بھی نہیں۔" عین مسکرائی تھی۔

"آل آئی نو دیٹ یہ بندہ تمہارے قابل نہیں ہے۔" جلال نے افسوس سے کہا تھا عین اس کی سمت دیکھ کر رہ گئی تھی، تبھی ابا کی آواز آئی تھی تو عین ان کی سمت متوجہ ہوگئی تھی۔

"ہم تمہارے فیصلے کو سراہتے ہیں برخوردار بات اثاثوں اور آباؤ اجداد کی جائیدادوں اور قبروں کی ہوتی تو ہم یہاں اس زمین پر رہنا چاہتے مگر یہ بات عقائد اور نظریات کی ہے ہم عزت کو فوقیت دینے والوں میں ہیں۔" نواب صاحب مسکرائے تھے۔

"نواب صاحب آپ پہل کریں گے تو دوسرا قدم آپ کے ہمراہ ہمارا ہوگا۔" حکمت صاحب نے ان کی مکمل تائید کرتے ہوئے کہا تھا۔

"اس زمین پر قدم رکھنے کا خواب تو ہمارا بھی ہے ڈیڈ ہم تو اس خبر کو سننے کے منتظر ہیں جیسے ہی خبر آئی ہم اس زمین کی طرف کوچ کر جائیں گے چاہے ہزار مخالفتیں ہوئی یا رکاوٹیں راہ میں حائل ہوئی ہم اس کی پروا نہیں کریں گے رکاوٹوں سے ڈرنا تیمور بہادر یار جنگ نے نہیں سیکھا۔" تیمور ایک عزم سے بولا تھا تو جانے کیوں عین اس کی سمت بغور توجہ سے دیکھنے لگی تھی۔

اس شخص کا لہجہ، اس کی آواز، اس کے الفاظ یا اس کی پرسنالٹی، ایسا کیا تھا جو قابل توجہ تھا اور کیا شے تھی جو اپنے ساتھ باندھتی تھی وہ فوری طور پر جان نہیں پائی تھی۔ تیمور نے اسے اپنی طرف دیکھتے دیکھا تھا۔ وہ اس تصبیح چہرے کو دیکھتا ہوا مسکرایا تھا عین فوراً اس کی سمت سے نگاہ پھیر گئی تھی اور دوسری سمت دیکھنے لگی تھی۔

"ہم یہ رشتہ نہیں کرنا چاہتے عین یہ بات ابا کو بتانا بہت ضروری ہے کیا آپ ابا سے بات کریں گی یا ہم ان کو خود انفارم کردیں؟" جلال نے بہن سے کہا تھا۔

"آپ بات کرلیں جلال ورنہ ابا کو آپ جانتے ہیں بات کرتے وقت نہیں لیں گے ایسا نہ ہو کہ وہ جنت الفردوس سے آپ کی بات طے کردیں اور آپ ہاتھ ملتے رہ جائیں۔" عین مسکرائی تھی تبھی جلال نے سر ہلایا تھا۔

"ایک اعلان اور بھی کرنا ضروری سمجھتے ہیں آپ اس سے قبل کہ ضیافت شروع ہو وہ اعلان کرنا ضروری ہے۔" تبھی جلال چلتا ہوا ان کے پاس جا رکا تھا اور انہیں اشارہ کر کے اپنی جانب متوجہ کیا تھا اور ان کے کان میں اپنا مدعا کہہ دیا تھا سیف صاحب نے اپنے سپوت کی طرف بغور دیکھا تھا پھر سر ہلا دیا تھا اور اپنے مہمانوں کی طرف متوجہ ہوئے تھے اور مسکرا کر بولے تھے۔

"چلیے آپ ضیافت کا مزہ لیں ضروری باتیں تو ہوتی ہی ہیں۔" انہوں نے کہہ کر بیٹے کی طرف دیکھا تھا جلال نے دل ہی دل میں شکر کا سانس لیا تھا اور تشنہ طلب نظروں سے ابا کو دیکھا تھا سب لوگ ضیافت میں مصروف ہوگئے تھے اور تب سیف صاحب نے بیٹے کے شانے پر ہاتھ رکھا تھا۔

"برخوردار کیا ارادہ ہے آپ نے اس رشتے کے لیے منع کیوں کیا، ٹھیک ہے آپ کی مرضی اہم ہے مگر ہم آپ کے والد محترم ہیں کسی بات کا فیصلہ لینے کا حق تو ہم بھی رکھتے ہیں نا؟" سیف صاحب مسکرائے تھے جلال نے سر ہلا دیا تھا۔

"آپ بجا فرماتے ہیں ابا جان مگر فی الحال ہم نے شادی کے لیے نہیں سوچا ہم چاہتے ہیں عین کی ذمہ داری

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

سے آپ پہلے فارغ ہوجائیں پھر ہم تجارت کے بزنس پر بھی غور وخوض کررہے ہیں، نواب ہیں مگر حالات بدلتے دیر نہیں لگتی ابا جان، ہم اپنے بل بولتے پر کچھ کرنا چاہتے ہیں شادی تو کسی بھی وقت ہوسکتی ہے ہمارے خاندان کا اتنا نام ہے عزت ہے اس خاندان سے جڑنا کون نہیں چاہے گا۔" جلال نے والد کو دلائل سے قائل کیا تھا سیف صاحب نے لحہ بھر کو کچھ سوچا تھا پھر سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

"چلیں آپ بھی اپنی من مانی کرکے دیکھ لیں نواب خاندان کا خون ہے اس میں جوش نہ ہو یہ باعث حیرت ہوگا، ہم آپ کو بزنس کے لیے مدد کرنے کو تیار ہیں جو کرنا ہو ہمیں آگاہ کردیں ویسے یہ انکار کہیں شادی سے یا اس رشتے سے فرار تو نہیں؟" سیف صاحب نے بیٹے کو بغور دیکھا تھا جلال نے سر نفی میں ہلا دیا تھا۔

"نہیں ابا ایسی بات نہیں ویسے ہمیں ایک اور بات بھی کرنا تھی آپ سے مگر ابھی نہیں فی الحال آپ اپنے دوستوں کے ساتھ ضیافت کا لطف اٹھائیں ہم دیگر معاملات پھر ڈسکس کرلیں گے۔" جلال نے حیدر کی سمت دیکھتے ہوئے کہا تھا ابا سر ہلاتے ہوئے آگے بڑھ گئے تھے۔

"کیا ہوا آپ کی دال گل گئی؟" عین نے چلتے ہوئے قریب آکر اپنے بھیا کو بغور مسکراتے ہوئے دیکھا تھا جلال مسکرا دیا تھا اور عین کی چھوٹی سی ناک دبائی تھی۔

"تمہارے بھیا کو قائل کرنا آتا ہے عین ویسے ابا بھی بہت نائس ہیں مجھے لگا تھا مشکل ہوگی مگر معاملات آرام سے سلجھ گئے۔" جلال سکون کی گہری سانس لیتا ہوا مسکرایا تھا۔

"بہرحال معاملات سلجھ گئے ہیں تو اب مدعا ہم سے بھی کہہ ڈالیے یہ انکار ہو کسی خوشی میں رہے ہیں کیا اس کا کوئی خاص سبب ہے کہیں یہ معاملات عشق تو نہیں۔" عین مسکرائی تھی جلال مسکرا دیا تھا۔

"تم جانتی ہو عین ہم کسی بات کا سوچ لیں تو پھر اسے انجام دے کر ہی سکون کا سکون لیتے ہیں عشق کی بات ہے

آنچل کی جانب سے ایک اور آنچل

ماہنامہ
حجاب
کراچی

اگلا شمارہ ان شاء اللہ
سالگرہ نمبر ہوگا

ملک کی مشہور معروف قلمکاروں کے سلسلے وار ناول، ناولٹ اور افسانوں سے آراستہ ایک مکمل جریدہ گھر بھر کی دلچسپی صرف ایک ہی رسالے میں موجود جو آپ کی آسودگی کا باعث بنے گا اور وہ صرف **"حجاب"** آج ہی ہاکر سے کہہ کر اپنی کاپی بک کرالیں۔

سالگرہ نمبر میں شامل ہونے کیلئے بہنیں جلد از جلد اپنی نگارشات ادارے کو بذریعہ ڈاک یا ای میل بھیجیں۔

خوب صورت اشعار منتخب غزلوں
اور اقتباسات پر مبنی مستقل سلسلے

اور بہت کچھ آپ کی پسند اور آرا کے مطابق

Infoohijab@gmail.com
info@aanchal.com.pk

کسی بھی قسم کی شکایت کی صورت میں

021-35620771/2
0300-8264242

تبھی تو ابا کے فیصلوں سے انحراف کر رہے ہیں۔ نہیں جانتے ابا اگلے فیصلے کے لیے اتنے سپورٹیو رہیں گے کہ ہیں مگر فی الحال تو خطرہ ٹل گیا ہے اب آپ کو جاپانی نقوش والے بچوں کی پھپھو نہیں بننا پڑے گا۔" جلال مسکرایا تھا، تبھی عین نے بھائی کی طرف دیکھا تھا اور نظر بھٹکتی ہوئی تیمور پر جا رکی تھی جو کسی دوست سے بات کرتے ہوئے اس کی جانب خاص توجہ سے دیکھ رہا تھا۔

"تیمور سے ملے آپ، آپ کے دوست خاصا حس مزاح رکھتے ہیں ہم سے ملے تو جتایا تک نہیں کہ وہ تیمور بہادر یار جنگ ہیں۔" عین بولی تھی تو جلال نے اپنے دوست کی سمت دیکھا تھا۔

"کمال کا نوجوان ہے بڑی بڑی باتوں کو بھول جاتا ہے کسی کی کوتاہیوں کو ہائی لائٹ نہیں کرتا جب تک کوئی خود ریلائز نہ کرلے حس مزاح تو اچھا ہے مگر یہ کوالٹی پرسن بھی ہے میرے ساتھ تھا انگلینڈ میں بہت سی مستیاں کی ہیں ہم نے وہاں مگر سب کچھ سیکھا بھی ہے زندگی سے؟"

جلال مسکرایا تھا عین بھائی کی نظروں کے تعاقب میں دیکھنے لگی تھی اس شخص کی شخصیت میں ایک خاص کشش تھی کیا بات خاص تھی وہ فوری طور پر جان نہیں پائی تھی تبھی تیمور کی نگاہ اس پر پڑی تھی تو وہ نگاہ فوراً پھیر گئی تھی اور بھائی کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

"جلال آپ کو فتح النساء کے بارے میں سوچنا چاہیے میری خواہش ہے وہ میری بھابی بنے۔" عین نے موقع دیکھ کر اپنی خواہش کا اظہار کردیا تھا جلال نے اسے لمحہ بھر کو دیکھا تھا اور مسکرا دیا تھا۔

"دل کی بات ہے عین اور دل مائل نہیں اس کا کیا کیا جائے آپ آگاہ کریں ورنہ ان معاملات کو وقت پر ڈال دیں تو مناسب ہوگا آپ کی خواہش ہمارے لیے اہم ہے آپ ہماری پیاری بہن ہیں ہم آپ کو رد نہیں کرسکتے، مگر بہتر ہوگا آپ ہمیں کچھ وقت دیں اور ان معاملات کو اپنی جگہ خود حل ہونے دیں فتح النساء کی عزت کرتے ہیں ہم وہ ایک خوب صورت اور ذہین لڑکی ہیں مگر ہمیں ان سے محبت نہیں ہے۔" جلال نے کہا تھا اور عین اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔

"محبت اتنی ضروری ہے کیا؟" وہ بے ساختہ تیمور کی سمت دیکھنے لگی تھی جانے کیوں نگاہ اس سمت مائل ہو رہی تھی وہ خود حیران تھی جلال اس کے محسوسات کو جانے بنا مسکرا دیا تھا۔

"ہم نہیں جانتے محبت اتنی ضروری ہے کہ نہیں مگر محبت ہو جائے تو پھر چین نہیں پڑتا ہم عجب مشکل میں ہیں ہمیں بس یہ پتا ہے اس سے زیادہ کی خبر نہیں۔" جلال بولے اور پھر چلتے ہوئے آگے بڑھ گئے تھے عین نے جانے کیوں اس شخص کو بغور دیکھا تھا جو اس کی سمت متوجہ نہیں تھا مگر اسے جانے کیوں لگا تھا وہ نظر اسے نہ دیکھ کر بھی اسے ہی دیکھ رہی تھی وہ اس کیفیت کو سمجھ نہیں پائی تھی۔

مگر وہ دانستہ تیمور بہادر یار جنگ کی سمت سے نگاہ ہٹا گئی تھی۔

......☆☆......

"ابا جان ہمیں نہیں لگتا حیدر عین کے لائق ہیں ان کے بارے میں کئی باتیں سننے کو ملی ہیں جو مناسب نہیں ہیں ہم عین کا رشتہ ایسے بندے سے برقرار رکھ کر غلطی کریں گے ایسا مجھے لگتا ہے۔" جلال نے شطرنج کی چال چلتے ہوئے ابا کی طرف دیکھا تھا اور پاس پڑا کافی کا کپ اٹھا کر سپ لینے لگا تھا ابا نے اسے پرخیال انداز میں دیکھا تھا پھر مدہم لہجے میں بولے تھے جلال نوجوانی میں ایسی خبریں عام ہوتی ہیں مگر وہ اچھا معتبر خاندان ہے اور ہمیں لگتا ہے اس رشتے کو ختم کرنا حماقت ہوگی۔ دو بڑے خاندانوں میں تو بات ہے اگر کوئی جواز ڈھونڈے بنا اس رشتے کو برخاست کیا جاتا ہے تو بات ایوانوں میں ڈسکس ہوگی یہ دو بڑے خاندان ہیں اور دونوں نیک شہرت رکھتے ہیں۔" ابا نے سہولت سے جلال کو سمجھایا تھا۔

"آپ کی بات ٹھیک ہے ابا مگر عین کی ذمہ داری ہم ایسے انسان کو کیسے سونپ سکتے ہیں جو عین کو گرتے دیکھ کر چلتے ہوئے ایسے آگے بڑھ جاتا ہے جیسے کوئی واسطہ نہیں۔"

عین تمہیں بہت پیاری ہے ہم عین کے ساتھ کچھ غلط ہوتا نہیں دیکھ پائیں گے۔

ہم ان بچپن میں رشتوں کے خلاف ہیں آپ نے عین پر ایک رشتے کی ذمے داری لادوی جب وہ اس ذمہ داری سے واقف بھی نہیں تھی اب اس نے لاشعوری طور پر اس بوجھ کو ڈھونا سیکھ لیا ہے صرف اس لیے کہ کوئی انگلی اٹھا کر یہ نہ کہے کہ اس کی فیملی نے جو اس کے لیے سوچا اور ڈیسائڈ کیا یہ اس پر پورا نہ اتر سکی، رشتوں کے بوجھ اس طور ڈھونا رشتوں کی وقعت کو بے معنی کردیتا ہے ابا عین کی مرضی اس رشتے میں نہیں تھی اور تب آپ بھی نہیں جانتے تھے کہ حیدر کس طرح کا نوجوان بن کر سامنے آئے گا آپ اپنی بیٹی سے اس درجہ ناانصافی نہیں کرسکتے' جلال نے بہن کی بھرپور چاہت کی تھی ابا نے خاموشی سے اسے دیکھا تھا پھر سرہلایا تھا۔

''آپ کی بات بجا ہے جلال ہم موقف کی حمایت کرتے ہیں آپ بہترین بھائی ہونے کا ثبوت دے رہے ہیں اور ہمیں خوشی ہے کہ آپ اپنی بہن سے کنسرن شوکر رہے ہیں مگر بیٹا یہ رشتوں کے معاملات حساس ہوتے ہیں ہم بنا چھان بین کیے اس رشتے سے انکار نہیں کرسکتے اور یوں بھی اب عین نے اس رشتے کو ذہنی طور پر قبول کرلیا ہے اور رہی بات حیدر کے کردار کی تو ہم جانتے ہیں روسا اور امرا کے بچے ایسے کوئی شوق رکھتے ہیں جوانی میں ایسی حماقتیں سرزد ہوتی رہتی ہیں اس پر نکتہ چینی کرنا عبث ہوگا مگر پھر بھی ہم اس پر سراج صاحب سے بات کریں گے۔''

سیف صاحب بولے تھے اور جلال نے سرہلایا تھا

''جلال یہ کیا پٹی پڑھانے بیٹھ گئے تم اپنے ابا کو۔'' قریب ہی تخت پر بیٹھی شاہ جہاں بیگم نے چشمے کے پیچھے سے پوتے کو گھورا تھا۔ ''چار جماعتیں پاس کرکے ولایت سے آگئے ہو تو بڑوں کو غلط ثابت کرنے بیٹھ گئے جیسے وہ عین النور کے دشمن ہیں ظہوری بیگم نے بچوں کی حمایت کرکے انہیں غیر ضروری آزادی دے کر اچھا نہیں کیا۔'' دادی کی بات پر جلال نے ان کی طرف دیکھا تھا۔

آپ دنیا کے کسی بھی خطے میں مقیم ہوں
ماہنامہ نئے افق
ہم بروقت ہر ماہ آپ کی دہلیز پر فراہم کرینگے
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے ہر کونے میں 600 روپے
امریکا' کینیڈا' آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے
6000 روپے
مڈل ایسٹ' ایشیائی' افریقہ' یورپ کے لیے
5000 روپے
رقم ڈیمانڈ ڈرافٹ' منی آرڈر' منی گرام ویسٹرن یونین کے ذریعے بھیجی جاسکتی ہیں۔
مقامی افراد دفتر میں نقد ادائیگی کرسکتے ہیں۔
رابطہ: طاہر احمد قریشی 0300-8264242
نئے افق گروپ آف پبلی کیشنز
کمرہ نمبر 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی۔
فون نمبر: +922-35620771/2
aanchalpk.com
aanchalnovel.com
circulationngp@gmail.com

"دادی جان تعلیم غلط کو غلط اور صحیح کو صحیح کہنے کی تمیز دیتی ہے اس میں اماں کا قصور نہیں اماں پڑھی لکھی ماں ہیں اور انہوں نے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے کسی غلط کی حمایت نہیں کی۔" جلال نے مسکراتے ہوئے دادی اماں کو دیکھا تھا۔

شاہ جہان بیگم چشمے کے دوسری طرف سے انہیں شاکی نظروں سے دیکھنے لگی تھیں۔

"ارے بیٹا آپ کی اماں کے آنے سے قبل تو جیسے ہم پتھر کے دور میں رہتے تھے نواب خاندان کو ساری عقل و فراست آپ کی اماں جان نے ہی تو عطا کی ہے۔" دادی جان نے اسے لتاڑا تھا مگر وہ مسکرا دیا تھا اور چلتا ہوا ان کے پاس جا بیٹھا تھا ان کے ہاتھ سے سروتا لے کر چھالیہ کو کاٹتے ہوئے ان کی سمت دیکھا تھا۔

"اتنی خفا مت ہوں دادی جان ابا کافی فٹ اور جوان ہیں کیا خیال ہے آپ کی نئی بہو لانے کا کوئی منصوبہ بنایا جائے۔" جلال کے انداز میں شرارت تھی دادی نے اسے ایک چپت لگائی تھی جلال نے پان بنا کر ان کی طرف بڑھا دیا تھا۔

"میاں خود تو بگڑے ہوا اپنے ابا کو بھی اس کام پر لگا دو گے، پڑھی لکھی ماں کے بچے ہو نوابوں کا خون ہے ایسے بات کرتے ہو جیسے مجھے تو ظہوری بیگم سے کوئی لگاؤ ہی نہیں، خود بیاہ کر لائی تھی تمہاری ماں کو، انتخاب میرا ہے تمہارے ابا کو تو خبر بھی نہیں تھی دیکھا تک نہیں تھا انہوں نے ظہوری بیگم کو۔" دادی جان نے کہا تھا جلال مسکرا دیا تھا۔

"ویسے آپ کو اپنی بہو بیگم سے محبت بھی بہت ہے فوراً انہیں حمایت بھی دینے لگتی ہیں ہمیں ایک بات سمجھ نہیں آتی یہ بہو ساس کے اختلاف ہوتے کیوں ہیں ان کی حقیقت کیا ہے آپ اماں بیگم کی مخالفت کرتی ہیں تو اگلے ہی پل ان کی باتوں پر نکتہ چینی بھی کر رہی ہوتی ہیں مجھے ڈر ہے کل کو میری وائف آ گئی تو آپ دونوں اس سے جھگڑا کر کے گھر سے باہر نہ کر دیں۔" جلال نے چھیڑا تھا دادی جان نے اسے کان سے پکڑا تھا جلال مسکرا دیا تھا۔

"چلیے ٹھیک ہے میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں معاف کر دیجیے دادی جان۔"

دادی جان مسکرا دی تھیں۔

"تیری دلہن کے تو صدقے واری جاؤں گی سود کا سود اس سے بھی پیارا ہوتا ہے تمہارے بچوں کے باعث میں پڑ دادی بنوں گی تیرے بچوں کو گودوں کھلانے کا خواب دل میں لیے بیٹھی ہوں مجھے اچھا نہیں لگا جس طرح تم نے جنت الفردوس کے رشتے کو ٹال دیا دادی پیار سے اسے دیکھنے لگی تھیں۔

"ویسے کوئی نظر میں ہے تو بتا دو، اس سے قبل کہ تمہارے اماں ابا کوئی فیصلہ لے ڈالیں، مجھے خبر ہوگی تو تمہاری حمایت میں تو ضرور بولوں گی نا۔" دادی جان نے حمایت کا یقین دلایا تھا جلال مسکرا دیا تھا۔

"دادی جان فی الحال کوئی نہیں ہے یہی پرابلم ہے آپ کہیں تو فرنگن ڈھونڈ لاؤں۔" وہ شرارت سے مسکرایا تھا۔

"دوبارہ ایسی بات کی تو لاٹھی سے پٹائی کروں گی مجھے آدھے تیتر اور آدھے بٹیر پڑپوتے نہیں چاہیں تمہاری اماں تو گزارہ کر لیں گی جیسے تیسے مگر ہمیں تو انگریزی بولنا نہیں آتی سیدھی سی بات ہے بیٹا بہو وہ لاؤ جن کی باتیں ہماری عقل میں بھی آئیں، ہم ٹھہرے پرانے خیالوں کے ہمیں تو اردو سے ہی محبت ہے ہم نے بھی تعلیم حاصل کی مگر انگریزی پڑھ کر انگریزوں کی غلامی کا ثبوت نہیں دینا چاہتے تھے۔" دادی نے کہا تھا جلال سر ہلاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"ٹھیک ہے دادی جان جیسا آپ کا حکم آپ سے انحراف نہیں کر سکتا لیکن یہ بات طے ہے کہ بہو آپ کی مرضی اور پسند کی ہی لاؤں گا۔" جلال انہیں اطمینان دلاتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔

......☆☆......

فتح النساء نے از سر نو حیدر اور اس کے رویے کے بارے میں سوچا تھا تو ذہن الجھ کر رہ گیا تھا اسے اپنا آپ بہت حقیر اور ادنیٰ لگا تھا وہ چلتی ہوئی بوا کے پاس آن بیٹھی

تھی۔

”کیا ہوا آپ الجھی ہوئی کیوں لگ رہی ہیں فتح النساء؟“ بوا نے ان سے دریافت کیا تھا فتح النسا نے سر انکار میں ہلایا تھا۔

”ہمارے ابا کے بارے میں کیا جانتی ہیں آپ؟“ اس کے پوچھنے پر بوا حیران ہوئی تھیں۔

”یہ اچانک کیسی باتیں کرنے لگیں فتح النساء آپ جانتی تو ہیں کہ آپ کس خاندان سے وابستہ ہیں آپ کے چاچا تایا سے واقف تو ہیں آپ؟“

”وہ فرضی رشتے ہیں نا ان رشتوں کی کیا حقیقت ہے، آپ بھی جانتی ہیں؟“

فتح النساء نے بجھے بجھے سے لہجے میں کہا تھا بوا نے اسے بغور دیکھا تھا۔

”کیا ہوا یہ آج اس متعلق بات کیوں کرنے لگیں آپ۔“ بوا نے پوچھا تھا۔

فتح النساء خاموش ہو گئی تھیں پھر مدہم لہجے میں بولی تھیں۔

”ہمیں سچ جاننا ہے بوا ہم کن کی اولاد ہیں۔“ فتح النساء کے پوچھنے پر بوا نے خاموشی سے دیکھا تھا پھر آہستگی سے بولی تھیں۔

”بیٹا سوال اٹھانے سے اصلیت چھپ نہیں جاتی نا جواز دینے سے دلائل کی وقعت بڑھتی ہے۔“ بوا کہتی بات کرتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں اور فتح النساء ان کو دیکھ کر رہ گئی تھی۔

......☆☆......

”نواب صاحب کیا ضیافت تھی ایوانوں میں خبر عام رہی آپ کی سیاسی شخصیت کے ساتھ آپ کی اخلاقی باتوں پر بھی گفتگو رہی اور آپ کے مخالفین میں آپ کے اپنے سراج صاحب کھڑے دکھائی دیے آپ کے سمدھی بھی کمال کے آدمی ہیں سیف صاحب آپ کو مزید مخالفین کی ضرورت نہیں ضیافت کی بات میں آپ کی تقسیم کے معاملے میں کی گئی باتوں میں کئی پہلو نکلتے دکھائی دیے اور مخالفین اور حمایتی ان کو ڈسکس کرتے رہے۔“ حکمت بہادر یار جنگ بولے تھے تو نواب سیف الدین مسکرا دیے تھے۔

”جانے دیں حکمت صاحب ہماری باتیں کب سے اہم ہو گئیں ہم تو حقائق کی بات کر رہے تھے اور حقائق کی بات سامراجی نظام کے خلاف ہماری بالکل بغاوت کا اظہار کرتی ہے، ہمارے والدین نے جو قربانیاں دیں ہم انہیں رائیگاں جانے نہیں دیں گے یہ دور تیر و شمشیر سے لڑنے کا نہیں ہے عقل اور نفسیاتی غلبے کی جنگ ہے اور اس میں وہی فتح یاب ہوگا جس کا موقف درست ہوگا اور جس کو اپنا موقف بیان کرنا آتا ہوگا بغاوت تب تک کام نہیں آتی جب تک ایک موقف پر ڈٹا نہ رہا جائے ہمارے ابا مرحوم اللہ ان کے درجات بلند فرمائے، وہ ایک عظیم فریڈم فائٹر تھے ہمارے چاچا جان بھی ان کے ہمراہ تھے جب ان کی جان اس زمین کے کام آ گئی انہوں نے پیاس سے بلکتے ہوئے دم توڑا تھا قید میں ہم انگریزوں کی حکومت کی اگر حمایت کر دیں یا اپنا سر جھکا دیں تو یہ ہمارے بزرگوں کی قربانیوں سے غداری ہوگی، ہم ان گزشتہ نسلوں کی قربانیوں کو رائیگاں جانے نہیں دیں گے ہم جب ٹھان لیتے ہیں تو کر لینے کے بعد ہی سکون کی سانس لیتے ہیں مخالفین کے ساتھ کھڑے ہو جانا آسان ہے مگر ہم نے تنگ راہ کا انتخاب اپنے بزرگوں کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے کیا ہے ان فرنگیوں کو یہاں سے جانا تو ہوگا اور ہم ہندوؤں کا راج بھی نہیں بننے دیں گے جب تک کہ ایک پاک سر زمین کا بٹوارہ نہیں ہو جاتا۔ فرنگی چاہتے ہیں کہ اب ہندو قوم مسلمانوں پر راج کرے یہ ہم نہیں ہونے دیں گے ہندوؤں کی غلامی سے کہیں بہتر موت ہے۔ جس ڈیموکریسی اور ڈیموکریٹک اسٹیٹ کا یہ راگ الاپ رہے ہیں اس کی حقیقت اس سامراجیت کی مثال سے بھی بدترین ہے۔ یہ تو طے ہے کہ ہم یہاں اس زمین پر تبھی قیام کریں گے جب اس زمین پر مسلمانوں کا راج ہوگا اگر یہ سر زمین ہندوؤں کے حصے میں آتی ہے تو یہاں سے کوچ کر جانا مناسب ہے۔“ نواب سیف الدین پٹوڈی کڑے لہجے میں بولے

تھے۔

حکمت بہادر یار جنگ نے ان کی حمایت میں سر ہلایا تھا اور مسکرائے تھے۔

”ہمیں یاد ہے اور ہم آپ کے ارادوں کو بھی جانتے ہیں نواب صاحب آپ ہمارے مسلم لیگی ہیرو ہیں آپ کو کوئی فراموش کر سکتا ہے مسٹر جناح کے خیالات کے پکے حامی ہیں آپ اور ہم آپ کے حامی ہیں۔“ حکمت صاحب مسکرائے تھے اور سیف صاحب ان کو خاموشی سے دیکھنے لگے تھے۔

”ہم حقائق کو دیکھنے کی تگ و دو میں مصروف رہے ہیں حکمت صاحب ہم سے نہ کہا جائے کہ حقائق کی حقیقت کچھ نہیں انگریز کے اس سامراجی ڈھانچے کو تو تہس نہس ہونا ہے مسٹر جناح ہمارے گریٹ لیڈر اپنا بھرپور موقف رکھتے ہیں اور ہم بلاشبہ ان کے حمایتوں میں سے ہیں ہم ان کا ساتھ تب تک دیں گے جب تک تقسیم کا عمل وقوع پذیر نہیں ہو جاتا برطانوی راج کی اس نفسیاتی فتح کو ختم ہونا ہے یہ تو طے ہے۔

The muslim nation under the Quaid e azam leader ship is fighting on three fronts the bristish the congress, and quisling muslims.

The parallels of such a remarleable and would be the fruitful struggle are rare in the history of the world.

This Sturggle of the muslims for independence might will have come to nothing had the been led by a person of lesser vision. Quaid e azam is fighthing for the division of india into some muslim state and hindustan which means freedom for both the hindus and the muslims nations, he will definitely win.

نواب سیف الدین پٹودی کے کہنے پر حکمت بہادر یار جنگ نے سر ہلایا تھا۔

”بے شک نواب صاحب آپ بجا فرماتے ہیں میں آپ کی بات سے بھرپور اتفاق کرتا ہوں یہ واجب اور درست ہے۔ حکمت صاحب نے سر ہلایا تھا۔

MR jinnah is a staunch believer of the two nations theory beyound doubt.

جناح صاحب اصول پرست واقع ہوئے ہیں اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنے موقف پر ڈٹے رہیں گے اگرچہ ہندوؤں نے بھرپور کوشش کی ہے کہ ہندو مسلم الحاق کے نام پر کوئی پیش رفت ہو جائے اور ہمارے لیڈران ان کی حمایت کرتے ہوئے ان کے حق میں فیصلہ دے دیں مگر ان کی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتیں کیونکہ ہندو مسلم الحاق ممکن نہیں دو دو قوموں کا متحد ہونا کسی منزل کی سمت نہیں لے جا سکتا۔ ہندوؤں کے مزاج سے کون واقف نہیں منہ میں رام رام اور بغل میں چھری ایسے لوگوں کے ساتھ ہمارا کیا میل جول نہیں۔“ حکمت صاحب نے کہا تھا اور نواب سیف الدین پٹوڈی نے شطرنج کے مہروں کو بغور دیکھتے ہوئے چال چلی تھی۔

”ایک بات نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ ہندوؤں نے اپنی سی کوشش کی ہے۔

Hindus tried to find out muslim for hindus muslims unity and at the same time succeed in influencing muslim leaders like mr jinnah and

معروف صحافی، ادیب اور مفسر مشتاق احمد قریشی کی ایک اور معرکۃ الآرا تالیف

امام الائمہ حضرت امام ابوحنیفہ قدس سرہ اہل سنت اور فقہ حنفی کے بانی ہیں
حنفی فقہ کے بانی: امام اعظم حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ
کی سیرت، حیات اور ان کی فقہی زندگی اور کام کے بارے میں ایک مختصر جائزہ"

امام اعظم ابوحنیفہؒ

حیات و فقہی کارنامے

تلخیص و تالیف: مشتاق احمد قریشی ◆ ہدیہ: ایک سو پچاس روپے

منگوانے کا پتہ

نئے افق گروپ آف پبلی کیشنز 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی 74400 فون: 021-35620771/2
اسلامی کتب خانہ الحمد مارکیٹ غزنوی روڈ لاہور۔ فون: 042-37116257

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

Doctor iqbal but this situation did no last long and soon. under the influence of the muslims league magority of muslim leaders who had been lured by indian nationlism became the upholder of the two nations theory.

Mohammad Ali Jinnah refused to accept the neru's nation that there are only two forces in india, British imperialism and indian nationalism as represented by the congress.

مسٹر جناح نے تبھی موقع کی مناسبت سے یہ بات واضح کردی تھی میاں کہ برطانوی راج اور انڈین نیشنل ازم صرف دو طاقتیں ہی ہندوستان کی ترجمانی کرنے کے لیے بنی ہیں، سامراجیت ہم سے وابستہ نہیں نا ہندوؤں کے نظریات، سو جناح صاحب اسے مسترد کرچکے ہیں اور ہوچکے ہیں کہ

There was another party the muslim league which alone have the right to represent the muslims of india.

خیر اب تو بات بہت آگے نکل آئی ہے حکمت صاحب آپ کہاں کی باتیں لے کر بیٹھ گئے اب تو دو قومی نظریہ بہت واضح ہوچکا ہے جناح صاحب نے اپنی لکھنو کی تقریر میں جو 15 اکتوبر 1937ء کو ہوئی تھی اس میں یہ بات واضح کردی تھی، اب تو اس بات کو بھی دس برس گزر گئے اب ہمارے لیڈران ان کے تسلط میں آنے والے نہیں۔

ہندوؤں کی جماعت کانگریس اس دھوکہ دہی میں مصروف رہی ہے۔ 1935ء کے اسی ایکٹ کو ثابت کرتے ہوئے کہ یہ غلط ہے اور اس کے بعد مسلمانوں کی آنکھیں کھل چکی ہیں اگر اس ایکٹ کے حمایتی مسلمان خاموش رہتے تو پھر مسلمانوں کو سدا کی غلامی سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔

ہندوؤں کا خوف ان کے گلے کو آ گیا، انہیں جو خدشات ہندوؤں کی اکثریت کے راج کرنے کے دکھائی دیے تھے ان کی تھی مسلمانوں نے بھرپور انداز میں کردی۔

The fear of the indian muslims about hindus majority rule turned true.the shuddi campaign the vidhya mandar scheme and bande matram (hind anthem) were the worst examples of hindus vindicativeness.

نواب سیف الدین پٹوڈی کے کہنے پر حکمت صاحب نے حمایت کی تھی۔

”یہ تو بہت مدلل بات یاد دلادی آپ نے نواب صاحب ہندوؤں کی ذہنیت تو تبھی کھل کر سامنے آ گئی تھی اور ہمارے محترم ڈاکٹر علامہ اقبال نے بھی آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ سیشن 1930ء میں الہ آباد میں ہی یہ بات واضح کردی تھی کہ۔

I would like to see punjab NWFP sindh and blochistan amalgamate into a single state. Self goverment within or without the british empire and the fomation of consolidated north west indian muslim state appers to me to be the final destiny of the muslim at least history and today consider religion as a private and personal matter between man and God. this can be the case in hindusium and islam both these religions have definite social codes and aspect of their social life.

سیف صاحب بولے تو حکمت صاحب نے سر ہلایا تھا۔

''بلا کے دلیر ہیں ہمارے لیڈر جناح صاحب حق کی بات کہتے ہوئے چوکتے نہیں نہ ڈرتے ہیں۔ آپ کی اس بات نے مجھے ایک تاریخی میٹنگ لاہور میں ہونے والے خطاب جو 23 مارچ 1940ء کو ہوا تھا قائداعظم کے الفاظ بھرپور یاد رہ جانے والے تھے جناح صاحب نے کہا تھا کہ۔

We have our past experience of the last two half year we have learnt many lessons. we are now apprehensive and can trust no body it has always been taken for granted mistakenly that the muslims are a minority hindus and muslims belong to two religion philosphies social customs. literature they neither inter marry nor interdine and indeed belong to different civilizations which are based on conflicting ideas and conceptions their concepts of life are different of north west of india got his attention.

ہمارے لیڈر نے اپنا موقف دس برس قبل ہی جب واضح کر دیا ہے تو پھر کس بات میں شک کی گنجائش نہیں رہتی اقبال صاحب بلا کے دور اندیش نکلے انہوں نے اپنی ریاستوں کی بات کی تھی جو مسلمانوں کی اکثریت رکھتی تھیں اب خبر نہیں انگریز اور ہندو کیا کھیل کھیلتے ہیں۔ مگر مسٹر جناح نے تو تبھی 21 جون 1937ء نے علامہ اقبال صاحب کو متاثر ہو کر لکھ دیا تھا کہ

why should not the muslims of north west india and bangal be consedered as nation entiled to self determination just as other nations in india and outside india are.

ہمارے لیڈران دس برس قبل جان گئے تھے کہ ہندو قوم اس اقلیت کو قبول نہیں کر سکے گی جو ان پر برسوں سے حکومت کرتی آئی ہے ان سے اس دلیر قوم کی حکمران اب برداشت نہیں ہوگی فرنگی قوم کے جانے کے بعد ہندوؤں کی اکثریت مسلمانوں کو مزید جھیل نہیں پائے گی۔ آپ کو مسٹر جناح کا وہ آرٹیکل یاد ہے جس کا ذکر آپ سے کچھ عرصہ قبل بھی کیا تھا حکمت صاحب بولے تھے تو سیف صاحب نے سر ہلایا تھا۔

''ہم وہ انگلستان کے اخبار Time and Tide میں 9 مارچ 1940ء کو شائع ہونے والا آرٹیکل کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں حکمت صاحب جس میں جناح صاحب نے فرنگیوں کی آنکھیں کھول دیں تھیں وہ جو مسلمانوں کو دبی ہوئی قوم کہہ رہے تھے ان پر مسٹر جناح کا موقف بھرپور واضح ہو گیا تھا۔ جناح صاحب نے لکھا تھا۔

The British people being Christian sometime forget the religious wars of their own

پاک سوسائٹی پر مُوجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد
نمرہ احمد
فرحت اشتیاق
قُدسیہ بانو
نگہت سیما
نگہت عبدُاللہ
رضیہ بٹ
رفعت سراج

صائمہ اکرام
سعدیہ عابد
عفت سحر طاہر
تنزیلہ ریاض
فائزہ افتخار
سباس گُل
رُخسانہ نگار عدنان
اُمِ مریم

عُشنا کوثر سردار
نبیلہ عزیز
فائزہ افتخار
نبیلہ ابر راجہ
آمنہ ریاض
عنیزہ سید
اقراء صغیر احمد
نایاب جیلانی

اشفاق احمد
نسیم حجازی
عنایتُ اللہ التمش
ہاشم ندیم
مُمتاز مُفتی
مُستنصر حُسین
علیمُ الحق
ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

http://paksociety.com

they have different epics different episodes. very often the hero of one is the foe of the other and like wise their victories and defeat overlap he also added that to take together state one as a numerical majority other as a nation according to any definition of nation and they must have their homeland their territory and their state.

سیف صاحب کے کہنے پر حکمت صاحب نے سر ہلایا تھا۔

”بے شک اس کو آج 1947ء کے موجودہ دور میں رکھ کر دیکھیں تو جس طرح تحریک زور پکڑ رہی ہے اس سے جناح صاحب کا موقف واضح ہو جاتا ہے حکمت صاحب نے کہا تھا تبھی سیف پٹوڈی بولے تھے۔

”آپ کو وہ انٹرویو تو یاد ہوگا نا جو 14 اکتوبر 1944ء کو London News Chronicle نے پبلش کیا تھا؟“ حکمت بہادر یاور جنگ مسکرائے تھے۔

”جناب ہم آپ کے اور جناح کے حمایتی ہیں ہم کہاں بھول سکتے ہیں جناح صاحب کی شخصیت اتنی پر اثر ہے کہ اس سے متاثر نہ ہونا ممکن ہی نہیں ان کی اثر پذیری سے کون انکار کر سکتا ہے ہمیں تو ان مسلم لیگیوں کے الفاظ زبانی یاد رہتے ہیں۔“ حکمت بہادر یار جنگ مسکرائے تھے۔

”جناح صاحب نے فرمایا تھا کہ۔

There is only one practical realistic way of resolving hindu muslim differences this is to divide india into two sovereign parts of pakistan and hindudstan and for each of us to trust the other to give equitable treatment to hindu minorities in pakistan and muslim minorities in india the fact is that the hindu will not reconcile themselve to our complete independence.

نہرو صاحب تو صرف ہندوؤں کی بات کرتے ہیں ہمارے جناح صاحب اس معاملے میں غیر جانبدار ہیں وہ جہاں موقع ملتا ہے دونوں قوموں کا نظریاتی فرق واضح کرتے ہوئے ان کے مذہبی فرق کو بھی واضح کرتے ہیں اور اگر ہندو اقلیت کے طور پر ہمارے علاقوں کا حصہ بنتے ہیں تو وہ ان کے حقوق کی بھی بات کرتے ہیں نہرو صاحب نے ایسی کوئی بات کبھی نہیں کی سوچی جو اقلیتیں ہندوؤں کے زیر اثر آئیں گی یہ ان کا کیا حشر کریں گے یہ تو اپنے عقائد میں بھی پچاس عقائد رکھتے ہین ان کی اپنی تفریق ختم نہیں ہوتی اونچی ذات اور نیچی ذات کا فرق ہی ختم نہیں ہوتا تو یہ اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کیا کریں گے جو اقلیتیں پاکستان میں شامل ہوں گی وہ محفوظ رہیں گی جبکہ جو ہندوستان میں شامل ہوں گی وہ عدم تحفظ کا شکار رہیں گی ہمیں تو یہ صاف دکھائی دیتا ہے اب آگے تو آنے والا وقت ہی بتائے گا کہ کیا ہوتا ہے اور اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے جناح صاحب تو ایک ایسی ریاست کی داغ بیل ڈال چکے ہیں جس میں ہر اقلیت کو اس کا حق ملے گا۔ پھر چاہے وہ ہندو ہو یا سکھ یا کوئی اور اقلیت اس ریاست میں سب کے حقوق کی پاسداری ممکن ہوگی اس کا ہمیں یقین ہے بہر حال نہرو صاحب کی لفاظی وہ جانے ہم تو امید رکھتے ہیں کہ جہاں یہ جدوجہد زور پکڑ چکی ہے اور نوجوان اور خواتین اس کا حصہ بن چکے ہیں اب کوئی پیش رفت فرنگی سرکار کی طرف سے ہو جانا چاہیے۔“ حکمت بہادر یار جنگ نے کہا تھا اور نواب صاحب مسکرائے تھے۔

”میاں ایسی بھی کیا جلدی ہے کام تو اپنے وقت پر ہی ہوگا آخری کیل سامراجی راج کی قبر میں ٹھونکی جا چکی ہے اب کس بات کا ڈر، قرارداد کا پاس ہو جانا بڑی جیت ہے اور اس جیت کے بعد بھی مسلمان لیڈرز آرام سے نہیں بیٹھے کسی نہ کسی موقع پر اپنے موقف پر ڈٹے دکھائی دیتے ہیں اب تو خیر ہم جیت کے بہت پاس دکھائی دیتے ہیں سو فتح کے اس نشے کو آہستہ آہستہ محسوس کرنا اور وجود میں ڈھلتے دیکھنا ایک خوب صورت تجربہ لگ رہا ہے اب تو 1947ء کا دور ہے اور تحریک اتنی آگے بڑھ چکی ہے کہ کوئی خوف باقی نہیں رہا نہ شک کی کوئی گنجائش باقی رہی ہے آپ اپنے اندر کے وسوسے اور خوف باہر نکال دیجیے فتح تو ہو کر رہے گی۔“

سیف صاحب نے مسکراتے ہوئے جوش سے کہا تھا اور ان کے پر یقین لہجے پر حکمت صاحب سر ہلاتے ہوئے مسکرا دیے تھے۔

”بے شک فتح قریب لگ رہی ہے اب۔“

……☆☆……

”تمہیں کیا ہوا فتح النساء، تم کہاں غائب ہو ایسا کیا ہو گیا ضیافت میں کہ تمہارا تو رنگ ہی زرد پڑ گیا کچھ بات ہو گئی ہے تو ہمیں بتاؤ ہم تمہیں اس مشکل سے ہو سکتا ہے نکالنے میں کوئی مدد کر سکیں۔“ عین النور پٹوڈی نے فتح النساء کا ہاتھ تھام کر اسے محبت سے دیکھا تھا انہیں اپنی اس سہیلی سے خاص انسیت تھی اور انہیں واضح لگا تھا کہ فتح النسا کا ہاتھ بے حد سرد ہے اور چہرہ پھیکا سا۔

”آپ کی آنکھوں کی وہ جوت کیا ہوئی فتح النساء آپ تو دلیری میں ثانی نہیں رکھتیں اتنی مضبوط لڑکی اور ایسا پھیکا ڈرا سہما چہرہ۔

”یہ کیا حالت بنالی ہے آپ نے ہمیں آگاہ کریں کسی نے کچھ کہا ہے۔

عین نے سہیلی کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا تھا مگر فتح نے نفی میں سر ہلا دیا تھا اور مدہم لہجے میں بولا تھا۔

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں عین النور ہم ٹھیک ہیں بس کچھ دنوں سے طبیعت کچھ ٹھیک نہیں شاید اسی لیے بہرحال

آپ دنیا کے کسی بھی خطے میں مقیم ہوں

ماہنامہ آنچل
ماہنامہ حجاب کراچی

(ایک ساتھ منگوانے پر)

ہم بروقت ہر ماہ آپ کی دہلیز پر فراہم کرینگے

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے ہر کونے میں 700 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے

7000 روپے

میڈل ایسٹ، ایشیائی، افریقہ، یورپ کے لیے

6000 روپے

رقم ڈیمانڈ ڈرافٹ، منی آرڈر، منی گرام ویسٹرن یونین کے ذریعے بھیجی جا سکتی ہیں۔
مقامی افراد دفتر میں نقد ادائیگی کر سکتے ہیں۔

رابطہ: طاہر احمد قریشی 0300-8264242

نئے افق گروپ آف پبلی کیشنز

کمرہ نمبر: 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی۔
فون نمبر: 2/35620771-922+

aanchalpk.com
aanchalnovel.com
circulationngp@gmail.com

آپ ہماری بات چھوڑیے آپ بتایئے کیا ارادے ہیں۔" فتح بہت پھیکے سے انداز میں مسکرائی تھی اور عین نے اسے بغور دیکھا تھا۔

"کس بارے میں پوچھ رہی ہیں آپ فتح؟" عین نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا اور تب فتح بامشکل مسکرائی تھی۔

"نواب زادی ہم آپ کی شادی کی بات کر رہے ہیں اپنے شہزادے کے ساتھ اس کے دیس نہیں جانا آپ کو یوں تو آپ ہر وقت ان کے گن گاتی رہتی ہیں اب یکسر بھول گئیں؟" فتح نے کہا تھا تو عین مسکرا دی تھی۔

"نہیں بھول کیسے سکتے ہیں مگر ایسی کوئی بات اپنی ہوئی نہیں۔"

"اوہ ہمیں تو لگا کہ ضیافت میں نشر کی جانے والی خاص خبر آپ کی شادی ہوگی۔" فتح مسکرائی تھی عین نے سر انکار میں ہلایا تھا۔

"نہیں ابا کو جلال کی شادی کی بات کا ذکر کرنا تھا مگر جلال نے جانے کیسے عین موقع پر ان کو قائل کر لیا جلال کو جنت الفردوس ایک آنکھ نہیں بھائی جانے کیا چاہتے ہیں یہ چھوٹے نواب صاحب ان کا بھی پتا نہیں چلتا۔" عین نے کہا تھا تو فتح نے ان کو خاموشی سے دیکھا تھا۔

"کوئی بات تو ہے فتح آپ اس طرح سیریس ہونے والی تو نہیں اچھا یہ بتایئے کیا جلال نے کچھ کہا ہے کہیں آپ جنت الفردوس کا سن کر تو پریشان نہیں ہو گئیں اگر یہ بات جنت الفردوس کی ہے تو آپ کے دل کو حد درجہ سکون ملا ہوگا یہ سن کر جلال نے وہ بات نشر ہونے سے رکوا دی ہے۔" عین مسکراتے ہوئے بولی تھی اور فتح منہ پھیر گئی تھی۔

"محبت دسترس سے باہر کی شے ہے عین النور پٹوڈی محبت کا ذکر بھی پرایا لگتا ہے میں اس بارے میں نہیں سوچتی ہاں میں جلال سے محبت کرتی ہوں مگر جلال کی محبت پانا ایک خواب ہے۔ میں درمیان میں آنے والے فاصلوں کو بغور دیکھتی ہوں اور مجھے مان لینا پڑتا ہے کہ محبت کا حصول ممکن نہیں میں جلال سے شکوہ نہیں کر سکتی جلال نے کبھی حمایت نہیں کی نہ کوئی خواب دکھایا ان کو تو شاید خبر ہی نہیں کہ میں ان سے اس طور وابستہ ہو چکی ہوں۔" فتح النساء کا لہجہ اداس تھا عین نے اپنی پیاری دوست کو بغور دیکھا تھا اور اس کا ہاتھ تھام کر نرمی سے بولی تھی۔

"محبت دسترس سے باہر ضرور ہے مگر ناامید نہیں کرتی محبت اچھے کی امید رکھتی ہے فتح النساء تم بہت دلکش ہو بہت انوکھی لڑکی ہو اگر ہمارے بس میں ہوتا تو ہم جلال کی محبت آپ کو دلوا دیتے۔" وہ حساس طبیعت کی مالک لڑکی فتح النساء کے لیے کسی قدر افسردہ دکھائی دی تھی فتح النساء مسکرا دی تھی۔

"اچھا آپ ٹھہریں نواب زادی آپ کا دل اپنی رعایا کے لیے دکھی ہونا کوئی عبث نہیں مگر ہم ایسے بھی دکھی نہیں اب محبت کرتے ہیں سوال نہیں کرتے سوال کرنے والے کمزور ہوتے ہیں عین مانگنے سے محبت ملتی نہیں اور بتاتے اور آگاہ کرنے کے ہم قائل نہیں بہرحال یہ ذکر اٹھا کر ایک طرف رکھ دیں۔

آپ اپنے بارے میں بتائیں جلال کو اچھا نہیں لگا تھا جس طرح حیدر نے آپ کو نظر انداز کیا اور گرا کر آگے بڑھ گئے اس سے ثابت نہیں ہوجاتا کہ وہ کس قدر بے پروا ہے اور شادی جیسی بڑی ذمہ داری لینے کے قابل نہیں۔" فتح النساء ان کو حیدر کے کردار کے معاملے بتا نہیں سکتی تھیں نا انہیں قائل کر سکتی تھیں ان کی بات ایک طرف رکھ کر محض اس عشائیے والی بات کا ذکر کے ان کا مزاج بدلنا چاہا تھا۔ مگر عین مسکرا دی تھی۔

"فتح النساء رشتے اس طور نہیں بدلتے وہ ان سے غلطی ہوئی تھی اور غلطی کسی سے بھی سرزد ہو سکتی ہے نا ہم انسان ہیں تو ہم دوسروں کی غلطیوں کو نظر انداز کیوں نہیں کر سکتے ٹھیک ہے وہ ہم سے ٹکرائے اور ہمیں گرتا دیکھ کر سنبھال نہیں سکے مگر اس کی معذرت انہوں نے ہم سے کر لی تھی اب ہم اس ایک غلطی کی بنا پر کوئی فیصلہ لینے کی حماقت نہیں کر سکتے یہ مناسب نہیں ہوگا۔" عین مثبت سوچ کی حامل دکھائی دی تھی اور فتح النساء اسے پریشانی سے دیکھنے لگی تھی اگر عین کی شادی ایسے شخص سے ہو جاتی تو یقیناً عین کی

زندگی برباد ہو جاتی حیدر اس کے لائق نہیں تھا مگر وہ عین کو یہ بات نہیں کہہ سکتی تھی عین اس کی بات کا یقین نہ کرتی تو یہ بات بے وقعت ہو جاتی جس طرح عین حیدر کی خامیوں اور کوتاہیوں کو نظر انداز کرتی تھی اسے دیکھ کر یہی لگتا تھا کہ عین اس کے خلاف کچھ غلط نہیں سن سکتی تھی اس نے اپنا حمایتی ووٹ یقیناً اس شخص کو دیا تھا اور فتح النساء سے قائم دوستی کا کوئی وجود باقی نہیں رہنا تھا فتح النساء عین کا مزاج جانتی تھی وہ فقط دوستی برقرار رکھنے کو اس بات کو چھپا بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ بات عین کی زندگی کی اور مستقبل کی تھی مگر فتح النساء شش و پنج کا شکار تھی اور کچھ اخذ نہیں کر پا رہی تھی کہ اسے کیا کرنا چاہیے یہی سوچ کر وہ عین کے پاس سے اٹھ گئی تھی۔

''ہم چلتے ہیں عین پھر بات کریں گے چاچا جان کچھ نئی کتابیں لانے والے تھے اور آپ تو جانتی ہیں ہم کتابوں کے کس قدر دیوانے ہیں سو ہمارا دل تو وہیں اٹکا ہوا ہے یوں بھی ہم بوا کو بتا کر نہیں آئے تھے وہ پریشان ہو رہی ہوں گی۔'' فتح النساء بہانہ کرتی ہوئی فوراً اٹھ کر باہر نکل آئی تھی عین کو اس روز اپنی دوست کچھ عجیب لگی تھی مگر وہ کچھ بولی نہیں تھی۔

......☆☆......

فتح النساء بے دھیانی میں چلتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی جب جلال سے ٹکرائی تھی۔

''لڑکی دیکھ کر چلا کرو کیا ہو گیا ہے کچھ ہوش ہے کہ نہیں۔'' جلال نے مسکراتے ہوئے اسے سنبھالا تھا اور کہا تھا مگر وہ جیسے پتھر بنی اسے دیکھتی رہی تھی اگر کوئی اور موقع ہوتا تو اس شخص کے اس درجہ پاس آنے پر وہ پاگل ہو جاتی مگر اب اس کی اس درجہ قربت پر بھی اس نے کوئی ردعمل نہیں دیا تھا اس کے کھوئے کھوئے انداز پر جلال نے اسے دیکھا تھا وہ پہلے والی فتح النساء سے بہت مختلف لگی تھی۔

''طبیعت ٹھیک ہے آپ کی کیا ہوا ہے آپ کچھ پریشان لگ رہی ہیں۔'' نواب جلال الدین پٹوڈی نے اس کی سمت بغور دیکھتے ہوئے پوچھا تھا فتح النساء نے سر نفی میں ہلا دیا تھا وہ اس کی سمت دیکھنے سے گریز کرتی ہوئی آگے بڑھنے لگی تھی جب جلال نے اس ہاتھ تھام لیا تھا۔

کوئی اور موقع ہوتا تو فتح النساء آسمان پر بادلوں کے ساتھ اڑنے لگی۔ مگر اس لمحے اس سے اس عمل نے کوئی تاثر نہیں دیا تھا اس شخص کا ہاتھ تھامنا قریب آنا اور اس کے چہرے کو بغور دیکھنا جیسے وہ کسی بات کو محسوس کرنے کی حس کھو چکی تھی۔ جلال کو اس بات پر حیرت ہوئی تھی وہ فتح النساء کا مزاج جانتا تھا اسے بچپن سے جانتا تھا وہ اتنی کھوئی کھوئی اور متفکر کبھی دکھائی نہیں دی تھی۔

جلال اس کے سامنے آن رکا تھا اور اس کے چہرے کو بغور دیکھنے لگا تھا۔

وہ شخص آسمان جیسا تھا مگر وہ آسمان اس کا نہیں تھا سو وہ اسے دیکھنے سے گریزاں تھی جلال نے اس کا چہرہ تھام کر رخ اپنی جانب پھیرا تھا اور بغور دیکھتے ہوئے مدھم لہجے میں بولا تھا۔

''معاملہ کیا ہے فتح النساء آپ اتنی پریشان کیوں ہیں کسی نے کچھ کہہ دیا ہے کیا۔ یا کسی کی بات ناگوار گزری ہے آپ عین کی دوست ہیں ابا کے دوست کی بیٹی ہیں ہمارے لیے باعث احترام ہیں ہم آپ کی بہت عزت کرتے ہیں ہمیں بتایئے ہم اس شخص کو چھوڑیں گے نہیں جس نے آپ کا دل دکھایا ہے یا آپ سے کوئی بدتمیزی کی ہے۔'' وہ آسمان بنا مخلص لہجے میں بولا تھا اس آسمان کے لہجے میں بادلوں کی نرمی اور ٹھنڈک تھی فتح النساء کا دل چاہا تھا اس شخص کے شانے پر سر رکھے اور سب کہہ دے مگر وہ سوائے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھنے کے کچھ نہیں کر سکی تھی اس کے لبوں پر گہری چپ تھی اس کے پاس جیسے لفاظ کھو گئے تھے اور لبوں پر تالے پڑ گئے تھے اس نے بس نفی میں سر ہلا دیا تھا مگر جلال نے اس کا ہاتھ نہیں چھوڑا تھا۔ اس کی نظریں اسے بغور جانچتے ہوئے دیکھنے لگی تھیں۔

''کس نے کچھ کہا ہے نام بتایئے اس محل میں کسی کی ہمت نہیں جو ایسی حرکت کرے ہم اس کا سر قلم کروا دیں گے بتایئے ہمیں۔'' نواب جلال الدین پٹوڈی نے اسے

دیکھتے ہوئے کچھ اخذ کرنا چاہا تھا مگر فتح النساء اس کی سمت دیکھ کر نگاہ پھیر گئی تھی مگر وہ اس لہجے کی نرمی پر اپنی آنکھوں میں آئی نمی نہیں روک پائی تھی نمی آنکھ میں ٹھہری تھی اور اس لہجے کی حلاوت پا کر آنسو رخساروں پر چھلکنے لگے تھے وہ نہیں چاہتی تھی جلال ان آنسوؤں کو دیکھے سو چہرہ پھیرنا چاہا تھا مگر جلال نے اس کا چہرہ تھام کر رخ اپنی طرف موڑ لیا تھا۔

”فتح النساء نام بتائیے کون ہے وہ گستاخ۔“ وہ ضدی لہجے میں جیسے سب جاننے کا خواہاں تھا فتح النساء نے اسے خاموشی سے دیکھا تھا نگاہ دھندلائی تھی چلتے ہوئے آنسو رخساروں پر تھے جلال الدین پٹوڈی نے اسے بغور دیکھا تھا پھر ہاتھ بڑھا کر ان آنکھوں کی نمی چننا چاہی تھی جب وہ نگاہ پھیر گئی تھی اور ہاتھ چھڑا کر آگے بڑھنا چاہا تھا مگر جلال الدین پٹوڈی اس کا ہاتھ چھوڑنے پر مائل دکھائی نہیں دیا تھا جیسے ہی وہ ہاتھ چھڑانے کی کوشش میں پلٹی تھی جلال نے اسے جھٹکے سے اپنی طرف کھینچا تھا اور وہ اس کے فراخ سینے سے آن ٹکرائی تھی اور مزید کوئی مزاحمت نہیں کر پائی تھی انداز اتنا تھکا ہوا تھا کہ وہ اس کے سینے پر سر رکھ کر چپ چاپ آنسو بہانے لگی تھی جلال نے اس کا سر اپنے سینے پر دیکھا تھا اور اس کی آنکھوں کی تمام نمی کو اپنے سینے میں جذب ہوتا محسوس کیا تھا وہ لمحے خاموشی سے گزرتے رہے تھے فتح النساء کی آنکھوں کی نمی اس فراخ سینے میں جذب ہوتی رہی تھی۔

قطرہ......قطرہ......

غبار دھلتا گیا تھا اور جب فتح النساء نے خود کو مطمئن محسوس کیا تھا تب خاموشی سے سر اٹھا کر جلال کو دیکھا تھا وہ بدستور اس کی سمت دیکھ رہا تھا وہ نگاہ قریب تھی حد سے زیادہ قریب ان دھڑکنوں کا سلسلہ وہ متواتر سن رہی تھی کب خبر تھی وہ اس دل کو بغور اتنی دیر تک سن لینے کا کوئی موقع کبھی پاس سکے گی اسے جو امید نہیں تھی وہ ہوا تھا وہ اس شخص کے قریب آئی تھی اس کے دل کی دھڑکنوں کو سنا تھا اس چہرے کو اتنی قریب سے پہلی بار دیکھا تھا وہ نگاہ شاید پہلی بار اس کی سمت اس طور متوجہ ہوئی تھی کوئی اور موقع ہوتا تو فتح النساء کا دل ہواؤں میں معلق ہو جاتا بادلوں کے ساتھ اڑنے لگتا مگر اس لمحے کا گریز اور خاموشی اس طور برقرار رہے تھے اس نے خاموشی سے اس شخص کو دیکھتے ہوئے اس کے سینے سے سر اٹھایا تھا۔

ان بھیگتی آنکھوں میں کیا خاص پہلو تھا کہ وہ بغور اسے دیکھتا رہا تھا ان لانبی پلکوں میں کیا راز دیا تھا کہ وہ اس کی کھوج تک جانے کو بے چین دکھائی دیا تھا فتح النساء نے اس سے دور ہونا چاہا تھا مگر اس لمحے میں جانے کیوں بے ساختہ فتح النساء کے اردگرد اپنے مضبوط بازو کا حصار باندھ دیا تھا اور اسے بغور دیکھتے ہوئے مضبوط لہجے میں بولا تھا۔

”ہم آپ کو تب تک جانے نہیں دیں گے فتح النساء جب تک آپ ساری بات نہیں بتا دیتیں کیسے مدعا کیا ہے آپ اتنی پریشان کیوں لگ رہی ہیں۔“ وہ مضبوط لہجے میں کہتے ہوئے اس کے چہرے اور آنکھوں کو بغور دیکھنے لگا تھا۔

تب فتح النساء کو بولنا ضروری لگا تھا۔

”ہم پریشان نہیں آپ اپنی گرفت سے ہمیں آزاد کردیں۔“ وہ اس صورت حال پر جیسے بوکھلا کر رہ گئی تھی مگر جلال نے اس کے گرد اپنی گرفت ڈھیلی نہیں کی تھی وہ اس طور اس کے گرد اپنے بازو کو مضبوطی سے باندھے کھڑا تھا اور فتح النساء صورت حال کا اندازہ کرتی ہوئی ہراساں سی ارد گرد دیکھنے لگی تھی اگر ان کو جلال کے کوئی اس قدر قریب دیکھ لیتا تو یقیناً قصے کہانیاں بن جاتے صد شکر تھا آس پاس کوئی نہ تھا فتح النساء نے درخواست کرتی نظروں سے جلال کو دیکھا تھا۔

”کہا نا ہم پریشان نہیں ہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

”پھر آپ رو کیوں رہی تھیں۔“ وہ جاننے پر بضد ہوا تھا۔

”وہ ہماری آنکھ میں کچھ چلا گیا تھا ہوا زیادہ چل رہی ہے نا آج۔“

فتح النساء نے فوری طور پر بہانہ کرتے ہوئے جواز دیا

تھا مگر جلال نے اس کے گرد سے اپنی بازو کی گرفت ڈھیلی نہیں کی تھی۔

"آپ کا لہجہ بتاتا ہے آپ کی دلیل کمزور ہے فتح النساء آپ جھوٹ کب سے بولنے لگیں ہمیں لگا تھا آپ صاف گوئی سے کام لینے کی قائل ہیں اور آپ کا دل آپ کی آنکھوں کی طرح شفاف ہے۔" جلال نے اسے شاکی نظروں سے دیکھا تھا وہ زچ ہو کر رہ گئی تھی تبھی نگاہ پھیرتے ہوئے بولی تھی۔

"ہمیں ابا اماں کی یاد آ رہی تھی بس یونہی دل بھر آیا ہم نے تو ان کو دیکھا تک نہیں ہمیں خبر ہی نہیں ماں باپ کون ہوتے ہیں ہم ان کی اولاد ہیں بھی کہ نہیں۔" وہ ٹالنے کو بولی تھی جب جلال نے اسے دیکھا تھا۔

"اکیس برس بعد یہ کیسا سوال اٹھا آپ کے اندر آج پہلے تو کبھی آپ کو اس طور اپنے والدین کی یاد نہیں آئی آپ جواز ڈھونڈنے میں ناکام رہی ہیں فتح النساء کوئی معقول بہانہ کیا ہوتا تو شاید ہم قائل ہو جاتے اتنا تو ہم آپ کو جانتے ہیں۔" وہ حیران ہوئی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ جلال اس کا جھوٹ اس طور پکڑے گا یا وہ اسے اس طور جانتا ہے اسے ایک نئی بات پتا چلی تھی ایک انوکھا انکشاف ہوا تھا کہ وہ شخص نا صرف اسے کس قدر جانتا تھا بلکہ نوٹس بھی لیتا تھا شاید یہ بات خوش کن تھی کہ نہیں وہ جان نہیں پائی تھی مگر وہ جلال کی سمت سے نگاہ پھیر گئی تھی اس کی گرم گرم سانسوں کو اپنے چہرے پر محسوس کر رہی تھی چہرہ جلتا ہوا سا محسوس ہوا تھا تبھی جھکی نگاہوں سے بولی تھی۔

"آپ ہمیں کب سے جاننے لگے ہم جھوٹ نہیں بولتے۔" لمحہ بھر کو دل میں آیا تھا کہ مرزا حیدر سراج الدولہ کی حقیقت ان سے کہہ دے اور بتا دے کہ وہ عین کے لائق نہیں ہیں انہوں نے بہت گری ہوئی حرکت کا مظاہرہ فتح النساء کے ساتھ کیا ہے اور اسے میلی نظروں سے دیکھا ہے مگر وہ اس لمحے ایسا کچھ نہیں کر پائی تھی جانے کیا بات تھی دل میں کہ اسے ایسا کہنے سے باز رکھ رہی تھی۔

"ان دھڑکنوں میں جو بات باعث پریشانی ہے ہمیں وہ سننا ہے فتح النساء۔" جلال الدین پٹوڈی اس کی سمت دیکھتا ہوا بولا تھا' عجب ضدی لہجہ تھا اور فتح النساء کی جان پر بن آئی تھی۔ وہ جس کیفیت میں تھی ان نظروں کی تپش نے وہ کیفیت ماند کر کے ایک ہل چل سی اندر مچا دی تھی سو وہ اس سے دور نکلنے کی راہ ڈھونڈنے لگی تھی مگر وہ فی الحال اس کے گرد سے اپنی مضبوط گرفت ہٹانے کو تیار نہیں تھی اور فتح النساء کو سمجھ نہیں آیا تھا۔ اب اسے کس طرح قائل کرے وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ شخص اتنا ضدی واقع ہوا تھا وہ اس کے مزاج سے واقف ضرور تھی مگر اس درجہ قربت اور اس کا ضدی انداز اس کے حواس خطا کر رہا تھا تبھی وہ اس کی سمت سے نگاہ چراتے ہوئے بولی تھی۔

"ہمیں دیر ہو رہی ہے' ہم بوا کو گھر بتا کر نہیں آئے۔ وہ پریشان ہو رہی ہوں گی' ہمیں جانا ہے۔ ہمیں جانے دیجیے' یہ ضد کسی اور وقت پر اٹھا رکھیں' اتنا جان لیں ہم آپ سے کچھ نہیں چھپائیں گے اگر کوئی بات ہوئی تو آپ سے ضرور اس کا ذکر کریں گے۔" اس نے آہستگی سے کہا تھا اور جلال نے اسے جائزہ لیتی نظروں سے دیکھا تھا پھر بے پروا انداز میں گویا ہوا تھا۔

"آپ اس گھر میں بچپن میں آنے جانے کی عادی رہی ہیں' آپ کی بوا کو یقیناً معلوم ہو گا کہ آپ اس طرف آئی ہیں۔ محل میں آپ جتنی محفوظ ہیں اس بات پر آپ بھی قائل ہوتی دکھائی دیں گی۔ ہمیں اتنا تو معلوم ہے کہ جس کسی نے بھی آپ سے کچھ کہا ہے وہ اس محل کا نہیں ہے کیونکہ محل میں کسی میں اتنی ہمت نہیں کہ کسی بیٹی بہو پر کوئی غلط نظر ڈال سکے۔ ہم بھی فرشتہ نہیں ہیں مگر خواتین کا احترام کرنا ہمیں خوب سکھایا گیا ہے۔ ہمیں لگ رہا ہے بات پریشان کن ہے اس لیے ہم اتنا ان سیٹ کر رہے ہیں تا کہ صورت حال کے بگڑنے سے پہلے اس پر قابو پایا جا سکے۔ اتنی تو خبر ہو چکی ہے کہ معاملہ سنگین ہے' آپ کی دھڑکنوں کے ارتعاش میں جو خوف ہے وہ اس خوف کی خبر صاف دے رہا ہے۔ یہی بات تھی کہ ہم جانے بنا آپ کو جانے

دینا نہیں چاہتے تھے اگر آپ بتانے کو تیار نہیں تو ہم آپ کو مجبور نہیں کریں گے۔" کہتے ہوئے اس نے فتح النساء کے گرد سے اپنا حصار ختم کیا تھا اور دو قدم دور ہو کر اسے جانے کی راہ دی تھی اور اس کے دو قدم دور جانے سے جیسا ایک دور تک پھیلا ہوا وسیع آسمان اسے سمٹتا لگا تھا۔ جیسے آسمان نے اپنی حدود کا تعین کرتے ہوئے اس کے اطراف سے اپنا وجود سمیٹ لیا تھا۔ ایک بے چینی نے اندر تک سر اٹھایا تھا مگر وہ کچھ بولے بنا رخ پھیر کر پلٹی تھی اور چلتی ہوئی آگے بڑھ گئی تھی۔ جلال اس کی سمت سے پلٹ کر اس کی مخالفت سمت چلتا ہوا آگے بڑھنے لگا تھا۔

* * *

تیمور بہادر یار جنگ، جلال کے کمرے کی سمت بڑھنے لگا تھا جب ٹیرس کی سمت نگاہ گئی تھی اور عین النور وہاں کھڑی دکھائی دی تھی تب وہ جانے کیوں جلال کے کمرے کی سمت سے رخ پھیر کر اس کی سماعت کا سفر کرتا ہوا آگے بڑھا تھا اور اس کے قریب آن رکا تھا۔ عین النور پتوڈی کسی کی آمد کو محسوس کر کے پلٹی تھی اور تیمور بہادر یار جنگ کو سامنے دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔

"آپ یہاں؟" وہ حیرت سے چونکتے ہوئے بولی تھی۔

"کیوں آپ کو یقین نہیں ہے کہ ہم آپ کے سامنے ہیں یا ہمارے بارے میں سوچ رہی تھیں؟" تیمور اس کی سمت دیکھ کر مسکرایا تھا عین دوستانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا دی تھی۔

"ہم یقین نہیں کر سکتے تیمور بہادر یار جنگ آپ وہی بزدل سے انسان ہیں۔ آپ کی پرسنالٹی تو یکسر بدل چکی ہے اور یہی بات ہمیں حیرت میں مبتلا کر رہی ہے۔" عین کے مسکرانے پر وہ بغور اس کی سمت دیکھنے لگا تھا۔

"تغیر وقت کے ساتھ آتا ہے عین النور! آپ کو اتنی حیرت کیوں ہے؟ کہیں یہ حیرت کسی خاص بات کی پیش خیمہ تو نہیں؟" وہ اسے بغور دیکھتے ہوئے مسکرایا تھا اور عین اس کی سمت سے رخ پھیر گئی تھی۔

اب بات کرنے کا ڈھنگ ہی دیکھ لیجیے، آپ باتوں کے جال بُننا سیکھ گئے ہیں۔ بچپن میں تو آپ کو بات کرنے کا ڈھنگ معلوم ہوتا تو دور کی بات آپ میں اتنا اعتماد نہیں تھا کہ دو لفظ بھی کہہ سکیں اور اب تو ہم آپ کے لفظوں کے انتخاب پر حیران رہ جاتے ہیں۔ اتنا اعتماد کہاں سے آ گیا آپ میں یکدم۔" عین مسکرائی تھی وہ پرسکون انداز میں کہہ رہا تھا۔

"اتنے سالوں میں اعتماد اکٹھا کرتا رہا ہوں، خبر تھی کہ آپ کے سامنے بولنے کی ہمت نہیں کر پاؤں گا سو اس ضمن میں خاص توجہ مرکوز رکھی اور مشق جاری رکھی۔" ان آنکھوں میں شوخی تھی۔

"مشق...... کیسی مشق؟" وہ چونکی تھی، وہ مسکرا دیا تھا۔

"مشق کیا ہوتی ہے آپ نہیں جانتیں؟" اس کے احساس دلانے پر وہ چونکی تھی۔

"اوہ آپ ایسے دل پھینک واقع ہوں گے ہمیں اندازہ نہیں تھا۔ جلال کے دوست ہیں پروف ہو گیا۔ کہیں آپ بھی گوری میموں کے جال میں تو نہیں پھنس گئے۔ ایک بات بتا دیں آپ کو یہ گوری میمیں دیکھنے میں دلنشین ترین ہوتی ہیں مگر ان کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ اس متعلق تو ہم جلال کے کان بھی کھینچ چکے ہیں۔" وہ ایک تمکنت سے کہہ کر گردن موڑ کر کافی کے سپ لینے لگی تھی اور تیمور اس کی سمت بغور دیکھتا ہوا مسکرایا تھا۔

"آج صبح جاگا تو ایک روشن تارہ آسمان پر دیکھا پھر اچانک ہی آپ کا دھیان آ گیا۔ حیرت ہوئی اگرچہ اس بے سمت تکتے تارے نے آپ کا کوئی ذکر بھی نہیں کیا تھا۔ پوچھنا یہ تھا کہ اگر بے سبب یونہی کوئی بار ہا ذکر بات بے بات کسی تسلسل سے آنے لگے تو معنی کیا نکلتے ہیں؟" تیمور بہادر یار جنگ کی آنکھیں اور لہجہ عجب گرفت میں لینے والا تھا۔ عین النور نے ایک لمحے میں اس پر سے اپنی توجہ ہٹائی تھی اور مدھم لہجے میں گویا ہوئی۔

"ہم تاروں کی سمت نہیں دیکھتے کیونکہ ان کی نظروں کی حیرت سمجھ نہیں آتی۔ ہم ان کے شکوہ کا کوئی جواب نہیں

پاتے مگر آپ تاروں کی گفتگو کو اس درجہ بغور سننے کا عمل ترک کردیں۔ اگر وہ بے معنی باتیں کرتے ہیں تو ان کے معنی ڈھونڈنا آپ پر لازم نہیں ہوجاتا۔" اس نے سرسری انداز میں کہا تھا۔

تیمور بہادر یار جنگ نے اس صبیح چہرے کو بغور دیکھا تھا۔ بالوں کی لٹیں ہوا سے اڑتے ہوئے عجیب گفتگو کرتی محسوس ہوئی تھیں۔ تیمور بہادر یار جنگ کی نگاہ جیسے الجھنے لگی تھی۔

"دیکھیے آسمان پر آج چاند پورا ہے، سنا ہے پورے چاند میں عجیب ایک کشش ہے، جس سے جادو چھانے لگتا ہے۔ کہیں آپ کی بے معنی باتیں اسی دیوانگی کو ظاہر تو نہیں کرتیں؟" وہ کافی کا سپ لیتے ہوئے مسکرائی تھی۔ تیمور نے نگاہ اٹھا کر چاند کی سمت دیکھا تھا پھر اس چہرے کو دیکھا تھا۔

"چاند کو غور سے دیکھا ہے کبھی آپ نے؟ اس کے کتنے چہرے ہیں اور غور سے دیکھیں کتنی باتیں لکھی ہیں اور کتنی شکایتیں؟ مستعار کی روشنی دیکھنے نہیں دیتی، غور سے دیکھیں تو کئی راز ہیں اس چہرے میں، چلیں نہیں دیکھنا آسمان تو رہنے دیں۔ ایسا کریں آئینہ دیکھ لیا کریں جو راز آسمان کی سمت دیکھ کر نہیں کھلتے شاید آئینے میں ضرور دکھائی دیں گے۔" اس محبت بھرے لہجے میں حیرتیں تھیں۔

عین جانے کیوں اس کی سمت دیکھ نہیں پائی تھی اور کافی کے سپ لینے لگی تھی تب جانے کیوں تیمور بہادر یار جنگ نے ہاتھ بڑھا کر اس کے ہاتھ سے کافی کا وہ کپ لیا تھا۔ عین النور پٹوڈی حیرت سے اسے دیکھنے لگی تھی، تیمور بہادر یار جنگ کافی کے سپ لینے لگا تھا۔

"آپ کو کافی پینا تھی تو بتادیتے، ہم آپ کو نئی منگوادیتے۔"

"آپ کے ساتھ کافی پینے کا موڈ تھا مگر آپ نے پوچھا نہیں پھر دھیان آیا اس کافی میں جو چاشنی ہوگی شاید وہ چاشنی کافی کے دوسرے کپ میں ناپید ہو سو آپ کے ہاتھ سے یہی کافی لینا مناسب خیال کیا۔" تیمور بہادر یار جنگ کے لہجے میں چھپی، ایک لگن کو محسوس کرتے ہوئے وہ لب بھینچ گئی تھی وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا تھا جب وہ بولی تھی۔

"کسی کا جھوٹا پینا ٹھیک نہیں ہوتا۔"

"کیوں نہیں؟ جن زادوں کی زمین پر یہ معیوب نہیں، کہتے ہیں جھوٹا پی لینے سے محبت ہوجاتی ہے۔" تیمور کی آنکھوں میں شرارت تھی۔ وہ جیسے اسے زچ کردینے کے درپے تھی، عین خودی طور پر وہاں سے ہٹ بھی نہیں سکتی تھی۔ یہ مناسب نہیں لگتا سو اس کی سمت دیکھنے سے گریز کرتی ہوئی بولی تھی۔

"ہماری زمین پر ایسا نہیں تصور کیا جاتا، مہمانوں کو الگ سے کافی پیش کی جاتی ہے۔ جھوٹا پلانا آداب کے خلاف ہے۔" وہ سہولت سے سمجھانے لگی تھی۔

"اوہ یہ تو گناہ عظیم ہوگیا آپ کی سلطنت میں۔ اب کیا کریں؟ اس کا سدباب آپ کریں گی یا ہم کریں؟" وہ بغور دیکھتا ہوا کافی کے سپ لینے لگا تھا۔

"کیسا سدباب؟ آپ کی باتیں عام فہم کیوں نہیں ہوتی؟ عجب الجھا سا دیتے ہیں آپ اور پھر اس بات کو تسلیم بھی نہیں کرتے۔ جانے کہاں سے ایسے اصول سیکھ آئے ہیں۔ بچپن کے دوست ہیں سو برداشت کررہے ہیں ورنہ جان لیں ہم بچپن والی وہ سزائیں دینے میں کوئی پس و پیش نہیں رکھیں گے اگر آپ اسی طور ہمیں پریشان کرتے رہے۔" وہ ایک خاص تمکنت سے بولی تھی اور تیمور مسکرادیا تھا، وہ اسے سننے سے زیادہ اسے دیکھنے پر معمور رہا تھا جیسے لفظ تو یاد نہیں رہے تھے کہ اس نے کیا کیا کہا تھا مگر وہ اس کی آنکھوں کی یکسانیت کے رنگ سمجھنے کے جنون میں اسے تکتا ہوا ایک قدم قریب آیا تھا۔

"مٹھاس آنکھوں میں زیادہ تھی یا کافی میں؟ اندازہ نہیں کرپایا، یاد نہیں رہا۔ اس کی باتوں نے کسی بات کا تعین کرنے نہیں دیا، سمجھ نہیں پایا الجھاؤ باتوں کے تھے یا کاکلیں چہرے پر بکھری تھیں مگر میں سلجھنے کے جتن کرتے ہوئے الجھتا چلا گیا۔" وہ مدھم لہجے میں کہتا ہوا مسکرایا تھا، عین نے

اسے دیکھا تھا اور مسکرا دی تھی۔

''تیمور بہادر یار جنگ! ہر بات کے اسباب ڈھونڈنا آپ کی سرشت میں ہے مگر اتنا تجسس ہونا ٹھیک نہیں ہوتا۔ کچھ معاملات اپنی الجھنیں اور سلجھاوے اپنے طور پر سنبھال کر رکھنے کی عادی ہوتی ہیں اور کسی طرح کی بیرونی مداخلت برداشت نہیں کرتیں۔'' عین النور نے اسے دیکھا تھا تیمور مسکرا دیا تھا۔

''میں آپ کو بہت عرصے بعد ملا ہوں مگر لگتا نہیں کہ کوئی لمحہ آپ سے دور گزرا ہے۔ میں آپ کے بارے میں سوچتا رہا ہوں آپ کا ایٹی ٹیوڈ' آپ کی باتیں' اکثر بہت یاد آتی تھیں۔ زمانوں کے گزرنے سے اس تسلسل میں کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ زندگی تیز رفتار رہی مگر اس بھاگتے دوڑتے موسموں میں اکثر آپ کی یاد نے بے طرح چونکا دیا۔'' تیمور نے کہا تھا اور عین اس کی سمت دیکھنے لگی تھی۔ لمحہ بھر کو جیسے کچھ نہیں آیا تھا کہ کیا کہے مگر پھر دوسرے ہی لمحے سنبھلتے ہوئے بولی تھی۔

''اچھے دوست ہیں آپ' تبھی تو ہر ظلم وستم برداشت کرتے رہے ہیں۔'' تیمور مسکرا دیا تھا۔

''آپ نے عجیب عادت ڈال دی تھی' یہاں سے جا کر بھی دل ڈرتا رہتا تھا کہیں سے آپ نکل کر نہ آ جائیں اور سزاؤں کا وہ سلسلہ دوبارہ شروع نہ کر دیں۔'' وہ بولا تھا تو عین بے ساختہ ہنسنے لگی تھی۔

''اوہ آپ پر اس درجہ خوف طاری تھا؟ تبھی میں کہوں آپ کچھ لمحے کیوں کہہ رہے تھے کہ آپ کو یاد زیادہ آتی تھی اور کبھی آپ چونک بھی جاتے تھے۔'' عین اپنی دہشت اس پر دیکھ کر جیسے حد درجہ محظوظ ہوئی تھی۔ تیمور نے اس کی مسکراہٹ سے ایک عجیب دلکشی اس کے چہرے پر چھائی دیکھی تھی۔

''آپ سے کہہ دیا تھا کہ ان سزاؤں کے لیے شکوہ نہیں کروں گا۔ آپ چاہیں تو اب بھی وہ سخت رویہ روا رکھ سکتی ہیں۔ میں کان پکڑنے کو تیار ہوں اور اپنے وزن کے برابر وزن اٹھا کر گراؤنڈ کے دس چکر بھی کاٹنے کو تیار ہوں۔''

تیمور مسکرایا تھا۔

''اوہ کیا انگلینڈ میں اسٹڈی کے دوران وزن اٹھانے کی مشق کرتے رہے ہیں کیا؟'' عین نے مسکراتے ہوئے چھیڑا تھا۔ تیمور اس کو بغور دیکھتا ہوا مسکرایا تھا اور مدھم لہجے میں کہنے لگا تھا۔

''اسکول سے سینئر اسکول تک اور پھر کالج سے یونیورسٹی تک' بہت سے چہروں سے ملا ہوں' بہت سے دلنشین دیکھے ہیں مگر میری نگاہ جیسے بھٹک جاتی تھی۔ خیالوں میں موجود اس ایک چہرے کو ڈھونڈنے لگتی تھی مگر جب وہ چہرہ قریب یا سامنے نہیں پاتی تھی تو حیران رہ جاتی تھی۔ میں نے برسوں ایک چہرے کی کھوج میں گزاری ہے۔ بنا کسی چہرے سے متاثر ہوئے۔'' وہ مدھم لہجے میں اس کے بالوں کو اڑتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ ہوا کو جیسے ضد ہو گئی تھی کہ ان بالوں سے کھیلتی رہے گی اور وہ بار بار بالوں کی لٹوں کو پکڑ کر کانوں کے پیچھے دبا رہی تھی۔

''ایسے پاگل تھے آپ؟ عین النور جیسا کوئی اور نہیں ہے آپ بار بار ہر چہرے میں ایک چہرہ دیکھنے کی غلطی کیوں کرتے رہے؟'' وہ محظوظ ہو کر مسکرائی تھی۔

''تمہیں یاد ہے تم ایسی ہی باتیں بچپن میں ہی کہتی تھیں اور تب مجھے ضد ہو جاتی تھی۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کوئی اور تمہارے جیسا ہے کہ نہیں۔ ڈیڈ سے ضد کر کے انگلستان جانے کی بھی اسی لیے ٹھانی' میں دنیا کو دیکھنا چاہتا تھا اور تم سے ملتے جلتے چہروں کو تلاشنا چاہتا تھا تب لگتا تھا کہ تمہارے جیسے اور کئی چہرے ہوں گے۔ تم جیسی باتیں کرنے والے اور کوئی لہجے ہوں گے مگر پھر دیکھ لیا اور جان لیا۔'' وہ بات ادھوری چھوڑ کر مسکرایا تھا۔

''کیا جان لیا؟'' وہ متجسس سی اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی تھی۔

''یہی کہ تارے بہت سے ہوتے ہیں مگر چاند ایک ہی ہوتا ہے اور کوئی دوسرا چاند آسمان میں تاروں کے درمیان اس پہلے چاند کی جگہ نہیں لے سکتا۔ چہروں کی انفرادیت ان کی اہمیت بڑھا جاتی ہے' مجھے اس سچ کو مان لینا پڑا تھا کہ زمین

ایک چاند کے لیے بنی ہے اور ایک چاند زمین کا طواف کرنے کے لیے بنا ہے۔" تیمور بہادر یار جنگ بولا تھا تو وہ مسکراتی ہوئی لب بھینچ کر اس کی سمت سے نگاہ پھیر گئی تھی۔

"تیمور آپ اتنی دلچسپ شخصیت رکھتے ہیں آپ کسی اچھی لڑکی سے نہیں ملے؟ آئی مین اس طرح سے جو دل کو دھڑکا دے اور اس کے سامنے زمانوں کا وقت باقی نہ رہے۔" عین نے پوچھا تھا وہ اسے خاموشی سے دیکھنے لگا تھا اور مسکرا دیا تھا۔

"ملا تھا ایک بار ایسی لڑکی سے۔"

"اوہ رئیلی' پھر اس کے بعد کیا ہوا؟ آپ تو پاگل ہو گئے ہوں گے نا؟ کہیں اس سے محبت تو نہیں ہو گئی تھی آپ کو؟" عین نے دلچسپ قصے کی طرح اس کی گفتگو میں دلچسپی لی تھی اور محظوظ ہوتے ہوئے اسے دیکھا تھا' وہ خاموشی سے اسے بغور دیکھتا ہوا مسکرایا تھا۔

"ہاں پاگل ہو گیا تھا کچھ کچھ' اس کے بعد کچھ یاد نہیں رہا تھا مگر اسے مجھ سے محبت نہیں ہوئی تھی۔ وہ بہت نک چڑھی تھی کسی کو گھاس ہی نہیں ڈالتی تھی۔"

"اوہ پھر ایسی محبت کا کیا فائدہ' افسوس آپ کو محبت ہوئی بھی تو غلط جگہ اور مقام پر۔ اچھا اگر اسے آپ سے محبت ہو جائے تو کیا کریں گے آپ؟" عین نہیں جانتی تھی کہ وہ اس کا ذکر کر رہا تھا' اسے اس بات کا اندازہ نہیں تھا اور تیمور اس کی گفتگو سے حد درجہ محظوظ ہوا تھا۔

"وہ اس دنیا کا کوئی لمحہ ہوگا یا کسی اور زمین کی بات ہوگی؟ خبر نہیں عین مگر میں بے تابی سے اس لمحے کا انتظار کروں گا اس لمحے کو مٹھی میں دبا لوں گا اور وقت کو روکنے کی اپنی سی کوشش کروں گا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بس خاموشی سے دیکھوں گا۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کر سکوں گا۔" وہ مسکرایا تھا تو عین ہنس دی تھی۔

"عجیب سرپھرے ہیں آپ' کسی کی محبت سے اتنی محبت۔ حد کرتے ہیں آپ' ہمیں تو لگتا تھا آپ کہیں گے آپ کو محبت ہوئی ہی نہیں' دنیا گھوم آئے اور محبت نہیں ہوئی۔ اچھا بائے دا وے کون تھی وہ؟ کوئی فرنگی تو نہیں تھی نا؟" عین اس کی جانب دیکھتے ہوئے مسکرائی تھی۔

"نہیں فرنگی نہیں تھی مگر اس کی سرمئی آنکھوں میں کئی رنگ تھے۔ ٹھیک سے یاد نہیں شاید نیلا' براؤن اور کوئی اور رنگ......"

"اوہ...... آپ نے ان کی آنکھوں کے رنگ بھی زبانی یاد کر لیے تھے؟ تت تت...... پھر تو بہت افسوس ہوا' وہ دنیا کی بھیڑ میں آپ سے کھو گئی۔ چلیں دل چھوٹا نہ کریں' واپس جائیے اور اس دنیا کے گول گول چکر کاٹیے' وہ وہیں کہیں مل جائے گی' ہو سکتا ہے وہ بھی اس دنیا کے چکر کاٹ رہی ہو۔ بے ارادہ کھونے والے ایسے ہی بے ارادہ مل بھی جاتے ہیں نا؟" عین نے سوالیہ نظروں سے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔ تیمور نے بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے میکانکی انداز میں سر ہلایا تھا۔ وہ جیسے اس کا معمول تھا اور اس کے سامنے انکار کرنے یا اختلاف کرنے کی ہمت خود میں ناپید پاتا تھا۔

"محبت اتفاقاً ہو جانا کوئی اتفاق نہیں ہے شاید یہ ربط خاموشی میں دبے پاؤں ہیں' اتنی خاموشی میں کہ کبھی کبھی دل کو بھی خبر نہیں ہوتی۔ دھڑکنیں سارے راز سنا رہی ہوتی ہیں گر عقل سارے دروازے بند کر دیتی ہے مگر عقل کو مان لینا چاہیے اگر غیر محسوس طریقے سے افراتفری میں کوئی نا سمجھ میں آنے والی سے تسلسل سے واقع ہو رہی ہو تو یقیناً وہ محبت ہی ہے۔" تیمور نے مدھم لہجے میں آگاہ کیا تھا جب وہ سوالیہ نظروں سے اس کی سمت دیکھتے ہوئے بولی تھی۔

"ایسی محبت کون کرتا ہے تیمور بہادر یار جنگ! آپ نے تو دنیا دیکھی ہے' آپ کو نہیں لگتا کہ محبت ایسا کوئی وجود نہیں رکھتی۔" وہ کسی قدر افسردہ دکھائی دی تھی جانے کیوں اس کے لہجے میں ایک نامعلوم سی اداسی اتر آئی تھی۔ تیمور اس لہجے کی اداسی کو اپنے اندر محسوس کرتے ہوئے بولا تھا۔

"محبت اپنا وجود رکھتی ہے عین النور! اگر سنائی نہ دے اور دکھائی نہ دے تو یہ اخذ کر لینا کہ اس کا وجود نہیں تو یہ حماقت ہے۔" مگر وہ نفی میں سر ہلانے لگی تھی۔

"نہیں حماقت نہیں ہے' وہ عقل مندی ہے تیمور! جب

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

عقل دیکھتی نہیں اور تسلیم کرتی ہے اسے سمجھ داری تصور کر لینا چاہیے۔'' وہ مدھم لہجے میں بولی تھی۔

''نہیں سمجھ داری یہ نہیں ہوتی کہ کسی شے کی غیر موجودگی پر حتمی بنالے کروہ شے ایگزٹ ہی نہیں کرتی اگر عقل کو کوئی شے دکھائی نہیں دیتی تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کا وجود ہی نہیں بعض اوقات چیزیں نگاہ کو دکھائی نہیں دیتیں مگر ضروری نہیں جو شے نگاہ سے اوجھل ہے اس کی کوئی وقعت نہیں۔ بعض اوقات جو شے نگاہ کے سامنے نہیں ہوتی اور نظروں سے اوجھل ہوتی ہے اس کی وقعت اسی درجہ بڑھ جاتی ہے۔'' تیمور نے کہا تھا اور وہ سر ہلانے لگی تھی۔

''شاید ایسا درست ہے مگر نظر نہ آنے والی محبت کیسی ہوتی ہوگی؟'' اس کا انداز کھویا کھویا سا تھا۔

''آپ نے کبھی کھوئی ہوئی محبت نہیں دیکھی؟'' تیمور کے پوچھنے پر وہ چونکی تھی۔

''کھوئی ہوئی محبت کیسی ہوتی ہے؟ اس کا ذکر بھی نہیں سنا۔'' وہ مسکرائی تھی اور اس کا انداز بہت پھیکا سا تھا' تیمور نے اسے بغور دیکھا تھا پھر اس کی سمت ہاتھ بڑھا تھا اور اس کا ہاتھ مانگا تھا عین چونکی تھی۔

''ہاتھ دیجیے۔'' اس نے احترام سے کہا تھا' عین اس کی سمت جانے کیوں ہاتھ بڑھا رہا تھا۔ تیمور اس کا ہاتھ تھام کر مسکرایا تھا پھر اپنی خالی ہاتھ کی مٹھی بنا کر اس کے ہاتھ پر کچھ رکھا تھا جو شے نہ دکھائی دینے والی تھی۔ عین حیرت سے اسے دیکھنے لگی تھی مگر تیمور نے اس کا ہاتھ مٹھی کی شکل میں دوبارہ بند کر دیا تھا۔

''یہ کیا ہے' پاگل ہیں آپ؟'' عین مسکرائی تھی۔

''یہ نہ دکھائی دینے والی محبت مگر آپ اسے محسوس کر سکتی ہیں۔'' تیمور مسکرایا تھا۔

''کیا مطلب...... کیسے محسوس کر سکتی ہوں؟'' عین چونکی تھی' تیمور اسے دیکھ کر مسکرایا تھا۔

''محبت ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ تک منتقل کیا جانے والا ایک احساس ہے' اب وہ محبت ہے یا کچھ اور یہ آپ کو جاننا ہوگا مگر میں نے ایک سوچ اپنے ہاتھ سے آپ کے ہاتھ پر رکھ دی ہے۔ وہ سچ کوئی محسوسات تھی یا کچھ اور یہ آپ طے کریں گی۔'' تیمور بولا تھا اور وہ بے ساختہ ہنس دی تھی اور اپنی مٹھی کو دیکھنے لگی تھی۔

''سچ میں عجیب ہیں آپ تیمور بہادر یار جنگ! میں اپنے طور کچھ بھی اخذ کرلوں یہ تو نفسیاتی حربہ ہوگیا۔ آپ فرنگیوں کے دیس کیا ہو آئے آپ تو باتیں بھی انہی کی کرنے لگے۔ انگریزوں نے رنگ لیا آپ کو اپنے رنگ میں' آپ کہنا چاہتے ہیں کہ محبت ایک نفسیاتی غلبہ ہے؟ جیسے انگریزوں کا راج ایک نفسیاتی فتنہ ہے۔'' وہ اسے عجیب نظروں سے دیکھنے لگی تھی' وہ اس کی ذہانیت پر مسکرایا تھا۔

''محبت نفسیاتی غلبہ یا فتح نہیں ہے عین! آپ محبت کو سمجھنے کی غلطی کر رہی ہیں۔ محبت کو سمجھنے کے لیے اتنی عجلت کا مظاہرہ کرنا مناسب نہیں۔'' تیمور نے نرم لہجے میں سمجھایا تھا' تبھی اس نے ہوا کے رخ پر اپنے اڑتے ہوئے بالوں کی لٹوں کو سنبھالتے ہوئے کان کے پیچھے کیا تھا اور بے فکری سے شانے اچکاتے ہوئے تیمور کو دیکھا تھا۔

''جانے دیجیے آپ اور آپ کی بے سر پیر کی لوجکس۔ محبت نہیں ہوئی جادوئی پڑیا ہوگئی' ہمیں یہ جادوئی پڑیا نہیں کھولنا۔'' اس نے جانے کا ارادہ کر کے قدم آگے بڑھائے تھے مگر دوسرے ہی لمحے چونکی تھی اور رک کر تیمور بہادر یار جنگ کا ہاتھ تھاما تھا۔

تیمور اس کے ہاتھ تھامنے پر چونکا تھا' جب عین النور نے اپنی بند مٹھی کو کھولتے ہوئے اس کی ہتھیلی پر ان دیکھی کوئی شے رکھی تھی اور اس کی مٹھی بند کر دی تھی۔

''اسے آپ سنبھالیے' ہم سے ایسی چیزیں نہیں سنبھالی جاتیں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے تیمور کی سمت دیکھا تھا اور پھر اس کا ہاتھ چھوڑ کر آگے بڑھ گئی تھی۔

تیمور اس لڑکی کو جاتے ہوئے دیکھنے لگا تھا اور پھر اپنی بند مٹھی کو دیکھا تھا' جہاں دکھائی دینے والی کوئی شے نہیں تھی مگر ایک جلتا ہوا لمس تھا اور اس لمس کا احساس تھا۔ وہ یہ بات سمجھ کر مسکرایا تھا' پتا نہیں عین النور کی عقل میں یہ بات

قرآن پڑھنا آسان سمجھنا سب کے لیے آسان

معروف قلمکار مشتاق احمد قریشی کی عام فہم قرآنی تفسیر پر مبنی کتابیں

السلام علیکم

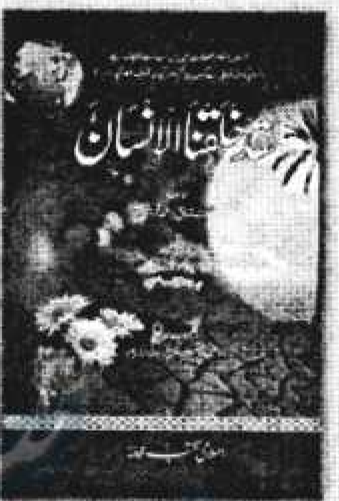
خلقنا الانسان

یایھا الذین امنوا

تفسیر
معوذتین

منگوانے کا پتہ

اسلامی کتب خانہ الحمد مارکیٹ غزنوی روڈ اردو بازار لاہور۔ 0423-7116257

نئے افق گروپ آف پبلی کیشنز، 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی۔ 0213-5620771/2

آئی تھی کہ نہیں، وہ سوچنے لگا تھا۔

* * *

"میاں یہ کیا اول فول بول رہے تھے اپنے سسر میاں کی ضیافت پر؟ ناک کٹوا دی ہماری، کانگریس کی بیٹھک میں لوگ انگلیاں اٹھا رہے تھے ہم پر۔ عجیب نالائق بیٹا ملا ہے ہمیں، اپنی عیاشیوں کے لیے سب پتا ہے مگر جہاں باپ کی عزت کی بات آ جائے وہاں بدھو بن جاتے ہیں۔" سراج الدولہ نے بیٹے کو ڈانٹا تھا، حیدر سراج الدولہ مسکرا دیا تھا۔

"ابا جان سیاسی بیان بازی کو نہیں سمجھتے آپ؟ کانگریس کا حصہ ہیں آپ روز کئی سیاسی بیان سنتے رہے ہوں گے، ان کی وقعت کیا ہوتی ہے؟ بہرحال ایک بات آپ کو بتانا چاہتے تھے ہم، ہمیں اس نئی سرزمین پر جانا سود مند سودا لگتا ہے ہم وہاں جا کر نوآبادیات کا حصہ بن کر وہ سب اثاثے بھی کلیم کر سکتے ہیں جو ہم نے یہاں چھوڑے بھی نہیں۔" حیدر مسکرایا تھا۔

"نالائق یہاں سے جانے والوں کو اثاثے نہیں ملیں گے، موت ملے گی۔ تم ہندوؤں کو نہیں جانتے، یہاں ہندو اور سکھ دونوں بپھرے ہوئے ہیں، وہ مسلمانوں کو اتنی آسانی سے اس نئی زمین تک کا سفر کرنے نہیں دیں گے، کاٹ کر رکھ دیں گے۔ یہاں سے جانے والے بچکانہ باتیں کرتے ہیں، یہ جوش کی باتیں ہیں اور جوش میں رہنے والے عقل کو خیرباد کہہ دیتے ہیں، مصلحت اسی میں ہے کہ اپنے علاقوں میں رہا جائے اور ہندوؤں اور سکھوں سے بنا کر رکھی جائے۔ اس سے ایک فائدہ ہوگا کہ جان بچ جائے گی اور نقصان نہیں ہوگا۔ ہم کانگریس کا حصہ یوں ہی نہیں بنے اگر چاہتے تو مسلم لیگ کا حصہ بھی بن سکتے تھے مگر ابا مرحوم کہتے تھے کہ اقلیت کا حصہ کبھی نہ بننا۔ اقلیت والے نمایاں زیادہ ہوتے ہیں اور نقصان اٹھاتے ہیں۔ ہمیشہ اکثریت کا ساتھ دینا کیونکہ جہاں اکثریت اقلیت پر غالب آئے گی وہاں جہاں اقلیت نقصان اٹھائے گی تم اکثریت کا حصہ ہونے کے باعث نقصان سے محفوظ رہو گے سو میری مانو تو اقلیت کا حصہ بننے کا چھوڑ کر اکثریت کا ساتھ دو۔" سراج صاحب نے بیٹے کو سمجھایا تھا، حیدر مسکرایا تھا۔

"ابا کہہ دینے سے ضروری نہیں ہم پاکستان کا حصہ بن جائیں مگر ہم ایک بات سوچ رہے تھے، سیف چاچا یہاں اپنے بھاری اثاثے چھوڑ کر جائیں گے ہمیں گمان ہے یہ وہاں پہنچ کر اس سے زیادہ اثاثوں کی درخواست کریں گے۔ ہم ان سے ہاتھ دھونا نہیں چاہتے۔" حیدر نے مکاری سے مسکراتے ہوئے بولا محترم کو دیکھا تھا۔

"کچھ نہیں ملے گا ان نواب صاحب کو جتنا زہر سکھوں اور ہندوؤں کے ذہن اور دلوں میں وہ بو رہے ہیں اس کا خمیازہ انہیں بھگتنا ہوگا۔ جناح صاحب ان کو محفوظ کرنے اس زمین پر نہیں آئیں گے نہ ان کے لیے کوئی خصوصی سواری کا اہتمام ہوگا۔ مسلم لیگی ہونے کا کوئی پروٹوکول نہیں لے گا انہیں، کتے کی موت مریں گے وہ۔ جتنے بیان ان کے اخباروں میں چھپتے ہیں ان کی گردن پر تو سب سے پہلے چھری پھیری جائے گی، آئے بڑے مسلم لیگ۔ ہندوؤں کی ذاتوں اور ان کے فرق کو سب سے زیادہ ہی ڈسکس کرتے ہیں، خود کہاں کے مومن ہیں نو سو چوہے کھا کر بلی حج کو چلی۔ اپنے گریبان میں نہیں دیکھتے۔" سراج صاحب نے اندر کا تمام زہر اگلا تھا، حیدر مسکرا دیا تھا۔

"میرے سسر میاں کی مقبولیت سے خائف ہیں آپ ابا جان! چلیں دل نہ جلائیں، دماغ ٹھنڈا کریں۔ ہم وہی کریں گے جو آپ کہیں گے۔" حیدر نے نرمی سے کہا تھا اور والد محترم کو دیکھا تھا۔

"یوں تو آپ سیف چاچا کے خلاف بولتے ہیں پھر جائیداد سے عاق کرنے کی بات کیوں کی؟ آپ کی نفرت اتنی شدید ہے تو پھر تو آپ کو فرق نہیں پڑنا چاہیے کہ ہم کیا کرتے ہیں اور کیا نہیں۔" سراج صاحب نے بیٹے کو گھورا تھا۔

"سپوت محترم ایسی ساری باتیں آپ کی عقل میں آ جائیں تو پھر آپ کسی کوٹھے پر نہیں ایوان میں بیٹھے دکھائی دیں۔ عقل کا استعمال کرنا شروع کر دیں گے، تحریک

زوروں پر ہے اور کسی بھی وقت کوئی تبدیلی آ سکتی ہے' سو اپنی آنکھیں اور عقل کھلی رکھیے۔" سراج صاحب کہہ کر چلتے ہوئے باہر نکل گئے تھے' حیدر مسکرا دیا تھا۔

"ابا بھی کمال ہیں' بات کو سمجھتے نہیں ہم کیا چاہتے ہیں وہ زیادہ ضروری ہے بہر حال وقت کی اولین ترجیح یہ ہوگی کہ تیل اور اس کی دھار دیکھی جائے۔" وہ مسکراتے ہوئے ڈرنک کا گلاس لبوں سے لگانے لگا تھا جب فون کی گھنٹی بجی تھی تب وہ ڈرنک کا گلاس وہیں رکھ کر فون اسٹینڈ کی طرف بڑھ گیا تھا۔

"ہیلو...... ہاں کرم دین! کیا خبر ہے' کیا ہم خاتون حاکم سے آج ملاقات کا شرف حاصل کر سکتے ہیں؟ دعجیب دوشیزہ ہیں ان کی ناں کی تکرار عجب ایک خمار طاری کرتی ہے۔ ہوش باقی نہیں رہتا اور دل مچلتا ہوا ان کے قدموں میں جا پڑتا ہے۔" حیدر مسکرایا تھا' دوسری طرف کرم دین جانے کیا بولا تھا کہ وہ مسکرا دیا تھا۔

"دل تو جیت کر رہیں کرم دین ہم ضد کے پکے ہیں' ٹھان لیں تو کر کے رہتے ہیں۔" حیدر مسکرایا تھا۔

"اچھا محترمہ سے پوچھ کر بتاؤ ہم تشریف آوری کریں؟ بہت دن ہوئے ان کا دیدار نصیب نہیں ہوا' دل کم بخت عجب اضطرابیت میں آن گرا ہے' ان سے ہماری طرف سے درخواست کر دیں اور جواب سے مطلع فرمائیں۔ ہم انتظار کرتے ہیں۔" حیدر سراج الدولہ نے کہہ کر فون رکھا تھا اور چلتے ہوئے اپنی جگہ پر آن بیٹھا تھا اور ڈرنک کے سپ لینے لگا تھا' ان کی آنکھوں میں ایک خاص چمک تھی۔

☆☆☆☆

فون کی گھنٹی بج رہی تھی جب عین النور وہاں سے گزرتے ہوئے رک گئی تھی اور فون کا ریسیور اٹھا لیا تھا۔

"ہیلو......" عین نے کہا تھا جب کہ دوسری طرف سے تیمور کی آواز آئی تھی۔

"ہم نے تب سے اب تک بند مٹھی نہیں کھولی عین النور پٹوڈی!"

"اوہ آپ' ہم سمجھے کوئی ضروری کال ہوگی۔" عین انہیں چھیڑتی ہوئی مسکرائی تھی۔

"ویسے ہمیں لگا تھا آپ وہ بے معنی قسم کی باتیں شاید کسی خاص دورانیے اور وقت میں کرتے ہیں مگر اب خبر ہوئی آپ ایسی باتوں کا انبار کسی بھی وقت لگا سکتے ہیں۔" وہ مسکرائی تھی دوسری طرف تیمور بہادر یار جنگ نے گہری سانس لی تھی۔

"ہم آپ کو ضروری بات بتانا چاہتے تھے۔"

"کون سی ضروری بات۔" وہ چونکی تھی۔

"وہی جو آپ شاید سمجھ پائی تھیں کہ نہیں۔" تیمور الجھ کر بولا تھا۔

"ہمیں کچھ نہیں سمجھنا بہادر یار جنگ! وہ مذاق تھا اور وہیں ختم ہو گیا تھا اس کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں تھی۔ آپ جانے کیا سمجھنے لگے' جائیے دنیا کے گول گول چکر کاٹیے اور اس محبت کو ڈھونڈیے جو آپ سے ایک دن کھو گئی تھی' ہم آپ کو اسے ڈھونڈنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ اس سے زیادہ اچھا مشورہ شاید ہی کسی دوست نے دوسرے دوست کو دیا ہو' جائیے جا کر اسے ڈھونڈیے مل جائے تو ہمیں بھی مطلع کر دیں۔ ہم یقین کر لیں گے کہ ایسی کسی محبت کا کوئی وجود ہے۔" عین نے بے فکرے پن سے کہا تھا اور فون کال کا سلسلہ منقطع کرنے لگی تھی جب تیمور نے دوسری طرف کہا تھا۔

"محبت کو ڈھونڈنے کے لیے دنیا کے گول گول چکر کاٹنا ضروری نہیں ہوتا عین! ہم اس کھوئی ہوئی محبت کو دنیا کے اردگرد چکر کاٹ کر ڈھونڈنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ آپ کو بتانا چاہتے تھے کہ ہم نے اس محبت کو اپنی مٹھی میں ڈھونڈ لیا ہے۔" تیمور پُرسکون انداز سے بولا تھا جب وہ چونک گئی تھی۔

"تیمور پاگل ہیں آپ؟ کیا آپ چاہتے ہیں ہم آپ کو ویسی ہی سزائیں دیں کہ آپ کا دماغ ٹھکانے لگا دیں۔" عین پوچھا تھا۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ

ایڈ فری لنکس
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety
پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1
پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بُک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

i. Open Paksociety Page.
ii.Click Liked.
iii.Select Get Notifications.
iv.Select See First.

All Done
Liked
Message
Get Notifications
Add to Interest Lists...
Unlike
IN YOUR NEWS FEED
See First
See new posts at the top of News Feed
Default
See posts as usual
Unfollow

http://paksociety.com

انتقام

جاوید احمد صدیقی

انتقام اک ایسا جذبہ ہے جو اگر حواس پر حاوی ہو جائے تو وہ انسان انسانیت کے جامے سے بالکل باہر نکل جاتا ہے اور پھر جانور بھی اس سے شرمانے لگتے ہیں۔

انگریزی ادب سے انتخاب، منفی جذبوں کے گرد گھومتی کہانی

دونوں نہ جانے کس طرح اتنا عرصہ ساتھ رہ چکے تھے اور یہ سفر بھی جیسے تیسے گزار رہے تھے۔ جیکی ذرا کم بولنے والا اور تھوڑا صلح جو واقع ہوا تھا مگر مسز جیکی تو بدلحاظ بدزبان اور منہ پھٹ انتہا کی واقع ہوئی تھی اور بہت سی باتوں اور عادات میں وہ دوسری عورتوں سے مختلف تھی۔ اپنے فیصلوں میں کسی کی مداخلت پسند نہ کرتی تھی اور خود ہی سب کرنے کی عادی تھی۔ کئی دفعہ تو اس کے عمل پر دوسروں کی توقعات پر پورا نہ اترتی تھی اور دوسروں کی امیدوں کے برخلاف عمل درآمد ہوتا تھا۔ یہی کچھ اس نے جیکی کی بہن کی تدفین کی رسوم پر کیا اس کی بہن ایک پھیپھڑوں کی بیماری سے چل بسی تھی۔ اصل میں بے انتہا سگریٹ نوشی نے اسے تباہ کر دیا تھا۔

تدفین اور دوسری تمام رسومات کے مراحل کے تمام اخراجات مسز جیکی نے ادا کئے تھے لوگ حیران تھے کہ یہ اس کی بہن تھی بھی نہیں پھر بھی......! ان رسومات پر کم از کم بیس ہزار خرچ ہوئے ہوں گے۔

مسٹر جیکی کی طرف کسی نے بھی توجہ نہ دی اور لوگوں کی نگاہوں سے بچنے کے لیے وہ پھولوں اور قدآدم پودوں کی آڑ لیتا رہا ایسی صورت حال نے اسے ذہنی پریشانی میں مبتلا کر کے اس کا موڈ بے حد خراب کر دیا تھا اور پھر یہ بھی کہ اس کی اپنی بیوی نے بھی تو اس کے احساسات کی پروا نہ کی اور پوچھا تک نہ تھا۔

”یوں لگ رہا تھا کہ وہ تمہاری بہن نہیں میری بہن تھی۔“ مسز جیکی نے تلخ لہجے میں تبصرہ کیا۔

”تمام تر بوجھ میرے اوپر تھا میرے تمام احباب متعجب تھے اگرچہ وہ اس سلسلے میں کچھ بولے نہیں۔“

جیکی تو صرف گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ کہ اس کے پاس کوئی جواب نہیں اور نہ ہی اس کی بیوی کسی جواب کی منتظر تھی۔

دونوں ہی تاش کے کھیل کے شوقین تھے اور تمام فساد کی جڑ بھی یہی کھیل تھا۔ شادی کے شروع دنوں میں جیکی نے اسے بتایا تھا کہ اس کھیل میں کبھی بڑی رقم نہ داؤ پر لگانا۔

جیکی نے نہ جانے یہ کیوں نصیحت کی حالانکہ اس کی بیوی مختلف قسم کی عورت تھی کسی بھی کھیل کا گیمبل اس کا جنون تھا۔ جتنا بڑا داؤ اتنا ہی اس کا جنون جوش مارتا تھا۔ اس نے شوہر کے برعکس ہدایت کے بڑے بڑے داؤ لگانے شروع کر دیئے۔ دس بار داؤ میں سات آٹھ بار وہ جیت جاتی۔ جیکی پریشان تھا کہ چھوٹے داؤ لگانے کے باوجود اس کی مالی حیثیت خراب ہوتی جا رہی تھی۔

آخر جیکی نے فرسٹیشن اور حسد میں آ کر بڑا داؤ لگا دیا مگر ہار گیا اور اب وہ یہ کھیل کھیلنے کی پوزیشن میں نہ تھا۔ مسز جیکی کے طعن و تشنیع میں اضافہ ہوتا چلا گیا وہ واقعی عقل سے کام نہیں لے رہی تھی کہ ایک بدحال مرد کی انا سے کھیل رہی تھی اور جیکی کے اندرونی جذبات سے بے خبر اپنی ہی رو میں چلتی جا رہی تھی۔

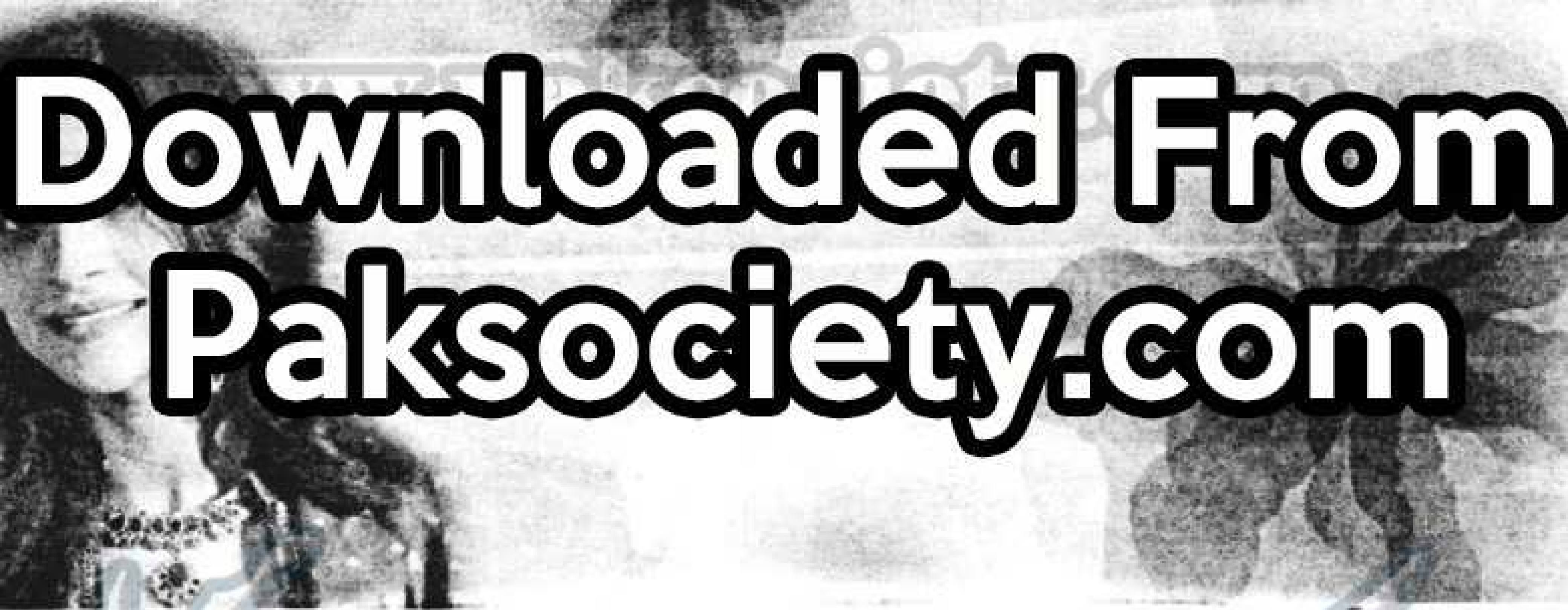

Downloaded From Paksociety.com

جیکی کی بے رخی کا احساس شدید ہوتا چلا گیا اور پھر بہن کی تدفین کے اخراجات وغیرہ کو لے کر مسز جیکی نے اس کی بے عزتی بھی خوب کی تھی۔ جیکی فی الحال تو خاموشی سے سہہ گیا اور صبر کے ساتھ رہا کیونکہ وہ ایک مضبوط فیصلے پر پہنچ چکا تھا۔

کچھ روز کے بعد پھر پارٹی کا انتظام تھا۔ اور جیکی کو بخوبی علم تھا کہ وہاں جوا تو لازمی کھیلا جائے گا۔ جیکی نے پارٹی میں جانے سے انکار کردیا۔ یہ سنتے ہی مسز جیکی حسب معمول بھڑک اٹھی۔

"تم ایک ناکام جواری ہو۔ اسٹیج کے جادوگر کے طور پر پھر بھی قابل قبول تھے۔ اب تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں وہاں تنہا گئی تو دوست احباب میرا کتنا مذاق اڑائیں گے۔"

یہ سنتے ہی جیکی کا چہرہ توہین سے سرخ ہونے لگا کہ بیوی کا اشارہ اس کی بہن کی تدفین کی طرف ہے اس نے ضبط کی انتہا کردی مگر وہ جیکی کی خواہش تھی کہ ابھی اس چڑیل کا گلہ دبا کر خاتمہ ہی کردو مگر اس کی بیوی کو کوئی پروا نہ تھی اس کی جارحیت بڑھتی جارہی تھی۔ اپنے آپ میں مگن۔

یہ سب کچھ اتنے حوصلے سے کرنے کی وجہ وہ جانتا تھا کہ جیکب اور اس کی بیوی کسی منزل کی جانب بڑھ رہے تھے۔ جیکی تاش کے کھیل کے ایک کھیل میں ناکام ہوچکا تھا۔ اس نے دوسرا کھیل منتخب کرلیا تھا جو پہلے کھیل سے بھی زیادہ خطرناک تھا اور وہ یہ کھیل ایک بار ہی کھیل سکتا تھا اور اسے یہ کھیل تو ہر حال میں جیتنا تھا ورنہ جلدی اور عجلت کے باعث یہ کھیل انتہائی تباہ کن ثابت ہوسکتا تھا۔ جیکی نے پارٹی میں شامل ہونے کی ہامی بھرلی اور مسز جیکی کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ جیکی کے ذہن میں کیا خطرناک منصوبہ پل رہا ہے۔

یہ ایک بے تحاشہ بے تکلف اور بے ہودہ ہونے کے ناطے بھرپور پارٹی تھی۔ جیکی ایک طرف صوفہ پر دھنسا سب کچھ دیکھ رہا تھا اور مختلف کھیل کھیلے جارہے تھے۔ جیکی نے اپنی بیوی کو بھی دیکھا جہاں وہ کھیل رہی تھی یہ ناممکن تھا کہ وہاں جیکب نہ اردگرد منڈلا رہا ہو!! وہ سوچتا ہی رہ گیا کہ اس کا ستارہ ہمیشہ خواب چمکتا تھا اور اس کی تمنا خاص تھی کہ اس کی بیوی قلاش ہو اور وہ ذہنی سکون محسوس کرے۔ یہ اس کی خام خیالی تھی فوری طور پر ایسے امکانات دکھائی نہ دیتے تھے۔

چاقو زنی کے کھیل میں اچانک ہی کسی نے نئی اختراع کر ڈالی۔ حساس اور خطرناک بھی۔ نئی طرز کا جوا شروع ہونے جارہا تھا بورڈ کے ساتھ ہی ایک آدمی چاروں ہاتھ پیر پھیلا کر کھڑا ہوگیا۔ اس کے پاس چار چاقو تھے۔ دو چاقو سامنے کھڑے شخص کی بغلوں کے نیچے بورڈ میں پیوست کرنے تھے ایک چاقو پھیلی ہوئی ٹانگوں کے درمیان اور آخر میں چوتھا چاقو سر سے چند انچ اوپر پھر شرطیں لگنے لگیں۔ ہال میں سنسنی پھیل گئی۔ لوگوں کا جوش وخروش قابل دید تھا۔

جیکی بھی اعصابی کشیدگی کا شکار ہوگیا تھا۔ جس شخص نے

خود کو داؤ پر لگایا تھا سب سے زیادہ رقم اسے ہی ملنی تھی۔ نئے کھیل نے حاضرین میں زبردست تھرل پیدا کر دی تھی اور حیرات انگیز طور پر چاروں چاقو نشانے پر لگے اور ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ معلوم نہیں یہ چاقو پھینکنے والے کا کمال تھا یا پھر اس شخص کی قسمت کی یاوری زوروں پر تھی۔ تاہم اس کی دلیری میں کوئی شخص نہیں تھا۔

دوسری طرف ایک انتھونی نام کے جواری نے بھی داؤ کے لیے اپنے آپ کو پیش کر دیا۔ چاقو زن تیار تھا ہال تالیوں کی گونج سے مسلسل شور بلند ہو رہا تھا دو چاقو عین نشانے پر لگے۔

چاقو زن تیسرا وار کرنے کے لیے پر تول رہا تھا۔ جیکی محسوس کر رہا تھا کہ انتھونی کچھ گھبراہٹ کا شکار ہو رہا ہے تیسرا وار کیا گیا اور ساتھ ہی انتھونی کی درد و تکلیف میں ڈوبی چیخ پورے حال میں گونج گئی۔ کیونکہ چاقو جسم میں پیوست ہو چکا تھا۔ لوگوں نے اسے صوفے پر لٹا کر فرسٹ ایڈ دی۔ جو مزید جان لیوا عذاب درد سے بچ گیا اور کسی دوسرے نے نشانہ بننے کی جرات نہ کی۔

ہنگامہ معمول پر آ گیا تھا کہ اور لوگ بھی مست ہو رہے تھے اور تھوڑی دیر میں ہی ایک بدصورت بدشکل شخص نے ریوالور نکال کر چھت کی طرف فائر داغ دیا۔ یکدم خاموشی چھا گئی اس نے سب کے سامنے چیمبر خالی کیا، پھر ایک گولی چیمبر میں داخل کر دی اور چرخی گھمانے کے ساتھ ہی وہ معنی خیز انداز میں مسکرانے لگا۔

"یہ کھیل ہم ملدی کلب میں کھیلا کرتے تھے اور داؤ بھی اونچا اور خطرناک بھی بہت زیادہ۔"

کچھ افراد نے مخالفت کی مگر وہ سب کچھ دیر پہلے والے حادثے کو فراموش کر چکے تھے۔ جیکی سپاٹ چہرے سے ہر چیز نوٹ کر رہا تھا۔ یکدم جیکی کے ذہن میں ایک خیال آیا اور سمجھ گیا کہ کیا ہونے جا رہا تھا۔

دوسرا کھیل اسے شروع کر دینا چاہیے جو پہلی اور آخری بات...... ثابت ہو گا؟ بدشکل نے پھر سب کو چیلنج کیا۔ بڑا ہاتھ ماریں مگر خطرہ بھی بڑا!!! ویسے جیتنے کے چانس زیادہ ہیں چھ کے مقابلے میں ایک۔ چیمبر میں صرف ایک گولی ہے۔ کوئی قسمت آزمائے گا؟؟ آئیے۔

جیکی نے بیوی کی جانب دیکھا۔ ہیجان اور جوش اور نشے کی وجہ سے اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ ایک خوبصورت جوڑا آگے آیا۔ اس کی پرجوش تالیوں سے استقبال کیا گیا۔ ہال کے وسط میں ایک کرسی پر بٹھایا گیا۔ بدشکل نے اصول و ضوابط اور داؤ کی رقم کی تشریح کی اور طریقہ کار سمجھایا۔ ریوالور اس کی کنپٹی سے لگا دیا گیا اور یہ کھیل وہ اپنی مرضی سے کھیل رہا ہے اس بیان پر اس کے دستخط بھی کروا لیے گئے اور دو گواہان نے بھی دستخط کیے تھے۔ نوجوان کا چہرہ پرسکون تھا۔ بدشکل نے چرخی گھمائی اور سکتہ زدہ ناظرین کی طرف دیکھا اور لبلبی دبا دی۔ کلک کی آواز آئی اور نوجوان فاتحانہ انداز میں مسکراتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ شور بپا ہوا کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دے رہی تھی۔ نوجوان میز کے قریب آیا اور اس پر رکھی ہوئی بھاری رقم سمیٹ رہا تھا بعض لڑکیاں اور لڑکے اس کا شانہ تھپتھپا رہے تھے اور کچھ رقص میں بھی جتلا تھے۔

بدشکل نے یکدم جیکی کی طرف دیکھا اور کہا۔

"تم...... تم وہاں کیا کر رہے ہو اور کیوں بیٹھے ہو؟" جیکی کی دھڑکن یکدم بڑھ گئی۔ مگر سوچا ایسا سنہری موقع شاید پھر نہ آئے۔ وہ اچانک کھڑا ہو گیا۔ سوچا اگر وہ کامیاب ہو گیا تو ایک تیر سے دو شکار ہونے تھے دولت بھی آتی اور بددماغ بیوی سے بھی چھٹکارا ملتا۔ اعترافی بیان موجود ہوتا اور اس کے پکڑے جانے کا تو سوال ہی نہ پیدا ہوتا۔ اسے بس اپنی سابقہ مہارت کا مظاہرہ کرنا تھا جو اسنے برسوں بطور اسٹیج جادوگر کام کر کے حاصل کیا تھا۔ جیکی نے جوئے کی میز پر نگاہ جمائی اور مسز جیکی کی آنکھوں میں واضح حیرت تھی۔ جس نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں نفرت کی جھلک دیکھی۔ اس نے مسکرا کر بیوی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ تالیوں کی گونج میں وہ بدشکل کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا۔ کھیل کی آڑ میں وہ ڈرامے کے لیے ذہن بنا رہا تھا۔ "ایسا خطرناک جوا میں اندھا دھند نہیں کھیلتا۔" اس نے

سنہری باتیں

! محنت اور ہنر مندی کے آگے کچھ بھی ناممکن نہیں۔ (سیموئل جانسن)

! عادت کی اگر مزاحمت نہ کی جائے تو یہ جلد ہی ضرورت بن جاتی ہے۔ (اگسٹائن)

! اپنے آپ پر قابو حاصل کرنا سب سے بڑی جیت ہے۔ (پلیٹو)

! تمام حیلے بے کار ہو جائے تو پھر تلوار سے کام لینا جائز ہے۔ (ہلاکو خان)

! جس سے مجھ کو نفرت ہے اس سے میں کبھی نہیں ملتا۔ (راجرز)

! اگر آپ کسی بھی بے وقوف کی شکل نہیں دیکھنا چاہتے تو آپ کو پہلے اپنا آئینہ توڑ دینا چاہیے۔ (ریب لائیس)

کائنات اشرف...... بوسال سکھا

اچھی بات

جو لوگ دوسروں کے دلوں کو کانٹوں سے زخمی کرتے ہیں ان کے اپنے اندر بھی کیکر اُگے ہوتے ہیں وہ چاہیں یا نہ چاہیں ان کے وجود کو کانٹا بننا ہوتا ہے وہ پھول نہیں بن سکتے۔

فائزہ بلال اقرأ...... جام پور، پنجاب

رزق

رزق صرف یہی نہیں کہ جیب میں مال ہو، بلکہ آنکھوں کی بینائی رزق ہے دماغ میں خیال رزق ہے۔ دل کا احساس رزق ہے رگوں میں خون رزق ہے، یہ زندگی ایک رزق ہے اور سب سے بڑھ کر ایمان بھی رزق ہے۔

فائقہ سکندر حیات...... لنگڑیال گجرات

سنہری الفاظ

- اگر چاہتے ہو کوئی تمہیں اہمیت دے تو اس کے لیے تم دوسروں کو اہمیت دو۔
- کسی کو اپنا بنانا چاہتے ہو تو اسے عزت دو کیونکہ عزت محبت سے ضروری ہے۔
- تم دوسروں کو غور سے سنو گے تو دوسرے تمہیں غور سے سنیں گے۔

شبنم ایوب...... کوٹ اسلام

افسانچہ

جیسے ہی میں نے اسے دیکھا میں فوراً وہاں سے بھاگی اس نے بھی شاید مجھے دیکھ لیا تھا وہ میرے پیچھے پیچھے بھاگا میں بھی اسے مارنے کے لیے اس کی طرف بڑھی وہ میرے قریب آیا میں نے جلدی سے چپل اٹھائی اتنے میں اس نے پیچھے سے آ کر اپنا کام کر دکھایا جس کا مجھے ڈر تھا وہی ہوا بچھو نے مجھے اتنی زور سے کاٹا کہ درد کے مارے میری چیخ نکل گئی۔

قرۃ العین، صائمہ امبرین...... داربن کلان

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

اپنے منصوبے کا آغاز کر دیا۔

"کیا مطلب؟" بدشکل بولا۔

"میں ریوالور اور گولیاں چیک کروں گا۔"

"کیا تم بے ایمانی کا الزام لگا رہے ہو؟" بدشکل نے منہ بنایا۔

"میری جان داؤ پر لگی ہے کیا یہ میرا حق نہیں ہے کہ میں اپنے طور پر مطمئن ہو جاؤں؟" جیکی نے جلدی سے جواب سے اس کا منہ توڑ جواب دیا۔ حاضرین نے تالیوں کی ساتھ اس کی حمایت کی۔ بدشکل نے ریوالور اور گولیاں اس کے حوالے کر دیں۔ جیکی نے چیمبر کی اکلوتی گولی بھی نکال لی اور چیمبر کا جائزہ لیا۔ ریوالور کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ گولیوں سے کھیلتا رہا۔ اس کے ہاتھ کی حرکات میں عجیب طرح کی تیزی تھی۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے ریوالور اور چھ گولیاں بدشکل کو واپس کر دیں اور تحریری بیان پر دستخط کیے۔ بدشکل نے ایک گولی ریوالور میں ڈالی۔ "ایک منٹ۔" جیکی نے ڈرامائی حرکت کی۔ "دوسری گولی ڈالو اسے واپس نکالو۔" جیکی کی آواز بلند تھی۔ چند قہقہے بلند ہوئے اور بدشکل نے جیکی کو ایسی نظروں سے دیکھا جیسے وہ کسی پاگل کو دیکھ رہا ہو۔ جیکی کے چہرے پر بے نیازی تھی۔ بدشکل نے گولی تبدیل کر کے نال جیکی کی کنپٹی سے لگا دی۔ "ایک منٹ۔" جیکی نے ہاتھ نیچے کیا۔

"اب کیا ہے۔" بدشکل غرایا۔

"باقی پانچ گولیاں میری مٹھی میں رہیں گی۔" جیکی نے کہا۔ پارٹی میں ایک مرتبہ پھر قہقہے بلند ہوئے۔

"دماغ خراب ہے کیا۔" بدشکل کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔

"ہاں ظاہر ہے پہلی بار کھیل رہا ہوں اس طرح کا جوا۔ تمہارے خیال میں اتنے لوگوں میں کتنے یہ ہمت دکھائیں گے؟" چلنے دو چلنے حاضرین نے شور مچایا۔ بدشکل نے منہ بنا کر پانچوں گولیاں جیکی کے حوالے کر دیں۔ بہر حال کمیشن تو اسے بھی ملنا تھا جیکی کو سو فیصد یقین تھا کہ اگر وہ کامیاب ہو گیا تو اگلا کھلاڑی خود اس کی بیوی ہوگی۔

بدشکل نے ایک مرتبہ ریوالور پھر اس کی کنپٹی پر رکھ دیا۔ "پلیز ایک منٹ۔" جیکی نے دفعتاً ہاتھ اٹھا کر کہا۔ بدشکل اس مرتبہ بھن گیا اور بولا۔

"مسٹر! چلو اٹھو یہاں سے۔" "کسی کو پتہ نہیں کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔" جیکی نے اس کے اشتعال کو نظر انداز کر دیا۔

"اس لیے میری خواہش ہے کہ میں اپنی بیوی کو قریب سے دیکھ سکوں۔" حاضرین نے بھرپور تالیوں سے استقبال کیا۔ اور مسز جیکی نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے نارمل رہنے کی کوشش کی اور جیکی کے قریب آ کر اسے چھوا۔ جیکی آج اپنے رویہ سے بار بار اسے حیران کر رہا تھا۔ وہ واپس اپنی میز پر آ گئی۔

"مر جائے تو اچھا ہے۔" اس نے دل ہی دل میں کہا۔ بدشکل زچ ہو چکا تھا اس سے پہلے کہ جیکی کوئی اور حرکت کرتا اس نے جلدی سے چرخی گھمائی اور فوراً فائر کر دیا۔

"کلک۔" اور اس مرتبہ شور کافی بلند تھا۔ اپنی بیوی کے چہرے پر مایوسی کی جھلک جیکی کے سوا اور کوئی نوٹ نہ کر سکا۔ جیکی داؤ میں لگی رقم سمیٹ رہا تھا۔ جوش سے بھرپور۔

"کوئی اور......کوئی اور......" "اتنے کم وقت میں اتنی دولت کہاں کما سکتے ہیں۔" بدشکل نے حاضرین کو اکسایا۔ مرنا تو ویسے بھی ہے۔ کئی طرح کے انسان کی موت ہو سکتی ہے۔ کوئی بیماری کے ہاتھ ختم ہو جاتا ہے۔ ہمت کیجیے مرد بنیے مرد بنیے۔

آخر کار ایک "مرد" کھڑا ہو ہی گیا۔ اور وہ مرد بھی مسز جیکی تھی۔ اس کی چال ناہموار تھی اور جیکی کے چہرے پر مسکراہٹ رینگ رہی تھی۔ وہ آگے بڑھ کر مسز جیکی کو روکنے لگا اور کہا۔ "ڈارلنگ! یہ کیا کر رہی ہو۔ ہم دونوں ایک ہیں یہ جیتی ہوئی رقم اپنی ہی سمجھو۔ ہم کوئی علیحدہ علیحدہ ہیں کیا؟ یہ جیتی ہوئی رقم اپنی ہی سمجھو؟ کیا ضرورت ہے جان کو خطرے میں ڈالنے کی۔" جیکی کی ان باتوں سے سب کو ہی متاثر کیا۔ لیکن اصل بات تو یہ ہے کہ یہ جیکی ہی جانتا تھا کہ مسز جیکی کبھی بھی باز نہ آئے گی۔ جیکی کے ان الفاظ کے سب لوگ گواہ تھے حالانکہ ان

الفاظ نے مسز جیکی کے لیے ایک سہرا کا کام کیا تھا۔ اور محفل کا جوش وخروش عروج پر تھا کیونکہ اس خطرناک کھیل کا نیا کھلاڑی بھی تو ایک عورت تھی۔ جیکی بیوی کے قریب تھا۔ اس نے ایک بار پھر ریوالور اور گولیاں اپنے قبضے میں لے لی تھیں۔ اس طرح بدشکل کا رہا سہا شک دور ہوگیا کہ جیکی ایک سنکی آدمی ہے۔ جیک آپ مسز جیکی کے پاس پنجوں کے بل بیٹھا اسے خطرناک کھیل سے باز رہنے کی نصیحت کررہا تھا۔ کسی کی بھی نگاہ اس کے ہاتھوں کی طرف نہ تھی۔ انہیں یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں یہ سنکی آدمی اپنی بیوی کو کرسی سے اٹھا لے گا۔ مایوسی ہورہی تھی کہ مسز جیکی بھی کہیں شوہر کی بات نہ مان لے اور کھیل شروع ہونے سے پہلے ہی ختم نہ ہوجائے۔

دوسری طرف بدشکل بھی بدحواس ہورہا تھا لیکن اسے مسز جیکی کی دلیری اور ڈھٹائی پر حیرت تھی وہ مسلسل جیکی کی باتوں کو رد کررہی تھی۔ آخر جیکی چہرے پر مایوسی لیے اٹھ کھڑا ہوا اور ریوالور بدشکل کو دے دیا۔ بدشکل نے جھپٹ کر ریوالور پکڑ لیا مگر اگلے ہی لمحے جیکی نے ہتھیار اس سے چھین لیا۔ نہیں وہ احمق ہے قسمت بار بار ساتھ نہیں دیتی۔ اسے کچھ ہوگیا تو بہت برا ہوگا۔ جیکی تو اسٹیج کے جادوگر کی طرح مہارت سے اپنی مرضی کا منظرنامہ تشکیل دے رہا تھا۔

”تم نے مجھ سے پوچھ کر اس کھیل میں حصہ لیا تھا۔“ اچانک مسز جیکی بھڑک اٹھی۔

”میری قسمت تم سے زیادہ اچھی ہے۔ سب جانتے ہیں اور مجھے تو حیرت ہے کہ تم بچ کیسے گئے؟“ مسز جیکی کے ردعمل نے بدشکل کو حوصلہ دیا۔

”مسٹر اس معاملے سے الگ رہو۔ وہ پہلے ہی تحریری بیان پر دستخط کرچکی ہے۔“ اس نے ریوالور لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ جیکی نے بڑے شکست خوردہ انداز میں ریوالور اس کے حوالے کردیا۔

”ہاں بیگم جلد پتا چل جائے گا کہ تم کتنی خوش قسمت ہو؟“ جیکی نے سوچا۔

اور اب ہیجان اور سنسنی پارٹی پر پھر سے طاری ہوگئی۔ بدشکل نے ریوالور مسز جیکی کی کنپٹی پر رکھ کر بلا تامل ہی لبلبی دبا دی۔ اور مسز جیکی کوئی آواز نکالے بغیر ہی کرسی سے لڑھک گئی۔ گولی سر میں اتر گئی تھی۔ خون ہی خون...... ہال میں مکمل سناٹا طاری تھا۔ جیکی نے ایک لمحے کے لیے پاگل رہنے کی اداکاری کی اور پھر بدشکل پر پل پڑا۔ جتنی دیر میں وہ ہوش میں آتا اتنی دیر میں جیکی نے اس کی ناک پر گھونسا جڑ دیا اور ریوالور بھی چھین لیا۔ جیکی جب پہلی مرتبہ کرسی کے پاس کھڑا ہوا تھا اسی وقت سے صحیح معنوں میں اسٹیج جادوگر کی شاندار اداکاری کررہا تھا۔ اس نے صرف ایک خطرہ مول لیا تھا اور وہ خطرہ تھا ”خونی کھیل“ میں شریک ہونے کا۔

بدشکل کی ناک سے خون جاری تھا۔ سناٹا یکدم شور شرابے افراتفری میں تبدیل ہوگیا تھا۔ جیکی نے انتہائی صفائی اور اطمینان سے باقی پانچوں گولیاں ریوالور سے نکال کر بدشکل کے کوٹ کی جیب میں منتقل کردیں اور ریوالور کا دستہ اس کے سر پر بجانے لگا۔ ناک پر یہ چوٹیں بدشکل کو تڑپا رہی تھیں۔ حاضرین میں سے چند ایک نے جیکی کو پکڑ کر گھسیٹا۔ جیکی قاتل قاتل چیخ رہا تھا۔ کسی نے پولیس کو فون کردیا تھا۔

اور جب پولیس ہال میں پہنچی تو جیکی اس وقت بھی قاتل قاتل کے نعرے بلند کررہا تھا۔ پولیس نے پہلا کام یہ کیا کہ نیم پاگل مسٹر جیکی اور بظاہر یقیناً مردہ مسز جیکی کو اسپتال پہنچایا اور جیکی اس وقت بھی قاتل قاتل چلا رہا تھا جبکہ اس کا دل اندر ہی اندر قہقہے اور اپنی کامیابی پر لگائے جا رہا تھا۔

⁂

سنہرے دن

دستگیر شہزاد

غلامی کی کئی اقسام ہوتی ہیں، زمانہ قدیم میں جسمانی غلام ہوتے تھے یعنی پورے پورے خاندانوں کو خرید کر غلام بنالیا جاتا ہے۔ جس کی ایک شکل آج بھی ہمارے دیہات میں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔

دستگیر شہزاد ہماری آج کی نسل کے نوجوان شاعر اور ادیب ہیں جو جب بھی لکھتے ہیں دل کی آنکھ سے دیکھ کر لکھتے ہیں۔ زیر نظر تحریر بھی انہوں نے اسی عمیق تجربے کی روشنی میں لکھی ہے۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

غلامی ہمارے جاگیردارانہ معاشرے میں کیا کیا اور کل طرح گل کھلا رہی ہے

چوہدری کرم دین ہمارے علاقے میں سب سے بڑی جاگیر کا مالک تھا اور ہم سب اس کے نوکر تھے۔ ایک روز عامر نے مجھے بتایا تھا۔

”میرے بہت سے دوست اپنے بزرگوں کا ذکر کرتے ہوئے مجھے فخر سے بتاتے تھے کہ ہمارے بزرگوں کی ملکیت میں کتنی کتنی زمینیں اور کتنے نوکر ہوا کرتے ہیں۔ جہاں تک میرا تعلق تھا۔ میرے باپ کے پاس جتنی اراضی تھی وہ وراثت میں مجھے مل گئی تھی۔ یہ میرے لیے خوشی اور فخر کی بات تھی۔“

میں عامر کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا وہ بس میرا دوست تھا اور یہ دوستی بھی ایک اتفاقی حادثہ کی وجہ سے ہوئی تھی۔

”ہوا یوں کہ ایک روز سہ پہر کے وقت میں یونیورسٹی سے جا رہا تھا۔ اسی وقت میرا ذہن حاضر نہیں تھا اس لیے میں پیچھے آنے والی کار کا ہارن نہ سن سکا اور اس سے پہلے کہ وہ مجھے کچلتی ہوئی گزر جاتی۔ ایک مضبوط ہاتھ نے مجھے بازو سے پکڑ کر ایک طرف دھکیل دیا۔ میں گر تو پڑا لیکن خطرہ ٹل گیا۔ جب میرے حواس درست ہوئے تو میں نے دیکھا کہ ایک دراز قد دبلا پتلا نوجوان مجھے گھور رہا تھا۔ میرے شکریہ ادا کرنے پر اس نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ بھی نہیں آئی مگر وہ چبھتی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”جو کچھ ہوا بہتر ہوا...... آئندہ محتاط رہنا۔“ اتنا کہہ کر وہ چلا گیا۔ اس طرح ہماری واقفیت ہوئی تھی۔

یونیورسٹی میں ہمارا تعلق مختلف تعلیمی شعبوں سے تھا۔ میں عربی پڑھتا تھا اور وہ سائنس کا طالب علم تھا جب بھی ہمارا آمنا سامنا ہوتا۔ ہمارے درمیان چند رسمی الفاظ کا تبادلہ ضرور ہوتا۔ بہر حال اب ہم ایک دوسرے کے دوست بن چکے تھے لیکن وہ مجھے کبھی دل سے اچھا نہیں لگا تھا۔ یہ محض انسان دوستی اور تجسس کا احساس تھا جو مجھے اس کا دوست بننے پر مجبور کیے ہوئے تھا۔ میں اس کی عزت کرتا تھا لیکن اسے پسند نہیں کرتا تھا کیونکہ اس کی شخصیت میں ذرا بھی جاذبیت نہیں تھی۔ اس کی عادت میں کرختگی کا عنصر نمایاں تھا۔ میں اس کی خاندانی حیثیت سے واقف نہیں تھا

Downloaded From

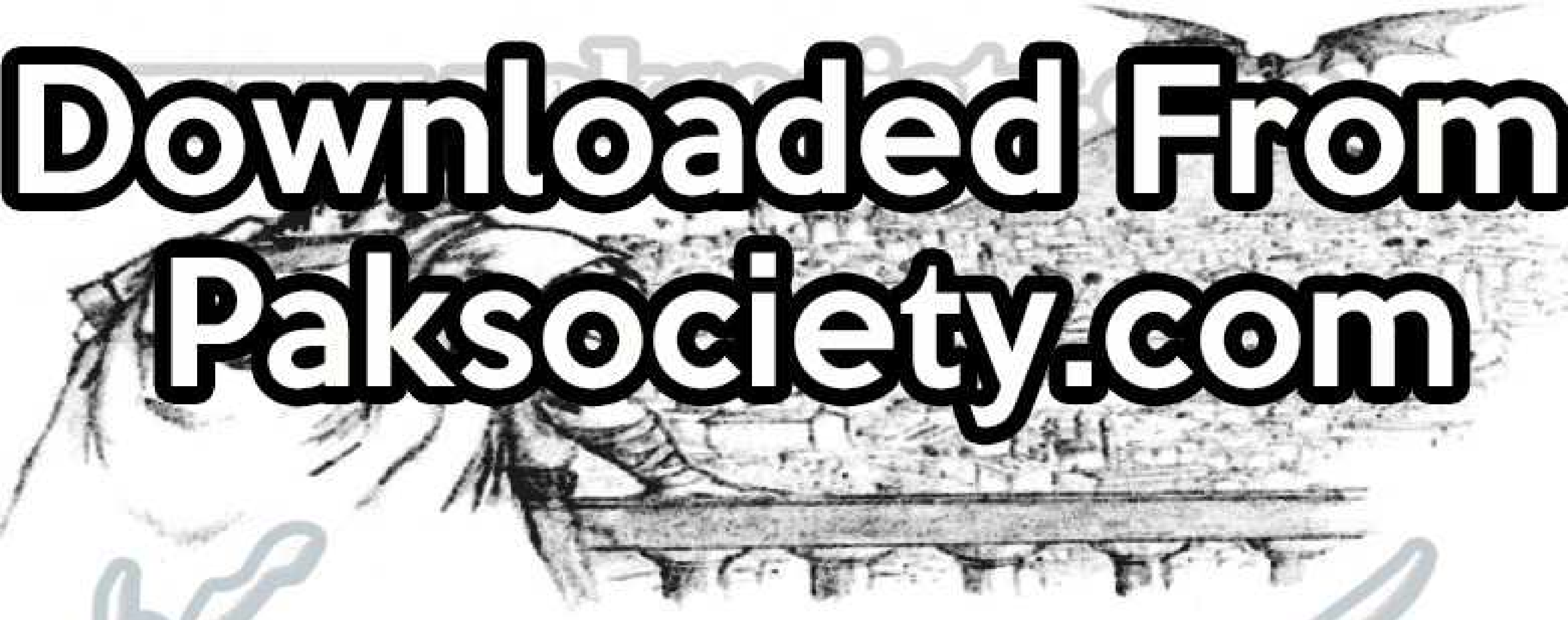

کیونکہ اس نے اس کے بارے میں بتایا ہی نہیں تھا۔ البتہ یونیورسٹی میں اسے دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اس کا تعلق کسی امیر گھرانے سے نہیں تھا وہ بے حد کفایت شعار اور رہن سہن کے معاملے میں دوسرے طالب علموں سے مختلف تھا۔ اس نے کبھی مہنگا لباس نہیں پہنا تھا اور نہ ہی فلم یا تھیٹر جیسی تفریحات میں جاتا تھا۔ کلاس کے بعد وہ زیادہ تر وقت اپنے کمرے میں پڑھتا کھیل کے گراؤنڈ میں چہل قدمی کرتا یا پھر شہر کی طرف چلا جاتا تھا۔ میں نے کبھی اس کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں دیکھی وہ ہر وقت کسی گہری سوچ میں کھویا رہتا تھا۔ میں اکثر حیران ہوتا تھا کہ ایسی کون سی بات ہے......؟ ایک روز مجھ سے پوچھے بنا رہا نہ گیا۔

”عامر! ہر وقت کیا سوچتے رہتے ہو......؟“

”تم نہیں سمجھ سکو گے۔“ اس نے سرد مہری سے جواب دیا اور چلا گیا۔

وہ ٹھیک ہی کہتا تھا کہ میں واقعی نہیں سمجھ سکتا تھا کہ ایک نوجوان اتنا افسردہ اور الجھا ہوا کیسے ہو سکتا ہے میری حیرت آہستہ آہستہ تجسس کی صورت اختیار کر گئی اور شاید اس لیے میں نے اس کی روزمرہ کے معمولات کا مشاہدہ کرنا شروع کر دیا۔

”مثلاً وہ کس قسم کے لوگوں سے ہے۔ اس سلسلے میں پہلا انکشاف یہ ہوا کہ اس کا واحد دوست میں ہی ہوں۔ چند ایک لوگوں سے اس کے تعلقات ضرور تھے لیکن دوستی نہیں تھی۔ دراصل وہ دوست بنانا ہی نہیں چاہتا تھا۔ دوسروں سے ملتے ہوئے اس کے رویہ سے بے زاری کا اظہار ہوتا تھا۔ حتیٰ کہ یونیورسٹی کی کوئی لڑکی بھی اس کی بات کرتی تو اس کا چہرہ مسکراہٹ سے عاری ہوتا تھا۔ میں اس کا دوست تھا لیکن وہ مجھ سے بھی سرد مہری سے پیش آتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میں اسے دل سے پسند نہیں کرتا تھا جہاں تک تعلیم کا تعلق تھا وہ بے تحاشہ پڑھنے کا عادی تھا۔ اسے ادب پڑھنے کا بھی شوق تھا۔ وہ ایسے گمنام مصنفین کی کتابیں بھی پڑھتا جو برسوں سے لائبریری کی الماریوں میں بند پڑی تھی اور انہیں پڑھنے والا کوئی نہیں تھا۔ اگر ایک دن ناول پڑھتا تو دوسرے دن فلسفہ کی کتاب اور اس کے بعد اگلے دن تاریخ کی کتاب۔ ایسی صورت میں جب کہ میں نے خود ان کتابوں کو نہیں پڑھا تو ان کے حوالے سے عامر کے بارے میں کیسے کوئی رائے قائم کر سکتا تھا۔

ایک دن وہ بغیر اطلاع دیئے میرے کمرے میں آ گیا۔ ان دنوں میں کرائے کے مکان میں مقیم تھا۔ وہ بے تکلفی سے اندر داخل ہوا اور صوفے پر بیٹھ کر اپنے پرانے کوٹ سے گرد جھاڑنے لگا۔ میں نے پڑھتے ہوئے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور پھر سر جھکا کر پڑھنے لگا۔ اگرچہ میری نظریں کتاب پر تھیں لیکن کان اس کی آواز کے منتظر تھے۔

”چوہدری صاحب! کیا تمہیں معلوم ہے کہ آج کل اپنے ملک میں غریب اور بے روزگار عوام کی تعداد کتنی ہے......؟ اچانک اس نے پوچھا۔

”کئی لاکھ۔“ میں نے بغیر سوچے اور بے پروائی سے جواب دیا۔

"نہیں اس سے کہیں زیادہ......" عامر کے لہجے میں عجیب سی جھلاہٹ تھی۔

شکر ہے میرے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ میں نے خوش دلی سے سوچا لیکن جب میں نے سر اٹھا کر دوبارہ اس کی طرف دیکھا تو اس کے اضطراب نے مجھے پریشان کر دیا۔

"کیا تم بھی کسی جاگیردار کے بیٹے ہو......؟" اس نے بڑے بے تکے اور غیر مہذب انداز میں پوچھا۔

میں نے سوچا اس کے خیال میں میرے باپ کی کوئی زیادہ زمین نہیں ہے اس لیے وہ سوال پوچھ کر مجھے کمتری کا احساس دلانا چاہتا ہے۔ میں نے مسکراتے ہوئے فخریہ کہا۔

"یقیناً میری حیثیت کے آدمی کے پاس زمین ہونی چاہیے۔ میرے پاس میرے باپ کی دی ہوئی وراثتی زمین ہے۔"

اس نے طنزیہ انداز میں قہقہہ لگاتے ہوئے میری طرف ایسی نظروں سے دیکھا جس میں رشک کے بجائے حقارت کا اظہار تھا۔ وہ عام زمین دار کو حقیر جان رہا تھا۔ میرے لیے یہ حیران کن بات تھی مجھے خود اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا لیکن فوراً غور کرنے پر میری سمجھ میں آیا کہ وہ محض حسد کی وجہ سے ایسا کر رہا تھا کیونکہ اس کی کفایت شعارانہ زندگی سے ظاہر تھا کہ وہ کسی زمین دار باپ کا بیٹا نہیں ہے...... میں نے ہمدردی سے پوچھا۔

"کیا چوہدری کرم دین کی نوکری کے علاوہ اور کوئی کاروبار بھی ہے؟" میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے بڑی افسردگی سے کہا۔

"میرا دادا غلام رسول اور میرا باپ اعجاز رسول شروع دن سے ہی چوہدری کرم دین کے کارندے ہیں۔"

اس کے کہنے کا انداز ایسا تھا جیسے کوئی بہت ہی مجبوری ہو۔

"ایسا نہیں ہو سکتا۔" میں بوکھلا اٹھا۔

"بھلا دوستوں میں ایسی انکساری کی کیا ضرورت ہے؟"

"انکساری؟ مجھے انکساری کی کیا ضرورت ہے؟" اس نے اس طرح حیران ہو کر کہا جیسے میں نے بہت عجیب بات کہی ہو۔

"تم جو کہہ رہے ہو کہ میرے بزرگ چوہدری کے نوکر تھے۔ اور کوئی کاروبار بھی نہیں تھا۔"

"ہاں! نوکر ہی تھے پھر......؟"

"لیکن تم تو یونیورسٹی میں پڑھ رہے ہو۔" مجھے ابھی تک یقین نہیں آیا تھا۔

"کیوں کیا مزدور کا بیٹا یونیورسٹی میں نہیں پڑھ سکتا؟" اس نے کہا اور پھر ملامت آمیز لہجے میں پوچھا۔

"ہو سکتا ہے قیام پاکستان سے پہلے تمہارے بزرگ بھی کسی بڑے زمین دار کے نوکر ہوں؟"

میں اس طرح اچھل پڑا جیسے کسی نے میرے سر پر ڈنڈا دے مارا ہو۔ یہ میری بے عزتی تھی۔ غصے کے مارے میں کھڑا ہو گیا۔

"تمہارا کیا خیال ہے میرے بزرگ کیا تمہارے بزرگوں جیسے تھے؟" میں نے قہر آلود نظروں سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میرے بزرگ کسی جاگیر کے مالک نہ تھے لیکن اپنی اوقات کے مطابق عام سے زمین دار تھے۔ ان سے پہلے جو بزرگ تھے یقیناً وہ بھی زمین دار ہوں گے۔"

وہ میرے منہ پر میرے بزرگوں کو نوکر کہہ رہا تھا۔ زندگی میں کبھی کسی نے اتنی میری بے عزتی نہیں کی تھی۔ میرے لیے یہ ناقابل برداشت تھا۔ میں نے سختی سے اسے گھورا تو لیکن جب ہماری نگاہیں ملیں تو ایک مقناطیسی کشش نے آہستہ آہستہ میرا غصہ ختم کر دیا۔

"ٹھیک ہے میں تمہاری بات مان لیتا ہوں لیکن مجھے یہ کہنے دو کہ مجھے اپنی غربت پر فخر ہے اور میں اس بات پر بھی خوش ہوں کہ میں کسی جاگیردار کا بیٹا نہیں ہوں۔" حسد اور جلن اس کے الفاظ سے ظاہر ہو رہی تھی۔ یہ سوچ کر مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔

"کس بات پر ہنس رہے ہو۔" اس کا چہرہ سپاٹ لگا۔

"ہاں میں بہت خوش ہوں کہ میں ایک مزدور کا بیٹا ہوں۔ مزدور اپنے پسینے کی کمائی سے اپنے بچوں کا پیٹ بھرتا ہے لیکن تم ان باتوں کو کیا جانو۔ ایسے آراستہ کمرے میں ریشمی لحاف اوڑھ کر سہانے خواب دیکھنے والا ان باتوں کا

مفہوم نہیں سمجھ سکتا۔ میرا جی چاہتا ہے کہ تم لوگوں کی آنکھیں کھول دوں۔ ہاں میں ایک نوکر کا بیٹا ہوں۔ مجھے اس سے انکار نہیں بلکہ اس پر فخر ہے۔"

میں نے سوچا کہ اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے اس لیے اس سے جان چھڑانی چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ کوئی مصیبت کھڑی کر دے لیکن وہ مسلسل بولے جا رہا تھا۔

"تم زمین دار ہو۔ جس پر تمہیں اطمینان اور خوشی ہے لیکن کیا تم نے کبھی یہ سوچا ہے کہ ایک مزدور کی زندگی کیسے گزرتی ہے۔ کیا تم ان میں سے کسی ایک کی زندگی کے بارے میں بتا سکو گے؟ نہیں تم نہیں بتا سکو گے اس لیے مجھے ان کی کہانی بیان کرنے دو۔"

"میرا دادا غلام رسول اور میرا باپ اعجاز رسول دونوں ہی چوہدری کرم دین کے نوکر تھے۔ میں نے اپنے بزرگوں سے بڑھ کر وفادار کوئی نہیں دیکھا۔ انہوں نے چالیس سال تک چوہدری کرم دین کے کھیتوں میں ہل چلایا۔ میرے باپ نے بھی چھوٹی عمر میں ہل چلانا سیکھ لیا تھا۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تو اس وقت اس کے بال سفید ہو چکے تھے۔ میں نے اکثر دیکھا کہ چوہدری کرم دین اور اس کے بیٹے کو برا بھلا کہتے اور وہ خاموش سر جھکائے سب کچھ سنتا رہتا تھا۔ ہم چوہدری کرم دین کی حویلی کے پچھواڑے ایک شکستہ چھپر کے نیچے رہتے تھے۔ میرا باپ، ماں، دادا اور میں۔ میری ماں رات گئے تک چوہدرانی اور اس کی بیٹیوں کی خدمت میں لگی رہتی تھی۔ اس لیے اسے سونے کا بہت کم وقت ملتا تھا۔ موسم سرما کی تیز ہوا سے ہمارا چھپر ہلتا رہتا اور جب یخ ہوا سوراخوں سے اندر داخل ہوتی تو پہلے لحاف کا بستر سردی روکنے میں ناکام ہو جاتا۔ میرا دادا اور میرا باپ باہر جا کر سوکھی ٹہنیاں پتے گھاس پھونس اکٹھا کر کے لاتے اور آگ جلا لیتے۔ جب سردی کا احساس کم ہوتا تو میرا دادا بھولی بسری باتیں یاد کرنے لگتا۔ وہ مجھے اپنی طرح ایمان داری اور وفاداری سے چوہدری کرم دین کی خدمت کرنے کی تلقین کرتا۔ اچھائی اور محنت کا انعام ضرور ملتا ہے وہ کہا کرتا تھا۔

میرا باپ بہت کم بات کرتا تھا۔ دادا کا لیکچر ختم ہونے تک آگ بجھ چکی ہوتی اور ہم تینوں سردی میں ٹھٹھرے ہوئے اپنے بستر پر لیٹ جاتے۔ ایک دن آخر دادا کو اس کی اچھائی کا سبق مل گیا۔ گرمیوں کی ایک صبح ہم بے دار ہوئے تو بستر پر نہیں تھا۔ بعد میں اس کی لاش باغ میں آم کے درخت سے لٹکی ہوئی ملی۔ ماں نے مجھے آخری وقت تک اس کا چہرہ نہیں دیکھنے دیا۔ اس کی لاش وہاں سے اتار کر ایک چارپائی پر ڈال دی گئی جسے سفید کپڑے سے ڈھانپا ہوا تھا۔ میں اس کے گرد آلود پاؤں ہی دیکھ سکا۔ یہی اس کا آخری دیدار تھا جو میں کر سکا تھا۔ اس نے خودکشی کیوں کی؟ وجہ بہت ساری تھی۔ ایک روز قبل چوہدری کرم دین کی چند قیمتی چیزیں گم ہو گئی تھیں۔ جن کی چوری کا الزام میرے دادا پر لگا دیا گیا تھا۔ دادا کی وفاداری سراپا احتجاج بن گئی۔ وہ خواب میں بھی چوہدری کرم دین کے ہاں چوری کرنے کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔ اسے ناکردہ جرم کی سزا میں نہ صرف مارا پیٹا گیا بلکہ اس سے چیزوں کی واپسی کا مطالبہ بھی کیا گیا۔ میرا دادا انتہائی شرمسار تھا کہ وہ اپنے مالک کا اعتماد حاصل کرنے میں ناکام ہو گیا تھا اور اس بات نے اسے اور بھی دل شکستہ کر دیا تھا کہ چوہدری کرم دین کی سال ہا سال خدمت کرنے کے باوجود اس کے پاس ایک روپیہ نہیں تھا جو وہ نقصان کی تلافی کے لیے ادا کر سکتا۔ اس طرح چالیس سال کی خدمت کے بدلے میں اس نے اپنی اجرک کی مدد سے باغ میں آم کے درخت کے ساتھ لٹک کر جان دے دی۔ یہ تھا اس کا انعام۔ اگرچہ پورے گاؤں والوں نے اس کی موت پر افسوس کا اظہار کیا تھا لیکن چوہدری کرم دین کی نظر میں وہ چور ہی تھا۔ اس طرح اب میں نہ صرف ایک مزدور کا بیٹا تھا بلکہ ایک چور کا پوتا بھی تھا۔

مجھے یقین تھا کہ میرا دادا چوری نہیں کر سکتا تھا کیونکہ یہ اس کی فطرت ہی نہیں تھی۔ وہ ایک نیک آدمی تھا۔ اس شام جب میرا باپ مجھے اپنے بازوؤں میں لے کر لیٹا تو ساری رات سسکیاں لیتا رہا اور میں بھی رات بھر سو نہیں سکا۔ بابا کے معصوم چہرے کے تصور سے میری آنکھیں بار بار آنسوؤں سے بھیگ جاتی تھیں۔ اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اپنے دادا کے بازوؤں میں ہوں۔ میں اس سے لپٹ کر روتے ہوئے بولا کہ دادا میں کبھی نہیں مان سکتا کہ تم نے چوری کی ہے۔ چور کوئی اور شخص ہوگا۔ صبر کر بیٹا صبر کر...... میرے باپ کی آواز تھی۔ میں نے اپنی آنکھوں

سے آنسو پونچھے تو وہ زار و قطار رونے لگ گیا۔ وہ اب ہچکیوں کے ساتھ روتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

بیٹا تم ٹھیک کہتے ہو۔ تمہارا دادا چور نہیں تھا۔ میں جانتا ہوں اصل چور کون ہے۔ میں اس کا بازو تھام کر ضد کرنے لگا کہ مجھے اس کے بارے میں بتاؤ گے میں نے وعدہ کرلیا تو وہ بولا۔ اصل چور چوہدری کرم دین کا بیٹا چوہدری جمال دین ہے۔ میرے باپ کے لہجے میں تلخی تھی۔ تمہارے دادا کو اس کا علم تھا لیکن اس نے اپنی جان دے کر اس پر حرف نہیں آنے دیا۔ اسی وجہ سے میں بھی سچ نہیں بول سکتا۔ وہ ہم سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ چکا ہے۔ اب میں یہ بات کروں بھی تو کون یقین کرے گا۔ البتہ ہم کسی بڑی مصیبت میں گرفتار ہوجائیں گے۔ اس وقت میں اپنے باپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا تھا لیکن خوف کی وجہ سے میں نے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ میں اپنے دادا کو یاد کرکے بہت روتا تھا۔ اب صرف میرے ماں باپ ساتھ تھے اور ہم ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔ دادا کے مرنے کے بعد میرا باپ بہت پریشان رہنے لگا تھا۔ پھر اس کے بعد اس کے چہرے پر شاید ہی مسکراہٹ آئی ہو۔ سردیوں کے ایک دن میں اور میرا باپ آگ کے قریب بیٹھے تھے کہ اچانک باہر شور سنائی دیا۔

کوئی چلا رہا تھا۔ ”لوگو میری مدد کرو......لوگو مجھے بچاؤ۔“ خوف کے مارے میں اپنے باپ سے لپٹ گیا۔ اس نے مجھے تسلی دیتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ڈرو نہیں بیٹا میں جو آپ کے پاس ہوں۔“ پھر باہر خاموشی چھا گئی۔ لیکن زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ گاؤں کے چوکی دار نے آکر میرے باپ سے کہا کہ اسے حویلی میں چوہدری صاحب بلا رہے ہیں۔ وہ اسی وقت حویلی چلا گیا۔ میں نے اس کا بہت انتظار کیا جب میرا باپ واپس نہ آیا تو مجھے اکیلے میں ڈر لگنے لگا تھا۔ آخر وہ آ گیا اس کے ساتھ ماں تھی۔ وہ دونوں رو رہے تھے۔ میرے باپ نے مجھے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا اور بری طرح رونے لگا۔ اس رات ہم تینوں جاگتے رہے۔ میرا باپ انتہائی مایوسی کے عالم میں میری ماں سے باتیں کر رہا تھا مجھے اس کی باتیں تو سمجھ نہیں آرہی تھیں لیکن اتنا یاد ہے وہ کہہ رہا تھا کہ مجھے مرجانے دو۔ ایسی زندگی کا کیا فائدہ۔ ہم چوہدری کے نوکر ہیں ہمیں وہی کرنا ہے جو چوہدری ہمیں حکم دیں گے۔ ہماری اولاد کی زندگی میں بھی یہی غلامی ہے۔

اگر میں زندہ رہا تو میرا عامر بھی نوکر ہی بن سکتا ہے اور یہ غلامی کا سلسلہ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔ بہتر یہی ہے کہ میں چوہدری کرم دین سے تھوڑی رقم حاصل کرلوں تاکہ عامر تعلیم حاصل کرسکے اور بڑا ہوکر دنیا میں اپنے لیے کوئی نیا راستہ اختیار کرسکے۔ اس وقت میرے باپ نے جو کچھ کہا تھا وہ مجھے آج بھی یاد ہے میری ماں سارا وقت روتی رہی اور کہتی رہی کہ میں تمہارے بغیر کیسے زندہ رہوں گی؟ گھریلو حالات دیکھ کر میں بھی رو رہا تھا۔ اگلی صبح ابھی ہم بستر پر ہی تھے کہ پولیس میرے باپ کو لینے آ گئی۔

اس پر ایک دن پہلے کسی کو قتل کرنے کا الزام تھا لیکن میں کیسے یقین کرسکتا تھا جب کہ شام کو وہ میرے ساتھ آگ کے قریب بیٹھا تھا۔ جب باہر شور ہوا تو وہ مجھے اپنے بازوؤں میں لے کر تسلی دے رہا تھا۔ وہ باہر گیا ہی نہیں تو کسی کو قتل کیسے کرسکتا تھا؟ میرا باپ اپنی صفائی میں ایک لفظ کہے بغیر خاموشی سے سر جھکائے پولیس والوں کے ساتھ چلا گیا۔ میری ماں سکتے کے عالم میں کھڑی تھی۔ میں پاگلوں کی طرح اس کے پیچھے بھاگا مگر پولیس والوں نے مجھے دھکا دے کر گرا دیا اور میں نے اپنے باپ کو کبھی نہیں دیکھا۔

چند ماہ بعد وہ جیل میں ہی بیمار ہوکر مرگیا اور اس کا جنازہ ہی گھر آیا۔ میری ماں نے چوہدری کرم دین کے گھر کا کام چھوڑ دیا تھا اور ہم دوسرے محلے میں رہنے لگے تھے۔ انہی دنوں میں اسکول میں پڑھنے لگ گیا۔ یہ بات بھی مجھے بعد میں معلوم ہوئی کہ وہ قتل چوہدری کرم دین کے بیٹے جمال دین نے کیا تھا۔ میں چوہدری اور اس کے بیٹے سے نفرت کرتا تھا۔ آج میں جس مقام پر ہوں وہاں تک پہنچانے کے لیے میرے باپ اور میری ماں کی شفقت کا ہاتھ تھا۔ میرے والدین کی محنت‘ ان کی قربانیاں رائیگاں نہیں جائیں گی اور چاہے کچھ بھی ہوجائے میں غلامی کا یہ سلسلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کردوں گا۔“ وہ خاموش ہوگیا مگر اس کے چہرے کی خوفناک سی کیفیت تھی۔ وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے بمشکل اپنا غصہ ضبط کر رہا تھا یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ انتہائی اذیت سے گزر رہا ہو۔ میں خود بھی دل گرفتہ تھا لیکن اس کے باوجود اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

”عامر! کوئی اور بھی ایسی تکلیف دہ بات ہے جو تم چھپا رہے ہو؟“ میں نے پوچھا اور شاید اس نے میرے دل کی بات جان لی تھی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور پھر وہ کمرے میں ایک آدھ چکر لگا کر دوبارہ بیٹھ گیا۔

”ہاں ابھی کہانی ختم نہیں ہوئی۔“

”میں نے تم سے کچھ باتیں چھپائی ہیں لیکن اب تمہیں وہ بھی بتا دوں گا۔ ایک روز میں خلاف معمول اسکول سے جلد گھر آ گیا تو دیکھا کہ ماں ایک مرد کے ساتھ بیٹھی تھی انہوں نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ میں خاموشی سے باہر چلا آیا۔ غصہ اور شرم سے میرا برا حال تھا۔ اس وقت سخت محنت سے تعلیم حاصل کر رہا تھا اور میری ماں گھر میں اپنا آپ اجاڑ رہی تھی۔ یہ کس قدر اذیت ناک بات تھی جب کہ مجھے اپنی ماں سے اتنا پیار تھا کہ میں اس پر ہاتھ اٹھانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا میں نے آدمی کو پہچان لیا تھا۔ وہ چوہدری کرم دین کا بیٹا چوہدری جمال دین تھا۔ جس نے میرے دادا اور میرے باپ کو مرنے پر مجبور کر دیا تھا اور اب میری ماں کو تباہ کر رہا تھا۔ میں نے اپنے کانوں سے سنا۔ میری ماں کہہ رہی تھی جلدی کرو اس سے پہلے کہ عامر آ جائے...... تم چلے جاؤ۔ چوہدری جمال دین نے کچھ کہا جس کے جواب میں ماں کی آواز پھر سنائی دی۔ چوہدری صاحب ہم پر رحم کرو۔ یہاں نہ آیا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ میرا بیٹا عامر تمہیں دیکھ لے۔ جب میں دوبارہ گھر آیا تو ماں اکیلی بستر پر سر جھکائے کسی سوچ میں گم تھی۔ میں اس کی طرف لپکا تو وہ ایک دم چونک پڑی اور گھبرا کر بولی۔

”تم آ گئے......؟“

میں غصے اور ذلت کے احساس سے پاگل ہو رہا تھا۔

”ماں تمہیں شرم آنی چاہیئے۔“ میں چلایا۔

”میں اسکول جاتا ہوں اور تم گھر میں اس طرح...... ایسا کیوں ہوا ماں؟“

”عامر بیٹے......“ ماں ایک دم چیخ اٹھی اور پھر بلک بلک کر رونے لگی۔ دفعتاً ماں کا پیار میرے غصے پر حاوی ہو گیا۔ مجھے یاد آنے لگا کہ وہ کس طرح دن رات میرا خیال رکھتی تھی۔ میں سبق یاد کرتا تو سارا وقت میرے قریب بیٹھی مجھے پیار سے دیکھتی رہتی۔ میرے آرام کا خیال رکھتی اور میری ہمت بندھاتی۔

”مجھے معاف کر دو ماں۔ مجھے اس طرح تمہارا دل نہیں دکھانا چاہیئے تھا۔ مجھے معاف کر دو۔“

اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور پھر میرا بازو پکڑ کر اپنے قریب بٹھا لیا۔

”تم ٹھیک کہتے ہو عامر۔“ اس کے لہجے میں بلا کا کرب تھا۔ معافی تو مجھے مانگنی چاہیے۔ تمہارے باپ کے مرنے کے بعد میرا سب کچھ تم ہی ہو۔ میں تمہارے باپ کے ساتھ ہی مر چکی ہوں۔ میں صرف تمہارے لیے زندہ ہوں۔ اگر تم نہ ہوتے تو میں تمہارے باپ کے ساتھ ہی مر چکی ہوتی۔ کیا تمہیں اپنے باپ کے آخری الفاظ یاد نہیں ہیں؟ اس کی ایک ہی خواہش تھی کہ تم پڑھ لکھ کر ایک عظیم انسان بن جاؤ تاکہ دنیا میں باعزت زندگی بسر کر سکو۔ اگر وہ اس مقصد کے لیے جان دے سکتا ہے تو میں ایسا کیوں نہیں کر سکتی؟ میری بدنصیبی کا آغاز تو اس دن سے ہو گیا تھا جس دن میں چوہدری کرم دین کے گھر کے کام پر مامور ہوئی تھی۔ اس دن سے جمال نے مجھے تنگ کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور میرے لیے اس سے بچنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ جب تمہارا باپ مر گیا اور ہم وہاں سے دوسرے محلے میں چلے آئے تو وہ یہاں میرا پیچھا کرنے لگا کیونکہ یہاں پر آنا اس کے لیے آسان تھا۔ اور میرا قصور یہ ہے کہ میں بدصورت نہیں ہوں اور ہم ان کی جاگیر میں رہتے ہیں۔ خاص طور پر تمہارا مستقبل میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ ان کی مدد کے بغیر ہم کچھ نہیں کر سکتے اور یہ وحشی درندہ تو سب کچھ کر سکتا ہے...... میرے بیٹے! خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔ تم جب تک اپنی تعلیم مکمل نہیں کر لیتے میں سب کچھ برداشت کر لوں گی۔“ ماں نے مجھے گلے لگا لیا۔ میرے دل میں اس کے لیے پیار ہی پیار تھا۔

”یہ تم پر بہت زیادتی ہے ماں!“ میں نے دکھ سے نڈھال ہو کر کہا۔

”میں اسکول نہیں جاؤں گا۔ میں تمہیں اس عذاب میں مبتلا نہیں دیکھ سکتا۔ میں تعلیم کے بجائے مشقت کو ترجیح دوں گا۔“ اس نے ایک دم سے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ بولی۔

”بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ تمہیں ہر قیمت پر تعلیم حاصل کرنی ہے اس مقصد کی خاطر میں تمام عمر لوگوں کے

برتن صاف کرنے کو تیار ہوں۔" اس دن ماں مجھے سارا وقت سمجھاتی رہی اور دلائل سے زیادہ اس کے آنسوؤں نے مجھے اس کی بات ماننے پر مجبور کردیا۔ دوسرے دن میں معمول کے مطابق اسکول چلا گیا۔ اور پھر میں نے کبھی پڑھائی چھوڑنے کی بات نہیں کی۔ اس امید پر میں اسکول میں انتہائی محنت سے پڑھتا تھا کہ اعلیٰ تعلیم ہی روشن مستقبل کی طرف جانے کا راستہ ہے۔ میں نے اپنے والد کی خواہش کے مطابق اس غلامی کی زندگی کو ختم کرنے کا مصمم ارادہ کر رکھا تھا لیکن تلخ حقیقت مجھے چین لینے نہیں دیتی تھی۔ میرا ماضی کسی بدروح کی طرح میرے تعاقب میں رہتا تھا۔ زندگی کرب کے سوا کچھ بھی نہیں۔ خاص طور پر میرے جیسے انسان کو سال ہا سال کی غلامی سے نکلنے کی کوشش کر رہا ہو۔

لیکن میں ناامید نہیں ہوا کیونکہ میری ماں کے پیار نے مجھے مشکلات سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ دیا تھا۔ جمال اب بھی بدستور ہمارے گھر آتا تھا۔ اس جان لیوا اذیت کو جس طرح میں برداشت کرتا تھا میں نے کبھی اپنی ماں پر ظاہر ہونے نہیں دیا۔ جب وہ چلا جاتا تو ماں بالکل مختلف عورت نظر آتی۔ وہ پاگلوں کی طرح روتی رہتی اور میں دیر تک اسے تسلیاں دیتا رہتا۔ اگر یہ سب اسی لیے ہوتا رہتا تو مجھے یقین تھا میری ماں بہت جلد مر جاتی لیکن پھر جمال کو ایک اور لڑکی مل گئی اور اس نے ہمارے گھر آنا چھوڑ دیا۔ اس طرح ماں نے آنے والے دن سکون سے گزارے۔

یہاں تک کہ میں یونیورسٹی میں داخل ہوگیا...... آج میری ماں کو مرے ہوئے پورے تین سال ہوگئے ہیں لیکن میں اسے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں بھول سکا اور نہ ہی اپنے دادا اور باپ کو۔ میں جب بھی انہیں یاد کرتا ہوں تو مجھے کبھی ندامت کا احساس نہیں ہوتا اور نہ ہی میرے لیے شرمندگی کا باعث ہیں بلکہ میں ان پر فخر کرتا ہوں...... بے شک میرے دادا نے ایک چور کی حیثیت سے خودکشی کی۔ میرے باپ نے قتل کا مجرم بن کر جیل میں جان دی اور میری ماں نے ایک داشتہ کے روپ زندگی گزاری لیکن کیا تم ان سب گناہوں کے لیے انہیں قصوروار ٹھہرا سکتے ہو؟ انہوں نے کسی کا کیا بگاڑا تھا۔" وہ بہت جذباتی ہو رہا تھا۔

"میں جانتا ہوں تم انہیں ذلیل لوگ جانو گے لیکن وہ سونے کا دل رکھنے والے لوگ تھے میں ان کی یاد میں ساری ساری رات جاگتا ہوں۔ اس وقت مجھے بہت اذیت ہوتی ہے جب میں سوچتا ہوں کہ میں یہاں آرام دہ بستر پر دراز ہوں جب کہ میرے وطن' پیارے وطن کے لاکھوں غریب لوگ مشقت کی مصیبت زدہ زندگی گزار رہے ہیں۔ ویسی ہی مصیبت زدہ زندگی جو میرے دادا نے گزاری تھی۔ کوئی بوڑھا چوری کا ملزم ٹھہرائے جانے پر خودکشی کرنے پر مجبور ہوگا۔ کوئی نوجوان ناکردہ جرم کی سزا میں جیل کی سلاخوں کے پیچھے دم توڑ رہا ہوگا۔ کوئی ماں کسی چوہدری کی ہوس کا نشانہ بن کر سسک رہی ہوگی اور کوئی بچہ اپنے باپ سے لپٹ کر آنسو بہا رہا ہوگا اور ان کا چوہدری سہانے خواب لیے سویا ہوا ہوگا۔

میں ایسی زندگی پر لعنت بھیجتا ہوں اگر میرا بس چلے تو میں دنیا سے چوہدراہٹ کا وجود ہی ختم کردوں۔ انہیں لوگوں نے میرے بابا کو خودکشی کرنے پر مجبور کیا۔ میرے باپ کی زندگی چھینی اور میری ماں کی زندگی پامال کی۔ اب وہ سب ختم ہوچکے ہیں مگر چوہدری کرم دین اور اس کے بیٹے ابھی تک زندہ ہیں۔ میں ان سے انتقام ضرور لوں گا۔

وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ دیکھو ......" اس نے باہر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میں نے دیکھا' اس کا اشارہ گلی کی طرف تھا جہاں ایک فیشن ایبل جوڑا اپنی مستی میں جا رہا تھا۔

"ہم لوگ سال ہا سال سے ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں۔ ہمارے دادا خودکشی کرلیتے ہیں۔ ہمارے باپ جیلوں میں سسک سسک کر مر جاتے ہیں۔ ہماری مائیں بے آبرو ہوجاتی ہیں اور ہمارے بچے چیخ چیخ کر روتے ہیں لیکن ان امیر زادوں میں ایک بھی ایسا نہیں ہے جس کے ضمیر نے اسے ملامت کی ہو۔" عامر کی آواز میں برسوں کی اذیت اور تکلیف کا کرب تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے مجھے کوئی کوڑے لگا رہا ہو۔ میری نظروں کے سامنے بے شمار دردناک مناظر گھومنے لگے۔

میں ایک زمین دار کا بیٹا تھا۔ اس کی باتیں میرے دل پر بجلی کی مانند برسنے لگیں۔ اب میں اپنے آپ کو جمال کی جگہ تصور کر رہا تھا جس نے عامر کے دادا کو تباہ کیا۔ اس کے باپ کو اپنے جرم کا سزاوار ٹھہرایا اور اس کی ماں کی بے حرمتی

کی۔ انتقام میں سلگتی ہوئی آنکھوں نے مجھے بری طرح خوف زدہ کردیا تھا۔ میں سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے منہ پر کوئی طمانچہ لگا رہا ہو۔

”چوہدری صاحب! کیا ہوا؟“ وہ نرمی سے پوچھ رہا تھا۔ مجھ میں بولنے کی سکت نہیں تھی۔ میں نے خاموشی سے آنسو پونچھ ڈالے اور بڑی ہمت کر کے پوچھا۔

”عامر! تم نے میری جان کیوں بچائی جب کہ تم جانتے تھے کہ میں ایک زمین دار کا بیٹا ہوں۔ تم نے کیوں مجھے کار کے نیچے کچل جانے نہیں دیا......؟“

اس کے چہرے پر ایک بار پھر اداس سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ بولا۔

”ایک انسان ہونے کے ناتے۔“

میں آنسوؤں کی دھندلاہٹ میں خاموشی سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اس نے بھی میری طرف دیکھا اور کہنے لگا۔

”اپنی خوشیوں کے بجائے دوسروں کی خوشیاں تلاش کرنا اور اپنی زندگی کو دوسروں کی زندگی کے لیے قربان کردینا ہی انسانیت ہے اور مجھے یہ انسانیت کا سبق اپنے بزرگوں سے وراثت میں ملا ہے۔ میرے دادا سے میرے باپ سے مجھے......خدا جانے کب ایسی سوچوں اور اس نام کی زندگی سے چھٹکارہ حاصل کرسکوں گا؟“ اس کی کرب ناک آواز نے میرے اعصاب شل کردیئے تھے۔ ندامت اور صدمے کی شدت سے بے حال ہوگیا تھا۔ پھر وہ اٹھ کر چلا گیا۔

اس کے بعد میں نے اسے شاذ و نادر ہی کبھی دیکھا ہو۔ اب وہ نہ کھیل کے میدان میں نظر آتا اور نہ ہی شہر کی طرف جاتا۔ میں اس سے ملنے کئی بار اس کے کمرے میں گیا لیکن وہ نہیں مل سکا۔ رفتہ رفتہ ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی بنتے جا رہے تھے لیکن مں اسے اور اس کی باتوں کو ایک لمحہ کے لیے بھی بھول نہیں سکا۔ وقت گزرتا گیا۔ یونیورسٹی چھوڑے ایک عرصہ بیت گیا مگر اب بھی جب کبھی دوستوں کی محفل میں زمینوں کا ذکر ہوتا تو میں بڑے فخر سے کہتا کہ میں ایک زمین دار ہوں اور میری خواہش ہے کہ ابھی اور زمین خریدوں تاکہ میں بھی اپنے علاقے کا بڑا زمین دار بن سکوں۔ اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد کسی حد تک میری یہ خواہش پوری ہوگئی۔ میری زمین میں اضافہ ہوگیا تھا اور میں نے ملازم بھی زیادہ رکھ لیے تھے جو نہایت وفاداری سے میری خدمت کرتے تھے۔ میں بہت خوش اور مطمئن تھا لیکن میں ظلم کی وہ داستان نہیں بھولا تھا جو کبھی عامر نے مجھے سنائی۔

ایک دن میں اور میری بیوی باغ میں بیٹھے ٹھنڈی ہوا سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ ہمارے ایک ملازم نے مجھے اس روز کا اخبار لا کر دیا۔ میں نے اخبار پڑھنا شروع کیا تو میری نظر ایک مزدور لیڈر کے قتل کی خبر پر پڑی۔ مزدور لیڈر کا نام عامر تھا۔ مجھے یقین ہوگیا کہ یہ وہی عامر ہے جو میرا محسن تھا۔ جس نے میری جان بچائی تھی اس کی کہانی پھر میرے ذہن میں تازہ ہوگئی۔

ایک اور سونے کا دل رکھنے والا شہر خموشاں میں جا بسا تھا۔ اس دنیا سے چھٹکارہ شاید اس کے لیے خوشی کی بات ہو۔ میں نے سوچا اس نے میری جان بچائی تھی میں احسان مندی کے احساس سے مغلوب ہو کر آہ بھرے بغیر نہ رہ سکا۔

”چوہدری صاحب اچانک آہیں کیوں بھرنے لگے......؟“ میری بیوی نے میرے قریب ہو کر پیار سے پوچھا۔

”کچھ نہیں میرا ایک کلاس فیلو مر گیا ہے۔“ میں نے اپنی بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے افسردگی سے جواب دیا۔ اس کا چہرہ اور پیار سے چمکتی آنکھیں بھی عامر کی یاد میں میرے دل سے محو نہ کرسکیں۔

* * *

http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

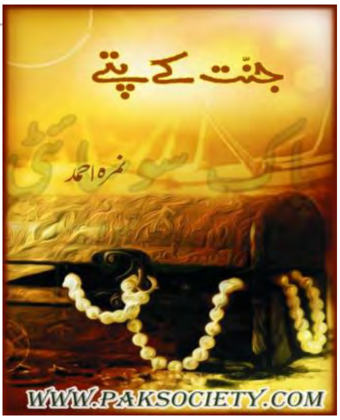
جنت کے پتے
نمرہ احمد
WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
مصحف
نمرہ احمد
www.Paksociety.com

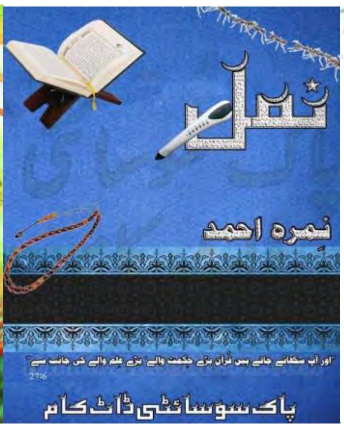
نمل
نمرہ احمد
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

آبِ حیات
عمیرہ احمد
WWW.PAKSOCIETY.COM

ہم سفر
فرحت اشتیاق
http://www.paksociety.com

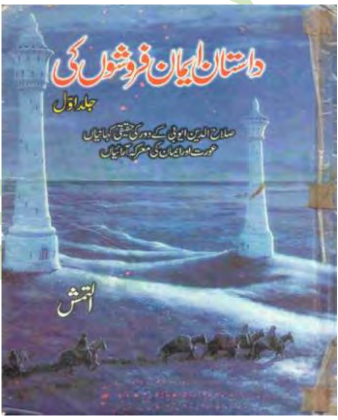
داستان ایمان فروشوں کی
جلد اول
التمش

بن روئے آنسو
فرحت اشتیاق
www.paksociety.com

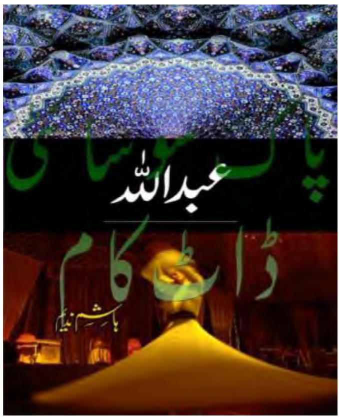
عبداللہ
ہاشم ندیم

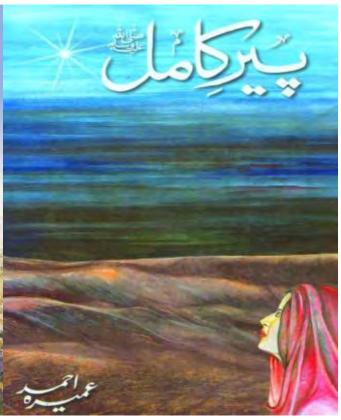
پیرِ کامل
عمیرہ احمد

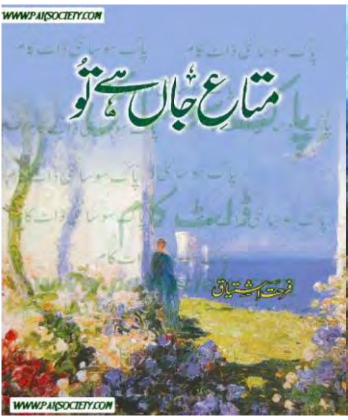
WWW.PAKSOCIETY.COM
متاعِ جاں ہے تو
فرحت اشتیاق
WWW.PAKSOCIETY.COM

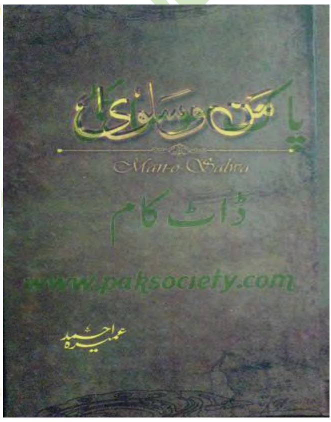
من و سلویٰ
Man-o-Salwa
www.paksociety.com
عمیرہ احمد

جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو
فرحت اشتیاق
WWW.PAKSOCIETY.COM

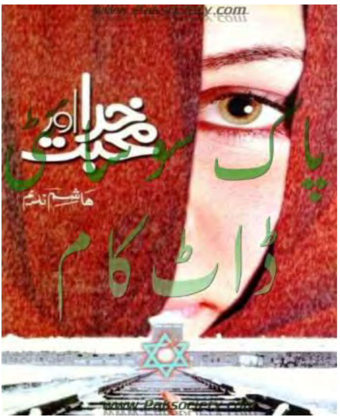
خدا اور محبت
ہاشم ندیم

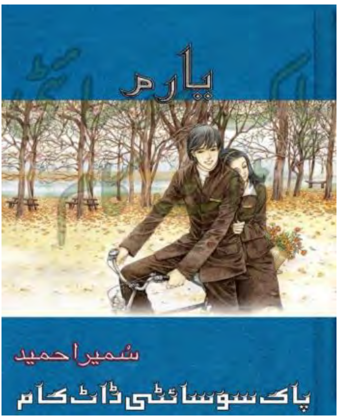
بارش
شمیرا حمید
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

ٹوٹا ہوا تارہ
سمیرا شریف طور
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

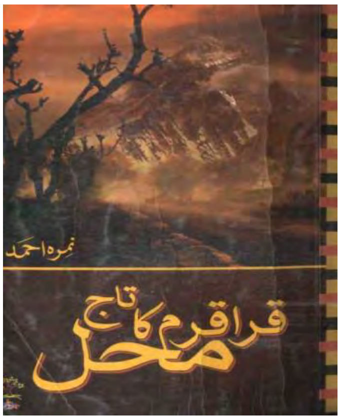
نمرہ احمد
قراقرم کا تاج محل

قافلہ شہیدوں کا

مہر پرویز احمد دولو

ملک کے طول ارض پر جنگ کے سیاہ بادل چھائے ہوئے ہیں جسے دیکھو اس کے پاس ایک ہی موضوع ہے کہ بھارت وطن عزیز پر دانت تیز کیے بیٹھا ہے دوسری طرف پاکستان میں شہادتوں کا سفر جاری ہے۔ وطن عزیز کے بزرگ نوجوان اور بچے غیر ملکی قوتوں اور ان کے مقامی سہولت کاروں کی کارروائیوں کے باعث اپنی جانیں گنوا رہے ہیں یہ جنگ کیا رنگ لائے گی اس کا کیا نتیجہ نکلے گا یہ سب کو پتا ہے۔

اپنے وطن پر جان نچھاور کر دینے والے باپ کی بیٹی اور شہید بھائی کی بہن کی داستان۔

اس کا مجازی خدا وطن دشمنوں کا حامی تھا

”آپ تو صرف طلاق دے کر گھر سے نکالنے کی دھمکی دے رہے ہیں۔ میں تو پاک وطن کی حرمت اور وقار کے لیے اپنی جان کی قربانی دینے کو بھی معمولی قربانی سمجھتی ہوں۔ میں اور میری کوکھ میں پلنے والا اس مقدس دھرتی کا سپوت ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے تیار ہیں۔ ہم دعا گو ہیں اللہ تعالیٰ ہماری یہ ادنیٰ قربانی اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے۔ ہم ماں بیٹے کو تم یہ بہت کم سزا دے رہے ہو میں تو ہزار بار قربان ہو کر بھی اس وطن کے احسانات کا بدلہ نہیں چکا سکتی۔“

”اگر آج معاشرے میں میری اہمیت ہے تعلیم یافتہ ہوں معاشرے کے باوقار بلند و بالا مقام کے مالک شخص کی بہو ہوں تو اس عزت افزائی کا سارا کریڈٹ اسے جاتا ہے۔ افسوس ہے تمہاری سوچ پر اسی کا کھا کر گلہ کرتے ہو یہ تمہاری پہچان کا موجب ہے حکومتوں کے قیام و تحلیل میں تمہارا نمایاں کردار ہے۔“

”اگر تتنے ہی غیور ہو یہاں سے نفرت ہے کچھ بھی تمہاری مرضی خواہش اور منشاء کے مطابق نہیں ہو رہا تو یہاں سے چلے کیوں نہیں جاتے‘ اس ملک کو چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ جن کے گن گاتے ہو جو تمہیں محبوب لگتے ہیں ان کے پاس کیوں نہیں جاتے۔ میرے سامنے اس کی ہرزہ سرائی مت کرو۔ مجھے مت بتاؤ کہ یہ کتنی شان اور حرمت کا حامل ہے دنیا کے نقشے پر اس کو دیکھتے ہی کتنے ہی حکمرانوں پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔“

❁……❁……❁……❁

منظور پاک وطن کی سرحدوں کی حفاظت کے لیے فاٹا میں دہشت گردوں سے نبرد آزما تھا کہ اس کو اطلاع دی گئی کہ ”تمہارے ہاں جڑواں بچے بیٹی اور بیٹا پیدا ہوئے ہیں۔“

وہ تو اطلاع پاتے ہی خوشی سے نہال ہو گیا‘ دشوار گزار پہاڑوں پر ڈیوٹی سرانجام دے رہا تھا مارکیٹ بازار تک جانا

علم مومن کی میراث ہے یہ جہاں سے ملے اسے حاصل کرو (حدیث)

تشنگان علم کیلئے محترم مشتاق احمد قریشی کی
جانب سے ایک اور تحفہ قرآن آسان تحریک کے تحت

اللہ جل جلالہ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

اللہ کون ہے اور کیوں ہے۔ جانیے اور سمجھیے صرف کلام اللہ کی روشنی میں
بقول ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر مدظلہ یہ کتاب بطور خاص
ان لوگوں کیلئے ہے۔ جو عصری تعلیم کے دلدادہ اور سائنسی ترقی کی چمک سے
چندھیائے ہوئے اور اللہ کی صفت خالقیت، مالکیت اور رزاقیت سے ناآشنا
بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے ہی منکر ہیں

اسلامی کتب خانہ الحمد مارکیٹ غزنوی روڈ اردو بازار لاہور۔ 0423-7116257
نئے افق گروپ آف پبلی کیشنز 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی۔ 0213-5620771/2

ممکن نہ تھا۔

اس دفعہ جب گاؤں سے چھٹی گزار کر واپسی کی تیاری کر رہا تھا تو بیوی زینب نے بڑے چاؤ سے اسے دیسی گھی میں آٹا بھون کر اس میں گڑ اور شکر ڈال کر پنجیری بنا کر دی تھی وہ جب بھی رات کو ڈیوٹی سے کوارٹر میں آتا تو مزاج کے ساتھ منہ بھی میٹھا کرنے کو جی چاہتا تو تھوڑی سی پنجیری نکال کر کھالیتا' جو اسے منہ کا ذائقہ بدلنے کے ساتھ زینب کی یاد اور محبت سے بھی سرشار کردیتی۔

اس خوشی کے موقع پر اور تو اس کو میٹھی چیز نہ ملی سو اس نے صندوق کا تالا کھولا' کڑھائی والے رومال میں بندھی پنجیری نکالی اور تمام ساتھی دوستوں میں بانٹ دی۔ دیسی گھی کی مہک اور خالص گڑ کی بنی پنجیری جو بھی کھاتا تعریفوں کے پل باندھنے کے ساتھ مبارک باد کے مخلص تحائف دیتا تھا۔

اولاد کی خوشی کا خمار اس کے حواس پر چھانے لگا' اب تو دشوار گزار گھاٹیوں میں ساری رات جاگ کر ڈیوٹی کرنا بھی اسے معطر پھولوں کی رکھوالی لگتی۔ خیالوں میں گھر کے کچے صحن میں گھوم رہا ہوتا' بچوں کی قلقاریوں سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ بیوی کے نخرے بھی اٹھا رہا ہوتا۔ مجال ہے جو اس کے ماتھے پر شکن آتی۔ ہر لمحے پھولوں کی طرح مہکتا اور چڑیوں کی طرح چہکتا رہتا۔ جسم کا انگ انگ خوشیوں کا منبع بنا ہوا تھا۔

❀…… ❀…… ❀…… ❀

منظور آج بہت خوش تھا' دفتر سے چھٹی منظور ہوتے ہی اسے پر لگ گئے تھے' وہ اڑ کر گاؤں پہنچ جانا چاہتا تھا' جہاں معصوم بچے اس کی آمد کے منتظر تھے۔ جونہی اپنے شہر پہنچا گاؤں جانے والی بس سواریوں کے انتظار میں تھی' منظور کو یہ انتظار سخت ناگوار لگ رہا تھا اس کا جی چاہ رہا تھا آج اسے اکیلے ہی کو لے کر بس گاؤں روانہ ہو۔

بہر حال کافی دیر بعد بس کے اندر اور چھت کا منظر یوں تھا جیسے آم کے درخت پر آم لٹک رہے ہوں جدھر نگاہ اٹھتی لوگ ہی لوگ تھے جو بس کے اندر اور چھت پر یوں بیٹھے تھے جیسے آج انہیں ہوائی جہاز میں سفر کرنے کا خواب پورا کرنے کا موقع ملا ہے۔

جب بھی بس اسٹاپ پر سواریاں اتارنے کے لیے رکتی منظور کو یوں لگتا جیسے اسے بخار کی کھٹی کڑوی کھچر پلادی گئی ہو' وہ تو چاہتا تھا بس آج جہاز کی طرح اڑ کر اسے گھر پہنچا دے۔ خدا خدا کرکے گاؤں کا اسٹاپ آیا' اس نے سیٹ سے باہر ایسے چھلانگ لگائی جیسے کوئی خونی درندہ اس کے پیچھے لگا ہو۔

زمین پر پاؤں ٹکتے ہی گھر کی طرف یوں دوڑ لگا دی جیسے پولیس کا چھاپہ پڑنے پر جواری جوتے چھوڑ کر بھاگتے ہیں۔ گھر کی کچی گری ہوئی دیوار سے بنے راستے سے اندر صحن میں پہنچا۔ جونہی کچے کوٹھے کے دروازے پر پہنچا تو کیا دیکھتا ہے دو معصوم بچے کھجور کے پتوں سے بنی ہوئی پٹی سے بنی ہوئی چارپائی پر لیٹے ہیں ان کے سروں کے نیچے ریت بھر کے رنگدار کپڑوں کی تھیلیاں چھوٹی چھوٹی سرہانیوں کی صورت میں رکھی ہیں۔ آنکھوں میں سرمے کے ڈورے ہیں بھوؤں کو بھی سرمے سے سیاہ کیا گیا ہے زندگی کے ننھے مسافر ایک دوسرے کے ساتھ شرارتوں کے ساتھ اوں باں کرنے میں مصروف ہیں زینب بھینسوں کے گوبر سے بنی تھاپیوں پر ان کے لیے دودھ گرم کررہی ہے۔ جب زینب نے اچانک اپنے سر کے تاج کو سامنے دیکھا تو ہکا بکا رہ گئی' آنکھیں جھپکنا بھول گئی' جب ہوش کی دنیا میں واپس لوٹی تو خوشی سے نہال ہوگئی اور بجائے اس کہ حال احوال پوچھتی بھاگ کر بچوں کے پاس گئی' انہیں پسینے سے شرابور بغلوں میں اٹھایا اور خاوند کی گود میں ڈال دیا اور بدلے میں انعام کی طلب گار نگاہوں سے اس کے چہرے کا طواف کرنے لگی۔

جلد ہی دونوں خوشیوں کے جھولے میں سوار ہوکر معطر فضاؤں میں ہلکورے لینے لگے۔ خوشی کے موسم کے گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلا' پلک جھپکتے ہی چھٹیاں یوں ختم ہوئیں جیسے ہاتھ سے مچھلی پھسلتی ہے۔ آخر کار ایک دن پھر وہ وطن کی سرحدوں کی طرف محوسفر ہوگیا۔ شاید وہ اس کی جدائی کی وجہ سے رنجیدہ ہوگئی تھی۔ روانگی والے دن پندونصائح کا لمبا چوڑا پلندہ زینب کے حوالے کیا۔

❀…… ❀…… ❀…… ❀

دن رات مہینوں کی مسافت طے کرکے سالوں میں تبدیل ہوگئے زندگی کے موسم میں کتنی ہی بہاریں اور خزائیں آئیں آسیہ اور حبیب نے اب چلنا شروع کردیا

تھا۔ زینب دونوں کی انگلیاں پکڑ کر صحن میں چلتی، ان کے معصوم قہقہوں سے دل و دماغ پر خوشیوں کے بادل چھا جاتے۔ جب ہوش کی دنیا میں قدم رکھا تو گاؤں کے اکلوتے پرائمری اسکول میں داخل کروا دیا۔ ماں بڑی محبت سے علی الصبح اٹھ کر ناشتہ تیار کرتی، ہاتھ منہ دھلاتی، بالوں میں تیل لگاتی وردی پہناتی، جوتوں کے تسمے باندھنے کے بعد ان کا میک اپ کرنا شروع کر دیتی۔ آنکھوں میں سرمہ۔ چہرے پر کریم ملتی کنگھی سے بال سنوارتی بستے بغل میں دے کر دونوں کو اسکول کے گیٹ تک چھوڑ آتی۔

چھٹی سے کافی دیر پہلے اسکول کے دروازے پر ان کی آمد کی منتظر ہوتی۔ وہ دونوں چھٹی کی خوشی سے نہال ہو کر بھاگتے، اٹھکیلیاں کرتے کودتے کیاریاں پھلانگتے شرارتیں کرتے بھاری بستوں کو کاندھوں پر لٹکائے گیٹ پر پہنچ جاتے جہاں ماں چشم براہ ہوتی۔

ان کو چھاتی سے لگاتی پیار سے چومتی بستے خود اٹھا لیتی، یوں گھر پہنچ جاتے۔ کھانا تیار ہوتا گھر پہنچتے ہی بغلوں سے بستے نکالے جاتے جوتے اتارے جاتے ہاتھ منہ دھلوا کر صدقے واری جانے والی ماں کھانا اپنے ہاتھوں سے کھلاتی۔

* * *

دونوں بہن بھائی ایک طرف زندگی کے منازل طے کرتے جا رہے تھے دوسری طرف تعلیمی مراحل کو عبور کرتے ہوئے میٹرک فرسٹ ڈویژن لے کر پاس کر گئے۔ یہ خوش خبری بھی منظور کو گھر سے کوسوں دور فلک شگاف پہاڑوں پر دہشت گردوں سے نبرد آزما ہونے کے دوران ملی۔ ایک منظور کمانے والا اور چار افراد کھانے والے تھے اسی لیے مزید تعلیم دلوانے کے بجائے ان کے مستقبل کے بارے میں سنجیدگی سے غور و خوض ہونے لگا۔ بیٹے حبیب کو تو اپنے افسروں سے بات کر کے فوج میں بھرتی کروانے کا فیصلہ کیا جب کہ بیٹی آسیہ کو گھر پر ہی ماں کا ہاتھ بٹانے کی ذمہ داری سونپی۔ حبیب فوج میں بھرتی ہو کر اٹک آرٹلری سینٹر میں ٹریننگ کرنے لگا۔ آسیہ گھر پر ہی خانہ داری کے کاموں میں ماں کا ہاتھ بٹاتی، فارغ وقت میں دونوں ماں بیٹی گھر میں پالی گئی بھینس کے لیے چارہ لانے وڈیرے کے کھیتوں میں

سمجھنے کی باتیں

- زندگی انسان سے وفا نہیں کرتی لیکن انسان اس پر وفا کی آخری حد تک یقین رکھتا ہے۔
- پھول جب کھلتا ہے تو آنکھوں کو ٹھنڈک بخشتا ہے جب خوش بو دیتا ہے تو روح کو معطر کرتا ہے لیکن جب اپنے ساتھ لگے کانٹے چبھوتا ہے تو دل کے ٹکڑے کرتا ہے۔
- دعا انسان کی خواہشات کی تکمیل کا سب سے بڑا ہتھیار ہے بشرطیکہ اس میں خلوص نیت ہو۔
- پرخلوص دوستی دنیا کے تمام رشتوں سے بلند و بالا تر ہے۔
- محبت ایک پاکیزہ رشتہ ہے جو انسان کو خدا کی بندگی سکھا دیتا ہے۔

مہوش فاطمہ بٹ...... دینہ (جہلم)

خوبی

خوبی وہ چیز ہوتی ہے جس پر انسان اعتماد کرتا ہے جس کی وجہ سے دوسرے لوگ اس کی ذات پر بھروسہ کرتے ہیں لیکن رفتہ رفتہ یہ خوبی اس کی اصلی اچھائیوں کو کھانے لگتی ہے، اسی خوبی کی وجہ سے اس میں تکبر پیدا ہو جاتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ اسی خوبی کے باعث وہ انسانیت سے گرنے لگتا ہے فرد...... قومیں سب اپنی خوبیوں کی وجہ سے تباہ ہوتی ہیں۔

مونا شاہ قریشی...... کبیر والا

تلخ حقائق

- اس دنیا میں انسان ہر چیز کے پیچھے بھاگتا ہے مگر دو چیزیں خود انسان کا پیچھا کریں گی ایک اس کا رزق اور دوسرا اس کی موت۔
- انسان گناہ کرنے سے جہنم میں نہیں جاتا بلکہ گناہ کرنے کے بعد مطمئن رہنے اور توبہ نہ کرنے کی وجہ سے جہنم میں جاتا ہے۔
- میں دنیا کو اپنی جوتوں کی نوک پر رکھتا ہوں۔

فائقہ سکندر حیات...... لنگڑیال

چلی جاتیں۔ پہلے چوہدریوں کے جانوروں کے لیے چارہ کاٹتیں اس مزدوری کے عوض ان کو اپنی بھینس کے لیے چارہ مل جاتا یوں زندگی اپنی ڈگر پر رواں دواں تھی۔

❁ …… ❁ …… ❁ …… ❁

وڈیرے چوہدری ناصر کا بیٹا ندیم شہر کے مہنگے معیاری پرائیویٹ اسکول میں پڑھ رہا تھا۔ میٹرک میں اس نے اپنے شہر میں ٹاپ کیا تھا۔ بیٹے کی اتنی بڑی کامیابی نے چوہدری ناصر کو خوشیوں کے چمن کا والی بنا دیا تھا اس کا سر فخر سے بلند تھا خوشیوں نے اس کی حویلی کو چار چاند لگا دیئے۔ بیٹے کی کامیابی کی خوشی گاؤں کے ہر گھر میں پہنچانے کی غرض سے اس نے بہت بڑی پارٹی کا اہتمام کیا۔ فنکشن کے لیے دل کھول کر خرچ کیا گیا۔ پورے گاؤں کو مدعو کیا گیا' شہر سے متعلقہ اسکول کے اساتذہ کرام کو خصوصی دعوت دی گئی تھی ان کو وی آئی پی پروٹوکول سے حویلی لایا گیا۔ حویلی کو قندیلوں موم بتیوں اور برقی قمقموں سے سجایا گیا۔

پھولوں کی مہکار اور رنگی برنگی جھنڈیاں عجیب سماں پیش کررہی تھیں۔ ہر طرف خوشیوں کا میلہ لگا ہوا تھا۔ چوہدری ناصر کی خوشی دیدنی تھی جب کوئی اس کو مبارک باد دیتا اس کا چہرہ فخر سے چاند کی طرح دمکنے لگتا۔ بیٹا پھولوں اور نوٹوں کے ہاروں میں چھپا دکھائی نہیں دے رہا تھا تحائف کا الگ ڈھیر لگا ہوا تھا۔ خوشیوں کے اس میلے میں آسیہ بھی ماں کے ساتھ آئی ہوئی تھی۔ آج تو چوہدری ناصر اور اس کے بیٹے چوہدری ندیم کی ایک جھلک دیکھنا بھی دشوار نظر آرہی تھی لوگوں کا جم غفیر بڑھ چڑھ کر مبارک بادیں دے رہا تھا۔ چوہدری ناصر بڑے فخر سے بیٹے کی کارکردگی اور ذہانت پر روشنی ڈال رہا تھا تمام کلاس کے طلبا سے زیادہ حاصل کیے گئے نمبرز بڑی خوشی سے ملنے والوں کو بتا رہا تھا۔ حاصل کیے گئے نمبرز آسیہ نے سنے تو حیران رہ گئی اس نے گاؤں کے ہائی اسکول سے چوہدری ندیم سے پچاس نمبرز زیادہ لیے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ غربت نے اس کے تعلیم حاصل کرنے کے راستے کو مجبوری کے کانٹوں کی باڑ سے بند کردیا تھا ادھر ایک چوہدری کا بیٹا تھا جس کی کامیابی پر خوشی کے شادیانے بجائے جارہے تھے روپیہ پانی کی طرح بہایا جارہا تھا اور ایک وہ تھی جو اعلیٰ تعلیم کے خواب دیکھتے ہوئے مایوسی کی اتھاہ گھاٹیوں میں گر چکی تھی۔

مجبوریاں اس کا منہ چڑا رہی تھیں وہ ایسی نگری کی باسی تھی جہاں معاشرے کے ٹھیکیداروں نے پورے ماحول حالات و واقعات کو یرغمال بنا رکھا تھا ان کے حکم کے بغیر کسی بھی در و دیوار پر پتہ بھی حرکت نہیں کرتا تھا۔ وہ سپنوں کی ملکہ تھی کتنے ہی خواب آنکھوں کے محلات میں سجا رکھے تھے اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے علم کے نور سے گھر والوں عزیز رشتے داروں اور وطن کی تقدیر بدلنا چاہتی تھی مگر مجبور لوگوں کی ازلی دشمن غربت نے اس کے قلم دان ہاتھوں میں جھاڑو اور چارہ کاٹنے والی درانتی تھمادی تھی۔ آسیہ کی طرح اس کی سہیلیاں بھی بن بلائے مہمان کی طرح اس فنکشن میں آدھمکی تھیں۔ لڑکیوں نے چوہدری ندیم کے نمبروں کا اعلان سنا تو چوہدری کو مبارک باد دینے کے بجائے آسیہ کو سراہنے لگیں' اس کی ذہانت کی سرگوشیاں کرنے لگیں۔ فنکشن رات گئے اختتام کو پہنچا۔

آسیہ کے حاصل کردہ نمبروں کی بازگشت چوہدری ناصر کے کانوں تک بھی جا پہنچی۔ اس کے گاؤں کے فوجی کی بیٹی نے ٹاٹ پر بیٹھ کر تعلیم حاصل کرکے علاقے کے تمام اسکولوں میں ٹاپ کیا۔ اگلے ہی دن چوہدری کی طرف سے بلاوا آگیا کہ اس بچی سے مجھے ملاؤ جس نے گاؤں میں رہ کر اعلیٰ نمبروں سے میٹرک پاس کیا۔" آسیہ ماں کے ساتھ حویلی پہنچ گئی۔

چوہدری نے اس ہونہار بچی کا انتہائی خوش اخلاقی اور محبت سے استقبال کیا۔ شفقت بھرا ہاتھ سر پر رکھا امتحان میں کامیابی کی مبارک باد دی اور آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں پوچھا۔

آسیہ مستقبل کے بارے میں کیا بتاتی۔ "گھر میں جھاڑو دیتی ہوں' فارغ ہو کر کھیتوں میں چارہ کاٹتی ہوں۔" اور پھر دوپٹے کی اوٹ میں سسکیاں لے کر آنسو بہانے لگی۔

مزید بتایا۔ "گھر کی صفائی کرتی ہوں ایک بھینس دودھ کے لیے پال رکھی ہے اس کے لیے چارہ لانا' گوبر سے تھاپیاں بنا کر بیچنا دھوپ چھاؤں میں باندھنا میری ذمہ داری میں شامل ہے۔"

چوہدری صاحب یہ سنتے ہی رنج کی ندی میں ڈوب گئے۔ اس بچی کو تو ذہین بچوں کی طرح مثالی ہونا چاہئے تھا مگر جانوروں کے ساتھ جانور بن گئی ہے۔ اس کی ذہانت اور صلاحیتوں سے گاؤں کی تمام بچیوں کو استفادہ حاصل کرنا چاہیئے۔ سوچوں کے جوار بھاٹے نے چوہدری کے دماغ میں ہلچل مچادی۔ اس نے اپنی سرپرستی میں بچی کو اعلیٰ تعلیم دلوانے کا فیصلہ کیا۔ ایک غریب بچی کے مقدر سنوارنے اور معاشرے کا باوقار شہری بنانے کا مصمم ارادہ کیا۔ ان جذبات، احساسات اور نوازشات کا جب آسیہ اور اس کی ماں کو پتہ چلا تو خوشی سے نہال ہوگئی اس کے پاؤں زمین پر تک نہیں رہے تھے آسیہ تو خوشی سے فضاؤں میں اڑنے لگی، اسے تو آج قارون کا خزانہ مل گیا تھا جو سنبھالے نہیں جا رہا تھا۔ چوہدری صاحب کی بھرپور کوشش اور مدد سے آسیہ اور ندیم کا ایک ہی کالج میں داخلہ ہوگیا دونوں آگے بڑھنے کی غرض سے سکون کے لمحات بھی تعلیم کے حصول پر صرف کرنے لگے۔

امتحانات کی دوڑ میں کبھی آسیہ آگے ہوتی اور کبھی ندیم۔

"وقت کے گھوڑے پر سوار تھے سفر طے ہونے کا پتہ ہی نہیں چلا۔ بی ایس سی میں فرسٹ اور سیکنڈ پوزیشن پر دونوں قابض تھے۔ تعلیمی تھکاوٹ دور کرنے کے لیے دیگر سرگرمیوں میں بھی مصروف رہتے۔ مسلسل اکٹھے رہنے اور تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے دلوں کے فاصلے بھی قربت میں بدلنے لگے اگرچہ چاہت کے میدان میں دونوں برابر کے حصے دار تھے مگر ان کے مزاج سوچ فکر اور خواہشات میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

چوہدری ندیم آزاد فضاؤں میں شکار کرنے والا عقاب تھا، اڑان کے معاملے میں حدود و قیود سے باغی، صرف مقاصد کے حصول کا متمنی۔ تعلیمی شعور نے دنیا سے آگہی کیا دی وہ تو وطن کی فضاؤں اور سرحدوں کے درمیان گھٹن محسوس کرنے لگا۔

انٹرنیٹ کے ذریعے دیگر ممالک کے لڑکے لڑکیوں سے رابطے میں رہتا، پاکستانی ثقافت کو دقیانوسی اور پرانی تہذیب کا شاخسانہ قرار دیتا، انڈین فلموں کا دیوانہ ان راہوں کو ترقی اور دنیا میں مقام پیدا کرنے کا ذریعہ سمجھتا، فلمی اداکاروں کے اسٹائل اپناتا اور فخر سے دوستوں کو بتاتا۔

آسیہ کو بھی ماڈرن طرز زندگی اپنانے کو کہتا۔ انڈین فلموں کی اداکاراؤں کے اسٹائل اپنانے کو کہتا۔ مختصر کپڑے تراشے بال غیر مردوں کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے لڑکیوں کا سرعام بازاروں میں پھرنا جدت اور شعور قرار دیتا۔ آسیہ ایک مسلمان گھرانے کی بیٹی تھی اس کا ماڈل حضرت فاطمہؓ تھیں ان فضولیات سے اسے سخت نفرت تھی، اس نے آج تک کالج میں سر سے دوپٹہ نہیں اترنے دیا تھا ننگے سر غیر مردوں کے ساتھ پھرنا تو بہت دور کی بات تھی آج تک شہر کے کسی ہوٹل میں چوہدری ندیم کے ساتھ کھانا کھانے نہیں گئی تھی۔ عورت کا زیور اس کے شرم وحیا کو قرار دیتی تھی۔ انڈیا کی فلموں سے اسے سخت نفرت تھی۔

بھارت جس کے شہریوں سیاستدانوں اور پنڈتوں نے 1947ء سے لے کر آج تک پاکستان کو نیچا دکھانے اس کا نقصان کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا تھا اس لیے فلموں اور بھارتی ثقافت کو سخت ناپسند کرتی تھی جب کہ ندیم اس وطن کی فضاؤں اور ثقافت کا شیدائی تھا اسے جمہوری ملک قرار دیتا آزاد ریاست عوام کے حقوق کا تحفظ کرنے والا ترقی یافتہ جدید ملک جس کی فلم انڈسٹری کا ڈنکا پوری دنیا میں بج رہا تھا۔

مگر سرحدوں کے محافظ فوجی جوان کی بیٹی کو یہ سب کچھ ناگوار گزرتا۔ اس کی آنکھوں کے آگے بہتے مظلوم کشمیری مسلمانوں کی فلم چلتی رہتی۔ جنہیں بھارتی درندے گولیوں سے بھون دیتے مگر ان کو پوچھنے والا کوئی نہ تھا جوان عصمتوں کو سر بازار لوٹ لیا جاتا، گائے کا گوشت کھانے پر ہندو بلوائی ٹوٹ پڑتے، مسلمان ہونے کی بنیاد پر کئی شہروں میں داخلہ ممنوع تھا۔ ذوالجناح اور میلادالنبی ﷺ کے جلوسوں پر پابندی تھی، پورے بھارت میں مسلمانوں کی زندگی عذاب بنی ہوئی تھی ہر روز ایک نئی قیامت ڈھادی جاتی خون کی وادی میں نہلانے والے نہتے مسلمانوں کی لاشوں پر رونے والوں پر بھی گاڑیاں چڑھادی جاتی ہیں 1947 سے لے کر آج تک لاکھوں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی جارہی ہے۔ آج تک پوری دنیا سے کسی نے مذمت کے دو الفاظ بولنا بھی گوارا نہیں کیے، بھارت میں مسلمانوں کی زندگی کتنی اجیرن ہے یہ تو جہنم میں زندگی گزارنے والے مسلمان ہی بتا

سکتے ہیں۔ کشمیر جنت نظیر پاکستان کی شاہ رگ اٹوٹ انگ تھا اور رہے گا۔ ایک غاصب کی طرح اس نے کشمیر پر ناجائز قبضہ کر رکھا ہے وہ پاکستان کو کب برداشت کر سکتا ہے۔

تف ہے پاکستانی نوجوانوں پر جو بھارتی فلموں کے شیدائی' اس ثقافت کے چاہنے والے ہیں وطن عزیز کی اشیاء پر دشمن کی ثقافتی یلغار کو ترجیح دیتے ہیں۔ آسیہ جب بھی واہگہ بارڈر پر پرچم اتارنے کی تقریب میں پریڈ دیکھنے جاتی تو رینجرز کے جوانوں کی اک اک ادا پر فدا ہو جاتی' جب کہ ندیم کو سانپ سونگھ جاتا۔

چوہدری ندیم پاکستانی مصنوعات کو انتہائی حقارت سے دیکھتا' جب کہ بھارتی اشیاء بڑے فخر سے استعمال کرتا' ان کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیتا' ملاوٹ سے پاک خالص اشیاء قرار دیتا دیرپا مضبوط اور جدید سمجھتا۔ چکا چوند روشنی کو حقیقی سمجھتا۔

❀ ...... ❀ ...... ❀ ...... ❀

آج زینب کے پاؤں خوشی سے زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ مخمور فضاؤں میں اڑان بھر رہی تھی خوشیوں کی بہاریں منظور کا تار لایا تھا' جس کی فوج کی سروس پوری ہو گئی تھی ٹھیک ایک ماہ بعد ریٹائرڈ ہو کر ہمیشہ کے لیے گھر آ رہا تھا' وصل کی طویل مدت قربت میں بدلنے والی تھی ہمیشہ کے لیے زینب کے سنگ رہنے آ رہا تھا' زندگی کی رہتی ساعتیں اکٹھے گاؤں کے کچے مکان میں ایک دوسرے کے ساتھ گزارنا تھیں۔

پاپا کی آمد پر آسیہ کا انگ انگ خوشی سے ناچ رہا تھا۔ تعلیمی منازل کی کامیابیوں سے ہمکنار ہونے کی خوشی سنانے کے لیے بہت بیقرار تھی امتحانات کی شاندار کامیابی و دیگر سرگرمیوں کی مد میں ملنے والے انعامی کپ' تمغے' شیلڈز' اسناد اور تحائف دکھا کر فخر سے سر بلند کرنا تھا۔ اس نے دن رات کو گھنٹوں اور منٹوں میں تبدیل کر کے انگلیوں پر شمار کرنا شروع کر دیا تھا۔ انتظار کی گھڑیاں ختم ہونے میں صرف دس دن رہ گئے تھے۔ گھنٹوں کی صورت میں دو سو چالیس گھنٹے باقی رہ گئے تھے۔

ہر گزرنے والا گھنٹہ ماں بیٹی کے وصل کو آس امید کے چراغوں میں تبدیل کر رہا تھا' آنکھوں کے انتظار کی گھڑیاں بہت جلد ختم ہونے والی تھیں پھر چند ہی تو گھنٹے رہ گئے تھے۔

''وہ لمحات کتنے حسین ہوں گے جب ابا جان سامان سے بھرے بیگ اور صندوق لائیں گے۔ تو میں سامان کی خوشی کے بجائے گلے لگ کر جدائی کی پیاس خوب بجھاؤں گی' اس وقت تک جدا نہیں ہوں گی جب تک میری ریجھ نہیں اترے گی۔

ایسی کتنی ہی خیالی باتیں باپ سے کر کے دل کا بوجھ ہلکا کرتی رہتی۔ ماں بیٹی نے کتنے ہی رنگ آنکھوں میں سجا رکھے تھے۔ خیالوں میں روزانہ تاج محل تعمیر کرتیں۔

❀ ...... ❀ ...... ❀ ...... ❀

منظور تو اب ادائیگی فرائض کی مدت پوری کر چکا تھا۔ اس کے ساتھی آج بھی پہاڑوں کے درمیان بنی چوکی پر ڈیوٹی سرانجام دے رہے تھے۔ وہ آج آخری باران کو ملنے جا رہا تھا۔ آج کی شام اپنے پرانے دوستوں کے سنگ گزار کر یادگار بنانا چاہتا تھا۔ پھر کب ان گھڑیوں نے واپس لوٹ کر آنا تھا۔

خیالات کے تانے بانے بنتا چوکی پر پہنچ گیا۔ تمام دوست خوب گلے ملے' اس آخری ملاقات کو سہانا بنایا گیا۔ یادوں کے کتنے ہی دریچوں کے در وا ہو گئے۔ خوش گپیوں میں وقت گزرنے کا پتہ بھی نہ چلا۔

''محبتوں کے سفیر' مادر وطن کے غیور بیٹے یادوں کی ڈوری میں الجھے ہوئے تھے کہ اچانک دہشت گردوں کی طرف سے راکٹ داغے گئے' گولے پھینک کر چوکی کو نشانہ بنایا گیا۔ چند لمحات قبل زندگی کی رعنائیوں سے چمکتے چہرے موت کی وادی میں پہنچ گئے' ہنستے مسکراتے چہرے ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئے' یادوں کو دہرانے والے خود یاد بن گئے۔ مادر وطن کے بیٹے شہید ہو کر اپنی ذمہ داریوں کو نبھا گئے۔ اپنے لہو سے وطن کے سرسبز و شاداب محبت و پیار کے پودوں کو سیراب کر گئے۔

ظالم دہشت گردوں نے خوشیوں کے ترانے بجانے والے گھروں کو ماتم کدے میں بدل دیا تھا۔ موت کی وادی کے مسافر اپنے ہم وطنوں کو زندگی کا پیغام دے گئے۔ ان شہیدوں کے لاشے جب گھروں میں پہنچے تو کہرام مچ گیا۔ منظور کے گھر والے تنکا تنکا چن کر اپنے خوابوں کو

حقیقت کے محل میں سجا چکے تھے جب اس کا جسد خاکی گھر پہنچا تو بھونچال آ گیا۔

آسیہ اور زینب پر سکتے کی کیفیت طاری ہو گئی۔ رونے کے بجائے کبھی شہید کے جسم کو، کبھی لوگوں کے چہروں کو دیکھتیں۔

ہوش میں آتے ہی آنسوؤں کا ساون بھادو برسنے لگا۔ بین دلوں کو ریزہ ریزہ کرنے لگے۔ آسیہ جب باپ کی لاش پر لپٹ کر دھاڑیں مارنے لگی تو ہر دل اور ہر آنکھ رونے پر مجبور ہو گیا۔ باپ نے لاش سے کتنے ہی شکوے کر ڈالے۔

حبیب بھی باپ کی شہادت پر چھٹی لے کر آیا تھا۔ کفن دفن سے لے کر ختم کی رسم تک تمام فرائض اپنے ہاتھوں سے سرانجام دیئے تھے۔

مرنے والوں کے ساتھ کب مرا جاتا ہے۔ اس شہید خاندان کا جدائی کا زخم بھی مندمل ہونے لگا۔ اس شمع کو اب حبیب نے اپنے خون سے روشن کرنا تھا۔ اس دیار کی آبیاری خون جگر سے کرنی تھی۔ دہشت گردوں کے خلاف آپریشن تیز کر دیا گیا تھا۔

پاک آرمی کے سربراہ جناب راحیل شریف نے غیور بیٹوں کو پیغام دیا۔

"دہشت گردوں کا پیچھا موت کی دیوار تک کرنا ہے' ان کے عزائم کو خاک میں ملانا ہے۔ اس دھرتی کو دہشت گردوں کے پلید سائے سے محفوظ کرنا ہے۔ جان سے گزر جانا ہے مگر اس دھرتی کی حرمت پہ آنچ نہیں آنے دینی"۔

پرجوش خطاب نے جوانوں کے جذبے ہمالیہ سے بھی بلند کر دیئے تھے۔ موت کی خواہش لیے جوان دہشت گردوں پر ٹوٹ پڑے تھے۔

جس علاقے میں چوکی کو نشانہ بنایا گیا تھا اس کے اردگرد سرچ آپریشن کر کے کتنے ہی جوانوں کی دن رات کی محنت رنگ لائی۔ وہ ایک دن حملہ کرنے والے دہشت گردوں کے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔

لاؤڈ اسپیکر پر اعلان کر کے ہتھیار ڈالنے کے لیے کہا گیا لیکن انہوں نے فائرنگ کر دی۔ جوانوں کی جوابی فائرنگ سے کتنے ہی دہشت گرد مارے گئے۔ بچ جانے والے ہتھیار پھینک کر ہاتھ بلند کیے سامنے آ گئے ان کو گرفتار کر لیا

جھوٹے انسان کی نشانیاں

- جھوٹ بولنے والا نظر نہیں ملاتا۔
- پلکیں زیادہ جھپکاتا ہے۔
- اس کی آنکھوں کی پتلیاں ذرا پھیلی ہوتی ہیں۔
- وہ اچانک بات شروع کرتا ہے اور جلد از جلد ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے اور سوالات سے کتراتا ہے۔
- آپ کی توجہ ہٹانے کے لیے وہ آپ کے سوال کے جواب میں بھی ایک سوال کر دے گا۔
- اس کی آواز خوامخواہ تیز ہو جائے گی۔
- بات کرتے وقت ہاتھ ملے گا انگلیاں چٹخائے گا۔
- چہرے پر ہاتھ پھیرے گا یا کسی چیز کو کھٹکھٹائے گا۔

مشی خان...... مانسہرہ

پیاری بات

زندگی کے نشیب و فراز میں بعض اوقات ایسے لمحات بھی آتے ہیں کہ انسان بالکل ناامید ہو جاتا ہے اور اسے اپنے اطراف میں اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے اس میں مقابلے کی سکت ختم ہو جاتی ہے اور یہ بات انسان کی عظمت کے خلاف ہے اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات قرار دیا ہے دنیا میں جتنی قوموں نے بھی ترقی کی ہے وہ سب اسی عزم و ہمت کا نتیجہ ہے جو اللہ نے انسان کو عطا کی ہے اس لیے انسان کو چاہیے کہ کبھی حوصلہ نہ ہارے بلکہ ہمت سے کام لے اور مردانہ وار ناکامیوں کا سامنا کرے ساتھ ہی اللہ سے بے پناہ رحمت اور اس کی بخشش پر یقین رکھے، ان شاء اللہ ایسا انسان کبھی ناکام نہیں ہوگا۔

ام کلثوم...... بہاولنگر

گیا۔ تفتیش کرنے پر معلوم ہوا۔

یہ لوگ بھارت سے باقاعدہ تربیت حاصل کرکے آئے تھے ان کے پاس جدید ہتھیار تھے۔ مورچوں کی تلاشی لی گئی تو کھانے پینے کی تمام اشیاء بھارتی مصنوعات تھیں۔ چائے پتی' دودھ کے ڈبے' ڈبل روٹیاں وغیرہ سب بھارتی تھیں جن پر مختلف کمپنیوں کے نام کندہ تھے۔

گرفتار دہشت گردوں کو میڈیا پر دکھایا گیا ان کے مذموم مقاصد انہیں کی زبانی سنائے گئے۔ ان کا مقصد ایک ہی تھا پاک وطن کی بنیادوں کو کمزور کرنا۔

ٹی وی پر خبروں کے درمیان یہ جھلکیاں دیکھنے پر آسیہ کا غصہ آسمان کو چھونے لگا۔ ان ظالم درندوں نے کتنے گھروں کے چراغ گل کردیئے تھے کتنے معصوم شہریوں کے خون سے ہولی کھیلی تھی۔

❀ …… ❀ …… ❀ …… ❀

زینب بیوہ ہوچکی تھی۔ آسیہ کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ چکا تھا۔ چوہدری ناصران مصائب کی گھڑیوں میں ابر رحمت بن کر برس رہا تھا۔ دل جوئی تسلی۔ امداد کے لیے ہر ممکن اقدامات کیے اور پھر اس گھر کے دکھوں کو سمیٹنے کا ایک عجیب فیصلہ کیا۔

بے شک زینب' آسیہ اور حبیب کی حیثیت چوہدری کے مقابلے میں کچھ بھی نہ تھی مگر آسیہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی تھی۔ سوجھ بوجھ' اعلیٰ ذوق اور فہم و ادراک کی مالک تھی۔ تعلیم کے زیور سے مالا مال اور یہ سب چوہدری کی مرہون منت تھا۔

اس قیمتی دمکتے ہیرے کو چوہدری ہمیشہ کے لیے اپنی حویلی کی زینت بنانا چاہتا تھا۔ اس مقصد کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ایک شام زینب کے گھر جاکر اپنے بیٹے ندیم کے لیے آسیہ کا رشتہ مانگا۔

ماں جوان بیٹی کی وجہ سے سخت پریشان تھی' باپ قبر میں جا سویا تھا۔ بھائی گھر سے دور وطن کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے دشمن سے برسر پیکار تھا۔

ساری رات جاگ کر بیٹی کی عزت کی چوکیداری کرتی تھی۔ کوئی نیکی کام آگئی تھی جس کی وجہ سے یہ پریشانی ختم ہونے والی تھی۔ بیٹے سے مشورہ کرنے کے بعد چوہدری کو ہاں کردی۔ بیٹی کی حد تک تو مطمئن ہوگئی تھی بیٹے کا سبب بھی رب نے بنادیا تھا۔

ماں کے ساتھ بیٹا بھی اس خوش خبری کو سن کر بہت خوش ہوا تھا۔ وہ بھی بہن کی وجہ سے پریشان رہتا تھا لیکن محاذ پر ملک دشمن عناصر سے برسر پیکار رہنے کی وجہ سے اسے سوچنے کا کم ہی موقع ملتا تھا۔

باپ کی شہادت نے حبیب کے جذبے کو جلا بخشی تھی۔ وطن دشمن عناصر کو کھوج کھوج کر نکالنا' ان کی مکروہ سرگرمیوں کی بیخ کنی کرنا۔ اپنے ایمان کا حصہ سمجھ رکھا تھا۔ وہ تو اب خطروں کا کھلاڑی بن چکا تھا۔ دہشت گردوں کی تلاش میں پیش پیش ہوتا۔ کئی آپریشنوں کے دوران "را" کے ایجنٹ پکڑے۔ "را" کی بڑھتی سرگرمیوں کی وجہ سے اس کے اندر نفرت کا تندور تپنے لگا۔

"ماں! میں اس دھرتی کا مقروض بیٹا ہوں۔ سرحدوں پر گھات لگائے دشمن تیرے پاک وطن کے امن وسکون کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں پتہ نہیں کب دھرتی ماں کی حرمت کی پاسداری کے لیے میری جان کی ضرورت پڑ جائے۔ آپ جلد از جلد آسیہ کی شادی پکی کردیں۔ میں آپ کی خوشیوں کو دوبالا دیکھنا چاہتا ہوں۔ ابو کی شہادت کے بعد آج تک میں نے آپ کو خوش نہیں دیکھا۔ جوان بیٹی کے فرض سے سبکدوش ہوکر ابو سے کیا وعدہ پورا کریں۔ ہماری پریشانیاں ختم ہوجائیں گی۔ میں سکون کے ساتھ اپنے فرائض سرانجام دے سکوں گا۔" یہ خط میں لکھ کر گاؤں کے پتے پر ماں کو بھیج دیا۔

❀ …… ❀ …… ❀ …… ❀

ماں بیٹے کے خط کو پاکر بہت خوش ہوئی' تمام صورت حال چوہدری کے گوش گزار کی تو گویا وہ پہلے ہی اسی انتظار میں تھا۔ صلاح مشورے سے دن مقرر کرنے کے بعد حبیب کو اطلاع بھیج دی گئی۔ اطلاع پاتے ہی حبیب بہت خوش ہوا اور تیاریوں میں لگ گیا۔ اب کی بار تنخواہ گھر بھیجنے کے بجائے باڑہ مارکیٹ پشاور چلا گیا۔ اعلیٰ معیار کی نایاب قیمتی اشیاء خریدیں۔ اب اس کو متعلقہ تاریخ کا شدت سے انتظار تھا۔

❀ …… ❀ …… ❀ …… ❀

ایک صبح دہشت گردوں نے فوجی اسلحہ ڈپو اور بڈھ بیرا ایئرپورٹ پر فوجی وردیوں میں ملبوس ہو کر حملہ کردیا۔

حبیب کی ڈیوٹی ختم ہونے میں ابھی آدھا گھنٹہ باقی تھا کہ علاقہ زوردار دھماکوں سے گونج اٹھا۔ ہر طرف دھواں ہی دھواں تھا۔ دھوئیں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دہشت گردوں نے اسلحہ ڈپو کی طرف بڑھنا شروع کردیا۔ مگر غیرت مند جوان تو جیسے ان کے منتظر تھے ان سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے تیار ہوگئے۔

دھوئیں کے بادلوں کی اوٹ سے دہشت گرد جونہی ڈپو کے دروازے پر متعین جوانوں کی نظر میں آئے۔ انہوں نے ان پر گولیوں کی بارش کرکے قیامت ڈھادی۔

بہت سے دہشت گردوں کی زندگی کے چراغ ہمیشہ کے لیے گل ہوگئے لیکن شاید وہ ہر صورت نقصان کرنے کا تہیہ کرکے آئے تھے۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ کے درمیان اسلحہ ڈپو کی طرف دوڑ لگادی۔ خودکش جیکٹوں کی سیفٹی پنیں نکال کر دھماکے کرنے شروع کردیئے۔ ہر طرف آگ کا کھیل شروع ہوگیا۔

وطن دشمن عناصر خود تو جہنم واصل ہوئے ساتھ ہی ڈیوٹی سرانجام دینے والے جوان بھی دھماکوں کی زد میں آگئے۔ مگر انہوں نے جان پر کھیل کر دشمن کے مذموم ارادوں کو خاک میں ملادیا۔ اسلحہ ڈپو کے سامنے فولاد کی دیوار ثابت ہوئے۔ ڈپو سے دور ہی دشمن کو جہنم کا ایندھن بنادیا اور جام شہادت نوش کرکے وطن کا قرض چکا گئے۔

خود تو جان سے گزر گئے مگر بہت سی جانوں کو تحفظ کے حصار میں محفوظ کرگئے۔ لہو سے وطن عزیز کے کروڑوں در و دیوار پر سجائے زندگی کے چراغ روشن کرگئے۔

❁ …… ❁ …… ❁ …… ❁

حبیب باپ کی طرح دھرتی کا قرض چکا کر سرخرو ہوگیا تھا۔ وطن کی فضاؤں کو اپنے جیون کے مہکتے پھولوں سے معطر کرچکا تھا۔ اس دھرتی کے مان کی لاج رکھ کر ملک کا سر فخر سے بلند کردیا تھا۔

زینب اور آسیہ ایک دفعہ پھر شہید کی وارث بن گئی تھیں۔ ان کے ہر دل عزیز پیارے حبیب نے وطن کی آن پر قربان ہونے کا شرف حاصل کرلیا تھا۔ اٹھتی جوانی کی امانت واپس دھرتی ماں کو لوٹادی تھی۔ شہداء کی جدائی نے آسیہ اور زینب کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ان غمگین اوقات میں چوہدری نے ان کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ آخرکار سنبھلتے سنبھلتے ایک دفعہ پھر زندگی کی طرف لوٹ آئیں۔

❁ …… ❁ …… ❁ …… ❁

آخر کار وہ دن بھی آپہنچا جس دن آسیہ اور ندیم رشتہ ازدواج میں منسلک ہوگئے۔ چوہدری ندیم آسیہ کے سر کا تاج، ماتھے کا جھومر، سپنوں کا راجہ، چاہتوں کا امین اور زندگی کی نگری کا بادشاہ تھا۔

اگرچہ آسیہ باپ اور بھائی کی جدائی کو نہیں بھولی تھی۔ ان کی یاد میں آنسو بہانے پر مجبور کردیتی۔ مگر ندیم کو بھرپور پیار کا موقع دیتی اس کی خواہشات اور ضروریات کا خیال رکھتی۔ کبھی شکوے کا موقع نہ دیا اس کی خوشی میں خوش تھی۔

وقت کی پگڈنڈی پر زندگی کی گاڑی ہچکولے کھاتی جارہی تھی۔ آسیہ کے دل میں بھائی اور باپ کی قربانی کے چراغ جل رہے تھے۔

دہشت گردوں کی روح فرسا کارروائی آسیہ کو خون کے آنسو رلاتی۔ اس کا خون کھولنے لگتا۔ انسانیت کے دشمنوں سے نبٹنے کے لیے بہت سے پلان ذہن میں ترتیب دیتی۔

❁ …… ❁ …… ❁ …… ❁

چوہدری ندیم اب ذمے دار شہری بن چکا تھا۔ اس کی تعلیمی سوجھ بوجھ پر روپے پیسے کی چھاؤں نے اندھیرا کر رکھا تھا۔ منہ میں سونے کا چمچ لے کر پیدا ہونے والے کو دھن کے آنے کی خبر ہی نہ تھی۔ بے رحم انسانوں کی طرح دولت دونوں ہاتھوں سے لٹا رہا تھا۔

ایسے دولت مند نوجوانوں کے اردگرد نالائق دوستوں کی فوج ظفر موج ہوتی ہے جو دولت کے بل بوتے پر عیاشیوں کے مزے لوٹتے ہیں۔

چوہدری ندیم بھی ایسے ہی ناعاقبت اندیش دوستوں کے نرغے میں تھا۔ جو اسی کی طرح آزاد خیال، دین و دنیا سے نابلد، عزت قوم وطن کے معنی نہیں جانتے تھے۔ صرف روپے پیسے کی زبان سمجھتے تھے وہی ان کا دین ایمان، گھربار اور وطن تھا۔ ان لوگوں کی زندگی کا مقصد کھاؤ پیو مزے اڑاؤ تھا۔ سو اس مقصد کو پروان چڑھانے کے لیے ندیم کے ہاں

ہی ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔

آئے روز پارٹیاں منعقد کی جاتیں اس دوران انڈیا گانوں پر ڈانس ہوتے۔ فاحشہ خواتین کو مدعو کیا جاتا۔ انڈین گانوں پر ناچ کے مقابلے کروائے جاتے۔

انڈیا کی آنے والی ہر نئی فلم سینما گھروں کی زینت بننے سے قبل چوہدری ندیم کے ڈرائنگ روم میں پہنچ جاتی۔ ڈرائنگ روم کی دیواروں کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ایک دیوار پر انڈین خواتین فنکاراؤں کی تصاویر چسپاں تھیں جب کہ دوسری دیوار پر مرد فنکاروں کی بڑی بڑی تصاویر آویزاں تھیں۔ تیسری دیوار گلوکاروں کی تصاویر سے مزین تھی اور چوتھی دیوار پر انڈیا کے سیاست دانوں کی دیوہیکل تصاویر تھیں۔

آسیہ جب بھی ڈرائنگ روم میں آتی اس کی سانس تھمنے لگتیں۔ دم گھٹنے لگتا۔ آنکھوں میں خون اتر آتا۔ نفرت سے چہرہ لال سرخ ہو جاتا۔ مگر وہ مجبور تھی بے شک یہ اس کا گھر تھا مگر اس کے پاس اتنے اختیارات نہ تھے کہ وہ ان تصاویر کو اتروا سکتی۔

ندیم کیسا پاکستانی تھا۔ جس کا اوڑھنا بچھونا انڈیا کے گیت، فلمیں اور اداکاروں کی تصاویر اور ان کے انداز اپنانا تھا۔

آئے روز اخبارات اور نیوز چینل خبریں دکھا رہے تھے کہ انڈین آرمی نے پاک سرحدوں کو اپنی وحشیانہ کارروائیوں کا نشانہ بنا رکھا تھا۔ بہت سے معصوم شہری شہید اور زخمی ہو رہے تھے، کشمیری نوجوانوں پر زندگی تنگ کر دی گئی تھی ۔ آئے روز گولیوں کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ زخمی جوانوں کو اٹھانے والی ایمبولینس پر گولیاں برسائی جاتیں۔ خواتین کو زدوکوب کیا جاتا۔ گاجر مولی کی طرح جوانوں کو کاٹا جا رہا تھا۔ عزتوں کے جنازے اٹھ رہے تھے۔ آئے روز کرفیو لگا کر نوجوانوں کو گرفتار کر کے جیلیں بھری جا رہی تھیں۔

انڈیا کے تھنک ٹینکوں نے پاکستانی نوجوان کو ذہنی طور پر مفلوج کر کے ثقافتی بے حیائی کے دریا کا رخ پاکستان کی طرف موڑ دیا تھا۔ اس میٹھے زہر نے کتنے ہی نوجوانوں کو اندر ہی اندر انڈیا کا ہمدرد بنا رکھا تھا۔

آسیہ سخت پریشان تھی۔ کئی بار میاں بیوی میں جھگڑا بھی ہوا۔ آسیہ نے غصے میں آ کر کئی فلموں کی سی ڈیز کو جلا دیا تھا۔ ڈرائنگ روم کی دیواروں کو رنگ کرنے کے بہانے تمام اداکاروں اور دیگر تصاویر کو اتار کر آگ لگا دی تھی۔ ندیم اب کم ہی دوستوں کو مدعو کرتا۔ گھریلو ماحول خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔

آسیہ کو فوجی جوان بہت پسند تھے۔ خبروں کے دوران جب بھی فوجی جوانوں کی سرگرمیوں کی جھلکیاں دکھائی جاتیں۔ اس کا سر فخر سے بلند ہو جاتا، عقیدت سے آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ بے اختیار ہاتھ اٹھا کر ان کو سیلوٹ کرتی۔ عمر درازی اور کامیابی کی دعائیں مانگتی۔

* * *

ایک نیوز چینل پر **14 August** کو واہگہ بارڈر پر پرچم اتارنے کی تقریب براہ راست دکھائی جا رہی تھی۔

آسیہ کا انگ انگ خوشی سے سرشار تھا۔ چہرے پر نور کی بارش ہونے لگی۔ تالیاں بجا کر فوجی جوانوں کو دل کھول کر داد دے رہی تھی۔

ندیم کے ساتھ رات کو تقریب کے موضوع پر خوب بحث ہوئی۔ آسیہ نے بڑھ چڑھ کر جوانوں کی تعریف کی۔ ان کی پریڈ کو سراہا۔ شہیدوں جیسی گرج کی پذیرائی کی، جذبوں کو سراہا، نعروں کی گونج کو شیروں کی للکار قرار دیا۔ اس کے برعکس ندیم کے پاس تعریف کے لیے کچھ نہ تھا۔ انڈیا کے فوجیوں کی ہرزہ سرائی بھی تکلیف دہ ثابت ہو رہی تھی۔

آسیہ دھرتی کے عظیم محافظوں کو بنفس نفیس جیتی جاگتی آنکھوں سے دیکھنا چاہتی تھی۔ اس بارے میں ندیم پر زور دینا شروع کر دیا کہ گنڈا سنگھ بارڈر کی پرچم کشائی کی تقریب میں شمولیت کی جائے۔ کافی دنوں سے ٹال مٹول کے بعد ایک اتوار کو گنڈا سنگھ بارڈر پہنچ گئے۔

چوہدری ندیم بڑا آدمی تھا، تقریب میں اسے خصوصی پروٹوکول دیا گیا اور بھی بڑے لوگ آئے ہوئے تھے ان سبھی کو وی آئی پی لاؤنج میں بٹھایا گیا۔ خصوصی کرسیاں لگائی گئی تھیں۔

جونہی پرچم اتارنے کی تقریب شروع ہوئی۔ دونوں ملکوں کے جوان میدان میں اترے۔

پاکستانی شیروں نے زمین پر ایڑیاں مار مار کر گویا زلزلہ برپا کر دیا۔ درودیوار ہلا کر رکھ دیئے۔ غیرت سے اکڑی گردن، بازو وطن کی محبت پر کٹنے کے لیے تلوار کی طرح تیز اور نوکیلی آنکھوں میں عقاب کی سی تیزی، چہرے غیرت سے دمک رہے تھے۔ سروں پر عزت و وقار کے طغرے سجائے، سینے چٹانوں کی طرح سخت، آواز میں شیر کی گرج اور پاؤں کی دھمک گویا پاتال تک زمین کو لرزا رہی تھی۔

جب بھی انڈیا کا فوجی پریڈ کے لیے آتا، سب بھارتی لوگ کرسیوں سے اٹھ کر ان کا استقبال کرتے، تالیاں بجا کر حوصلہ افزائی کرتے، جب کہ جب پاکستان رینجر کا شیر میدان میں اترتا وی آئی پی حضرات بالکل خاموش بیٹھے رہتے جب کہ جن لوگوں کو حقارت اور غربت کی وجہ سے کھڑا ہونے کے لیے بھی مشکل سے اجازت دی گئی تھی یہ مفلوک الحال لوگ تالیاں بجا بجا کر زمین و آسمان ایک کر دیتے۔ جذبات کی رو میں بہہ کر پاکستان پائندہ باد کے نعروں سے اوج ثریا تک تہلکہ مچا دیتے۔

وی آئی پی حضرات کی کرسیوں سے صرف آسیہ واحد پاکستانی تھی جو ہر آنے والے پاک رینجر کے جوان کا اٹھ کر بھرپور انداز میں تالیاں بجا کر استقبال کرتی۔ نعروں سے کرسیوں میں ہلچل مچا دیتی۔ اس کے ساتھ پیچھے کھڑے عام شہری نعروں اور تالیوں کی گونج سے ماحول ولولہ انگیز بن گیا تھا۔

پریڈ کے دوران ایک عجیب واقعہ ہو گیا۔ جونہی انڈیا بی ایس ایف کے دو فوجی اپنے عوام کی تالیوں کی گونج میں میدان میں اترے پانچ سات قدم ہی پریڈ کی تھی کہ فوجی پھسلنے کی وجہ سے منہ کے بل دھڑام سے گرا، اتنا دیکھنا تھا کہ پاکستانی شائقین کے منہ سے ہنسی کے فوارے پھوٹ پڑے، تالیوں کی گونج سے آسمان میں شور مچ گیا۔

یہ دیکھنا تھا کہ آسیہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی، کرسی پر کھڑی ہو گئی، پاکستان زندہ باد کے نعرے لگانے لگی۔ تالیاں بجا بجا کر ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو خون کی طرح سرخ کر لیا اس دوران کھڑے پاکستانیوں نے آسیہ کا بھرپور ساتھ دیا۔ نعروں کی گڑگڑاہٹ سے بارڈر کی چولیں ہلا دیں۔ انڈیا کے فوجی اور مہمان منہ چھپا کر خفت مٹانے لگے۔

چوہدری ندیم نے آسیہ کے جذبات ٹھنڈے کرنے اور اسے بٹھانے کی ہر ممکن کوشش کی مگر لگتا تھا جیسے آج آسیہ کی آنکھوں کے سامنے اس کے باپ اور بھائی کے قاتل کھڑے ہوں اور وہ ان کو کچا چبا جانا چاہتی ہو۔ ہر آنے والا لمحہ اس کے جذبات کو اور بھڑکا دیتا۔ آنکھوں میں خوشی کے آنسو اور آواز میں چنگھاڑ کی سی تیزی آ گئی تھی۔ عام لوگوں کے جذبات بھی قابل دید تھے۔ آسیہ کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے نعروں سے ماحول گرما رکھا تھا۔

لگتا تھا جیسے فوجی کو انہوں نے مار گرایا ہو۔ جب کہ ندیم سخت غصے میں تھا، بڑی ہزیمت اور شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔ مگر مجبور تھا اتنے محب وطن پاکستانیوں کے سامنے خاموش رہنے پر مجبور تھا۔ بڑی مشکل سے خود کو کنٹرول کیا۔ تقریب اختتام کو پہنچی یہ لوگ بھی گھر کو روانہ ہوئے۔ گھر پہنچتے ہی ڈرائنگ روم میں کمپیوٹر میں انڈین فلم لگائی اسپیکر آسیہ کے کمرے کے دروازے پر رکھ دیا۔ آواز فل کر دی اور گانے پر سر دھنے کے ساتھ بے ہنگم ڈانس کرنے لگا۔ گانے اور ڈائیلاگ بلند آواز میں یوں بج رہے تھے جیسے شادی والا گھر ہو۔

* * *

ندیم کا معمول بن گیا تھا اونچی آواز میں انڈیا کے گانے سننا اور بے ہنگم ڈانس کرنا۔ جب بھی آسیہ کو خوش گوار موڈ میں دیکھتا، انڈین ثقافت، اداکاروں، فلموں اور سیاست دانوں کی تعریفیں کرنا شروع کر دیتا۔

آسیہ اب امید سے تھی۔ انتہائی سست اور سہل پسند ہو گئی ہر وقت خوش رہتی، جھگڑے سے ہر ممکن اجتناب کرتی لیکن ندیم اسے تنگ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا۔ تکلیف دہ حالت ہونے کے باوجود ایک دن اس کا پارہ چڑھ گیا۔ ندیم پر یوں غصہ نکالا۔

”اگر تم کو انڈیا سے اتنی ہی محبت ہے تو وہاں چلے کیوں نہیں جاتے۔ وہیں مستقل بسیرا کر لو۔ ڈانس کرو، گیت سنو، فلمیں دیکھو، ثقافت اپناؤ، گائے کا گوشت کھانے کے بجائے اس کی پوجا کرو۔ شلوار کے بجائے دھوتی باندھو۔ ماتھے پر کلنگ لگاؤ، بتوں کی مورتیوں کو پرنام کرو، انڈین آرمی کے ساتھ معصوم کشمیریوں کا قتل عام کرو، سرحدوں کے قریب

بسنے والے پاکستانیوں پر گولے برساؤ' مسلمان بہو بیٹیوں کی عزت سے کھیلو' معصوم بچوں کے خون سے ہولی کھیلو' دوشیزاؤں کے سروں سے دوپٹے اتاردو' ماؤں سے بیٹے' بچوں سے باپ' بہنوں سے بھائی' بوڑھے بزرگوں سے برھاپا کا سہارا چھینو' گنگا جمنا جاؤ' ہندوؤں کی جلتی لاشوں پر تیل ڈالو' کٹورے میں خاک ڈال کر دریا کی لہروں کے حوالے کرو' ان خدمات کے عوض بھارتی ہندو اور ان کے بھگوان شاید تم سے راضی ہو جائیں۔"

"لیکن یاد رکھو! اس مقدس معطر' پاکیزہ' حرمت والی' کلمہ کی بنیاد والی دھرتی' اولیا اللہ کی سرزمین' شرم وحیا کی ردا والی' غیرتوں کی ترجمان' دنیائے عالم کے مسلمانوں کے مان پاکستان کی سرزمین اپنی گھٹیا حرکات' سوچ وفکر' قول وفعل' وطن دشمن سرگرمیوں' نفرت انگیز طرز عمل سے مکدر نہ بناؤ۔"

وطن پرستی سے بھرپور جذبات کی آئینہ دار تقریر کو سنتے ہی چوہدری ندیم کا غصہ انتہا کو پہنچ گیا۔ سخت غصے سے آسیہ کو مخاطب ہو کر کہا۔

"میرے علاوہ اس دنیا میں تمہارا کوئی سہارا نہیں' تمہارا بھائی اور باپ منوں مٹی تلے سو چکے ہیں۔ تم ایک خوشحال زندگی گزار رہی ہو۔ میری نفسیات کو اچھی طرح جانتی ہو۔ اگر تم نے میری سوچ' فکر اور طرز زندگی کو زک پہنچانے کی کوشش کی تو تم کو اس گھر سے دھکے دے کر نکال دوں گا۔ طلاق کا کلنک تمہارے ماتھے کی زینت ہوگا۔ لوگ تم سے نفرت کریں گے' طلاق یافتہ کا طعنہ دیں گے۔ ماں بننے والی ہو ہوش کے ناخن لو۔ تمہیں گھر اور آرام کی ضرورت ہے اپنے سکھ سے پیار کرو زندگی کو کانٹوں کی سیج نہ بناؤ۔ وطن پرستی کے دعوے اور نعرے ذرا کم ہی لگایا کرو۔"

"ایک میں ہی نہیں بہت سے پاکستانیوں کا مفاد انڈیا سے وابستہ ہے' پورے ملک میں کون سا گھر ہے' جس میں ٹی وی ہو اور انڈیا کی فلم اور ڈرامے نہ دیکھے جاتے ہوں۔ لاکھوں لوگ پان کے کاروبار سے وابستہ ہیں' ہر شہر گاؤں کی ویڈیو دکانیں انڈین فلموں سے بھری پڑی ہیں۔ ہر روز کروڑوں کا کاروبار ہو رہا ہے۔ ہم لوگ بھی انہیں سی ڈیز کی آڑ میں لاکھوں کا کاروبار کر رہے ہیں۔ لوگوں کو انڈین فلموں کی طرف مائل کرنے کے لیے انہیں یہ پہلے مفت دکھائی پڑتی ہے' چھالیہ' پان' گٹکا سب انڈیا سے آ رہا ہے۔"

"تمہیں تو وطن پرستی کا بخار ہے مگر اس ملک کے کتنے گلوکار ہیں جو اس دھرتی پر امن سے رہ رہے ہیں۔ یہاں رہتے کھاتے پیتے عیاشی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ جب بھی ان کو کسی پروگرام میں شرکت کرنے کی دعوت دیتے ہیں تو لاکھوں روپے لے کر پروگرام کرتے ہیں۔ اداکاروں کی لاکھوں کی ڈیمانڈ ہے شوز کرنے کی مگر یہی لوگ انڈیا بڑے فخر سے جاتے ہیں وہاں پروگراموں میں شرکت کرتے ہیں' جذبات میں آ کر ان شائقین کو پاکستانی شائقین پر ترجیح دیتے ہیں۔ انہیں تو نہ کوئی برا کہتا ہے نہ ہی غدار وطن کہلاتے ہیں بلکہ انہیں تو اعلیٰ اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ امن کے سفیر کے القابات دیئے جاتے ہیں۔ وہ لوگ انڈیا کے بجائے پاکستانی کے اندر ہی پروگرام کر کے اس ملک کا نام روشن کیوں نہیں کرتے۔ کتنے ہی گلوکار' اداکار انڈیا گئے ان کے پروگرام بند کروائے گئے' شوز پر پابندی لگوائی گئی' ایئرپورٹ پر انہیں ذلیل وخوار کیا گیا مگر پھر بھی وہ لوگ انڈیا جا کر پروگرام کرنا فخر سمجھتے ہیں۔ اس ملک کے سننے والوں کو اپنا اثاثہ سمجھتے ہیں۔ اب خود فیصلہ کرو اگر کاروبار کی وجہ سے تھوڑا بہت میرا مفاد وابستہ ہے تو اس میں مضائقہ ہی کیا ہے۔"

* * *

آسیہ سخت کرب میں مبتلا تھی' ندیم نے جو باتیں کہیں وہ کافی حد تک حقیقت پر مبنی تھیں۔ مگر اس کے بھائی اور باپ کی شہادت بھی بھارتی ریشہ دوانیوں کا نتیجہ تھی' کشمیر میں روزانہ جنازے بھارتی سورماؤں کے ہاتھوں شہید ہونے والوں کے اٹھ رہے تھے۔ سیالکوٹ باؤنڈری پر آئے روز خلاف ورزی ہو رہی تھی' فاٹا سے انڈین جاسوس' ایجنٹ اور سہولت کار پکڑے جا رہے تھے۔ یہ ایسے حقائق تھے جن کو جھٹلانا آسان نہ تھا۔

اگر چند دولت کے پجاری حریص اداکار' گلوکار انڈیا جا کر پیسوں کے عوض ذلیل خوار ہو رہے تھے تو اسے پوری قوم کی آواز نہیں کہا جا سکتا تھا۔

* * *

چوہدری ناصر اپنے مزارع کے ساتھ سرحدی گاؤں میں واقع رقبے میں نیچی دھان کی فصل دیکھنے گیا۔ دور دور تک

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

مونجی کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ بہت سے مزدور دھان کے پودے لوہے کے ڈرم پر مار کر مونجی الگ کر رہے تھے۔ ہر طرف مونجی کے ڈھیر اور دھان کے کھیت نظر آ رہے تھے۔ مونجی کے ڈھیر دیکھ کر چوہدری ناصر کا دل خوش ہو گیا۔ کام کرنے والے مزدور جھک کر سلام کر رہے تھے۔

لہلہاتے کھیتوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے چلتے چلتے کتنا ہی فاصلہ طے ہو گیا۔ پتہ اس وقت چلا جب چوہدری کھیتوں کی پگڈنڈیوں کو عبور کرتے ہوئے ورکنگ باؤنڈری سے پار چلا گیا۔ ادھر بھی دھان کے کھیت تھے درمیان میں باڑھ وغیرہ نہیں تھی اس لیے سرحد عبور کرنے کا پتہ ہی نہ چلا۔

سامنے کھیت میں دو سکھوں کو کام کرتے دیکھ کر چوہدری کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ سرحد کا خیال آتے ہی اس کے ہوش اڑ گئے۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ واپسی کے راستے پر تیز تیز چلنے لگا۔

دور بارڈر فورس کے سپاہی معمول کے گشت پر تھے۔ انہوں نے چوہدری کو تیز چلتے دیکھا تو للکارا اور ہاتھ اوپر کر کے رکھنے کا حکم دیا۔ چوہدری نے ان کی بات پر عمل کرنے کی بجائے دوڑ لگا دی۔ فوجیوں نے جب پاکستان کی طرف دوڑتے ہوئے دیکھا تو فائر کھول دیا۔ گولی کو کون سا پیدل چل کر آنا تھا۔ رائفل سے نکلنے کی دیر تھی کہ چوہدری کی پیٹھ کو چیرتی ہوئی سینے سے نکل گئی۔

ادھر سے مسلسل فائرنگ ہو رہی تھی جب دوڑتے فوجی قریب پہنچے تو چوہدری زندگی کی بازی ہار چکا تھا۔

فوجی لاش کو گھسیٹ کر دور چوکی پر لے گئے۔ فوجی نے گاڑی میں لاش کو ڈالا اور شہر بھیج دیا۔ کھیتوں میں کام کرنے والے مزدور یہ سب کارروائی دیکھ رہے تھے ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو چوہدری زندہ سلامت یہاں موجود تھا۔ غلطی سے سرحد پار کرنے کی پاداش میں بغیر کسی جرم کے گولیوں سے بھون دیا گیا۔ اور لاش پتہ نہیں کہاں لے گئے تھے۔

* * *

باپ کی شہادت کی خبر چوہدری ندیم پر دکھوں کے پہاڑ توڑ گئی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا چھوٹی سی غلطی سے اس کے باپ کو موت کی نیند سلا دیا جائے گا۔

وہ تو آج صبح تک اس ملک کا حمایتی تھا۔ ہر موقع پر اس کی ترقی، انسان دوستی، امن اور انسانیت پروری کے ترانے گاتا تھا۔ اس ملک کی حمایت میں پیاری بیوی، بچے کی ماں بننے والی، اس کی نسل کو آگے بڑھانے والی دیوی کو طلاق دینے کی دھمکی دے چکا تھا۔

بی ایس ایف اس کی پسندیدہ فوج تھی۔ مگر یہ کیا ہو گیا تھا انہوں نے اس کے باپ کو صرف سرحد پار کرنے کی غلطی کی وجہ سے گولیوں سے بھون دیا تھا۔

بیوی آسیہ کی دلیلیں، وطن پرستی کے ترانے، وطن دوستی کے قصے اور واقعات ایک ایک کر کے آنکھوں کی اسکرین پر چلنے لگے۔

اب تک تو وہ پاکستانی لبادہ اوڑھ کر بھارت کا خیر خواہ تھا۔ مگر وہ یہ بات تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا کہ وہ انڈیا سے محبت نہیں کر رہا تھا بلکہ پاکستان سے غداری کر رہا تھا۔ نمک پلیدی کر رہا تھا۔ کھا کر تھالی میں چھید کر رہا تھا، کروڑوں پاکستانیوں کی آزردگی کا موجب بن رہا تھا اور اپنی آخرت بھی خراب کر رہا تھا۔

ہوش میں اس وقت آیا جب باپ جیسی عظیم ہستی سے محروم ہو گیا۔ بیوی کی نگاہوں میں گر چکا تھا۔ جاگتے ضمیر کو وقتی ذہنی عیاشی اور دولت کے حصول کے لیے قتل کر چکا تھا۔

سوچوں نے اس کے اندر زلزلے کی سی کیفیت پیدا کر دی، سوچ، فکر کی سب صلاحیتیں دم توڑ گئیں۔ اب تک صرف ہنسنا، خوشیاں منانا سیکھا تھا۔ آنکھوں سے بھول کر بھی آنسو نہیں بہے تھے۔ مگر آج تو وہ اندر سے ٹوٹ چکا تھا، آنکھوں کے ساون کی گھٹا نے برسنا شروع کیا تو غیروں کی محبت کا سب اثاثہ اس کی نذر ہو گیا۔ سب کچھ بہہ گیا تھا کچھ بھی باقی نہ بچا۔

❋

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

پاک سوسائٹی پر مُوجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد
نمرہ احمد
فرحت اشتیاق
قُدسیہ بانو
نگہت سیما
نگہت عبدُاللّٰہ
رضیہ بٹ
رفعت سراج
صائمہ اکرام
سعدیہ عابد
عفت سحر طاہر
تنزیلہ ریاض
فائزہ افتخار
سباس گُل
رُخسانہ نگار عدنان
اُمِ مریم
عُشنا کوثر سردار
نبیلہ عزیز
فائزہ افتخار
نبیلہ ابر راجہ
آمنہ ریاض
عنیزہ سید
اقراء صغیر احمد
نایاب جیلانی
اشفاق احمد
نسیم حجازی
عنایتُ اللّٰہ التمش
ہاشم ندیم
مُمتاز مُفتی
مُستنصر حُسین
علیمُ الحق
ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

مرگ قبل از مرگ

حسیب جواد علی

موت ایک اٹل حقیقت ہے جس سے فرار اور انکار ممکن نہیں مرنے کے بعد اک دوسری زندگی شروع ہوتی ہے جس کا ادراک کسی انسان کے لیے ممکن نہیں۔
ایک ایسے شخص کی روداد، جو قبر میں جا کر دوبارہ زندہ ہو گیا تھا۔

مصر کا ایک سچا واقعہ

میرے دوست نجیب نے یہ کہانی مجھے سنائی تھی۔

موضوع گفتگو تھا "قبر اور قبر کا حال...... جو مردہ ہی جانتا ہے اور مردہ کبھی باہر آتا ہی نہیں تو یہ حال لوگوں سے مخفی ہی رہتا ہے۔ وعظ وغیرہ میں جو بتایا جاتا ہے وہ مذہبی کتابوں کے حوالے سے ہوتا ہے اور اس پر ہم یقین رکھتے ہیں۔ یقین رکھنا بھی چاہیے...... پھر توفیق فیوی کا ذکر آیا جو مر گیا تھا...... اسے دفن بھی کر دیا گیا تھا لیکن چند گھنٹے بعد ہی قبر توڑ کر یا قبر کھول کر باہر آ گیا تھا۔ یہ سب اس کے لیے بھیانک تجربہ تھا اور دوسروں کے لیے تحیر انگیز......

نجیب کا کہنا تھا کہ وہ اپنے دوست وصفی کے توسط سے توفیق سے ملا تھا اور توفیق نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا اور یہ کہ کس طرح اس نے اپنے آپ کو قبر سے آزاد کیا...... یہ سب جاننے کی جستجو میں اس نے وصفی کو توفیق سے ملاقات کے لیے تیار کر لیا۔ اب آپ نجیب کی زبانی یہ کہانی سنئے۔

میں نے بہت ضد کی تو وصفی تیار ہو گیا۔ اس نے کہا وہ کسی سے ملتا نہیں ہے۔ گوشہ نشین اور دنیا سے دور دنیا داری سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ پھر بھی تھوڑے سے وقت کے لیے تو اسے لے ہی آؤں گا تمہارے پاس...... میں نے کہا۔

"دیکھو صرف 20 یا 30 منٹ کی بات ہے اس سے وقت لے کر مجھے مطلع کرنا تا کہ میں کچھ تیاری کر لوں۔" یہ بھی بتایا کہ وہ کھانے میں کیا پسند کرتا ہے۔

"وہ کیا پسند کرتا ہے یہ تو مجھے نہیں معلوم لیکن جو بھی کھاتا ہے بڑی مقدار میں کھاتا ہے وہ بہت یجیم شحیم دراز قد اور طاقت ور ہے اسی تناسب سے اس کی خوراک ہے۔ اچھا خاصا خرچہ ہو جائے گا تمہارا۔" وصفی یہ کہہ کر ہاتھ ہوا میں ہلاتا رخصت ہو گیا۔

یہ واقعہ بہت پرانا نہیں تھا۔ 1990 کی دہائی کی بات ہے سعودی عرب اور مصر کے اخبارات میں بطور یہ واقعہ چھپا بھی تھا۔

اگلے روز وصفی کا فون آیا۔

"توفیق سے بات ہو گئی ہے وہ عشاء کے بعد آئے گا میرے ساتھ یہ جو رات کا وقت اس نے دیا ہے اس کا مقصد ہے لوگوں سے بچا جا سکے۔ کیوں کہ کھانا کھا کر آئیں گے ہم لوگ۔ اس لیے صرف ہلکی پھلکی چیزیں ہی رکھنا کھانے میں لیکن کولا کی بوتل بڑے سائز کی ضروری ہے۔"

میں نے ضروری انتظام کر لیا۔ بجائے کاغذ قلم ایک چھوٹا ریکارڈ تیار رکھا اور مائکروفون اور ریکارڈ کو میز کے نیچے طریقے سے چھپا دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ کاغذ قلم یا ریکارڈ وغیرہ کی موجودگی میں انٹرویو دینے والا اپنے آپ کو قدرتی انداز سے سامنے نہیں لاتا۔ باتوں میں بناوٹ

Downloaded From

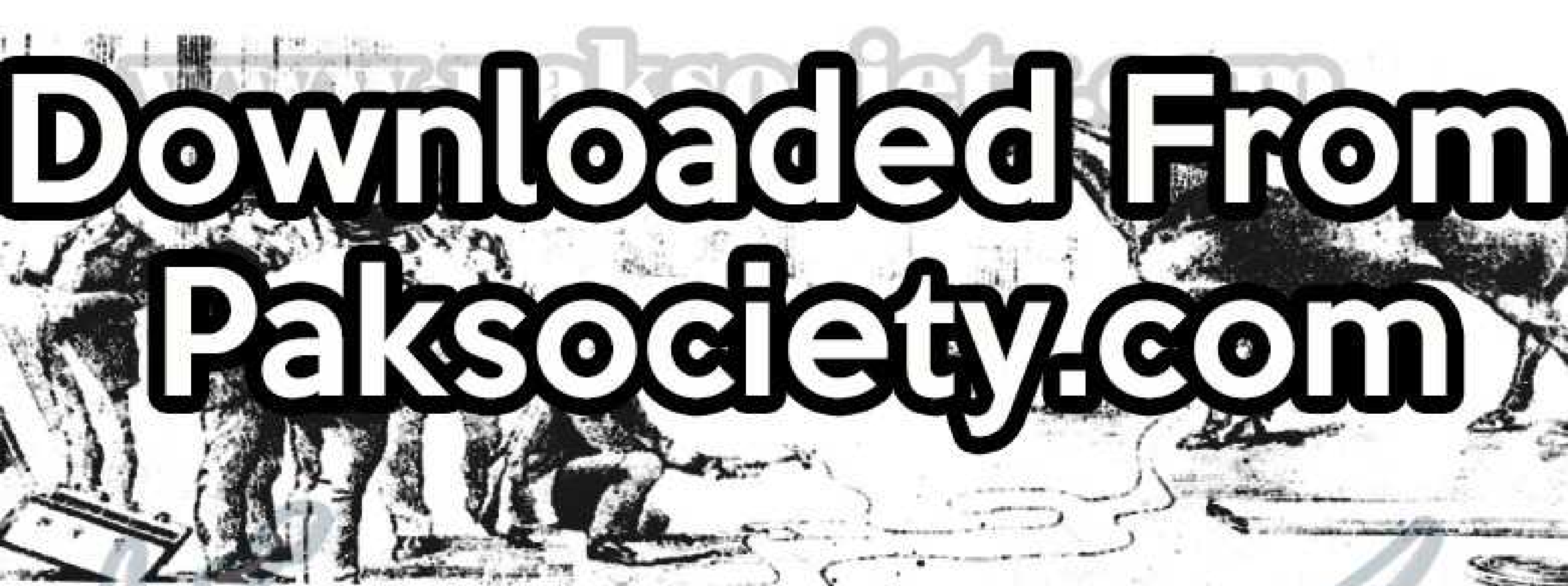

آجاتی ہے کچھ چھپا لیتا ہے اور کچھ ضرورت سے زیادہ بتا دیتا ہے۔

مجھے توفیق سے ملنے کا شوق اس لیے ہوا کہ عجیب و غریب خبروں کی تہہ تک پہنچنا میری عادت ہے۔ مساوات کا قتل میرے لیے اتنا تحیر خیز نہیں تھا جتنا ان ہی دنوں ہونے والے ایک ادیب کی خودکشی کا واقعہ...... جب کہ پہلی خبر اخبار کے پہلے صفحے کی خبر تھی اور دوسری آخری صفحے کی۔ بہت چھوٹی چند سطروں کی اور توفیق قوی موت کا مزہ چکھ چکا تھا۔ جی ہاں وہ مر گیا تھا۔ دفنا بھی دیا گیا تھا۔

یہ خبر مصر کے اخبارات اور سعودی عرب کے ایک مشہور اخبار میں چھپ چکی تھی اور اس کہانی میں بلکہ خبر میں تحیر تھا سنسنی تھی۔ توفیق بہت مشہور ہو گیا تھا لیکن پھر لوگوں کی بھیڑ بھاڑ اور بے تکے سوالوں سے گھبرا کر اس نے اپنے آپ کو غائب کر دیا۔ وہ گوشہ نشین ہو گیا تھا۔

دوبارہ زندہ ہونے کی صورت میں اس کو یہ اندازہ بھی ہوا کہ جن کو اس کی موت سے فائدہ ہو سکتا تھا۔ وہ دراصل اس کے مرنے پر افسوس نہیں جشن منانے والے تھے۔ ان لوگوں پر جو ردعمل ہوا وہ بھی اس کے لیے بہت تکلیف دہ تھا۔ چنانچہ اسے دنیا اور دنیا داری سے بے نیازی ہو گئی تھی۔

وہ لوگ عشاء کے بعد آ گئے۔ دروازہ کھولنے پر میں نے وصفی کے ساتھ ایک قوی الجثہ شخص کو پایا۔ وصفی اور خود میں اس کے سامنے بہت مختصر بلکہ حقیر لگ رہے تھے۔

اس کے ہاتھ بہت سخت تھے۔ مصافحہ کرتے ہی مجھے احساس ہو گیا تھا سخت کھردرے اور بھاری ہاتھ...... وقت ضائع کیے بغیر میں اس کو پہلے سے طے شدہ نشست پر لے گیا۔ کھانے کی اشیاء اور کولا کی بوتل اس کے سامنے رکھ دیں اس نے فوری طور پر ایک گلاس غٹاغٹ اپنے حلق میں انڈیلا اور میں نے بات شروع کر دی۔

”میں تم سے بہت سے سوال نہیں کرونگا۔ تم اپنی کہانی شروع سے سناؤ میں صرف سنتا رہوں گا۔ یہ تمہارے بولنے کا دن ہے اور میرے سننے کا۔

”کیا آپ میری روداد چھاپنا چاہتے ہیں؟ یہ بطور خبر آ چکی ہے اخباروں میں۔“ اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

”نہیں میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے...... فی الحال ...... تم تو شروع کرو اپنی کہانی...... میں منتظر ہوں۔“ میں نے مطلب پر آتے ہوئے ایک گلاس مشروب اور اس کے آگے رکھ دیا۔

اس نے دو گھونٹ لیے اور گلا صاف کرنے کے لیے تھوڑا کھکھارا۔ یہ کھکھار غرائب سے مشابہ تھی۔ اس نے اپنی کہانی شروع کر دی۔

”میں جدہ میں ایک تعمیراتی کمپنی میں کام کرتا تھا۔ یہ کمپنی پرانی عمارتوں کو مسمار کر کے نئی جدید عمارتیں بناتی تھی۔ میں اپنی چند مخصوص صلاحیتوں کی وجہ سے کبھی بے روزگار نہیں رہتا تھا۔ اگر ایک کمپنی چھوڑتا تھا تو دوسری کوئی

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

کمپنی مجھے لے لیتی تھی۔ عمارت کو مشین سے توڑنے کے علاوہ میں جہاں ضرورت ہوتی صرف اپنے ہاتھوں سے دیوار توڑ دیتا تھا۔ ہاتھ تنگ جگہ پر اپنے کمالات دکھاتے تھے جہاں مشین کی پہنچ ممکن نہ ہوتی تھی۔ میرے ہاتھ کی ایک ضرب سے دو چار بلاک تو آسانی سے اپنی جگہ چھوڑ دیتے تھے۔ کبھی کبھی تو دس بارہ بلاک الگ ہو جاتے۔ اس طرح کام کی رفتار برقرار رہتی تھی اور وقت ضائع نہیں ہوتا تھا۔ ان لوگوں کو یہی چاہیے ہوتا تھا۔

ایک دن کام کے دوران پیٹ میں تکلیف کا شدید احساس ہوا اور پھر یہ تکلیف بڑھتی رہی مجھے اسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ جہاں پتہ چلا کہ میرے پیٹ میں ایک بڑی رسولی ہے۔ اس کو نکالنا بہت ضروری تھا۔ آپریشن کے بعد میں بہتر محسوس کر رہا تھا لیکن پھر یہ فیصلہ ہوا کہ مجھے اپنے وطن مصر واپس جانا چاہیے۔ میری صحت بحال ہو گئی اور کھوئی ہوئی قوت مجھے واپس مل گئی۔ میں اپنے خاندانی کاروبار میں مشغول ہو گیا۔

کئی مہینے کے بعد ایک دن اچانک مجھے پھر شدید درد کا احساس ہوا۔ درد اتنا شدید ہوتا تھا کہ مجھ پر غشی طاری ہو جاتی تھی۔ آس پاس کے ڈاکٹروں کو بالکل سمجھ ہی نہیں آیا کہ کیا ہو رہا ہے۔ اندر کسی نئی رسولی کا بھی کوئی امکان نہیں نظر آیا اور اسی دوران مجھ پر ایک مستقل غنودگی طاری ہو گئی۔ میں کچھ ایسی کیفیت میں تھا کہ ہوش و حواس برائے نام باقی تھے۔ یعنی میں کوما میں تھا اور لوگ سمجھ رہے تھے کہ میں مر چکا ہوں یا مرنے والا ہوں۔ مجھے آس پاس کی آوازیں آ رہی تھیں لیکن ایسے کے گویا کہیں دور بہت دور سے آ رہی ہو۔ کچھ سمجھ میں آ رہا تھا اور کچھ نہیں۔

آوازیں اس طرح کی تھیں...... نبض نہیں مل رہی ہے...... بالکل بھی نہیں...... سانس نہیں ہے...... لیکن بدن میں حرارت تو محسوس ہو رہی ہے...... بدن ٹھنڈا نہیں ہو رہا ہے...... ایک دوسری آواز جو غالباً ڈاکٹر کی تھی۔ اس کی گردن اور کلائی کی کھال بہت موٹی ہے۔ ہاتھ سے نہیں تو آلے سے محسوس ہونی چاہیے نبض...... اور پھر...... سسکیوں کی آوازیں...... شاید میرے رشتے دار آہ بکا کر رہے تھے۔

ضرور میری ماں کی آواز ان آوازوں میں سب سے زیادہ واضح ہو گی...... اور بہن کی آواز بھی ہو گی۔ اگرچہ وہ میری سوتیلی بہن تھی لیکن ہم دونوں ایک ہی گھر میں ساتھ ساتھ پلے بڑھے تھے۔ وہ میرے باپ کی پہلی بیوی کی اولاد تھی۔ یقیناً وہ بھی رو رہی ہو گی۔ وہ سب اللہ سے میری صحت اور زندگی کی دعا مانگ رہے ہونگے۔

ادھر میں کسی حد تک یہ سب کچھ سن رہا تھا۔ لیکن مجبور تھا حرکت نہیں کر پا رہا تھا۔ میں ہاتھ اٹھانا چاہتا تھا پلکیں جھپکا کر زندگی کی رمق موجود ہونے کا احساس دلانا چاہتا تھا لیکن کچھ بھی میرے بس میں نہیں تھا۔ شاید مجھے ہلکا سا یہ احساس ہو گیا تھا کہ اگر مجھے مردہ سمجھ لیا گیا تو اس کے نتائج کیا ہو سکتے ہیں مجھے یاد ہے میں خوف زدہ ہو گیا تھا لیکن دل ارادے اور دماغ کے درمیان کوئی رابطہ نہیں تھا۔ یا شاید رابطہ تھا لیکن اتنا کمزور کہ کسی طرح کی میکانکی حرکت ممکن نہیں تھی۔ سگنل جا رہے تھے لیکن بہت کمزور۔ بہرحال اپنی بے بسی بے چارگی پتہ نہیں میں آپ کو سمجھا پاؤں گا یا نہیں۔ صرف ایک رابطہ اگر تھا تو کانوں میں دماغ کے درمیان...... بہت خفیف بہت کمزور...... اگر یہ رابطہ بھی ٹوٹ جاتا تو شاید میں مکمل طور پر مر جاتا۔ لیکن ڈاکٹروں کی رائے میں تو میں مر ہی چکا تھا اور رہے رشتہ دار تو وہ ڈاکٹر کی رائے پر تکیہ کیے ہوئے تھے اور ڈاکٹر نے آخرکار اعلان کر ہی دیا۔

بدن سرد ہو رہا ہے اب کچھ باقی نہیں...... آپ لوگ تجہیز و تکفین کے انتظامات کریں اور مجھے اجازت دیں۔"

"اور وہ فیس وغیرہ......"

"چلو بعد میں دیکھیں گے۔" کہیں دور سے یہ ہلکی ہلکی آواز مجھے آئی جو یقیناً ڈاکٹر کی ہی ہو سکتی تھی۔ اس کے بعد کچھ ہچکیاں...... سسکیاں اور آہیں...... اس کے بعد جو کچھ میں نے محسوس کیا وہ مجھے یاد ہے...... وہ ایک ٹھنڈک کا احساس تھا جب شاید مجھے غسل دیا جا رہا تھا اور پھر وہ رہا سہا

کانوں اور دماغ کا رابطہ بھی ٹوٹ گیا۔

تب پتہ نہیں کب ایسا لگا جیسے میں طویل نیند سے جاگ گیا ہوں لیکن بے حرکت لیٹا رہا۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ میں حرکت کرسکتا ہوں...... لیکن نہیں میں حرکت نہیں کر پا رہا تھا کوشش کے باوجود۔ میرے ہاتھ کپڑے کی تہوں میں قید تھے اور میرے پیروں کے انگوٹھے آپس میں بندھے ہوئے تھے میں نے زور لگا کر اپنے ہاتھ آزاد کرلیا اور اٹھنے کی کوشش کی تو میرا سر اوپر کنکریٹ سے ٹکرایا۔ یہ چھت زمین سے تین فٹ سے زیادہ اونچی نہیں تھی۔ میں نے گھبرا کر اپنی ناک سے روئی اور منہ میں ٹھونسے ہوئے کپڑے کو باہر نکالا اور پاؤں موڑ کر اپنے انگوٹھوں کو آزاد کردیا۔ جب مجھے کچھ نظر نہیں آیا تو میں سمجھا کہ گھر کی بجلی گئی ہوئی ہے۔ لیکن یہ گھر نہیں تھا۔"

"اب جو ادھر ادھر میں نے ہاتھوں سے ٹٹولا تو میرا ہاتھ کسی سخت شے سے لگا۔ گول سی شے۔ مجھے ایک جھٹکا لگا اور میرا ذہن پوری طرح جاگ گیا۔ وہ کسی مرد کی کھوپڑی تھی میرے کسی قریبی رشتہ دار کی کھوپڑی۔ ممکن ہے میرے باپ یا میرے کسی چچا کی...... میں قبر میں تھا...... اجتماعی قبر میں...... اپنی خاندانی قبر میں...... میرے منہ سے بے ساختہ نکلا...... میرے اللہ مجھ پر رحم کر...... اور ان لوگوں پر بھی جو مجھ زندہ انسان کو دفنا کر چلے گئے...... میں ان کو معاف کرتا ہوں۔

میں وضاحت کردوں...... اگر آپ کو معلوم نہیں ہے تو...... یہاں مصر میں اجتماعی قبریں بھی ہوتی ہیں۔ ایک درمیانے یا بڑے سائز کے کمرے کے برابر...... حسب استطاعت...... کنکریٹ کا کمرا۔ لمبائی تین فٹ فرش سے اونچا بنایا جاتا ہے۔ اس میں داخلے کا ایک چھوٹا دروازہ ہوتا ہے۔ اتنا بڑا کہ ایک شخص بیٹھ کر...... سر ایک طرف خمیدہ کرکے اس میں داخل ہوسکے۔ کیوں کہ یہ کمرہ آدھا زمین کے اندر بھی ہوتا ہے لہذا ایک اور دروازہ باہر بھی رکھا جاسکتا ہی۔ دونوں دروازے بھاری پتھر کی سلوں سے بند کیے جاتے ہیں اتنے بھاری کہ ان کو ہٹانے کے لیے کم از کم تین

آپ دنیا کے کسی بھی خطے میں مقیم ہوں
ماہنامہ آنچل ماہنامہ حجاب کراچی
(ایک ساتھ منگوانے پر)
ہم بروقت ہر ماہ آپ کی دہلیز پر فراہم کرینگے
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے ہر کونے میں 700 روپے
امریکا' کینیڈا' آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے
7000 روپے
میڈل ایسٹ' ایشیائی' افریقہ' یورپ کے لیے
6000 روپے
رقم ڈیمانڈ ڈرافٹ' منی آرڈر' منی گرام ویسٹرن یونین کے ذریعے بھیجی جاسکتی ہیں۔ مقامی افراد دفتر میں نقد ادائیگی کرسکتے ہیں۔
رابطہ: طاہر احمد قریشی...... 0300-8264242
نئے اُفق گروپ آف پبلی کیشنز
کمرہ نمبر 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی۔
فون نمبر: +922-35620771/2
aanchalpk.com
aanchalnovel.com
circulationngp@gmail.com

افراد کی ضرورت پڑتی ہے۔ مرنے والے کو اندر نیچے کے دروازے سے قبر میں داخل کر دیا جاتا ہے اور ایک شخص اندر پرانی لاش یا ڈھانچے کو ایک طرف کر کے نئے آنے والے کی جگہ بناتا ہے اور پھر باہر نکل کر پتھر کی سل دوسروں کی مدد سے اس دروازے پر رکھ دیتا ہے۔ پھر تین سیڑھیاں اوپر دوسری سل کو بھی کھسکا کر اس اجتماعی قبر کو سیل کر دیا جاتا ہے۔

جب مجھے ادراک ہو گیا کہ میں قبر میں بند ہوں تو اپنے پچھلے تجربے کی بنیاد پر میں نے باہر نکلنے کے راستوں کو ٹٹول کر ڈھونڈنے کی کوشش شروع کی۔ جی ہاں میں اپنے کچھ رشتہ داروں کی تجہیز و تکفین میں شریک رہ چکا تھا۔ قریب کی دیواروں کو ٹٹولتے ہوئے میں جلد ہی اس جگہ کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گیا۔ بھاری سل میرے راستے میں حائل تھی میں نے اپنی پوری قوت کو مجتمع کر کے اس سل کو ہٹانے کی کوشش شروع کی۔ طبیعت کی خرابی اور کئی گھنٹوں کی خوراک اور پانی کی کمی سے میں کمزور ہو چکا تھا پھر بھی میں نے ہمت نہیں ہاری اور قریب ایک دیوار کے ساتھ کندھے ٹکا کر پیروں سے اس سل کو کھسکانے میں کامیاب ہو گیا وہی سل جسے تین چار آدمیوں نے وہاں رکھا ہوگا۔

ایک ہلکی سی تازہ ہوا کے جھونکے نے میرے پھیپھڑوں میں پہنچ کر گویا میرے اعصاب اور تمام حواس کو زندگی اور تازگی سے مامور کر دیا۔ اس کے بعد میں نے دوسری سل کو ہٹانے کی کوشش کی جو اوپر رکھی ہوئی تھی جو نسبتاً ہلکی تھی۔ باہر آزادی اور زندگی کے بھرپور سانس لینے سے پہلے میں نے دونوں سلوں کو باری باری ان کی جگہ پر دوبارہ نصب کر دیا۔ اب میں ٹھنڈی بے تعفن ہوا میں کھڑا ہوا تھا۔

میں قبر سے تو آزاد ہو گیا لیکن کفن سے آزاد ہونا ممکن نہیں تھا کیونکہ تن ڈھانپنے کو میرے پاس یہی کچھ تھا۔ میں نے کفن کو احرام کی طرح دو حصوں میں اپنے بدن پر لپیٹ لیا اور یہ مسئلہ حل ہو گیا۔"

"یہ رات کا آخری پہر تھا ......شاید صبح کے قریب......اور مجھے عشاء ہی میں دفن کیا گیا ہوگا۔ یعنی کئی گھنٹے گزر چکے تھے۔ میں اپنے گھر سے ایک ڈیڑھ کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ رات گئے تک رہنے والی چہل پہل ختم ہو چکی تھی۔ راستے میں نہ کوئی راہ گیر اور نہ پولیس والا میرے قریب سے گزرا کہ مجھے اس حالت میں دیکھ کر حیران ہوتا اور میری راہ میں رکاوٹ بنتا۔ جب اپنی گلی میں داخل ہوا تو خود بخود میری رفتار کم ہو گئی۔ میں اپنے گھر کے دروازے پر ٹھہر گیا۔ مجھے دروازے پر دستک دینے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ کسی طرح ہمت کر کے دستک دے دی۔ شاید پچھلے روز کی میری موت کے سلسلے میں آہ و بکا اور پھر تجہیز و تکفین کی مصروفیت سے تھک کر سب گہری نیند سو گئے تھے۔ میں نے سوچا ماں نہیں سو سکتی اور پھر اسی لمحے ماں کی آواز آئی......"

"کون ہے؟"

"میں نے اس وقت تک اپنا ذہن تو بہت استعمال کر لیا تھا لیکن زبان بالکل بھی......کوئی آواز ہی نہیں نکلی میرے منہ سے۔ باوجود کوشش کے......تب ایک بے معنی لفظ میرے منہ سے نکلا۔ میری آواز خود مجھے اجنبی سی لگی۔ اس نے پھر پوچھا۔

"کون ہے؟" اور دروازہ کھول دیا۔

"میری ماں نے حیرت سے مجھے دیکھا اور پھر ایک چیخ مار کر میری بانہوں میں جھول گئی۔ مجھے یقین ہے کہ یہ خوف کی چیخ نہیں بلکہ باقی گھر والوں کے لیے منادی تھی اور پھر تمام لوگ جاگ گئے۔"

"لمحوں میں گھر کا بڑا داخلی حصہ لوگوں سے بھر گیا لیکن فوراً ہی تقریباً خالی بھی ہو گیا۔ کچھ لوگ تو اندر آتے آتے واپس ہی بھاگ گئے ایک دوسرے سے ٹکراتے گرتے پڑتے۔ جو رکے ان کے منہ سے بے معنی آوازیں نکل رہی تھیں۔

میں نے کہا۔

"ارے میں زندہ ہوں......میں زندہ تھا اور تم لوگوں نے مجھے دفن کر دیا۔" آہستہ آہستہ لوگوں نے اپنی حیرت اور خوف پر قابو پایا۔ کسی نے پانی کا گلاس میرے ہاتھ میں

تھما دیا اور میں نے اپنی ماں کے چہرے پر چھینٹے مارے اور پھر باقی پانی اس کو پلا دیا۔ وہ ہوش میں آئی تو میرے ماتھے اور میرے گالوں پر بوسے دینے لگی۔ کسی نے دوسرا گلاس دیا تو وہ میں غٹا غٹ پی گیا۔ مجھے شدید پیاس لگی ہوئی تھی۔ ادھر میری بہن ہوش میں آنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ وہاں اس کا شوہر موجود تھا جس کے چہرے کے تاثرات اب حیرت اور خوف کے بعد حسرت اور افسوس کے غماز تھے اور جب میری بہن ہوش میں آئی تو اس کے تاثرات بھی اسی طرح بدل گئے۔ میری ماں کہہ رہی تھی۔

”مجھے یقین ہی نہیں تھا کہیں مرنے والوں کا چہرہ ایسا ہوتا ہے۔ کم بخت ڈاکٹر نے میرے بیٹے کو جیتے جی مار دیا۔ میں بتاؤں گی اسے مرنا کیا ہوتا ہے۔ ڈنڈوں سے ماروں گی اسے۔ کیس کروں گی اس پر اس کی سند ضبط کروا دوں گی......“

اب میں نے حالات کا جائزہ لیا۔ اپنی سمجھ اپنے دماغ کا استعمال کرتے ہوئے معاملات کو جاننے کی کوشش کی۔ کچھ گزرے لمحات کو یاد کیا تو گتھیاں گرہیں کھلتی چلی گئیں۔ وہ میری سوتیلی بہن تھی۔ میرے باپ کی پہلی بیوی کی اولاد۔ میرا مرنا اس کے لیے گویا لاٹری کھلنے والی بات تھی۔ میرے مرنے کے بعد وہ تمام جائداد کی مالک بن سکتی تھی۔ میری ماں کو آخر کتنے دن اور جینا تھا۔ آخر کار یہ سب اور ماں کا حصہ بھی اس کا ہی ہو جاتا۔ اس کے پیچھے میرے بہنوئی کا بہکاوا بھی کار فرما تھا۔

میری اچانک دنیا میں واپسی ان لوگوں کے لیے ایک تازیانہ تھا اور وہی سب کچھ ان کے چہروں سے عیاں ہو رہا تھا۔ یہ ہے انسان اور یہ ہیں اس کی خود غرضیاں اور لالچ۔ آپ پوچھیں گے کہ میں لوگوں سے کیوں بھاگتا ہوں۔ لوگ مجھ سے قبر کا حال پوچھتے ہیں میں نے جو کچھ دنیا میں دیکھا ہے وہ قبر سے کچھ کم خوف ناک نہیں اور پھر میں اگر قبر کے حالات بتاؤں تو وہ ایک زندہ مدفون انسان کے تجربات ہوں گے۔ اگر میں واقعی مر گیا ہوتا تو...... اسی خیال سے ہی کانپ اٹھتا ہوں کہ میں کیسے اس امتحان اس آزمائش کا سامنا کرتا اور میرا کیا حشر ہو گیا ہوتا۔

میں نے موت کو اتنے قریب سے دیکھا ہے کہ اب میرے خیالات میری دنیا سب کچھ بدل گئی ہے۔ یہ میری قسمت تھی کہ میں ایک ایسی قبر میں دفن کیا گیا کہ بساند اور گھٹن کے باوجود اتنی دیر میں سب برداشت کر گیا۔ زندہ رہا اور اپنی طاقت اور اللہ تعالیٰ کی مدد سے میں باہر آ گیا۔ اگر کہیں عام قسم کی قبر ہوتی...... جیسی سب علاقوں اور ملکوں میں ہوتی ہے تو شاید میں بہت اذیت کی موت مرتا اور پھر اسی کیفیت اور اسی حال سے بھی گزرتا جس سے سب مرنے والے گزرتے ہیں...... اللہ نے مجھے ایک موقع دیا ہے اپنے دانستہ اور نادانستہ کیے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کا۔ اپنے آپ کو سدھارنے کا۔ یہی وجہ ہے کہ اب میرا دل نہ لوگوں میں بیٹھنے کو چاہتا ہے اور نہ ان کی فضول باتیں سننے کو۔ روزی کماتا ہوں اور اللہ کے احکامات کی بجا آوری میں لگ جاتا ہوں۔ ایک دن آخر کار مرنا ہے۔ حقیقی موت...... جب مجھ سے قبر کھولنے کی سکت ہو گی اور نہ مجھے کوئی موقع دیا جائے گا۔“

یہ کہہ کر توفیق نے اپنی ڈھیلی آستین سے آنسو پونچھے۔ میں نے محسوس کیا کہ توفیق نے اپنی داستان ختم کر دی ہے۔ میں نے اس کو کھانے کی چیزوں کی طرف متوجہ کیا لیکن اس نے کچھ نہیں لیا۔ اور اچانک اٹھ کھڑا ہوا اور وصفی کے کندھے کو تھپکی دے کر چلنے کا اشارہ کیا۔ میں نے اس سے مصافحہ کر کے اس کو رخصت کیا اور گم صم پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔

◆

عذاب مسلسل

مجید احمد جانی

اللہ تعالیٰ کی صفات میں رحیمی اور کریمی کا جذبہ دیگر صفات پر حاوی ہے۔ اسی لیے اس نے معافی اور درگزر کا دروازہ ہمہ وقت کھلا رکھا ہے کہ انسان جرم کر کے گڑگڑاتے ہوئے اس کے سامنے جھکے اور وہ معاف کر دے لیکن اس کے باوجود انسان بہت ظالم ہے وہ نہ صرف اس کے احکامات سے روگردانی کرتا ہے بلکہ خود اپنے ساتھ بھی ظلم کرتا ہے۔

اک لڑکی کے عذاب مسلسل کی روداد، اس نے قدرت کے قوانین کا مذاق اڑایا تھا

تنہائی مجھے ڈسنے کو آتی ہے۔ کال کوٹھری کے درودیوار وحشت زدہ کسی درندے کی طرح کاٹنے کو تیار کھڑے ہیں۔ تاریکی میں خوف کے سائے اور بڑھ جاتے ہیں۔ میں سنٹرل جیل کی بیرک نمبر چار میں مقید ہوں۔ یہاں کی روداد سُنانے بیٹھ جاؤں تو سر شرم سے جھک جائے۔ عورت ذات کے ساتھ بہیمانہ سلوک ذہنی، جسمانی تشدد۔ اُف! جیسے میں درندوں میں پھنس گئی ہوں۔ ہر طرف وحشی درندے ہی درندے ہیں۔ جسموں کو نوچنے والے لمحوں کی تسکین کے لیے عمر بھر کا روگ پالنے والے عمر بھر کا روگ؟ ایک ایسا ہی روگ میں نے بھی پال لیا تھا۔

میرا نام ثمرین ہے۔ میں دھڑیالہ پنڈ کی رہائشی ہوں۔ جیل کی کوٹھری میں کیسے آئی۔ بڑی لمبی کہانی ہے لیکن مختصر سُناتی ہوں۔ اِس اذیت ناک زندگی سے بہتر تھا مجھے چوراہے پر لٹکا کر پتھر مار مار کر ہلاک کر دیا جاتا۔ شاید ایسی تکلیف پھر بھی نہ ہوتی۔ ایسی زندگی سے مر جانا ہی بہتر ہے۔ اِنسان خطا کا پُتلا ہے خطائیاں سرزد ہو جاتی ہیں۔ میں نے بھی ایک غلطی کر کے عمر بھر کا روگ پال لیا۔ میں انسان ہو کر انسانوں سے ڈسی ہوں......کیسے......؟

دھڑیالہ پنڈ میں ہم نئے نئے آئے تھے۔ میرے ابو کا ٹرانسفر راول پنڈی سے یہاں ہوا تھا۔ ابو سرکاری ملازم تھے اور اُن کا ایک شہر سے دوسرے شہر تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔ جونہی ابو کا تبادلہ دھڑیالہ پنڈ ہوا تو ہم ضروریات زندگی کا سامان اُٹھائے یہاں چلے آئے۔ پہلے سرکاری کالونی میں مکان ملا لیکن اسکول قریب نہ ہونے کی وجہ سے ہمیں سرکاری کالونی چھوڑنی پڑی کیونکہ میں اور تنویر پڑھ رہے تھے۔ جس علاقے میں کرائے پر مکان لیا تھا۔ اُس کے قریب ہی لڑکیوں کا ہائی سیکنڈری اسکول تھا۔

ہم دو بہن بھائی ہیں۔ بڑی میں ہوں اور مجھ سے چھ سال چھوٹا میرا بھائی۔ میری پیدائش کے چھ سال بعد اللہ تعالیٰ نے بڑی منتوں مرادوں کے بعد تنویر کی صورت میں پیارا سا بھائی عطا کیا۔ تنویر کے بعد میرا

Downloaded From Paksociety.com

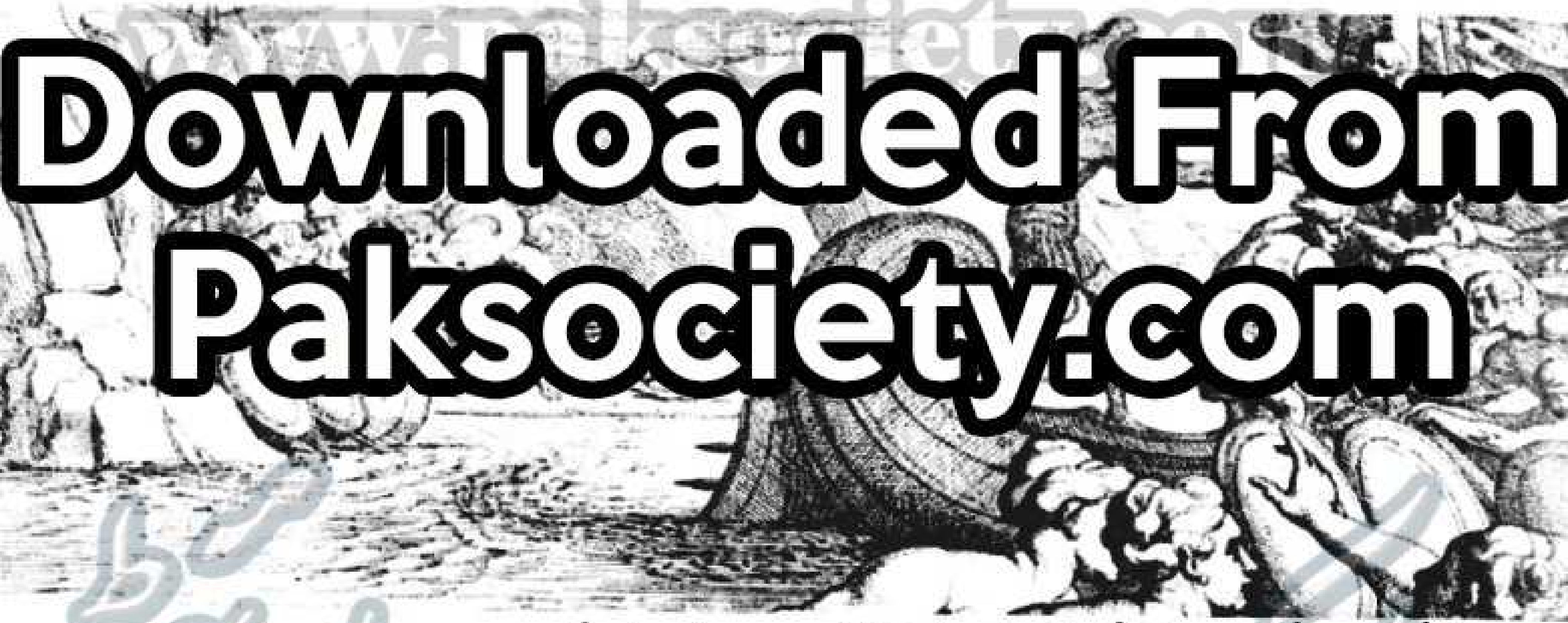

کوئی بہن بھائی اِس دُنیا میں نہیں آیا شاید اللہ تعالیٰ کو یہی منظور تھا۔

ہمارا خاندان چار افراد پر مشتمل تھا۔ رشتے داروں میں کوئی پوچھتا نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہم بھی اُن سے دُور ہو گئے۔ امی بتاتی ہیں کہ غربت کی وجہ سے سبھی رشتے دار چھوڑ چھاڑ گئے ہیں۔ جب اُنہوں نے نہیں پوچھا تو ہم نے بھی کنارہ کر لیا اور پھر تمہارے ابّو کی نوکری لگ گئی۔

میں ایف اے کر کے گھر بیٹھ گئی تھی۔ پڑھائی سے دِل اُچاٹ ہوا تو مڑ کر کتابوں کی طرف نہ دیکھا۔ کتابوں سے الرجی ہونے لگی اور میں نے پڑھائی کو خیر آباد کہہ دیا۔ اب تنویر چوتھی میں پڑھ رہا تھا۔ امی بیمار رہنے لگی تھی اور میں گھر کے کاموں میں لگی رہتی۔ پڑھائی سے آزادی مل گئی اور شروع شروع میں اُمی ابو نے مجھے پڑھنے کے لیے بہت زور دیا لیکن میری ہٹ دھرمی کی وجہ سے خاموش ہو گئے۔

ابو شریف اِنسان تھے، بے حد پیار کرتے تھے۔ مجھ پر جان چھڑکتے تھے۔ اُن کی بے پناہ محبت کو میں نے داغ دار کر دیا۔ کیسی بدبخت بیٹی ہوں۔ مجھے بیٹی کہلوانے کا حق بھی نہیں ہے۔ میں عورت ذات پر بدنما داغ ہوں۔

یہ اُن دِنوں کی بات ہے جب تنویر پانچویں کے سالانہ پیپرز دے رہا تھا۔ پانچویں کے بورڈ کے پیپرز ہوتے ہیں۔ تنویر جی جان سے محنت کر رہا تھا۔ ذہین بھی بہت تھا اور پڑھنے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ اسکول کے ساتھ ساتھ مدرسے بھی جاتا تھا۔ قرآن مجید ناظرہ پڑھ رہا تھا۔ مدرسے کے اُستاد بھی اُسے بہت پیار کرتے تھے اور تنویر کو اکثر محفلوں میں لے جایا کرتے تھے۔ اُس رات بھی تنویر مدرسے سے ابھی واپس نہیں آیا تھا۔ میں نے کھانے میں نیند آور گولیاں ملا دی تھیں۔

یہ میرا پرانا طریقہ تھا۔ کھانے میں نیند آور گولیاں ملا دیتی اور امی، ابو اور تنویر کھانا کھاتے بستر پر گہری نیند سو جاتے اور پھر میں ہوتی اور میرا محبوب ہوتا۔ دلاور ڈاکٹر تھا۔ دھڑیالہ پنڈ میں اُس کا کلینک تھا۔ یہاں ہم رہتے تھے۔ اِس گاؤں میں اور کوئی ڈاکٹر نہ تھا۔ امی اکثر بیمار رہتی تھی اور اپنی دوا اِسی کے کلینک سے لیتی تھی۔ میں بھی ساتھ جاتی اور واپسی پر بازار سے سودا سلف بھی لانا ہوتا تھا۔ ظاہری سی بات سامان اُٹھانے کے لئے مجھ ساتھ جانا پڑتا تھا۔

امی کو شوگر تھی اور گاؤں میں واحد ڈاکٹر دلاور ہی تھا۔ جس سے امی کا علاج ہو رہا تھا۔ اِسی لئے کلینک پر

رَش بھی رہتا تھا۔ میرے گھر کے کسی بھی فرد کو تکلیف ہوتی تو ہم ڈاکٹر دلاور سے دوا لیتے تھے اور تندرست بھی ہو جاتے تھے۔ ابو ڈیوٹی پر جاتے تھے، شہر لے جانے کے لئے اُنہیں وقت ہی نہیں ملتا تھا۔

ڈاکٹر دلاور خوبصورت نین نقش کا مالک تھا۔ ہینڈسم، پُرکشش شخصیت۔ کلین شیو میں اور بھی اچھا لگتا تھا۔ اُس کے سرخ لال گال چمکتے تھے اور قد کاٹھ کا بھی اچھا تھا۔ ایسی جسامت کا شخص ہر لڑکی کا آئیڈیل بن جاتا ہے۔ میں امی کے ساتھ کلینک پر جاتی تو اُس کی نگاہیں میری جاسوسی کرتی تھیں۔ میں بھی چڑھتی جوانی میں بلا کی خوبصورت تھی۔ جسامت کے بدلتے رنگوں نے اور بھی حسین بنا دیا تھا۔ سینے کے ابھاروں نے کشش پیدا کر دی تھی اور اداؤں میں مستی بھی آ گئی تھی۔ نگاہوں میں شرم، لبوں پہ مسکراہٹ، شرمیلا پن اُمڈ آیا تھا۔ ڈوپٹے کا پلو شرماتے ہوئے دانتوں میں دباتی تو انگ انگ سرور میں کھل اُٹھتا۔

دلاور جانے کب سے میری تاک میں تھا۔ میں بھی دِل ہی دِل میں اُسے چاہنے لگی تھی۔ امی زیادہ بیمار ہوئی تو چلنے پھرنے سے رہ گئی تب میں اکیلی دوائی لینے چلی جاتی۔ یہیں سے دلاور میرے اور میں اُس کے قریب ہو گئی۔ وہ مجھے جان بوجھ کر بٹھائے رکھتا اور میں بھی رَش زیادہ ہونے کا بہانہ بنا دیتی تھی۔ دونوں طرف آگ برابر لگی تھی۔ اُس نے اظہار محبت کیا اور میں نے بھی اقرار کر لیا۔

امی کی طبیعت زیادہ خراب رہنے لگی تو دلاور کو گھر بلوایا جانے لگا۔ ابو ڈیوٹی پر چلے جاتے تھے اور تنویر اسکول پیچھے میری حکومت ہوتی نگاہوں سے آغاز ہوا اور بات خفیہ ملاقاتوں تک جا پہنچی۔ میں بھی کسی بہانے دلاور کے پاس چلی جاتی جب اُس کے کلینک پر رَش نہ ہونے کے برابر ہوتا۔ اکثر دوپہر کو وہ فارغ ہوتا تو مجھے اُسی وقت ملنے آنے کا کہتا۔ لیکن یہ جگہ محفوظ نہیں تھی۔ کوئی بھی کسی بھی پل آ سکتا تھا۔ ہمیں محفوظ ٹھکانہ چاہیے تھا۔ جہاں ہم دُنیا سے بے نیاز ہو کر عشق کی پینگیں اُڑاتے اور وہ ٹھکانہ میرے گھر کے علاوہ کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ ڈاکٹر مجھے نشہ آور گولیاں دے دیتا جو میں کھانے میں ملا کر گھر والوں کو کھلا دیتی۔ رات کی تاریکی میں ڈاکٹر میرے گھر آ جاتا اور خدمت خلق، مسیحائی لبادہ اُتار کر ہوس پرستی کی چادر اوڑھ لیتا اور میں عورت کی شرم وحیا کی چادر دُور پھینک کر بھوکی چڑیل بن جاتی۔ جسموں کا کھیل شروع ہوتا اور رات گزرتی رہتی۔ رات بھر دُنیا سے بے نیاز ہم حرام فعل میں مگن رہتے۔ ایسا فعل جس کی اجازت دین اسلام نہیں دیتا۔ شیطانی طاقتیں حاوی تھیں اور ہم عقل و شعور رکھتے ہوئے بھی شیطانی کام سر انجام دے رہے تھے۔ جب بھی ہمارے ملنے کا پروگرام ہوتا یہی کارروائی ہوتی اور یہ تقریبا ایک سال سے چل رہا تھا ہم بلاخوف وخطرہ اِس فعل میں مگن تھے۔

جب بھی میں دلاور کو کہتی دلاور آخر کب تک ہم یونہی چھپ چھپ کر ملتے رہیں گے اپنے امی ابو کو میرے گھر بھیجو۔

دلاور کہتا ”ثمرین! فکر نہ کرو بہت جلد میرے گھر والے تیرے گھر آئیں گے اور تجھے میرے لئے مانگ لیں گے اگر دلاور کے والدین میرے گھر آ جاتے تو باخوشی یہ رشتہ قبول بھی کر لیا جاتا...... مگر...... مگر انہونی ہو گئی۔

اُس رات ہمارا ملنے کا پروگرام تھا۔ میں نے حسب سابق کھانے میں نشہ آور گولیاں ملا دی تھیں۔ مغرب ہوئی اندھیرا پھیلا اور پھر عشاء بھی ہو گئی امی

ابو کو کھانا دے چکی تھی لیکن تنویر ابھی تک گھر نہیں آیا تھا۔ اِن دِنوں تنویر کے پیپرز ہو رہے تھے۔ وہ کھانا کھانے کے بعد دیر تک تیاری میں لگا رہتا تھا۔ آج بھی میں نے اُس کے لئے کھانا رکھا ہوا تھا۔ مجھے پریشانی یہ تھی کہ اُدھر دلاور کے آنے کا وقت ہو رہا تھا اور ابھی تک تنویر گھر نہیں لوٹا تھا۔ ہمارے گھر والی گلی میں مسجد تھی جہاں تنویر قرآن مجید پڑھ رہا تھا۔ میں شش و پنج میں تھی کہ تنویر آ گیا۔

"تنویر کہاں رہ گئے تھے؟ اتنی دیر کر دی۔ میں تمہارے انتظار میں جاگ رہی ہوں۔ دیکھو تو امی ابو کب کے سو گئے ہیں۔" میں نے ایک ہی سانس میں کئی سوال داغ دیئے تھے۔

"باجی! محفل میلاد تھی۔ اس لیے لیٹ ہو گیا۔"

"اچھا! منہ ہاتھ دھو کر کھانا کھا لو۔ مجھے سونا بھی ہے۔"

"مجھے بھوک نہیں ہے۔"

"کیوں نہیں ہے بھوک؟ بھوک نہیں ہے کا بچہ۔" میں زیر لب بڑبڑائی۔

"تمہاری پسند کی ڈش خاص تمہارے لیے بنائی ہے۔ اچھا میں کھانا تمہارے کمرے میں لے آتی ہوں اور خود اپنے ہاتھوں سے کھلاتی ہوں۔"

مجھے ڈر تھا کہ اِسی لمحے دلاور نہ آ جائے۔ موبائل میرے پاس تھا نہیں جو دلاور کو کہتی کہ تھوڑی دیر کر کے آنا ابھی موبائل اتنے متعارف نہیں ہوئے تھے۔ میں کھانا لے کر تنویر کے کمرے گئی۔

"باجی! کھانا رکھ دو۔ میں کپڑے بدل کر کھاتا ہوں۔"

میں کھانا رکھ کر کمرے سے نکل آئی۔ تاکہ تنویر کپڑے بدل لے تو میں خود جا کر کھانا کھلاؤں گی لیکن

آنچل کی جانب سے ایک اچھوتا آنچل

ماہنامہ
حجاب
کراچی

اگلا شمارہ ان شاء اللہ
سالگرہ نمبر ہوگا

ملک کی مشہور معروف قلمکاروں کے سلسلے وار ناول، ناولٹ اور افسانوں سے آراستہ ایک مکمل جریدہ گھر بھر کی دلچسپی صرف ایک ہی رسالے میں موجود جو آپ کی آسودگی کا باعث بنے گا اور وہ صرف "**حجاب**"
آج ہی ہاکر سے کہہ کر اپنی کاپی بک کرالیں۔

سالگرہ نمبر میں شامل ہونے کیلئے بہنیں جلد از جلد اپنی نگارشات ادارے کو بذریعہ ڈاک یا ای میل بھیجیں۔

خوب صورت اشعار منتخب غزلوں
اور اقتباسات پر مبنی مستقل سلسلے

اور بہت کچھ آپ کی پسند اور آرا کے مطابق

Infoohijab@gmail.com
info@aanchal.com.pk
کسی بھی قسم کی شکایت کی صورت میں
021-35620771/2
0300-8264242

یہ نوبت ہی نہ آئی۔ میں کمرے سے نکلی تو دلاور دیوار پھلانگ رہا تھا۔ مخصوص راستہ واش روم کے ساتھ والی دیوار تھی جو دلاور پھلانگ کر اندر آجاتا تھا ہمارے واش روم کے پیچھے کوئی مکان نہیں تھے اور گلی کے آخر میں ہمارا گھر تھا ہمارے گھر کے پیچھے کھیت شروع ہوجاتے ہیں۔ دلاور کو دیوار پھلانگتے دیکھ کر میں اُس کی طرف چلی گئی اور......اور پھر اُسے خاموشی سے اپنے کمرے میں لے آئی۔ اِس سے پہلے کہ میں دلاور کو کہتی کہ تنویر ابھی آیا ہے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی دلاور نے بانہوں میں بھر لیا اور پھر ہم پر شیطانی نشہ چھا گیا خیال ہی نہ رہا کہ تنویر کمرے میں جاگ رہا ہے۔ کہتے ہیں کھاتا چور ایک نہ ایک پکڑا ضرور جاتا ہے۔ عشق اور مُشک چھپائے نہیں چھپتے۔ رات کے بارہ بجے تھے جب ہماری قسمت ہاری اور سب منظر بدل گیا۔

تنویر کمرے سے باہر آیا۔ شاید واش روم جا رہا تھا۔ واش روم جاتے ہوئے پہلے میرا کمرہ آتا ہے۔ میرے کمرے کا زیرو کا بلب جل رہا تھا اور ونڈو میں چھوٹا سا سوراخ تھا۔ جس سے باہر والا اندر کا منظر دیکھ سکتا تھا اِسی سوراخ سے تنویر نے اندر کا منظر دیکھ لیا۔ ہم تو بے لباس اپنی خرمستیوں میں گم تھے اور ہلکی ہلکی ہنسی ہنس رہے تھے شاید ہماری ہنسی نے تنویر کے قدم روک لیے تھے۔

تنویر نے مجھے آواز دی۔

”آپی۔“ تنویر کی آواز سنتے ہی ہمارے طوطے اُڑ گئے ہم جو ایک دوسرے سے چمٹے تھے الگ ہوئے۔ دلاور پھرتی سے اُٹھا۔ دروازہ کھولتے ہی تنویر کو دُبوچ لیا۔ جیسے بھوکا شیر اپنے شکار کو دُبوچ لیتا ہے۔ میں برہنہ جسم کو ڈھانپنے لگی۔ امی ابو گہری نیند سو رہے تھے۔ لیکن تنویر کا شور سن کر یقیناً ہمسائے آجاتے اور ہماری بدنامی ہوتی۔ دلاور نے تنویر کے منہ پر فوراً ہاتھ رکھ دیا تاکہ وہ شور نہ کر سکے اور اُسے کمرے میں لے آیا۔ وہ قیدی پرندے کی طرح پھڑ پھڑا رہا تھا۔ ننھی سی جان تھی کتنی مذمت کرتا۔ آخر تھک گیا۔ تنویر مذمت کرتے کرتے تھک گیا تھا۔ اُس کی مذمت میں کمی ہوتی جارہی تھی اور پھر تھوڑی ہی دیر میں اُس نے حرکت کرنا بند کر دی۔ شاید اُس کا دم گھٹ گیا تھا۔ دلاور نے تنویر کی حرکت رُکتی دیکھی تو اپنی گرفت ڈھیلی کر دی لیکن تنویر ایک طرف لڑھک گیا۔ اُس کا سانس بند ہونے کی وجہ سے موت واقع ہوگئی تھی۔ یوں انہونی ہی ہو گئی۔ ہم تو تنویر کو چُپ کرا کر سمجھانا چاہتے تھے لیکن یہ وہ لمحے تھے جب دماغ کا استعمال کرنا تھا مگر ہمارے دماغ تو ماؤف ہو چکے تھے۔ کوئی راستہ نظر نہیں آرہا تھا اور پھر یہ انہونی ہوگئی۔

میرا ایک ہی بھائی تھا اور وہی میرے کرتوں کی بھینٹ چڑھ گیا۔ دلاور اور میں ہوس کی آگ میں جل کر انسانی رُوپ میں درندے بن گئے۔ اب اپنا گناہ چُھپانے کے لئے تنویر کے مردہ جسم کو ٹھکانے لگانا ضروری تھا۔ ہم دونوں نے تنویر کے مردہ جسم کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کیے اور ایک پلاسٹک کے گٹو میں ڈال لیے کیونکہ تنویر کا سالم جسم باہر لے جانا کسی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اب دلاور کا کام تھا کہ وہ اِس گٹو کو کہاں غائب کرتا ہے۔ میں نے کمرے سے خون صاف کیا۔ رات کافی گزر چکی تھی۔ سونے کی تیاری کی مگر نیند نہیں آرہی تھی۔ پھر میں نے بھی نیند آور گولیاں کھالیں اور تھوڑی ہی دیر میں نیند کی وادی میں کھوگئی۔

صبح ابو نے جھنجوڑ کر اُٹھایا۔ ابو صبح سویرے اُٹھ جایا کرتے تھے۔ ناشتہ میں ہی بناتی تھی اور امی تو چلنے

پھرنے سے رہ گئی تھیں۔ میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی اور پھٹی پھٹی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی امی رو رہی تھی اور ابو کی آنکھیں خون برسا رہی تھیں ابو نے تنویر کا پوچھا میں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ پھر تو واویلا مچ گیا۔ تنویر کہاں گیا۔ تنویر کہاں گیا؟ اُس کا پیپر تھا اور تنویر کا کوئی اتا پتا نہیں تھا۔ پورے محلے میں شور مچ گیا۔ پُراسرا اغوا یا......یا......؟ ہر کوئی چہ مگوئیاں کر رہا تھا۔ ہماری کسی سے کوئی دُشمنی نہیں تھی۔ کس پہ شک کیا جاتا چُور تو گھر میں موجود تھا اور ہم باہر ڈھونڈ رہے تھے۔ کئی دن گزر گئے۔ تنویر کا سُراغ نہ مل سکا۔ امی کا رو رو کر بُرا حال تھا۔ ابو الگ پریشان تھے۔۔۔۔ معاملہ پولیس تک پہنچ گیا۔ جانے کس بدبخت نے تھانے جانے کا مشورہ دیا تھا۔ پولیس آئی تفتیش شروع ہوئی پوچھ گچھ ہونے لگی گاؤں میں جتنے بھی جواری تھے سبھی کو اندر کیا گیا مگر کوئی سُراغ نہ ملا۔

معصوم کا قتل زیادہ دن چُھپ نہ سکا اور راز افشا ہو گیا۔ تھانے دار نے جب تفتیش کا سلسلہ بڑھایا تو مجھ سے بھی بات کی گئی اور پھر...... پھر میں بوکھلا گئی۔ آخر سچ میری زبان پر آ ہی گیا کیونکہ عورت زیادہ دیر راز نہیں چھپا سکتی۔ میں نے اپنے تئیں کوشش تو بہت کی تھی مگر کامیاب نہ رہ سکی اور پھر سبھی حیرت کدہ تھے۔ میرے ساتھ دلاور کو بھی جلد گرفتار کر لیا گیا۔ دلاور نے تنویر کی ٹکڑے شدہ لاش برآمد کرائی۔ اُس نے پلاسٹک کے گٹو کو گاؤں کے سردار جی کے باڑے کے باہر گوبر کے ڈھیر میں چُھپا دیا تھا۔۔ جب دلاور نے وہاں سے گٹو برآمد کرایا تو گاؤں والے مشتعل ہو گئے اور دلاور کو مارنے کے لئے آگے بڑھے لیکن تھانے دار نے جرات مندانہ طریقے سے دلاور کو وہاں سے بچایا اور تھانے لے آئے۔

ہمیں عدالت میں پیش کیا گیا اور اقرار جُرم کے بعد ہمیں جیل بھیج دیا گیا۔ میری امی صدمے سے فوت ہو گئیں اور ابو پاگل خانے چلے گئے۔ وہ دیواروں میں سر مارتے مارتے پاگل ہو گئے تھے اور لوگوں نے پاگل خانے بھجوا دیا تھا۔ ہمارے گناہوں کی سزا ہمیں مل گئی اور مجھے تو عمر قید سنائی گئی لیکن میں آج کال کوٹھری میں اُس پل کو کوس رہی ہوں جب دلاور سے آنکھیں چار ہوئی تھیں۔ عمر قید سُنا کر احسان کیا گیا تھا۔ ہمیں تو اذیت دے دے کر مار دینا چاہیے تھا۔ جس طرح ہم نے تنویر کے ٹکڑے کیے تھے ہمارے بھی ٹکڑے کیے جاتے۔ ہماری بوٹی بوٹی کی جاتی یا چوراہے پہ لٹکا کر پتھر مار مار کر ہلاک کر دیا جاتا پھر بھی ہماری سزا کم تھی۔

میں اس دنیا میں چند دِنوں کی مہمان ہوں لیکن جیل میں جو سلوک میرے ساتھ ہو رہا ہے۔ کسی دُشمن کی بیٹی سے بھی نہ ہو۔ مجھے روز جسمانی اور ذہنی اذیت سہنی پڑتی ہے۔ روز میرے جسم کو نوچا جاتا ہے۔ بڑے بڑے افسر میرے ساتھ اپنی راتیں رنگین کرتے ہیں۔ اِس دُنیا میں میرا کوئی نہیں رہا۔ جب اپنے تھے تو میں نے اپنے ہاتھوں سے ہی اُن کے گلے دبا دیئے۔ اب کس سے اُمید بہار رکھوں۔ اپنی داستان اِس لیے لکھ کر ارسال کر رہی ہوں تا کہ میری طرح کوئی اور لڑکی اِس کھیل میں نہ پھنس جائے اور اپنے مستقبل کے ساتھ ساتھ اپنے خاندان کو برباد کرانے کا سبب نہ بن جائے۔

◆

خمیازہ

یاسین صدیق

زندہ کرداروں پر مشتمل ہمارے معاشرے کی تلخ لیکن سچی کہانی۔ جو اپنے اندر کئی اسباق لیے ہوئے ہے۔

یہ کہانی ہے اس عورت کی ہے جو جان دے کر بھی اپنے گناہوں کا خمیازہ ادا کرنے سے قاصر رہی۔

یہ کہانی ایک ایسے بیٹے کی ہے جو ماں کے گناہوں کا خمیازہ بھگتنے پر مجبور تھا۔

اچھی کہانیاں پڑھنے کے لیے بطور خاص

یہ 1982ء کی بات ہے۔ میری عمر اٹھارہ سال تھی۔ مجھے ہر وقت ایک بے چینی گھیرے رہتی تھی۔ اضطراب ہر دم جیسے کسی کی تلاش ہو۔ میرا خدا، انسان، کائنات، زندگی، موت جیسے بنیادی سوالات کے تسلی بخش جواب نہ ملنے کے سبب ذہنی خلفشار بڑھتا جا رہا تھا۔ انجانے خوف، الجھے خواب اور سب سے بڑھ کر خود کے رائگاں جانے کا دکھ مجھے بے چین رکھتا۔ کسی کام میں جی نہ لگتا تھا۔ مجھے دنیا اور دنیاداری میں کھوئے ہوئے لوگ، ایسے لوگ جو موت کی طرف بڑھ رہے تھے لیکن اس سے بے خبر، جلدی میں بے سمت بھاگتے ہوئے دیکھ کر دکھ ہوتا۔ اکثر گاؤں سے دور نکل جاتا، پیدل چلتا جاتا اور جب تھک جاتا تو واپسی کی راہ لیتا۔ مجھے الجھن سی محسوس ہوتی اس رنگ و بو کی دنیا سے۔ دنیا مجھے بالکل سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ ہر شے فضول سی لگتی۔ حتی کہ اپنا آپ بھی۔

صبح ہوتی، شام ہوتی میں سوچوں میں گم رہتا۔ میرے گھر والوں سے میری حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔ ہمارا ایک مکان تھا۔ جو ان دنوں خالی پڑا تھا۔ میں وہاں اٹھ آیا۔ اپنی ساری کتابیں بھی لے آیا۔ ایک طرح سے ساری دنیا سے کنارہ کشی کر لی۔ صرف کھانا کھانے اپنے گھر جاتا اور واپس اسی مکان میں آ جاتا۔ اور کتابوں میں گم ہو جاتا۔ آگہی بھی تو ایک عذاب ہے نا! میں اس عذاب سے گزرنے لگا۔ لائبریری سے کتابوں کا لانا اور واپس کرنا ایک واحد کام تھا جسے کرنے کے لیے میں شہر جاتا۔ دن ایسے ہی گزرتے چلے گئے۔

انہی دنوں ہمارے ایک محلے دار فقیر احمد تھے۔ (اب بھی ہیں) جو میرے اندر اٹھنے والے طوفانوں سے آگاہ تھے۔ تصوف روحانیت، جادو، وغیرہ پر ان سے بہت سی کتابیں میں نے لے کر پڑھیں تھیں۔

میں دنیا سے کٹ کر رہ گیا۔ میں تھا اور کتابیں تھیں۔ ایک سال کا یہ عرصہ جو میں نے اس مکان میں گزارا حاصل یہ کہ میں مزید الجھ گیا۔ ان باتوں کو تفصیل سے بیان نہیں کرنا چاہتا کیونکہ یہ اس کہانی کا موضوع نہیں ہے۔

شام ہو رہی تھی کہ فقیر احمد میرے پاس آئے۔ اس مکان کے دروازے کھلے رہتے تھے۔ میں صحن میں چٹائی پر بیٹھا تھا۔ میرے پاس آ بیٹھے انہوں نے اس روز مجھے ایک کافی سنائی تھی جس کے بول تھے۔

میرے شوق دا نہیں اعتبار تینوں آ دیکھ تو میرا انتظار آ جا

ان کی آواز میں کیا سوز تھا۔ کیا درد تھا۔ اور اس کافی کے الفاظ نے جو مجھ پر اثر کیا تھا اس لذت کو میں آج تک نہیں بھول پایا۔ کافی کے اختتام پر فقیر احمد کہنے لگے۔

”خرم ایک خاص بات کہنے آیا ہوں آج“

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

Downloaded From paksociety.com

"جی نہیں"

"ایسے کیسے زندگی بسر ہوگی؟" انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ ان کا اشارہ میری حالت کی طرف تھا۔ چہرے پر پریشانی کے آثار، آنکھوں میں نیند کے ڈورے۔ میں نے مغرب کی نماز اسی چٹائی پر پڑھی تھی اور وہیں بیٹھا ہوا تھا جب وہ آئے تھے۔

"کیا کروں؟" میں نے بھری بھری آنکھوں سے انہیں دیکھا۔

"اتنی کم عمری اور دنیا سے کٹ جانا اچھی بات نہیں۔" انہوں نے بات وہیں سے شروع کی جہاں چھوڑی تھی۔ میں نے ایک بار پھر ان کو ٹوک دیا۔ "میں کیا کروں۔ دل کہیں لگتا نہیں ہے۔ اب تو کتابوں سے بھی اکتاہٹ ہونے لگی ہے۔"

"میں یہ ہی کہنے آیا ہوں۔ کسی بھی چیز کی زیادتی اچھی بات نہیں ہوتی" ایک لمحے کو وہ رکے میں خاموش ہی رہا۔

"اٹھو گھر سے باہر نکلو دوست بناؤ۔ دوسروں کے دکھ سکھ میں شریک ہو جاؤ۔"

کتابوں میں دھرا ہی کیا ہے حافظ
سبق لے زندگی کا زندگی سے

میں نے اس بار بھی ان کی بات کا جواب نہیں دیا۔ تو انہوں نے مجھے غور سے دیکھا پھر پکارا۔

"خرم"

"جی"

"جو میں کہہ رہا ہوں تجھے سمجھ آرہا ہے نا۔"

"جی بالکل آرہا ہے۔" میں نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

"کوئی پوری زندگی تمہاری کفالت نہیں کرے گا۔ تمہارے والد بیمار رہتے ہیں۔ ان کا ہاتھ بٹاؤ۔"

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف

ایڈ فری لنکس

ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ

ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر

کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ

ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بُک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !
Liked
Message
Get Notifications
Add to Interest Lists...
Unlike
IN YOUR NEWS FEED
See First
See new posts at the top of News Feed
Default
See posts as usual
Unfollow
All Done

i. Open Paksociety Page.
ii.Click Liked.
iii.Select Get Notifications.
iv.Select See First.

"میں بہت الجھ گیا ہوں۔" میں نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ سلجھ جاؤ گے۔" ایک سانس لے کر انہوں نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔

"اللہ نے انسان کو اپنی مرضی سے پیدا کیا۔ جیسا اس نے چاہا ویسا پیدا کیا، کسی کو گورا، کسی کو کالا، کسی کو سانولا، ایسا ہی قد کاٹھ کا معاملہ ہے۔ اس بارے اس نے کسی سے حساب نہیں لینا۔ انسان کو عقل و شعور دے کر اللہ نے فیصلہ انسان کے اختیار میں رکھ دیا کہ ان دو راستوں میں سے کسی ایک پر چلنا ہے۔ یہ راستہ اللہ کی ناراضگی کی طرف اور یہ اللہ کی خوشنودی کی طرف جاتا ہے، اللہ نے اپنے پیغامبر بھیجے کہ ان کے راستے پر چلو تو کامیابی ہے۔ یہ جو اختیار دیا ہے اس کا ہی حساب لیا جائے گا۔ جزا و سزا دی جائے گی۔" میں ان کی باتیں توجہ سے سن رہا تھا۔ حالانکہ یہ سب میں پہلے سے جانتا تھا۔ وہ چند لمحے توقف کے بعد بولے۔

"ہمارے لیے زندگی گزارنے کا بہترین نمونہ آقا ﷺ کی زندگی ہے۔ آپ ﷺ ایک عرصے تک غار حرا میں جاتے رہے وہاں غور و فکر کرتے رہے۔ آپ ﷺ نے ایک بھرپور زندگی گزاری۔ شادیاں کیں، جہاد کیا، کاروبار کیا، دوست و دشمن بنائے۔ یہ سب اللہ کی خوشنودی کے لیے کیا۔ ہم کو بھی معاشرتی زندگی گزارنی چاہیے۔ کہ رہبانیت کی اسلام میں گنجائش نہیں۔"

شارٹ کٹ لانگ سٹوری میں نے ان کہنے پر عمل کر لیا۔ خدا نے مجھے ، مستعدی، خوش اندامی، شائستگی سے نوازا تھا۔ میں دوسروں کے غم میں شریک ہونے لگا۔ بہت تھوڑے عرصے میں میرے بہت سے دوست بن گئے۔ انہیں دوستو میں سے ایک دوست افضل کی کہانی آج آپ کو سنانے جا رہا ہوں۔ میں اس کہانی کا عینی شاہد ہوں۔

☆☆☆☆☆

افضل میرا دوست تھا۔ عام طور پر دوست ایک دوسرے کے کسی حد تک ہم خیال ہوتے ہیں۔ یا ان میں کوئی نا کوئی قدر مشترک پائی جاتی ہے۔ لیکن میرے اکثر دوست ہم خیال نہیں تھے۔ یا ہم میں بہت کم قدر مشترک پائی جاتی تھیں۔ اس فرق کی وجہ میرا مطالعہ تھا۔ وجہ میرے والدین تھے جنہوں نے مجھ پر کبھی کوئی سختی نہیں کی تھی۔ افضل انیس سال کا گورا چٹا، لمبے قد کا ایک خوبرو نوجوان تھا۔ جب اس کا والد فوت ہوا تو میں نے اس کی دل جوئی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ یوں افضل میرے قریب سے قریب تر آ گیا۔ افضل کی والدہ کو میں خالہ کہا کرتا تھا اور وہ بھی میرا بہت خیال رکھتی تھیں۔ افضل کی بہن کو میں اپنی بہن خیال کرتا تھا۔

میرا ایک اصول تھا کہ دوست کی بہن اپنی سگی بہن ہے اور اپنی بہن کی سہیلی بھی بالکل بہن جیسی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ زبان کے رشتے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ بلکہ رشتے ہوتے ہی زبان کے ہیں خون کے تو گروپ ہوتے ہیں۔ میرے استاد محترم کیا کرتے تھے کہ دوست کی بہن کو بہن نہ سمجھنے والا انسان نہیں جانور ہے۔ اس میں اور جانور میں کوئی فرق نہیں ہے۔ دوستوں کے درمیان اتنا اعتماد ہونا چاہیے کہ ایک دوست دوسرے دوست کو اپنے بیوی، بچوں، ماں، بہن، بیٹی کے پاس اعتماد سے چھوڑ کر جا سکے۔ میں نے پوری زندگی اس پر عمل کیا۔ یہ ہی وجہ تھی کہ افضل کا گھر میرا جانا آنا ہوا۔ اور محلے بھر میں ہی نہیں اپنے گاؤں میں بھی اپنے کردار کی وجہ سے سب سے الگ سمجھا جاتا۔ گاؤں کے مرد و عورت مجھ پر اعتبار کرتے تھے۔ کیونکہ کسی نے مجھ سے کبھی غلط بات نہیں سنی تھی۔ اس کا کبھی مجھے موقع ہی نہیں ملا تھا۔ میں بھی سب کو سلام کر کے گزرتا۔ ہر وقت کوئی نا کوئی کتاب میرے ہاتھ میں ہوتی۔

افضل کی بہن افضل کی طرح ہی خوبصورت تھی۔ میں جب بھی ان کے گھر جاتا آتا تو وہ بھائیوں کی طرح میرا خیال رکھتی تھی۔ پہلی چند ملاقاتوں میں اس نے میرے جانے آنے کو کچھ اور رنگ دینا چاہا تھا۔ مجھ سے ذومعنی بات کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں بھی انسان تھا۔ بہک جاتا۔ میرے لیے موقع بھی تھا۔ کوئی آنے جانے میں پابندی بھی نہیں تھی۔ لیکن ایسا کرنے کی بجائے ایک دن جب صرف میں اور کشور ہی کمرے میں اکیلے تھے۔ میں نے اس سے کہا۔ "کشور تم مجھے اپنی سگی بہن لگتی ہے۔"

"اس نے حیرانی سے دیکھا میں نے مزید کہا۔ "افضل کی بہن تو نہ جانے کیسے بن گئی ہمارے گھر پیدا ہو جاتیں۔" اس کی حیرانی کم ہوئی یا اس نے خود پر قابو پا لیا اور بولی۔

"اب بھی تو آپ کی بہن ہوں۔" میں نے مصنوعی حیرت سے کہا۔

”اچھا، تو چھوٹی بہنیں بھائیوں کے کام بڑے شوق سے کرتی ہے، تم بھی چائے بنا کر لے آؤ۔“

اس کے بعد اس نے بھی مجھے بھائی جان کہنا شروع کر دیا تھا۔ اور مجھ پر فخر بھی کرنے لگی تھی۔ اس کا نام کشور تھا۔ اس کا نام اس کی والدہ صفیہ بی بی نے رکھا تھا۔ جب آنٹی صفیہ کا خاوند اقبال فوت ہوا تھا۔ ان دنوں ہی میرا ان کے گھر جانا آنا ہوا تھا۔ حالانکہ افضل سے دوستانہ دو تین برس سے تھا۔ کشور اور افضل کی والدہ کا نام صفیہ بی بی تھا جب وہ بیوہ ہوئی تو عمر 35 برس ہو گئی۔ وہ ایک شاداب عورت تھی۔ وہ 25 سے زیادہ نہ لگتی تھی۔ ان دنوں افضل ایف اے میں زیر تعلیم تھا۔ والد کی وفات کے بعد اس نے اسکول چھوڑ دیا اور ایک الیکٹریشن کی دکان پر یہاں ریڈیو ٹیلی ویژن وغیرہ مرمت کیے جاتے تھے کام سیکھنے لگا لیکن میں مزید تعلیم حاصل کرتا رہا۔

☆☆☆☆

افضل کے والد اقبال کو فوت ہوئے ایک برس گزر گیا تھا کہ ایک دن مجھے خالہ کلثوم نے روک لیا۔ خالہ کلثوم کے خاوند کی محلے میں ہی کریانہ کی دکان تھی، کہنے لگی۔

”آج کل تم صفیہ کے گھر بہت آ جا رہے ہو۔“ اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی جو مجھے ناگوار گزری۔ میں نے پھر بھی بڑے تحمل سے جواب دیا۔ ”افضل میرا دوست ہے۔ اس سے ملنے جاتا ہوں۔“

کہنے لگی۔ ”بچ کے رہنا۔ یہ صفیہ بڑی حرافہ ہے۔“ میں نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ وہ تو میری ماں جیسی ہے جیسے آپ ہیں۔“ کہنے لگی۔

”کبھی ہمارے گھر آنا میں بتاؤں گی اس کے کرتوت۔“ میں نے کہا۔

”آپ ابھی بتا دیں، میں فری ہوں۔“

”بتا تو دوں لیکن تو سن نہ پائے گا اور پھر میں صفیہ کے منہ نہیں لگنا چاہتی۔ میں جو کچھ تم کو بتاؤں گی تم جا کر اسے بتا دو گے اس طرح لڑائی ہو جائے گی اور میرا خاوند بڑا کپتا ہے۔“

میرے اندر شروع سے ہی جاننے کا تجسس ضرورت سے زیادہ پایا جاتا تھا۔ ایسی باتیں کر کے اس نے اس تجسس کو بیدار کر دیا۔ میں نے خالہ کلثوم سے وعدہ کر لیا کہ آپ جو بھی بتائیں گی میں کسی کو نہیں بتاؤں گا اس طرح میں نے پہلی بار سلیم دکاندار کے گھر میں قدم رکھا۔

بھرے بھرے جسم کی مالک، سرخ و سفید رنگت کی سولہ سترہ سالہ ناہید کو میں نے اس دن پہلی بار اتنے قریب سے اور بنا پردے کے دیکھا۔ ویسے وہ مجھے اور میں اسے جانتا تھا۔ سلیم صاحب کی دکان گلی کی نکڑ پر تھی۔ اس گلی کے ایک طرف آخر میں ہمارا گھر تھا۔ نکڑ سے مڑ کر چوتھا یا پانچواں گھر افضل کا تھا اور افضل کے گھر آتے جاتے میں نے اس آفت کی پرکالہ کو دیکھا تھا۔ لیکن وہ اور حالت ہوتی تھی۔ اس وقت وہ کپڑے دھو کر اسے صحن میں ایک دیوار سے دوسری دیوار تک باندھی تار پر ڈال رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں شوخی ناچ رہی تھی۔ اس نے ہمارے لیے چائے بنائی۔ میں اسے اور وہ مجھے چوری چوری دیکھتے رہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میری نظر اس کی جانب اٹھ جاتی۔ اس دوران اس کی والدہ مجھے صفیہ کا ماضی سناتی رہی۔ اس نے جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ یہ تھا۔

”اقبال کی تعلیم میٹرک تھی۔ ان کی شادی 22 برس کی عمر میں صفیہ بی بی سے ہوئی تھی۔ ان دنوں صفیہ کی عمر 17 سال ہوگی۔ صفیہ نے ایف اے کیا تھا وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ وہ ہمارے قریبی شہر فتح پور سے ہمارے گاؤں فوجی والا بیاہ کر آئی تھی۔ صفیہ بی بی کے بارے میں محلے کی عورتوں سے سنا تھا کہ اس نے شہر میں کسی لڑکے سے آنکھ مٹکا کیا تھا۔ بات آنکھ مٹکے سے بڑھ گئی تھی۔ لڑکے نام جمال تھا۔ جمال ایک امیر گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ جمال 24,25 سال کا ایک گھبرو جوان تھا اس نے ایک دوست کے مکان میں ایک دن صفیہ کو بلایا۔ اس سے قبل ان کی ملاقات اسکول آتے جاتے ہوتی تھی دوستانہ دو سال سے تھا اور وہ جی بھر کر باتیں نہ کر سکتے تھے چنانچہ جب جمال نے صفیہ کو اپنے دوست کے مکان میں بلایا۔ وہ ذہنی طور پر بالغ تو پہلے ہی ہو چکی تھی۔ اس دن جسمانی طور پر بھی ہو گئی۔

پھر ان کی اکثر ملاقاتیں وہاں ہوتی رہیں۔ ابھی وہ فرسٹ ایئر میں تھی جب اس نے اپنی جسمانی تبدیلی کو سمجھا تو پریشان ہو گئی۔ اس موضوع پر جب اس نے جمال سے بات کی تو وہ غائب ہی ہو گیا۔ وہ تو ایک بھنورا تھا جو پھول کا رس چوس کر اڑ گیا تھا۔

اب ایک اور پریشانی تھی بھلا ایسی باتیں ایسی تبدیلیاں ماں سے کہاں پوشیدہ رہتی ہیں۔ اس دن جب وہ اسکول سے واپس آئی تو اس کی والدہ نے اس سے اس کے بارے میں پوچھا۔ صفیہ کی والدہ کو شک تو پہلے بھی تھا مگر سب کچھ جان کر ان میٹر گھوم گیا جو منہ میں آیا وہ کہا اور جو ہاتھ میں آیا صفیہ کے مارا آخر کہاں تک' بوڑھی تھی تھک گئی۔ تب بیٹھ کے رونے لگی بہر حال اس سے جہاں صفیہ کے گورے بدن پر نیل پڑے وہاں ماں کے دل میں ایک روگ بیٹھا۔ چند دن بعد اس کی والدہ اسے ایک لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے گئی جس نے دس ہزار لے کر اسے اس کے گناہ سے نجات دلائی۔ یوں یہ گھر بد نامی سے بچ گیا۔ حتیٰ کہ صفیہ کے اس کارنامہ کا کسی کو پتہ نہ چلا تھا۔ صفیہ کی شادی میں پھر دیر نہیں لگائی گئی۔ یوں اقبال جیسا سانولے رنگ کا بے روزگار شخص صفیہ جیسی پری شہر سے گاؤں بیاہ لایا۔ جس کے بارے میں اس کی بہنوں راشدہ، نسیم اور ماں کا خیال تھا کہ وہ چندے آفتاب چندے مہتاب میڈ ٹو آرڈر ہو ڈیفیکٹ، زیرو پوائنٹ ہے۔

صفیہ نے شادی کے تین ماہ بعد اپنے خاوند کو اس کے ماں باپ سے الگ کرلیا تھا۔ اس کے لیے ہر روز ایک تماشا لگایا اس نے گھر میں۔ علیحدہ مکان میں وہ سارا دن اکیلی رہتی۔ اس کا خاوند سارا دن فوجی والا کے موڑ پر سائیکلوں کے پنکچر لگاتا تھا۔

میری سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ یہ بہوئیں ماں باپ سے اس کا بیٹا کیوں چھین لیتی ہیں۔ اچھا خاصا مرد جو کہ بیٹا ہوتا ہے ایک بھائی ہوتا ہے وہ رن مرید کیوں بن جاتا ہے کچھ تو مجبوریاں بھی رہی ہوں گی۔ اقبال صاحب نے رن مریدی کے وہ ریکارڈ قائم کیے جن کی مثال ہمارے گلی کوچوں ہمارے خاندانوں میں اکثر مل سکتی ہے۔ جی ہاں اکثر مل جاتی ہے۔ ایک برس بعد کشور اور پھر دو برس بعد افضل کی پیدائش ہوئی۔ اقبال کے پھوپھی زاد بھائی حیدر کا روز اول سے ہی صفیہ سے ٹانکا فٹ تھا۔ اب بھی ہے۔ اسی لیے میں نے تم سے کہا کہ یہ صفیہ بڑی میسنی ہے۔ خالہ کلثوم نے یہ ساری کہانی مجھے سنائی۔ اس دوران ناہید نے چائے پلائی۔ کچھ سوال میرے اندر ڈنک مار رہے تھے۔ میں نے خالہ کلثوم سے پوچھا۔

”آپ کو کیسے پتہ کہ آنٹی صفیہ جمال نامی شخص سے ملتی رہی ہے؟“ انہوں نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بتایا۔

”جمال اپنے جس دوست کے گھر صفیہ سے ملتا تھا وہ میرے بھائی کا ہی تو گھر تھا۔“ میں نے حیران ہوکر پوچھا۔

”آپ کے بھائی کا۔“ انہوں نے عام سے لہجے میں بتایا۔

”جمال میرا کزن ہے' آج کل لندن میں ہے۔“ وہ ایک لمحے رکی اور بولی۔

”صفیہ کی امی کو دس ہزار روپے۔ میری بھابھی کے ذریعے ملے تھے جو اسے جمال نے دیئے تھے۔ جمال اور میرا بھائی دوست تھے اور یہ سب راز داں تھے مجھے یہ سب میری بھابھی نے بتایا تھا۔“ میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

”انہوں نے آپ کو کیوں بتایا؟“

”دیکھو خرم! تم ایک شریف گھرانے سے تعلق رکھتے ہو اور ہمارے سامنے ہی جوان ہوئے ہو۔ مجھے تمہارا ان کے گھر جانا اچھا نہیں لگا۔ پہلے تو میں نے سوچا تھا کہ شاید تم کشور کی وجہ سے وہاں جاتے ہو آخر وہ بھی ماں جیسی ہوگی لیکن پھر مجھے علم ہوا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ تم صرف افضل کے دوست ہو۔ میں نے سوچا۔ تمہیں خبردار کردوں اس لیے بتایا ہے سب کچھ لیکن میں بدنام بھی نہیں ہونا چاہتی' مجھے لگتا ہے تمہیں میری کسی بات کا یقین نہیں آیا۔“ میں نے جلدی سے تردید کردی۔

”نہیں' نہیں ایسا نہیں...... میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ آپ کو ان سب باتوں کا کیسے علم ہے۔ اور میں نے آپ سے پوچھ لیا؟“

”اچھا سنو' میری بھابھی کو اس دن بھائی ہمارے گھر چھوڑ جاتا تھا جس دن صفیہ اور جمال نے ان کے گھر ملاقات کرنا ہوتی تھی۔ ایک بار میں نے بھابھی سے اس کی پریشانی کی وجہ پوچھی تو اس نے صاف صاف سب کچھ بتا دیا کہ ”تمہارا بھائی غلط راستے پر چل رہا ہے۔ پھر اس نے مجھے صفیہ اور جمال بارے سب کچھ بتایا۔“

میں نے کہا۔ ”اچھا اچھا تو اس طرح آپ کو ان باتوں کا علم ہے۔“ اس کے بعد میں وہاں زیادہ دیر رکا نہیں جب ان کے گھر سے میں نکل رہا تھا تو مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے میری کمر پر کوئی چھپ رہی ہو دل چاہتے ہوئے بھی میں نے واپس مڑ کر نہیں دیکھا۔

☆☆☆☆

کشور کی شادی اس کے والد محمد اقبال کی وفات کے دو سال بعد ندیم سے ہوئی۔ ندیم کشور کا تایا زاد تھا۔ جب تک اقبال زندہ رہا ان سے ان کے رشتے داروں کا میل ملاپ زیادہ نہیں تھا۔ اقبال صاحب کی وفات کے بعد ٹوٹے ہوئے رشتے دار پھر سے افضل کے گھر میں آنے جانے لگے تھے۔ شائد اس کی وجہ کشور کا رشتہ ہی تھا۔ بلکہ ندیم کے والدین نے افضل اور کشور پر سرپرستی کا ہاتھ رکھ دیا تھا۔ آنٹی صفیہ اقبال صاحب کے رشتے داروں کو زیادہ پسند نہیں کرتی تھیں۔ اس کا اظہار انہوں نے کئی بار مجھ سے کیا بھی تھا۔ افضل کے ایک چچا نوردین نے کشور کی شادی کا جہیز بھی دیا تھا۔ میں نے خود کشور کی شادی میں شرکت کی تھی۔ میرے گھر والوں کے علاوہ محلے بھر نے اس شادی میں شرکت کی تھی۔ آنٹی کو ندیم کا رشتہ پسند نہیں تھا۔ اس کی وجہ ندیم کا کشور کا تایا زاد ہونا تھا لیکن یہ منگنی اقبال صاحب مرنے سے قبل کر گئے تھے اور کشور کے علاوہ افضل کو بھی یہ رشتہ پسند تھا اس لیے خوش اسلوبی سے شادی ہو گئی۔۔ اس شام جب کشور اپنے گھر کی ہو گئی تھی۔ میں اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔ جب نذیر آیا اور اس نے یہ بتا کر مجھے حیران کر دیا کہ وہ کشور سے پیار کرتا تھا۔ مجھے پہلے تو نذیر احمد پر بہت غصہ آیا آخر میں کشور کو بہن سمجھتا تھا بلکہ وہ تھی میرے دوست کی بہن۔ دوست غدار نہیں ہونا چاہیے مگر میں نے برداشت کیا اور سوچا۔

"خرم! نذیر احمد تیرے جذبات واحساسات سے واقف نہیں ہے تو اس سے ناراض ہوگا تو زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا۔ کہ وہ بھی اٹھ کر چلا جائے گا یا معافی مانگ لے گا۔ مگر اس سے جو حقیقت ہے وہ بدل نہیں جائے گی۔ اس حقیقت کو برداشت کرو نہ جانے اس وقت یہ خیال میرے دماغ میں کیوں آیا کہ کشور کون سی میری سگی بہن ہے۔ میں خود پر ملامت کرتا رہا ۔ یہ سوچ بھی آئی کہ اگر کشور سگی بہن ہوتی تو کیا نذیر احمد کی ہمت ہوتی کہ ایسی بات میرے سامنے کر سکتا یا میں کسی کی ایسی بات برداشت کر سکتا۔ میں کہا کرتا تھا کہ خون کے تو گروپ ہوتے ہیں A گروپ، B گروپ منفی، اصل رشتے تو زبان اور جذبات کے ہوتے ہیں اور کشور سے زبان کا رشتہ ہے۔ یہ بات بے شک سچ تھی لیکن اتنی بھی نہیں۔ ایسی باتیں سوچتے ہوئے میں خاموش رہا اس دوران نذیر احمد اپنی اور کشور کی محبت کی داستان سنا تا رہا تھا۔ اس نے اپنی اور کشور کی محبت کی داستان کچھ اس طرح سنائی کہ میرا دل بھر آیا تھا۔

میں نے اسے تسلی اور حوصلہ دیا۔ ایک بات بڑی حیرت انگیز تھی کہ میں جو خود کو پورے محلے کا سب سے باخبر فرد سمجھتا تھا۔ کشور اور نذیر کی محبت سے بے خبر رہا تھا۔ میں ایسے ہی بے خبر تھا جیسے افضل بے خبر تھا۔ اصل میں اکثر بھائی بہنوں کے ایسے معاملات سے بے خبر ہی رہتے ہیں۔ اس دن میں نے نذیر کی ساری داستان سنی اور اسے حوصلہ دیا۔ آخر مریضان عشق کی عیادت بھی تو ثواب کا کام ہے۔ مجھے حیرت اس بات کی تھی کہ کشور ایسی لگتی تو نہ تھی۔ مگر میرے سوال کے جواب میں نذیر نے کہا تھا۔ یار یہ سب ڈھونگ ہوتے ہیں یہ لڑکیاں اندر سے کچھ اور باہر سے کچھ اور ہوتی ہیں۔ اور یار رکھنا جس طرح یہ خود کو ظاہر کرتی ہیں۔ حقیقت میں اس کے برعکس ہوتی ہیں۔

ہر لڑکے کی بہن باعصمت ہوتی ہے۔ بیٹی بھی شریف ہوتی ہے۔ بیوی بھی باکردار ہوتی ہے۔ ماں تو پرستش کی جگہ اور معاشرے کا ہر فرد نہیں تو مردوں کی اکثریت دو چار عشق ضرور کرتے ہیں۔ ان کی زندگی میں ایک یا دو ایسی لڑکیاں ضرور ہوتی ہیں جن کے بارے میں لطیف جذبات رکھتے ہیں۔ جن سے وہ عشق کرتے ہیں وہ لڑکیاں کسی کی بہن ہوتی ہیں۔ وہ کسی کی بیٹی ہوتی ہیں۔ وہ کسی کی بیوی ہوتی ہیں۔ وہ کسی کی ماں بھی ہو سکتی ہے۔ یہ راز ہے اس راز میں پردہ ہے۔ یہ پردہ اللہ تعالیٰ کا قانون ہے۔ ورنہ دنیا تباہ و برباد ہو جائے۔ کوئی کسی رشتے پر اعتبار نہ کرے۔

☆☆☆☆

اب کشور اپنے گھر کی ہو چکی تھی۔ افضل صبح کام پر جاتا اور شام گئے واپس آتا تھا۔

ان دنوں جمعہ المبارک کی چھٹی ہوتی۔ میں افضل کے ہاں چلا آیا تھا افضل شہر گیا ہوا تھا۔ میں نے آنٹی کو سلام کیا۔ انہوں ہلکی سی بے رخی سے جواب دیا اور کہنے لگیں۔

"افضل تو گھر پر نہیں ہے۔" میں دروازے پر ہی کھڑا تھا ۔

"کہاں گیا ہے افضل آپ کو بتا کر تو گیا تھا۔"

"میں نے ہی اسے شہر سے کچھ سامان لینے بھیجا ہے۔"

وہ بے چینی سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھیں، میں نے تفکر کے

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

سائے ان کے چہرے پر محسوس کیے۔

”آنٹی خیر تو ہے ناں“ میں نے پوچھا تھا۔ وہ جلدی سے بولیں۔

”ہاں ہاں کچھ نہیں۔ افضل تھوڑی دیر میں آ جائے گا۔“ میں نے سوچا جو بھی ہو آنٹی اس وقت پریشان ہے مجھے پھر آنا چاہئے جب افضل واپس آ جائے گا۔ میں وہاں سے چلا آیا۔ میں افضل کے گھر سے واپس آ رہا تھا جب صفدر صاحب صفیہ آنٹی کے گھر کی طرف جا رہے تھے میرے سلام کا جواب انہوں نے مسکراہٹ سے دیا تھا۔ مجھے خالہ کلثوم کی کہی ہوئی باتیں یاد آئیں۔ اس وقت آنٹی گھر میں اکیلی ہی تھیں۔

اس طرح اکثر صفدر کو افضل کے ہاں آتے جاتے دیکھا گیا اس دن ہی نہیں اس سے قبل بھی میں نے سیکڑوں بار ان کو ایک دوسرے سے ملتے دیکھا تھا۔ درجنوں بار آنٹی صفیہ انکل صفدر کے ساتھ بازار، دوسرے گاؤں، رشتے داروں کے ہاں گئی تھیں۔ ان پر شک نہیں تھا اس لیے بھی کسی نے اہمیت نہ دی تھی، پھر دوسری بات یہ کہ وہ کسی کو اہمیت نہیں دے رہے تھے کہ کوئی کیا کہے گا۔ اب ان کے بچے جوان ہو چکے تھے اس لیے بھی لوگ شاید شک نہیں کرتے تھے۔ وجہ جو بھی ہو مجھے اس دن خالہ کلثوم سے مل کر شک ہونے لگا۔ نہ صرف میں نے بلکہ محلے کی بہت سی عورتوں اور مردوں کو بھی ان پر شک تھا۔

مجھے خالہ پر اعتبار تھا۔ صفدر علی کا کافی عرصے سے ان کے ہاں آنا جانا رہا تھا۔ وہ ایک سلجھا ہوا مرد نظر آتا تھا۔ اس کے چہرے پر بڑی بڑی آنکھیں ذہانت کی عکاس تھیں۔ وہ بات کرنے کا فن جانتا تھا۔ اس سے میری اکثر اصغر کے حمام میں ملاقات ہو جاتی۔ وہ بہت اچھے شعر سناتا تھا مجھے بہت پسند آیا تھا۔ مجھے کیا علم ہے کہ وہ یہ شعر کس خیال کے تحت سنا رہا ہے۔

ممکن ہو تو فرض عشق پورا کر لیں
ممکن ہو تو دل میں درد پیدا کر لیں

یہ 87 کے اختتام کی بات ہے ان دنوں میں ناہید کے عشق میں گوڈے گوڈے ڈوب چکا تھا۔

میں صبح سے شام بلکہ رات گئے تک گاؤں کے حالات سے باخبر رہتا تھا۔ کون کیا کر رہا ہے۔ کون کتنی مرتبہ کس گلی سے گزرا ہے اور کس کس نے چلمن سے اسے دیکھا ہے۔ کون کس سے عشق فرما رہا ہے وغیرہ وغیرہ مجھے یہ سب علم ہوتا تھا۔

بے شک کہ مجھے کلثوم آنٹی کی بات پر یقین نہیں آیا تھا مگر شک کے بیج کو اس نے بو دیا تھا۔ میں بہت پریشان ہو گیا تھا۔ یہ بات میں کسی نے کہہ بھی سکتا تھا۔ خود ہی سوچتا رہا آنٹی صفیہ بیوہ عورت ہے۔ جوان ہے اس کے دل میں بھی خواہشات جنم لیتی ہوں گی۔ جنسی بھوک، پیٹ کے بھوک کے بعد دوسری بڑی حقیقت ہے۔ ان خواہشات کو، ضرورت کو وہ کیسے دبا پاتی ہوگی۔ اس لیے اسلام میں بیوہ سے شادی کا حکم دیا ہے۔ اس لیے دوسری، تیسری شادی کا حکم ہے۔ ہمارے معاشرے میں نکاح پر پابندی نے، دوسری شادی کے مشکل ہونے نے، زنا کا راستہ کھول دیا ہے۔ ہم نے اپنے اوپر خول چڑھا لیا ہے۔ ہم سب اچھا سننا پسند کرتے ہیں۔ جو آئینہ دکھائے ہم اسے برا کہتے ہیں۔ میں خود دلیلیں دیتا رہا اور خود کو ہی ملامت کرتا رہا۔ دل چاہتا تھا کہ جاسوسی کروں۔ مگر خود کو باز رکھا اور سمجھایا انسان کو دوسروں پر شک کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ ایک دوسرے کی ٹوہ سے روکا گیا ہے۔ پھر دوسروں کو روکنے کے لیے انسان کا خود اچھا ہونا ضروری ہے اور ہم تو خود ہی اچھے کردار کے نہ تھے تو دوسروں کو بھلا کیسے نصیحت کرتے۔ میں خود ناہید کے سامنے دل ہار بیٹھا تھا۔ ناہید جو خود مجھ سے چھپ چھپ کر ملتی تھی وہ صفیہ کی برائیاں کرتی تھی۔ صفدر شادی شدہ تھا تین بچوں کا باپ تھا۔ شہر میں اچھا کاروبار تھا افضل کا چچا لگتا تھا۔ یعنی اقبال مرحوم کا پھوپھی زاد بھائی تھا۔ اور اقبال کا بہترین سے بھی بہترین دوست تھا۔ جب اقبال زندہ تھا تو بھی اس کا آنا جانا تھا۔ پہلے ناہید کی امی نے اور بعد ازاں ناہید نے مجھ سے ایسی بات کی تھی۔ ورنہ کوئی اس بات کو سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ افضل صفدر کو انکل کہا کرتا تھا۔ وہ ایک معزز آدمی شمار ہوتا تھا۔ آپ جانتے ہی ہیں آج کل معزز اسے کہتے ہیں جس کے پاس دولت ہو۔ بہر حال وہ معزز تھا۔ صفیہ کے گھر میں باقاعدہ صفدر کی آمد و رفت شروع ہوگی۔ صفیہ کے شوہر کی بے وقت موت۔ تنہائی۔ رشتہ داروں سے کٹی ہوئی اور جوان عورت تھی۔ صفیہ کے بارے میں میں قبل لکھ چکا ہوں کہ وہ عمر کی چور تھی ویسے بھی اس کی کیا عمر تھی پینتیس سال۔ صفدر کا سب سے قریبی دوست اصغر تھا۔ جس کا شہر میں اس کا حمام تھا

وزیر اعلیٰ پنجاب

1998ء کے شروع میں وزیراعلیٰ پنجاب جناب شہباز شریف بھل صفائی کے سلسلہ میں قصور گئے تو انہوں نے ایک گورنمنٹ پرائمری سکول کا دورہ کیا۔ اسکی پانچویں جماعت کے سترہ بچوں میں سے کسی کو معلوم نہ تھا کہ پاکستان کا دارالحکومت کہاں واقع ہے۔ حتیٰ کہ کوئی بچہ بانی پاکستان کا نام بھی نہ بتا سکا۔ وزیراعلیٰ نے پوچھا "نواز شریف کون ہے۔" تو ایک بچے نے معصومیت سے جواب دیا "بابرہ شریف کا بھائی۔"

جنرل فیض چشتی

جنرل فیض علی چشتی بیان کرتے ہیں جنرل ضیاء الحق کے ہمراہ ہم فرانس کے دورے پر گئے، وفد کے ارکان کو ایک اعلیٰ ہوٹل میں ٹھہرایا گیا۔ اسی شام جنرل ضیاء الحق کے دروازے پر دستک ہوئی، صدر مملکت نے دروازہ کھولا تو دیکھا کہ دروازے پر سفید وردی میں ملبوس ایک گورا کھڑا ہے۔ جس کے کندھے اور سینے پر کافی تمغے اور پٹیاں لگی ہوئی تھیں۔ صدر مملکت اسے دیکھ کر فوراً تپاک سے ہاتھ ملایا، بغلگیر ہوئے اور اسے اندر آنے کی دعوت دی۔ علیک سلیک اور خیر خیریت دریافت کرنے کے بعد صوفے پر بٹھایا اور فرانس کے قومی حالات اور فرانس پاکستان فوجی تعاون پر بات چیت شروع کی۔ چند منٹوں کے بعد گورے شخص نے کہا "جناب مجھے آپ کی باتیں سمجھ نہیں آرہیں۔ لیکن پھر بھی میرے لائق جو خدمت ہے وہ بتائیں میں حاضر ہوں" جنرل ضیاء الحق حیران ہو گئے اور اب اس شخص کا تعارف پوچھا۔ جس پر گورا بولا "جناب میں اس ہوٹل کا بیرا ہوں اور آپ کی سروس کے لیے آیا تھا۔ کوئی خدمت ہو تو بتائیے" جنرل چشتی بیان کرتے ہیں کہ یہ سن کر صدر ضیا الحق بڑے شرمندہ ہوئے۔ اس گورے کو رخصت کیا اور بعد میں، میں نے صدر مملکت سے پوچھا۔ آپ نے اس بیرے کو کیا سمجھا تھا۔ جنرل صاحب کہنے لگے۔ "میں سمجھا تھا فرانسیسی بحریہ کے ایڈمرل ملاقات کے لیے آئے ہیں۔" اسکے بعد ہم دونوں جنرل ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوتے رہے۔

بے نظیر بھٹو

بےنظیر بھٹو جب 1993 میں دوسری بار وزیراعظم بنی تو انہوں نے پی پی کے سردار فاروق لغاری کو صدر پاکستان منتخب کروایا۔ جب چاہتی لغاری صاحب کو اپنے پاس طلب کر لیتی تھیں۔ پہلے انہیں مسٹر لغاری اور بعد مسٹر پریذیڈنٹ کہہ کر پکارتی تھیں۔ عینی شاہدین کے مطابق جب آخری دور میں دونوں میں اختلافات عروج پر پہنچ گئے تو بینظیر خود چل کر ایوانِ صدر گئیں اور لغاری صاحب سے ملاقات میں انہیں "بھائی لغاری" کہہ کر مخاطب کیا۔ فاروق لغاری نے کہا "میڈم۔ یہ ملاقات وزیراعظم اور صدر مملکت کے درمیاں ہے۔ بہن بھائی کے درمیان نہیں۔ اس لیے بھائی بھائی کی بجائے سیاسی حالات پر بات کیجئے۔" تاکید کے باوجود بھی جب بینظیر بھٹو "بھائی لغاری" کہنے سے باز نہ آئیں تو فاروق لغاری اٹھ کھڑے ہوئے۔ اپنی اہلیہ کو بلا کر کہنے لگے "تمہاری نند آئی ہیں۔ ان سے گپ شپ لگاؤ۔ میں ضروری کام سے آفس جا رہا ہوں" اور گاڑی میں بیٹھ کر باہر چلے گئے۔ اس کے تھوڑے دن بعد ہی صدر لغاری نے بینظیر کی حکومت توڑ کر نگران حکومت بنا ڈالی۔

معراج خالد کی سادگی

معراج خالد مرحوم نگران وزیراعظم بنے تو انہوں نے قوم کو سادگی سکھانے کے لیے اپنے لیے ہر قسم کا سرکاری پروٹوکول منع کر دیا۔ ایک دن وہ مال سے گذر رہے تھے کہ دیکھا کہ پولیس نے ہر طرف ٹریفک جام کر رکھی ہے۔ آدھا گھنٹہ انتظار کے بعد انہوں نے گاڑی کے قریب گذرتے ایک پولیس کانسٹیبل سے پوچھا "بھائی۔ پچھلے آدھے گھنٹے سے ٹریفک کیوں بند ہے؟۔ کانسٹیبل نے انہیں پہچانے بغیر کہا "جناب گورنر پنجاب خواجہ رحیم گذر رہے ہیں" ملک معراج خالد نے موبائل پر خواجہ رحیم سے رابطہ کیا اور کہا کہ "آپ کے پروٹوکول میں میں بھی پھنسا ہوا ہوں۔" خواجہ رحیم نے قہقہہ لگایا اور کہا "ملک صاحب۔ معذرت لیکن اب تو میرے گذرنے کے بعد ہی ٹریفک کھلے گی اور میرے گذرنے میں ابھی 1 گھنٹہ باقی ہے" چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ خواجہ رحیم کا قافلہ کافی دیر بعد گزرا اور سادگی پسند وزیراعظم صاحب کی گاڑی کو 2 گھنٹے کے بعد آگے بڑھنا نصیب ہوا۔

جاوید چوہدری کی فیس بک ٹائم لائن سے کاپی

انتخاب: نورالدین...... کراچی

۔ وہ دونوں رازداں تھے۔ ان باتوں کا مجھے بعد میں علم ہوا تھا لیکن کہانی کے تسلسل کو قائم رکھنے کے لیے میں اسے ترتیب سے بیان کر رہا ہوں۔

☆☆☆

جب اقبال کی شادی صفیہ سے ہوئی تھی اس دن اس نے صفیہ کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھا تھا۔ جس کا مطلب صفیہ جانتی تھی مگر صرف مدعا کبھی صفدر زبان پر نہ لایا تھا۔ صفیہ بھی ایک غلطی قبل اس کے کر چکی تھی۔ اس لیے اب محتاط تھی۔ مجھے یہ تمام باتیں صفدر کے جگری یار اصغر سے معلوم ہوئی تھی۔ جب اقبال فوت ہو گیا تو ان دنوں صفدر کا آنا جانا بڑھ گیا تھا۔ افضل اسے کبھی ماموں کبھی چچا کہا کرتا تھا۔ صفدر بھی افضل کا بہت خیال رکھتا تھا۔ صفدر شام پانچ دوکان بند کرتا اور صفیہ کے ہاں آ جاتا تھا۔ اس کے پاس موٹر سائیکل تھا۔ کبھی کبھی وہ دو تین گھنٹے بیٹھ کر چلا جاتا۔ ورنہ اکثر وہ ایک گھنٹا بعد ہی چلا جاتا۔ اس دوران افضل بھی گھر آ جایا کرتا تھا۔ ایک تو اقبال کی موت صفیہ کی تنہائی اور پھر صفدر جیسا دم ساز غمگسار جو کہ چرب زبان بھی تھا۔ صفدر نے اپنے دوست اصغر کے سامنے اعتراف کیا کہ اس نے غیر محسوس طریقے سے صفیہ کے گرد جال تنگ کیا اور اس نے بھی کبھی اس کی باتوں شرارتوں ذو معنی فقروں کا برا نہیں منایا تھا۔ اب اس نے محسوس کیا کہ صفیہ بھی اس میں دلچسپی لے رہی ہے وہ اس کی تعریف کیا کرتا۔ اس کے لیے تحفے لایا کرتا تھا۔ اس بات کو بعض عورتوں نے محسوس کیا تھا۔ مگر چونکہ ناہید میرے زیادہ قریب تھی اس لیے اس نے مجھ سے ذکر کیا تھا۔ عورتوں کی ایک عادت ہوتی ہے کہ وہ دوسری عورتوں کے بارے میں بہت زیادہ تجسس کا شکار رہتی ہیں اور ان کے پاس وقت گزارنے کے لیے یہ بہترین کام ہوتا ہے۔ بعض دوسروں کے بارے میں عیب تلاش کرنا اور ان کو بڑھا چڑھا کر دوسری عورتوں میں بیٹھ کر بیان کرنا اور اپنے آپ کی تعریف کرنا کہ وہ دوسروں کے گھروں کے اندر کے حالات سے کتنی باخبر ہیں ۔ صفیہ نے کبھی نہ سوچا کہ اس کا بیٹا ہے ایک بیٹی ہے جذبات نے عقل پر پردہ ڈال دیا اور ایک دن دوپہر کو وہ سب ہو گیا جو صفدر کا منشا تھا اور صفیہ کا فطری جذبہ۔ صفدر نے اصغر کو بتایا تھا کہ وہ صفیہ سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے خاندان، لوگ کیا کہیں گے کا ڈر اور دونوں کی اولاد ہونے کی وجہ نے ان کو روکے رکھا۔ کوئی عورت سوکن برداشت نہیں کرتی، سوکن بننا بھی نہیں چاہتی۔ انہی معاشرتی رسم و رواج نے انہیں برائی کی طرف مائل کیا۔

گناہ کی طرف صرف پہلا قدم مشکل ہوتا ہے عورت کردار کی جتنی بھی مضبوط ہو۔ جب گھنٹوں مرد کے ساتھ رہے تو بہک جانا لازم ہے۔

ویسے بھی عورت کی نفسیات ہے کہ وہ اس کو اپنا سب کچھ ہار دیتی ہے۔ جس سے اس کی ملاقات ہو سکتی ہے۔ اس کے لیے مرد کی عمر، رنگ سماجی رتبہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اس طرح مزید چھ ماہ گزر گئے۔ صفدر صفیہ کو اس دوران پیسے بھی دیتا رہا تھا۔ کشور کے سسرال بھی ان کی مدد کرتے تھے اور پھر صفیہ نے ایک گرلز سکول میں آیا کی بھی نوکری کر لی تھی۔ افضل بھی پیسے کمانے لگا تھا۔ گھر کا خرچہ چل رہا تھا۔ صفیہ نے اگر صفدر کے ساتھ جسمانی تعلقات استوار کر لیے تھے تو اس کی وجہ اس کی غربت نہیں تھی یہ صفدر اس کی مالی امداد تو کرتا تھا۔ مگر صفیہ نے دولت کے لیے اپنا جسم نہیں بیچا تھا۔ اگر اس کے حالات اتنے برے نہیں تھے کہ جسم و روح کا رشتہ برقرار رکھنا مشکل ہو جاتا۔ ہم نے ایسی بھی عورتیں دیکھی ہیں جو بھوکی سو جاتی ہیں۔ مگر خود کو اپنے کردار کو داغ دار نہیں کرتیں۔ اس کی وجہ کچھ اور تھی وہ وجہ فطری جذبہ ہی ہو سکتا ہے۔

☆☆☆☆

پھر ایک دن وہی ہوا جو ہونا تھا۔ جو ایسے معاملات میں اکثر ہوتا ہے۔ اس دن افضل گھر بتا کر گیا تھا کہ وہ ندیم (اپنی بہن کشور) کے گھر جائے گا اور شام کو گھر لیٹ آئے گا۔ ابھی شام کے سات ہی بج رہے تھے۔ جب افضل گھر میں داخل ہوا تھا۔ اس نے کشور کے گھر جانے کا پروگرام ملتوی کر دیا تھا کہ دوسرے دن جائے گا۔ باہر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ خاموشی سے چلتا ہوا اس کمرے میں پہنچا جہاں اس کی ماں سوتی تھی۔ وہاں اس نے جو قدم رکھا تو...... اس پر آسمان ٹوٹ پڑا اس کی ماں اور صفدر اس حالت میں تھے کہ انہیں کوئی خبر نہ ہوئی جس لمحے ان کو کمرے میں کسی تیسرے فرد کی موجودگی کا احساس ہوا۔ صفیہ نے گردن اٹھا کر دیکھا اور گنگ رہ گئی۔ اسی لمحے افضل واپس پلٹ آیا۔ اس کے سامنے زمین اور آسمان گڈ مڈ ہوئے آپس میں ٹکرائے۔ ذہنی فضا میں دھواں بھر گیا اس نے جو منظر دیکھا تھا۔ اس کے بعد بھلا وہ

کیسے ہوش وحواس میں رہ سکتا تھا۔

ہوا یہ تھا کہ تھوڑی دیر پہلے صفدر گھر آیا تھا۔ اس نے سوچا ہوگا موقع اچھا ہے پھر شاید نہ ملے ویسے بھی شیطان تو شیطان ہے انہوں نے صفیہ کو کہا ہوگا صفیہ نہ مانی ہوگی مگر ان کے تعلقات ایسے تھے کہ وہ اسے منا سکتا تھا۔ صفیہ نے سوچا ہوگا ۔کیا ہے تھوڑے سے کی تو بات ہے۔ ایسا ہی ہوا ہوگا مگر پھر وہ ہوگیا جو ان دونوں میں سے کسی نے نہ سوچا ہوگا انہوں نے تمام احتیاط بلائے طاق رکھ دی تھی حتی کہ باہر کا دروازہ بھی کھلا ہی رہ گیا تھا۔

ادھر کافی دیر تک صفدر کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے۔ وہ اٹھا اور گھر سے نکل گیا۔ صفیہ کی حالت بہت خراب تھی پچھتاوا اور دکھ بیٹے کی نظروں سے گرنے کا صدمہ اور احساس گناہ اس پر سوچوں کا اتنا اثر ہوا کہ وہ روئی بھی نہیں شائد بدنامی کے ڈر سے وہ بکھری بکھری ایک طرف گر پڑی صفدر جلدی سے گھر نے نکل گیا اور سیدھا اصغر حمام والے کے پاس جا پہنچا کہ اسے بتا کر مشورہ کر سکے۔

صفیہ کے لیے زندگی موت سے بدتر ہو چکی تھی۔ اب وہ بیٹے کا سامنا کیسے کرتی۔ افضل نے ایک مرتبہ مجھے بتایا تھا کہ اس کی ماں بہت بہادر ہے۔ ایک خنجر اپنے سرہانے رکھ کر سوتی ہے۔ آج اس نے وہ خنجر اٹھایا اور اپنے پیٹ میں گھونپ لیا اس لمحے خدا جانے اس کے ذہن میں کیا چل رہا تھا۔ شاید افضل کا خیال ہو شاید صفدر کا شاید آگے آنے والے حالات کا۔ اس نے خنجر پیٹ میں مار تو لیا مگر درد ناقابل برداشت تھا اس کی ایک طویل درد میں ڈوبی ہوئی چیخ نکل گئی پھر وہ چیختی چلی گئی، تڑپتی چلی گئی، اس کی چیخوں نے پرسکون محلے میں ایک کہرام مچا دیا۔ وہ درد سے تڑپتی جا رہی تھی جب پڑوسی وہاں پہنچے۔

اس نے جو آخری الفاظ کہے وہ تھے افضل ......اور گردن لڑھک گئی اس نے کم از کم پانچ منٹ تڑپ تڑپ کر جان دی تھی۔ اس کا تصور کیا جا سکتا ہے کہ وہ کس کرب میں سے گزری تھی۔ پورے گاؤں کی فضا ایک دم سوگوار ہو گئی۔ جو سو رہے تھے وہ بھی اٹھ کر آ گئے۔ سب کے چہروں پر سوال تھے حیرت تھی۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ کچھ سمجھ دار عورتیں صفیہ کی لاش کو سنبھال رہی تھیں کچھ مردوں نے ان کے خاندان بھر میں یہ اطلاع پہنچا دی تھی۔ مگر ایک سوال اپنی جگہ موجود تھا کہ! صفیہ نے خودکشی کیوں کی؟ ہمارا گھر افضل کے گھر سے کافی دور تھا۔ رات کے دس بج رہے تھے۔ جب میں نے رسالہ ایک طرف رکھا اور صحن میں آ کر گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ مسجد میں اعلان ہوا تھا تو میں سناٹے میں آ گیا تھا۔ تیزی سے گھر سے باہر نکلا اور افضل کے گھر آ گیا۔

وہاں افضل کے تمام قریبی اقربا آئے ہوئے تھے۔ مگر افضل نہیں تھا۔ کچھ لڑکے اس کی تلاش میں بھی نکلے تھے۔ افضل کے اندر آگ بھری ہوئی تھی نفرت کا ایک الاؤ تھا اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا کرے۔ اس کے قدم جدھر اٹھے وہ ادھر چلتا گیا شاید اس لمحے اس کے اندر منتقی سوچوں کی یلغار ہو۔ وہ دور جانا چاہتا تھا۔ بہت دور وہ اب کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہا تھا۔ یک بیک اسے صفدر کا خیال آیا اس نے سوچا صفدر کو ختم کرنے کے بعد فرار ہو جائے گا مگر وہ یہ سب نہ کر سکا ۔کافی دیر تک گلیوں میں گھومتا رہا پھر گاؤں سے نکل گیا۔ اس نے بہت سے منصوبے بنائے اور رد کر دیے اس لمحے مسجد سے اس کی ماں کی (خودکشی) وفات کا ذکر ہوا تو وہ گنگ رہ گیا اس وقت وہ اسکول میں تھا گاؤں کے پرائمری اسکول میں۔ وہ وہیں بیٹھ گیا۔ اس کی سوچیں مفلوج ہو گئیں۔ جسم بے جان ہو گیا اس لمحے اس نے کچھ بھی نہ سوچا ہو شاید سوچا ہو یہ کیا ہوا؟ وہیں بیٹھا رہا وہ گھر نہیں آیا۔ وہ ڈرتا تھا لوگوں کے سوالوں سے۔ خود سے۔ بدنامی سے۔ ساری رات اس نے وہاں ہی کاٹ دی تھی۔ دوسری طرف صفدر کو بھی پتہ چلا مگر وہ خود نہ آیا۔ آتا بھی کیسے اس کی بیگم اور بیٹا اکبر اور بیٹی انجم آئی تھیں اور رونے والوں میں وہ سر فہرست تھیں۔ ادھر صف ماتم بچھی تھی سب سے زیادہ بری حالت کشور کی تھی۔ وہ سنبھالے نہ سنبھلتی تھی پہلے اس کا باپ فوت ہو گیا اب ماں نے خودکشی کر لی تھی۔ وہ بار بار بے ہوش ہوتی رہی مجھ سے یہ الم ناک منظر دیکھا نہ گیا میں وہاں سے واپس آ گیا تھا میرے ساتھ نذیر تھا "یار یہ سب برا ہوا ہے" ہاں میں اتنا ہی کہہ سکا مگر یہ سب کیسے ہو گیا؟ میں خاموش ہی رہا تھا۔

افضل اسکول سے صبح پانچ بجے اٹھا اور شہر آ گیا تھا۔ میں اسے اطلاع دینے کے لیے ڈھونڈ رہا تھا۔ مجھے ان سب باتوں کا علم نہیں تھا اس وقت۔ میں نے ہر جانے والی جگہ جہاں اس کا ملنا ممکن تھا اسے ڈھونڈا۔ لیکن وہ کہیں بھی نہ ملا۔ دوسرے دن دس بجے صفیہ کا جنازہ جا رہا تھا اور بہت سے

لوگوں نے اس میں شرکت کی تھی مگر ان میں افضل نہ تھا۔

☆☆☆☆

دن گزرتے گئے یہ راز راز ہی رہا کہ صفیہ نے خودکشی کیوں کی تھی۔ اس راز کو جاننے والے تین تھے ایک صفدر مگر وہ دوسرے تمام لوگوں کے ساتھ غم میں برابر کا شریک رہا تھا۔ دوئم صفیہ وہ اب قبر میں تھی۔ سوئم افضل وہ لاپتا تھا۔ وقت گزرتا گیا عورتیں باتیں بناتی رہیں ان کے پاس باتیں بنانے کے سوا ہوتا بھی کیا ہے۔ کشور کی حالت بھی سنبھل گئی۔ وقت پر ہر زخم کا مرہم ہوتا ہے۔

صفدر کا ایک دوست تھا اصغر میرا بھی ان کے ہاں آنا جانا تھا۔ صفیہ کی خودکشی سے قبل صفدر نے اصغر کو اپنے اور صفیہ کے مراسم کے متعلق فخر سے بتایا تھا۔ اس دن بھی صفدر پہلے اصغر سے ہی ملا تھا۔ اصغر نے ہی اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ وقتی طور پر منظر سے ہٹ جائے۔ اس نے ایسا ہی کیا تھا لیکن سوئم میں وہ شریک ہوا تھا۔ اسے پتہ چل گیا ہوگا کہ افضل کا کہیں اتا پتہ نہیں ہے پھر وقت کی گرد نے رفتہ رفتہ اس حادثے کو لوگوں کے ذہنوں سے کھرچنا شروع کر دیا کسی کو بھی افضل کے متعلق علم نہ تھا کہ وہ کہاں چلا گیا ہے رشتہ داروں نے تمام ضرورت کا سامان اٹھا کر کشور کو دے دیا اور مکان پر تالا لگا دیا۔ کشور کے خاوند ندیم ان کے والد اور کشور کے چچا نور دین، ماموں علی عباس نے، افضل کو ہر جگہ تلاش کیا جہاں اس کے ملنے کی امید تھی مگر لاحاصل۔

میرے ابو کو شہر فتح پور کے نزدیک ایک گاؤں میں سستی جگہ مل رہی تھی۔ ہمارے وہاں رشتہ دار بھی تھے یوں ہم نے اپنی جگہ بیچی اور وہاں منتقل ہو گئے۔ کشور کا گاؤں افضل کا گاؤں فوجی والا ہم سے 38 کلو میٹر دور تھا۔ گاؤں سے شہر آ کر میری اپنی مصروفیت بڑھ گئیں۔ نئے دوست نئے یار نئے لوگ تھے۔ یہاں میں نے کام بھی شروع کر دیا۔ پہلے ایک وکیل کا منشی رہا دو ماہ بعد منشی گیری چھوڑ دی۔ پھر ایک الیکٹریشن کی دوکان پر کام کیا۔ پھر ایک ہوٹل میں ویٹر رہا۔ وہاں بھی جی نہ لگا تو ایک ورکشاپ میں کام کرنے لگا۔ بہت جلد اکتا گیا۔ پھر ایک پکوڑوں کی ریڑھی لگائی۔ سات آٹھ سو جمع کیا اور کراچی چلا گیا۔ چار ماہ بعد لاہور تھا۔ مجھے ایک بے کلی ایک اضطراب ہر دم گھیرے رہتا۔ جب مشاغل معمول بن جائیں زندگی نظام اوقات اصول و ضوابط میں بٹ جائے۔ جب سونا جاگنا حتیٰ کہ سوچنا اور کام کرنا وقت کی پابندی میں آ جائے۔ تو مجھے اکتاہٹ ہونے لگتی ہے۔ جی تبدیلی کو چاہتا ہے۔ میں وہاں موجود ہوتا ہوں مگر نہیں ہوتا۔ خود کے رائیگاں جانے کا احساس شدید ہو جاتا ہے یہی سبب تھا کہ میں کوئی کام ٹک کر نہ کر سکا تھا۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ قبل جو حالات تھے وہی ہو گئے تھے میں دس بجے بیدار ہوتا ناشتہ کرتا اور آوارہ گردی کرتا۔ رات گئے واپس آتا اور رات گئے تک جاگتا رہتا۔ پانچ برس اور گزر گئے۔ میرے دوست نذیر احمد کی شادی تھی اور اس نے مجھے کارڈ لکھا تھا۔ چاروناچار میں تیار ہوا اور اس گاؤں میں جا پہنچا۔ جو کبھی میرا گاؤں تھا۔ ان گلیوں سے گزرتے ہوئے اک عجیب سا احساس ہوا۔ جیسے کچھ گم ہو گیا ہو۔ جانے پہچانے لوگ۔ کچھ دوست کام کے سلسلے میں پردیسی ہو گئے کچھ ابھی موجود تھے۔ کچھ لڑکیوں کی شادی ہو چکی تھی۔ بہرحال میں نذیر کے گھر پہنچا دوسرے دن بارات تھی۔ رات گئے باتوں باتوں میں افضل کا ذکر چل نکلا۔ نذیر نے بتایا کہ افضل ایک مرتبہ آیا تھا شام کو اور رات بھر اپنی بہن کے گھر رہا۔ دوسرے دن چلا گیا۔ کہاں چلا گیا کسی کو علم نہیں تھا۔ میں اٹھا اور ندیم کے گھر جا پہنچا۔ کشور گلے مل کے اتنا روئی، مجھے بھی رلا دیا۔ یہ رونا صفیہ آنٹی کے بچھڑنے کا تھا۔ یہ رونا افضل کے کھو جانے کا تھا۔

کشور کے ایک بیٹا ہوا تھا۔

میں رات گیارہ بارہ بجے وہاں سے اٹھ آیا اور بے مقصد گلیوں میں گھومتا رہا۔ اس گاؤں میں میں نے ایک عمر گزاری تھی میں پرائمری سکول میں گیا وہاں بیٹھ کر میں نے ماضی کو یاد کیا۔ اس گاؤں میں ہم نے بہت سے دوستوں سے محبت کی تھی حتیٰ کہ ہم کو گلیوں سے دیواروں سے بھی محبت تھی۔ اس گاؤں میں میری پہلی محبت کا گھر تھا۔ میرے جذباتی رشتے بہت تھے۔ اس گاؤں میں میں ٹہلتا رہا رات گزر گئی۔ نذیر احمد کے گھر میں خوشیاں ہی خوشیاں تھیں اور میرا دل گھبرا رہا تھا نذیر احمد کی شادی ہو گئی۔ میں اپنے شہر گھر واپس آنے سے قبل ایک مرتبہ پھر ندیم و کشور سے ملا۔ ناہید کے گھر گیا اس کے دن رکھے جا چکے تھے۔ اس کے ہاتھوں کی چائے پی۔ اس کی آنکھوں کی چمک کو آخری بار دل میں اتارا اور وہاں سے بھی

اٹھ آیا۔

کر دے نے پیار سارے گل ایہہ پرانی اے
لوکو سارے عاشقاں دی اِکو جئی کہانی اے

دوسرے دن میں اصغر سے ملا تو اس نے مجھے وہ سب کچھ بتایا جو اوپر لکھ چکا ہوں۔ میں یہ سن کر سناٹے میں آ گیا اس نے چائے پلائی اس دوران وہ شرمندہ سا دکھائی دیا۔ میں اس کے ذہنی کرب سے واقف تھا اس لیے کوئی ایسی بات یا سوال نہ کیا اس کا دوست صفدر ایک اچھا انسان تھا' بے شک وہ گناہ گار تھا۔ اصغر خود ایک اچھا انسان تھا۔ صفیہ گناہ گار تھی لیکن بہت اچھی عورت تھی۔ میں نے ان سب کو ان کی جگہ رکھ کر سوچا۔ مجھے کسی سے کوئی نفرت محسوس نہ ہوئی۔ سب نے اپنے اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کیا تھا۔ کر رہے تھے لیکن افضل کا کیا گناہ تھا۔ وہ کس ذہنی کرب و اذیت سے گزر رہا تھا۔ میں سوچ کر کانپ گیا اب اس کا ڈھونڈنا بہت ضروری تھا۔ لیکن وہ تھا کہاں۔ میں نے واپس آ کر ایک بار پھر اس کی تلاش شروع کر دی۔ ان دنوں میں ایک اسٹامپ فروش کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ اب میں نے فیصلہ کیا تھا کہ اسٹامپ فروش بن جانا ہے۔ میں نے اسٹامپ فروشی کا لائسنس حاصل کیا اور کچہری فتح پور میں بیٹھ گیا۔ خرم اسٹام فروش اینڈ وثیقہ نویس۔ اب گھر والے میری شادی کے لیے میرے پیچھے پڑ گئے تھے آخر میرے لاکھ انکار کے باوجود میں امی، ابو کے اصرار پر راضی ہوا پھر انہوں نے دیر نہیں لگائی۔ میری خالہ زاد شمیم میری بیوی بن کر میری زندگی میں آ گئی۔ اب زندگی ایک روٹین بن گئی۔ اللہ نے ایک سال بعد مجھے ایک بیٹا دیا۔ زندگی ایسے ہی گزر رہی تھی۔

یہ 2006 کی بات ہے۔ ایسا ہی ایک دن تھا۔ اچھی خاصی گرمی تھی۔ میں اپنی کرسی پر بیٹھا ایک بیان حلفی لکھ رہا تھا۔ اسی وقت دو افراد میرے پاس آ پہنچے۔ میں نے پہلی نظر میں انہیں گاہک ہی سمجھا۔ اور روایتی لہجے میں پوچھا۔

”جی بتائیں۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے ان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا۔ سرسری سی اس نظر میں مجھے چالیس سال کا ایک آدھے سفید سر کا خوبصورت مرد نظر آیا لیکن لاشعور نے ایک جھٹکا دیا۔ میں نے دوبارہ دیکھا۔ تو دیکھتا رہ گیا میرے اندر ایک نام گونجا افضل اور یہ ہی نام زبان پر آ گیا میں نے کام چھوڑا اور اٹھ کھڑا ہوا وہ افضل ہی تھا۔ اس نے بھی مجھے پہچان لیا تھا۔ ہم دونوں صدیوں کے بچھڑے گلے ملے میں نے کام سے چھٹی کی اور افضل کو گھر لے آیا۔ اس کے ساتھ اس کا دوست مجاہد تھا۔ میں نے افضل سے کوئی سوال نہیں کیا۔ کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ سوال کرتا بھی تو کیا کرتا۔ افضل کے ساتھ بہت برا ہوا تھا۔ پہلے باپ فوت ہوا پھر ماں نے خودکشی کر لی۔ افضل نے گھر چھوڑ دیا۔ یہ بڑی زہر بھری کہانی ہے۔ ناقابل بیان ہے۔ میں نے اس کے چہرے کو دیکھا۔ غور سے دیکھا۔ اس میں زندگی کا کرب نظر آیا۔ میں نے افضل کی یاسیت ختم کرنے کی پوری پوری کوشش کی تھی۔ اس نے خود ہی بتایا کہ وہ کراچی چلا گیا تھا۔ وہاں ایک فیکٹری میں کام کرتا ہے۔ اب وہ کشور سے ملنے اپنی جائیداد بیچنے آیا تھا۔ اس نے کراچی میں اپنا ہوٹل کھولنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کے لیے اسے کچھ مزید پیسوں کی ضرورت تھی۔ کچھ اس نے ان برسوں میں جمع کر لیے تھے۔ اس نے مزید بتایا کہ وہ یہاں گاؤں میں اپنی جائیداد بیچ کر آدھے پیسے کشور کو دے دے گا باقی لے جائے گا۔ میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ وہ پانچ دن میرے گھر ہی رہا۔ وہ پہلے گاؤں آیا تھا۔ وہاں سے میرا پوچھا تھا۔ پھر میرے پاس کچہری آیا تھا۔ ان پانچ دنوں میں میں نے اس کی تمام جائیداد بیچ دی اور نقد پیسے دلا دیئے۔ پانچویں دن میرا دوست کراچی چلا گیا۔

اب بھی کبھی کبھی بیٹھے بیٹھے افضل کا کشور کا خیال آ جاتا ہے۔ کبھی مجھے ان کی ماں سے نفرت سی محسوس ہوتی ہے۔ اس کی غلطی اس کی ہوس کی وجہ سے اس کے بچے دوسروں کی نظروں سے کیا خود اپنی نظروں سے گر گئے تھے۔ ماں کے گناہوں کا خمیازہ اس کا بیٹا اب تک بھگت رہا ہے۔

◆

پس پردہ

ریاض بٹ

اس بار جو تفتیش کہانی ارسال خدمت ہی وہ ایک حساس مسئلے پر ہے۔ ایک ایسا مسئلہ جس کو بعض اوقات ایک مذاق بنا دیا جاتا ہے۔ بہرحال دنیا میں ہر قسم کے انسان بستے ہیں...... جو ایسے ایسے گل کھلاتے ہیں ہیں۔ جن سے شیطان بھی پناہ مانگتا ہے لیکن ان کا انجام عبرت ناک ہوتا ہے۔

نئے افق کے قارئین کے لیے بطور خاص

بہت خوب صورت علاقہ تھا۔ ہر طرف قدرت کے حسین نظارے بکھرے ہوئے تھے۔ سامنے کی پہاڑی پر بادلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے جب ادھر سے ادھر چلتے تھے۔ تو انسان کا دل کرتا تھا کہ وہ انہیں ہی دیکھتا رہے۔ نظر ٹھہری جاتی تھی۔ قارئین آپ حیران نہ ہوں۔ میں اس بار کوئی رومانی کہانی نہیں سنانے لگا۔ بلکہ وہی تفتیشی کہانی سناؤں گا۔ جن کے آپ منتظر رہتے ہیں۔ یہ تو مختصراً اس علاقے کا تعارف تھا۔ جہاں پر ہمارا اپنا تھانہ تھا۔ یہاں پر میری مدد کے لیے دو اے ایس آئی آفاق، اسلم دو ہیڈ کانسٹیبل اکبر خان، زاہد، محرر امتیاز اور باقی سپاہی تھے۔ جن کے نام وقتاً فوقتاً آتے رہیں گے۔ یہاں جو بات بتانے والی ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے تھانے کی حدود میں چھ گاؤں اور شہر کا کچھ حصہ تھا۔ ریلوے اسٹیشن بالکل قریب تھا۔ جب کہ لاری اڈہ ذرا فاصلے پر تھا۔ ہمارے تھانے سے سب سے قریب اڈہ ذرا فاصلے پر تھا۔

ہمارے تھانے سے سب سے قریب جو گاؤں تھا اسے آپ فیض آباد سمجھ لیں اور ساتھ یہ بھی بتادوں کہ یہاں کے زمین دار ملک سجاول ایک خدا ترس انسان تھے۔ غریبوں کا ہر طرح خیال رکھتے تھے۔ ان کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ سجاول کی بیوی فریدہ اور بیٹے خرم اور اکرم اس کی ضد تھے۔

ان کا خیال تھا کہ مزارعوں اور خدمت گاروں کی جگہ قدموں میں ہوتی ہے دل میں نہیں۔ اس طرح یہ لوگ سر پر سوار ہو جاتے ہیں۔ البتہ سجاول کی بیٹی زبیدہ باپ کی حامی تھی۔ یہ سب باتیں بتانے کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس تھانے میں آنے کے کچھ دن بعد ہی مجھے ملک سجاول کی حویلی میں جانا پڑ گیا تھا۔ حالانکہ اس کے بیٹے اس کے حق میں نہیں تھے کہ بات پولیس تک پہنچائی جائے۔ کیونکہ ان کے خیال میں یہ ایک حادثہ تھا۔ واقعہ تھا اور گاؤں دیہات میں اس قسم کے واقعات ہوتے رہتے تھے۔

لیکن ملک سجاول نے ہمیں اطلاع بھجوادی تھی۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل اکبر خان اور سپاہی عظمت کو ساتھ لیا اور حویلی میں پہنچ گیا۔

یہ حویلی ایک قلعے کی طرح بنی ہوئی تھی اور یہاں پر دیگیں چڑھی ہوئی تھیں۔

جی ہاں ملک سجاول کے بڑے بیٹے خرم کی شادی تھی۔ بے شمار مہمان آئے ہوئے تھے۔ تقریباً چار دن سے یہ گہما گہمی جاری تھی اور ابھی مزید چار پانچ دن رہنی تھی۔ جہاں پر پیسے کی ریل پیل ہو۔ تو وہاں خرچ کرنے کے مواقع ڈھونڈنا کوئی بڑی بات نہیں ہوتی۔

حالانکہ ملک سجاول اس کے حق میں نہیں تھا۔ وہ کہتا تھا کہ خرچ ضرور کرو لیکن ذرا ہاتھ ہولا رکھ کر۔ لیکن یہاں یہ بات نہیں ہو سکتی تھی۔ کیونکہ ہاتھ تھا ملکانی کا اور اس ہاتھ کو

Downloaded From

ملک صاحب نہیں روک سکتے تھے۔ بہرحال اصل بات کی طرف آتا ہوں۔

جیسا کہ اس قسم کی شادیوں میں ہوتا ہے کہ رات کو جس کو جہاں جگہ ملتی ہے وہاں سو جاتا ہے۔ لیکن ایک مہمان انور شاید حویلی کے ایک کونے والے کمرے میں کہیں سو گیا تھا۔ (بہرحال یہ قیاس آرائیاں تھیں) کیونکہ اس کمرے کی طرف جاتے ہوئے اسے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔

صبح آٹھ بجے کے قریب کسی نوکر کو اس کمرے میں جانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ضرورت اس لیے ہوئی کہ وہاں چاول اور چینی کی بوریاں پڑی ہوئی تھیں۔

لیکن......

کمرے کا منظر دیکھ کر وہ سب کچھ بھول گیا...... اس نے دیکھا کوئی مہمان اوندھے منہ پڑا ہوا ہے وہ بھاگتا ہوا چلایا تھا کہ کسی سے ٹکرا گیا۔

”او بشیرے اندھے ہو گیا......؟“

”جناب...... ملک صاحب...... ادھر ادھر...... کمرے میں......“ بشیرے کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔

”کیا...... ادھر ادھر لگا رکھی ہے؟“ یہ اکرم تھا۔

”او...... جی ادھر چینی اور چاولوں والے کمرے میں کوئی مہمان اوندھے منہ پڑا ہوا ہے۔“

پھر جب چھوٹے ملک نے بندے کو سیدھا کیا تو اس پر یہ بات آشکار ہوئی کہ یہ تو ساتھ والے گاؤں صابر آباد سے آیا ہوا مہمان انور ہے۔ اس کے منہ سے جھاگ نکل کر تھوڑی پر خشک ہو گئی تھی اس نے پہلے اپنے بڑے بھائی خرم کو یہ بات بتائی۔ پھر دونوں اپنے باپ کے پاس گئے۔

وہ بھی کمرے تک دوڑا آیا۔ لاش کی حالت دیکھ کر اس نے بھی یہی اندازہ لگایا کہ اسے سانپ نے ڈس لیا ہے۔ پھر جس طرح یہ بات مجھ تک پہنچی اس کا ذکر آ چکا ہے۔ مجھے

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

دیکھتے ہی خرم نے کہا تھا۔

”تھانے دار صاحب ابا جی نے ناحق آپ کو زحمت دی ہے اس قسم کے واقعات تو ہوتے رہتے ہیں۔“

اس کی بات مجھے بہت بری لگی اور میں نے اس کے منہ پر کہہ دیا۔

”برخوردار آپ کے والد صاحب نے اچھا کیا کہ مجھے اطلاع دے دی اور مجھے یہ بات پتہ چلی۔“

لاش کو اس نے سیدھا کیا تھا تو میں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

”دیکھو...... تمہیں پتہ ہے کہ جب اس قسم کا کوئی واقعہ ہوتا ہے تو کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ تم نے لاش کو سیدھا کیوں کیا؟“

”تھانے دار صاحب میں نے یہ سمجھا کہ یہ سو رہا ہے۔“ اس نے اپنی طرف سے عقل مندی کی بات کی۔

”دیکھو برخوردار...... اس کمرے میں نہ تو کوئی چارپائی ہے اور نہ کوئی اور چیز یہاں تو صرف بوریاں ہی ہیں۔“ میں نے دیواروں کے ساتھ رکھی ہوئی بوریوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ بغلیں جھانکنے لگا۔ ملک سجاول اس موقع پر بولا۔

”تھانے دار صاحب ...... دیکھیں میں نے اپنا فرض پورا کر دیا ہے اب آپ کیا کہتے ہیں؟“

”ملک صاحب...... لاش پوسٹ مارٹم کے لیے جائے گی۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کی خوشیاں زہر آلود ہو گئیں۔“

بہر حال میں نے ہیڈ کانسٹیبل کو لاش کے ساتھ بھجوا دیا۔ اور خود ملک سجاول کے ساتھ قریبی حجرے میں آ کر بیٹھ گیا۔ سپاہی کو میں نے کہا کہ وہ ادھر ادھر سے معلومات حاصل کر لے۔ میں نے غور سے دیکھا کہ سجاول کا چہرہ پریشانیوں کی آماج گاہ بنا ہوا ہے۔

”ملک صاحب ہمت کریں یہ کوئی ایسی بات نہیں جس کا زیادہ اثر لیا جائے۔ یہ بات تو روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ انور کو سانپ نے ہی ڈسا ہے میں نے سینے پر سانپ کے ڈسنے کا نشان دیکھ لیا ہے۔“

”لیکن...... تھانے دار صاحب۔“ اس نے چند لمحے سوچا پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”یہ واقعہ یا حادثہ جو بھی آپ کہہ لیں ہوا تو میرے گھر میں ہے نہ۔“

”اوہ ...... آپ اس بات کی ٹینشن نہ لیں اچھا یہ بتائیں کہ انور آپ کا رشتہ دار ہے؟“

”نہیں تھانے دار صاحب یہ میرے دوست نمبردار رکن زمان کا بیٹا ہے اور میں نے اسے اطلاع بھجوا دی ہے۔“

ابھی ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ ایک دبلا پتلا بندہ حجرے میں داخل ہونے کی اجازت طلب کرنے لگا۔

ملک سجاول فوراً کھڑا ہو گیا اور اسے اندر لے آیا۔ یہ انور کا باپ نمبردار رکن زمان تھا۔

”ملک صاحب ...... یہ کیا ہو گیا؟ اسے سانپ نے کیسے ڈس لیا؟“ وہ سجاول سے ہم کلام تھا۔

”میں خود پریشان ہوں ...... زمان اور تم سے شرمندہ بھی۔“

”ملک صاحب بھلا اس میں آپ کا کیا دوش۔“

میں نے کھنکھار کر گلہ صاف کیا اور رکن زمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں۔ سانپوں کا کیا بھروسا کب اور کہاں ڈس لیں۔ ان کو کون روک سکتا ہے۔“

رکن زمان نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ لیکن خاموش رہا۔

”ابھی حالات ایسے نہیں تھے کہ میں انور (مقتول) کے باپ سے سوال و جواب شروع کر دیتا۔

بہر حال ایک سوال کا جواب میں نے اسے ضرور دیا کہ وہ کل آ کر تھانے سے لاش لے جائے۔

پھر میں نے ملک صاحب سے کہا۔

”اچھا تو ہم چلتے ہیں۔“

اور میں سپاہی کو لے کر تھانے میں واپس آ گیا۔ تھانے کا عملہ چند دنوں میں میری فطرت سے واقف ہو گیا تھا۔ انہیں میرے ساتھ ایڈجسٹ ہونے میں زیادہ دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ میں نے اپنی سیٹ سنبھالی اور اے ایس آئی آفاق کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔

"سر کیا حکم ہے؟"

"دیکھو آفاق۔ ارد گرد پر کڑی نظر رکھو۔ کسی کے ساتھ کوئی رعایت نہیں رکھی اور سب بدمعاشوں کا سارا ریکارڈ میرے سامنے ہونا چاہیئے اور ذرا باری باری ان کے درشن بھی کروادو۔"

"ٹھیک ہے سر...... ہر کام آپ کے حکم کے مطابق ہوگا۔" پھر میں نے اور آفاق نے اکٹھے کھانا کھایا تھا۔

وہ چلا گیا اور میں میز پر بکھرے ہوئے کاغذات کی طرف متوجہ ہوگیا۔ نئے تھانے کے کافی جھمیلے ہوتے ہیں۔ کچھ کیس زیر تفتیش ہوتے ہیں۔ گاؤں' دیہات میں بھی مخبر بڑے مددگار ثابت ہوتے ہیں اور ان سے زیادہ کھوجی تھانے دار کی آنکھ ہوتے ہیں۔ زمین ڈھول والی ہوتی ہے۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ زیر تفتیش صرف ایک کیس تھا جس کا ذکر اگلی کسی کہانی میں آئے گا۔

بہر حال وہ پورا دن کاغذات میں سر کھپانے میں گزر گیا۔ شام کو میں اپنے کوارٹر میں چلا گیا۔ دوسری صبح لاش اور پوسٹ مارٹم کی رپورٹ ساتھ ساتھ آ گئی۔ کافی دیر سے نمبردار چار بندوں کے ساتھ آیا بیٹھا تھا میں نے ضروری کاغذی کارروائی کروانے کے بعد لاش اس کے حوالے کردی۔

جاتے جاتے وہ مجھے کہہ گیا۔

"تھانے دار صاحب میں دو چار دنوں بعد آپ کے پاس حاضر ہونگا۔"

میں نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں واضح طور پر تحریر تھا کہ موت سانپ کے ڈسنے کی وجہ سے ہی واقع ہوئی ہے سانپ اتنا زہریلا تھا کہ چند لمحوں میں ہی موت واقع ہوگئی ہوگی۔ کچھ اور باتیں بھی تھیں جن کا ذکر مناسب موقع پر آئے گا۔

آٹھویں دن مجھے سپاہی عظمت نے آکر بتایا۔

"سر... نمبردار صاحب آئے ہیں انہیں بھیج دوں یا......؟"

"دیکھو عظمت......" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے خشک لہجے میں کہا۔

"ایک بات اپنے پلے سے باندھ لو۔ جو بھی مجھ سے ملنا چاہتا ہے اسے بلا تاخیر میرے پاس بھیجنا ہے صرف مجھے اطلاع دینا لازمی ہے کہ فلاں صاحب یا صاحبہ مجھ سے ملنے کے خواست گار ہیں۔"

"ٹھیک ہے سر آئندہ آپ کو شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔" چند لمحوں کے بعد نمبردار میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔

وہ پریشان لگتا تھا۔ یہ تو ہونا ہی تھا کیونکہ اس کا جوان جہان بیٹا وہاں چلا گیا تھا جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ میں نے غور سے نمبردار کے چہرے کی طرف دیکھا وہاں مجھے پریشانی کے علاوہ کچھ اور بھی نظر آرہا تھا۔ جس کو میں لفظوں کا جامہ پہنانے سے قاصر تھا۔

جب کافی دیر اس کے منہ سے کوئی بات نہیں نکلی تو میں نے نرم لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

"نمبردار صاحب کیا بات ہے؟ زیادہ نہ سوچیں جو کچھ کہنا چاہتے ہیں کہہ دیں۔"

اس نے میری طرف دیکھا پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"میرا بیٹا سانپ کے ڈسنے کی وجہ سے نہ مرا ہوتا تو میں بلا جھجک اپنے دل کی بات کہہ دیتا۔"

"آپ اس بات کو ذہن سے ایک منٹ کے لیے نکال دیں اور جو کچھ آپ کے دل میں ہے اسے لفظوں کی زبان دے دیں۔"

"تھانے دار صاحب...... مجھے شک ہے کہ میرے بیٹے کو جان بوجھ کر سانپ سے ڈسوایا گیا ہے۔"

"اوہ......" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن یہ شک آپ کے دل میں کیوں پیدا ہوا؟"

"جناب! میرے پاس ثبوت کوئی نہیں ہے۔"

"دیکھیں...... میرا وقت بہت قیمتی ہے...... آپ پٹری سے نہ اتریں۔ آپ ثبوت کو چھوڑیں شک کی وجہ بتائیں؟"

"دراصل تھانے دار صاحب ایک لڑکی کی وجہ سے اکرم اور میرے بیٹے کے درمیان لڑائی ہوئی تھی۔"

"عشق، محبت وغیرہ کا چکر۔"

"جناب! دلوں کا حال تو سوہنا رب ہی جانتا ہے لیکن

http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

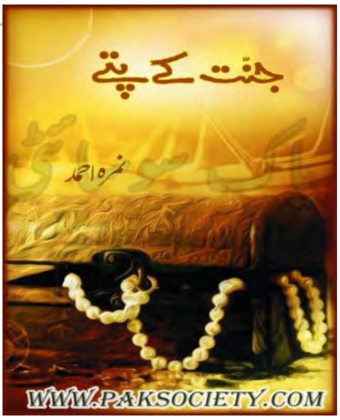
جنت کے پتے
نمرہ احمد
WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
مصحف
نمرہ احمد
www.Paksociety.com

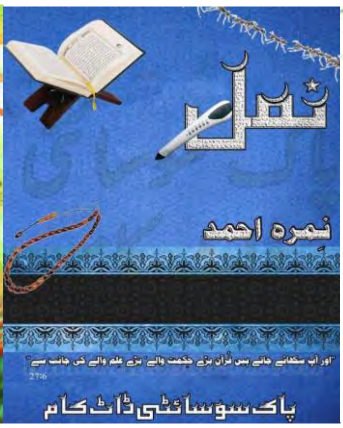
نمل
نمرہ احمد
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

آبِ حیات
عُمیرہ احمد
WWW.PAKSOCIETY.COM

ہم سفر
فرحت اشتیاق

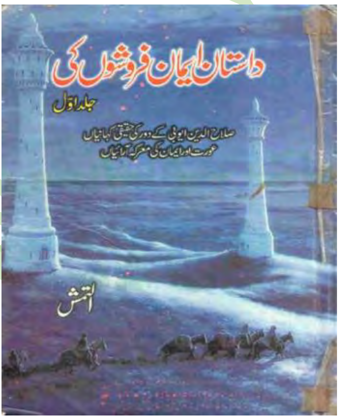
داستان ایمان فروشوں کی
جلد اول
التمش

بِن روئے آنسو
فرحت اشتیاق
www.paksociety.com

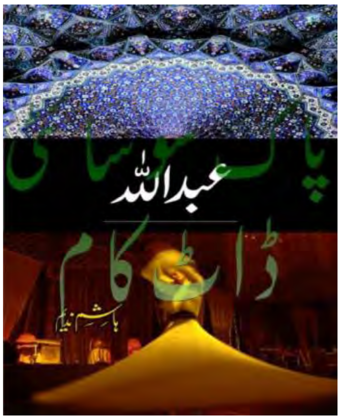
عبداللہ
ہاشم ندیم

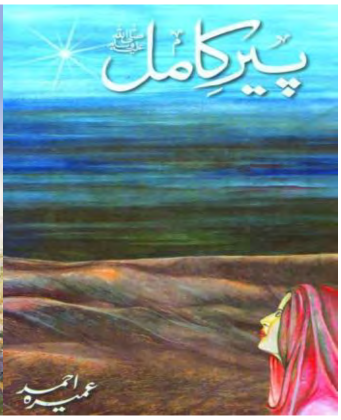
پیرِ کامل
عمیرہ احمد

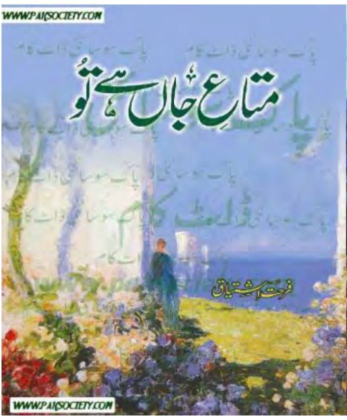
WWW.PAKSOCIETY.COM
متاعِ جاں ہے تو
فرحت اشتیاق
WWW.PAKSOCIETY.COM

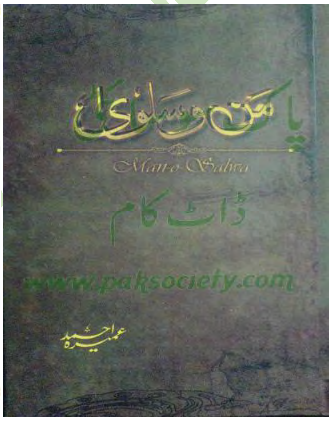
من و سلویٰ
Man-o-Salwa
www.paksociety.com
عمیرہ احمد

جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو
فرحت اشتیاق
WWW.PAKSOCIETY.COM

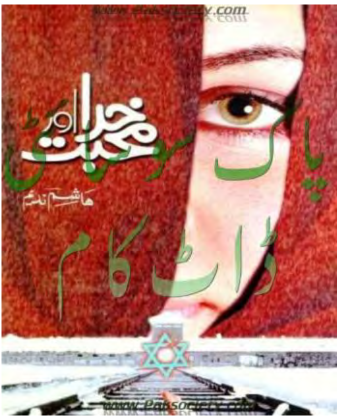
خدا اور محبت
ہاشم ندیم

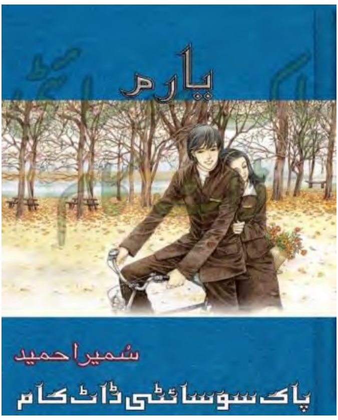
بارش
شمیرا حمید
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

ٹوٹا ہوا تارہ
سمیرا شریف طور
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

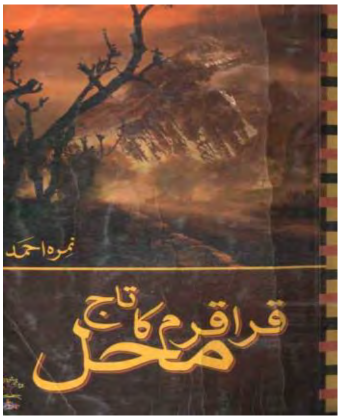
نمرہ احمد
قراقرم کا تاج محل

انور نے جو کہانی مجھے سنائی تھی وہ میں آپ کے گوش گزار کر دیتا ہوں۔"

"ایک دن اکرم ہمارے گاؤں گیا تھا کچھ لڑکیاں وہاں کنویں سے پانی بھر رہی تھیں اکرم کے پاس جیپ تھی اور وہ خود ہی ڈرائیو کر رہا تھا لڑکیوں میں پروین عرف پنو بھی تھی۔ اکرم نے پنو کو کوئی بے ہودہ سی بات کہہ دی۔ میرا بیٹا ادھر سے گزر رہا تھا......" نمبردار تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوا...... پھر گویا ہوا۔

"آگے سنانے سے پہلے اتنا بتا دوں کہ میرے بیٹے کی خرم اور اکرم وغیرہ کے ساتھ کبھی نہیں بنی۔ بہرحال میرے بیٹے نے اکرم سے کہا۔"

"اکرم بھائی تم نے زیادتی کی ہے......"

اکرم بولا۔ "یہ تمہاری معشوقہ ہے تو میں......"

"اکرم بولا۔

"یہ میری معشوقہ نہیں ہے میرے گاؤں کی عزت ہے۔"

"اچھا...... لیکن میں اس دل کا کیا کروں؟ جو اسے دیکھتے ہی میرے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔" اکرم نے لوفرانہ انداز میں کہا۔ اور پنو سے بولا۔

"حسن کی سرکار...... ذرا پانی تو پلا دو۔" لیکن پنو نے خلاف توقع اس کے منہ پر تھپڑ رسید کر دیا۔

اکرم غصے سے لال پیلا ہو گیا اور پروین عرف پنو کی کلائی پکڑنے کی کوشش کی۔ مگر اس سے پہلے ہی انور نے اس کی کلائی پکڑ لی اور نرم لہجے میں ہی بولا۔

"دیکھو تم ہمارے مہمان ہو اس لیے میں تمہارا لحاظ کر رہا ہوں ورنہ......؟"

اکرم نے جھٹکا دے کر اپنی کلائی چھڑا لی اور انور کے سامنے تن کر کھڑا ہو کر بولا۔

"تم میرا لحاظ نہ کرو جو کچھ کرنا ہے کر لو۔ دیکھو ابتداء میں کرتا ہوں۔" پھر اس نے انور کے منہ پر ایک تھپڑ جڑ دیا۔

"پھر جو کچھ ہوا ہوگا اس کا آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ میں صرف اتنا بتا دیتا ہوں کہ لڑکیوں کے شور مچانے پر جب لوگ آئے تو انور، اکرم کو نیچے گرا کر اس کی اچھی خاصی درگت بنا چکا تھا۔ ویسے انور کو بھی کافی چوٹیں آئی تھیں۔"

نمبردار خاموش ہوا۔ تو میں نے چند لمحے توقف کیا۔ پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔

"بھئی کمال ہے آپ نے تو اس طرح واقعے کو لفظوں کی زبان دی ہے جیسے آپ نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔"

"تھانے دار صاحب میں نے بعد میں پروین سے بھی پوچھا تھا۔"

"اوہ...... کیا دونوں کے بیان ملتے جلتے تھے؟"

"بالکل جناب!"

"لیکن...... نمبردار صاحب ایک بات مجھے بری طرح کھٹک رہی ہے؟"

"کونسی بات جناب؟" نمبردار نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

"جب تعلقات اتنے خراب تھے تو آپ کا بیٹا شادی میں کیوں آیا؟"

"تھانے دار صاحب بیٹے کی موت کے بعد میرا دماغ جگہ پر نہیں رہا ہے۔ آگے کا حال تو میں آپ کو بتانا ہی بھول گیا۔"

"آگے کا حال......" میں نے اس کے الفاظ زیر لب دہرائے اور اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔

"جی ہاں...... سارا واقعہ انور کے بعد اور پروین سے اس کی تصدیق کرنے کے بعد میں سیدھا سجاول کے پاس گیا تھا اور اسے سارا واقعہ سنا دیا تھا۔ مختصر یہ کہ انہوں نے دونوں کو گلے ملوا کر راضی نامہ کروا دیا تھا۔"

"پھر...... آپ کا شک......" میں نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"جناب! آپ شاید سجاول کے بیٹوں کی فطرت سے واقف نہیں ہیں۔ پھر ایک بات اور بھی ہے۔ اس واقعے کو تقریباً ایک ماہ ہو گیا ہے۔ جب انور کو شادی کا پتہ چلا تو اس نے مجھے کہا تھا میں شادی میں نہیں جاؤں گا۔ بے شک ان کا بلاوا آئے لیکن......"

چند لمحے رک کر نمبر دار نے چند گہری گہری سانسیں لیں پھر بات کو اختتامی ٹچ دیتے ہوئے بولا۔

انور کے سارے ارادے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ ایک ہفتہ پہلے اکرم خود چل کر آیا اور انور کی تھوڑی پکڑ کر بولا۔

”دیکھو...... میں نے دل میں کوئی بات نہیں رکھی۔ تم بھی میری طرف سے دل صاف کرلو۔ میں تمہاری منت کرتا ہوں کہ خرم کی شادی میں ضرور آنا۔“

”یہ ہے ساری بات تھانے دار صاحب۔“

نمبردار کے چہرے کے تاثرات یہ بتا رہے تھے کہ اس نے گویا گیند میری کورٹ میں پھینک دی ہے۔

”ٹھیک ہے نمبردار صاحب میں دیکھتا ہوں کہ اس سلسلے میں کیا کرسکتا ہوں۔ ویسے ایک بات ہے آپ رپورٹ تو درج نہیں کروانا چاہیں گے اور میرا خیال ہے قانونی تقاضے بھی آپ سے پوشیدہ نہیں ہونگے۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

”میں سب سمجھتا ہوں جناب۔ ان حالات میں کیا رپورٹ درج کروانا اور سجاول کے بیٹے پر شک کرنا مناسب ہے؟“

”جی...... میرا مشورہ تو یہ ہے کہ آپ رپورٹ آج کی تاریخ میں درج کروادیں تو بہتر ہے میں ابھی رپورٹ کو خفیہ رکھونگا۔“ اور اس کو رخصت کرنے کے بعد میں سوچوں کے گھوڑے دوڑانے لگا۔

قارئین میں خود بھی مطمئن نہیں تھا کچھ اشارے اور بھید ایسے تھے جن کو میں سمجھنا چاہتا تھا۔ جن سے پردہ اٹھانا چاہتا تھا۔ یہ تو اچھا ہوگیا تھا کہ نمبردار خود ہی اس طرف آ گیا تھا ورنہ مجھے اس کے گاؤں کا ایک چکر تو لگانا ہی تھا اور جو کہانی نمبردار مجھے سنا گیا تھا اس کا میرے علم میں آنا لازمی تھا لیکن یہ لازمی نہیں تھا کہ سجاول کا بیٹا یا بیٹے ہی موجودہ خاکے میں فٹ آتے۔

بہرحال کچھ نہ کچھ تو ضرور تھا یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھنے والا تھا اس کا فیصلہ آنے والے وقت پر کرنا تھا اور یہ بات بھی آپ کے علم میں ہوگی کہ میں تفتیش میں بال کی کھال اتارتا تھا۔

اس دن کا بقایا حصہ تھانے کے مختلف امور نمٹاتے ہوئے گزر گیا۔

اگلی صبح میں نے سجاول کو پیغام بھیجا کہ وہ اس طرح تھانے میں آئے کہ کسی کو پتہ نہ چلے کہ اسے تھانے میں بلوایا گیا ہے۔ دن دو بجے کے قریب وہ آیا۔ میں نے سب سے پہلے اسے بیٹے کی شادی کی مبارک باد دی۔

”وہ گلہ لے کر بیٹھ گیا۔ کہ آپ آئے کیوں نہیں؟“

”میں نے معذرت کی کہ تھانے کی مصروفیات مجھے کہیں آنے جانے نہیں دیتیں۔“

بہرحال جلد ہی میں اس موضوع کی طرف اسے لے آیا جس کے لیے اسے بلایا گیا تھا۔

”سجاول صاحب! میں ویسے ہی انور کے متعلق کچھ سوالات کرنا چاہتا ہوں؟“

”کریں جناب...... شاید آپ کے دل میں کچھ شک ہے؟“

”شک تو کوئی نہیں......“ میں نے بغیر مقصد میز کے دائیں طرف رکھے کاغذات کو بائیں طرف رکھتے ہوئے کہا۔

”صرف انور اور آپ کے بیٹے اکرم کا جو جھگڑا ہوا تھا اس کے متعلق کچھ تصدیق کرنا چاہتا ہوں۔“

”اوہ...... یہ بات آپ کو کس نے بتائی؟“ وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگا۔

جب کوئی ایسا سوال کرتا تھا تو مجھے غصہ بہت آتا تھا لیکن...... ایک تو سجاول ایک خداترس انسان تھا۔ دوسرے موجودہ حالات میں اس بات کے متقاضی تھے کہ میں مصلحت سے کام لوں۔ اس لیے میں نے نرم لہجے میں زمین دار سے کہا۔

”آپ کچھ دار آدمی ہیں میں یہاں کا تھانے دار ہوں ایسی باتیں مجھ تک پہنچ ہی جاتی ہیں۔“

”تھانے دار صاحب میں معذرت خواہ ہوں مجھے ایسا سوال نہیں کرنا چاہئے تھا بہرحال جو باتیں آپ کو پتہ چلیں ہیں وہ بالکل درست ہیں۔ لیکن میں نے راضی نامہ کروادیا تھا اور انور اس لیے شادی میں آیا تھا۔ بات بھی پرانی ہوچکی ہے۔“

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

”سجاول صاحب آپ پاؤں کس سے دھوتے ہیں؟“

”ظاہر ہے پانی سے......لیکن وہ حیران نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

”جب یہی پانی جم کر برف بن جاتا ہے۔ یہ برف اگر آپ کے پاؤں پر پڑ جائے تو آپ کے پاؤں کا کیا حال ہوگا؟“

”گہری بات ہے تھانے دار صاحب......میں آپ کی بات کی گہرائی تک پہنچ گیا ہوں۔ لگتا ہے آپ اپنے تحفظات دور کرنا چاہتے ہیں۔ میں حاضر ہوں آپ اس بات کا بالکل لحاظ نہ کریں کہ اکرم اور خرم میرے بیٹے ہیں میں قانون کو افضل سمجھتا ہوں۔“

”مجھے آپ سے یہی امید تھی......اگر سب لوگ آپ جیسے خیالات کے مالک ہوجائیں تو ہمارا کام آسان ہوجائے ویسے میں دعا گوہوں کہ ایسا ہی ہوجائے۔“

اسی دوران چائے آگئی تھی اور ہم اپنا اپنا کپ خالی کرچکے تھے میں نے اسے رخصت کرنے سے پہلے یہ بات سمجھا دی کہ ابھی گھر میں کوئی بات نہ کرے۔ البتہ حالات پر نظر رکھتے ہوئے میں ایک دو دن میں حویلی میں آؤنگا۔“

میرا پروگرام تو نمبر دار کے گاؤں بھی جانے کا تھا پروین اور اس کی دو قریبی سہیلیوں سے بھی چھوٹا سا انٹرویو کرنا چاہتا تھا۔

میں نے اے ایس آئی آفاق کے ذمے بھی ایک کام لگایا تھا یہ اسی شام کی بات ہے کہ وہ میرے کمرے میں داخل ہوا اس کے چہرے پر تھکن کے آثار تھے۔ اس نے کرسی پر بیٹھ کر چند گہری گہری سانسیں لیں۔ چند لمحے دیوار پر لگی بابائے قوم قائداعظم محمد علی جناح کی تصویر کو دیکھتا رہا پھر گویا ہوا۔

”سر یہ ملک کتنی قربانیوں کے بعد معرض وجود میں آیا تھا۔ آج چودہ اگست ہے ہماری آزادی کا دن لیکن کیا ہم نے اس ملک کی قدر کی؟“

”آفاق یہ ایک المیہ ہے اس پر جتنی بھی بحث کی جائے نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات ہی نکلنا ہے تم سناؤ کہاں سے آرہے ہو؟“

”سر یہی تو بتانے لگا ہوں......میں نے سفید کپڑوں میں آپ کے بتائے ہوئے کام کے لیے تفتیش کی تو پتہ چلا کہ یہاں کوئی تعاون نہیں کرتا۔ سب اپنی اپنی دنیا میں مگن ہیں۔ پھر میں نے اپنے کام کے لیے ایک آدمی کو ہائر کیا وہ کچھ جانتا تھا یقین کریں دو سو روپے میں وہ پورا دن میرے ساتھ رہا اور آخر میں وہ جگہ ڈھونڈ ہی لی۔“

”ڈھونڈ لی......“ میں خوشی سے تقریباً اچھل پڑا۔

”لیکن سر......ہم دریا کے پاس پہنچ کر بھی پیاسے ہی رہے۔“

”اوہ......“ میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔

”چلو آفاق اپنی تگ و دو جاری رکھو۔ اس کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں ہے ویسے میرا اندازہ صحیح ہے نا؟“

”سر......بالکل آپ کی سوچ کے گھوڑے جس سمت دوڑ رہے ہیں۔ انشاءاللہ وہی سمت ہماری منزل ہوگی۔“

قارئین ذرا انتظار کریں۔ یہ گورکھ دھندہ ابھی میرے سامنے بھی کلیئر نہیں ہے۔ البتہ ایک بات میں یہاں ہی کلیئر کردوں کہ اے ایس آئی آفاق نے میرے ہی مشورے پر سادہ کپڑوں میں یہ سب کچھ کیا تھا۔

اگلی صبح مطلع ابر آلود تھا۔ میں نے سپاہی عظمت کو ساتھ لیا اور زمین دار سجاول کی حویلی میں پہنچ گیا۔ اس وقت اس کے بیٹے خرم اور اکرم بھی موجود تھے۔ سجاول ہمیں اونچی چھت والے کمرے میں لے گیا۔

میں نے پہلے تو اسے کسی قسم کے تکلف سے منع کردیا۔ حالانکہ اس بات پر اس کا منہ بن گیا لیکن میں نے اس کی پروا نہ کرتے ہوئے اسے کہا۔

”دعوت ادھار رہی۔ جونہی میں فارغ ہوا میں اور آفاق اس کی دعوت کھانے ضرور آئیں گے۔“ ویسے یہ حالات پر منحصر تھا۔

وہ تھوڑا مطمئن ہوگیا اور اس کا موڈ بھی خوش گوار ہوگیا۔ وہ بولا۔

”جناب! اب آپ بتائیں کہ میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں۔“

میں نے چند لمحے سوچا اور پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ اپنے دونوں بیٹوں کو بھیج دیں اور خود ذرا باہر رہیں۔" وہ چلا گیا۔

پھر میں نے سپاہی عظمت سے کہا کہ وہ اکرم کی جیپ کے پاس رہے۔

جیپ کو میں نے حویلی کے داخلی گیٹ کے پاس بنے ہوئے گیراج میں دیکھا تھا۔

ادھر سپاہی باہر نکلا۔ اور ادھر خرم اور اکرم اندر داخل ہوئے اور مجھے سلام کرکے بیٹھ گئے دونوں کی عمروں میں دو سال کا فرق ہوگا۔ دونوں کا رنگ گورا تھا اور ان کے چہرے کے خدوخال چیخ چیخ کر گواہی دے رہے تھے کہ وہ ضدی طبیعت کے مالک ہیں اور اپنی بات منوانے کے عادی ہیں۔

میں نے باری باری دونوں کی آنکھوں میں دیکھا۔

پھر خرم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"برخوردار شادی خانہ آبادی مبارک ہو۔"

"خیر مبارک جناب لیکن ہمیں آپ سے سخت گلا ہے آپ کو کم از کم ولیمے میں تو آنا چاہیے تھا۔"

"بھئی ...... دیکھو ہماری مصروفیات ایسی ہوتی ہیں کہ ہم وقت نہیں نکال سکتے۔ اس لیے معذرت۔ بہرحال آج تم لوگوں سے کچھ باتیں کرنے کے لیے آیا ہوں۔"

"جی فرمایئے؟"

"دیکھو...... کوئی ایسا واقعہ ہو جاتا ہے جیسا کہ انور کے ساتھ ہوا ہے تو ہم کاغذوں کا پیٹ بھرنے کے لیے کچھ نہ کچھ تفتیش ضرور کرتے ہیں میں نے محتاط اور نپے تلے لفظوں کا استعمال کرتے ہوئے کہا۔

"جی ظاہر ہے ویسے اگر سانپ ڈس لے تو میرے خیال میں تفتیش فضول ہوتی ہے ایسے واقعات تو ہوتے رہتے ہیں۔ خرم نے اپنی دانست میں عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھو خرم میاں سانپ جب کسی کو ڈستا ہے تو وہ تھوڑا بہت وقت تو زندہ رہتا ہے اور کچھ واویلا ضرور مچاتا ہے۔ میں نے اکثر مار گزیدہ کو یہ شور مچاتے سنا ہے کہ بچاؤ بچاؤ مجھے سانپ نے ڈس لیا ہے ...... پھر ایک اور بات مجھے تفتیش پر مجبور کر رہی ہے وہ یہ کہ انور اس کمرے میں کیا کر رہا تھا جہاں پر بوریاں رکھی ہوئی تھیں۔ وہاں سونے کے لیے بھی کوئی جگہ نہیں تھی نہ کوئی چارپائی وغیرہ تھی اور نہ کوئی اور بندوبست تھا پھر وہ الگ تھلگ کمرہ تھا اور اس کا ایک دروازہ کھیتوں کی طرف تھا۔"

"جناب اس لیے وہاں شادی میں استعمال کرنے کے لیے چاول اور چینی کی بوریاں رکھی تھیں۔ کیونکہ کمرے کے عقبی دروازے تک گاڑی آسانی سے آجاتی ہے۔" اکرم نے کہا۔

میں دل ہی دل میں اکرم کی اس بات پر ہنس پڑا۔ اس نے کتنی صفائی سے بات کو گھما دیا تھا۔ میں نے بھی کان کو دوسرے طریقے سے پکڑنے کا تہیہ کرلیا اور مسکرا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا یہ بوریاں جیپ میں رکھ کر لائی گئی تھیں؟"

"جیپ میں ...... نہیں تو ...... منی ٹرک میں لائی گئی تھیں۔"

"اچھا......" میں نے ہنکارہ بھرا۔

پھر اکرم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں ذرا جیپ کو دیکھنا چاہتا ہوں...... اس جیپ کو جس میں بیٹھ کر تم انور کے گاؤں گئے تھے اور تمہارا جھگڑا انور کے ساتھ ہوا تھا۔"

"میں سمجھ گیا تھانے دار صاحب شاید آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم نے سانپ پکڑ کر انور کو لڑا دیا تھا لیکن میں آپ کو بتا دوں کہ میں اور بھائی خرم سانپ سے بہت ڈرتے ہیں لیکن خرم بھائی......" اکرم نے خرم کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"بالکل مجھے تو سانپ سے بہت ڈر لگتا ہے۔" خرم نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔

"اچھا اس بات کو تم یہیں چھوڑو مجھے جیپ کے پاس لے چلو۔"

میں نے دیکھا کہ میری اس بات سے ان کے چہرے پر شدید ہیجان اور حیرانگی کے تاثرات ابھر آئے ہیں۔

جو چیز یا تاثرات کی میں توقع کر رہا تھا وہ مجھے نظر نہیں آرہے تھے۔

لیکن ایک بات میں نے خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ وہ

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

دونوں بلا کے اداکار تھے۔ وہ مجھے جیپ کے پاس لے گئے۔ وہاں سپاہی الرٹ کھڑا تھا۔ میں نے جیپ کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔

اور قارئین میں یہاں ایک اور بات آپ کے گوش گزار کر دوں کہ جس دن انور کی لاش ملی تھی میں نے اس دن بھی جیپ کا معائنہ کیا تھا۔ اور اس کے ٹائروں سے تھوڑی سی مٹی کھرچ کر لے گیا تھا۔ اور یہی مٹی دے کر اے ایس آئی آفاق کو وہ جگہ ڈھونڈنے کے لیے کہا تھا جہاں کی یہ مٹی تھی۔ کیونکہ یہ مٹی کسی خاص جگہ کی تھی۔

آفاق نے وہ جگہ تو ڈھونڈ لی تھی ...... لیکن آگے اندھیرا تھا کیونکہ وہاں کے مکین وہاں سے کسی اور جگہ چلے گئے تھے بہر حال میں نے تقریباً پانچ منٹ جیپ کا معائنہ کیا اور میں نے دیکھا کہ جیپ کو دھو دیا گیا ہے۔

دونوں حیران نگاہوں سے میری طرف اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے میں کوئی مداری ہوں اور ابھی جیپ کو ہاتھی میں تبدیل کر دونگا۔ لیکن میں نے ایسا کچھ نہیں کیا بلکہ معائنہ کے بعد اکرم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”تم انور والے واقعے کے دن جیپ کہاں لے کر گئے تھے؟“

”تھانے دار صاحب اس دن تو ہم شادی کے ہنگاموں میں مصروف تھے ہمیں کہیں جیپ لے جانے کی فرصت ہی نہیں تھی۔“ اکرم نے کہا۔

”پھر ...... اس دن کوئی اور جیپ لے گیا ہوگا۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

”اس دن جمیل اور انور جیپ لے کر گئے تھے اور میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ جمیل میرا دوست ہے جس دن میری انور کے ساتھ لڑائی ہوئی تھی اس دن میں جمیل سے ہی ملنے گیا تھا۔“

”جمیل اور انور جیپ لے کر گئے تھے۔“ میں نے زیر لب دہرایا۔ پھر اکرم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا بتا کر وہ جیپ لے کر گئے تھے؟“

”انہوں نے کہا تھا وہ ذرا سیر کرنے جا رہے ہیں۔“

”مجھے یہ واضح نظر آ رہا تھا کہ دونوں بھائی کسی طرح بھی انور والے واقعے میں ملوث نہیں ہیں اور یہ بات مجھے قرین قیاس لگ رہی تھی کہ انور کو سانپ نے ڈسا نہیں تھا بلکہ اسے سانپ سے ڈسوایا گیا تھا۔ کیونکہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کا جو حصہ میں نے گول کر دیا تھا اس میں دو باتیں لکھی تھیں۔

”ایک یہ ہے کہ انور کی موت رات آٹھ اور نو کے درمیان واقع ہوئی تھی دوسرے وہ کسی خواب آور دوا کے زیر اثر تھا۔“

اس کے بعد میں سپاہی عظمت کے ساتھ واپس تھانے میں آ گیا تھا۔

اس وقت سورج غروب ہونے کے قریب تھا۔ جب اے ایس آئی آفاق میرے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر گویا کامیابی کے تاثرات ثبت ہو کر رہ گئے تھے۔ اس نے آتے ہی پر جوش لہجے میں کہا۔

”سر میں آج کانسٹیبل اکبر خان کو ساتھ لے گیا تھا۔“ وہ چند لمحے خاموش ہو گیا۔

یہ اس کی عادت تھی وہ سسپنس پیدا کرنے کا عادی تھا۔ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

”اے ایس آئی کہہ رہا تھا ہم نے مطلوبہ جگہ ڈھونڈ لی ہے یہ جگہ ریلوے اسٹیشن سے شمال کی طرف دو کلومیٹر کے فاصلے پر ہے ...... اور اس میں اکبر خان کی پشتو کا بڑا عمل دخل ہے۔ وہاں زیادہ تر پٹھان آباد ہیں۔“

”ویری گڈ۔“ میں نے اس کی تعریف کرنے میں ذرا بخل سے کام نہیں لیا۔

”سر اب ہمارے لیے کیا حکم ہے؟“

”پہلے تم یہ بتاؤ کہ کیا تم سرکاری کپڑوں میں گئے تھے۔“

”نہیں سر ...... ہم سادہ کپڑوں میں تھے اور وہاں ہم نے کسی خیالی سمندر خان کے متعلق بات چیت کی تھی۔“

”بالکل ٹھیک ...... میرے حسب منشا تم نے سارا کام کیا ہے۔“

”پھر ......“

”میں نے اسے تازہ ترین حالات سے آگاہ کیا۔“

”سر آپ کا جو خیال ہے اگر اس پر حقیقت کی مہر ثبت کر دی جائے تو اس سارے چکر کے پیچھے وجہ کیا ہو سکتی

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

ہے؟"

"وجہ بھی سامنے آجائے گی جب ہم یہاں تک پہنچ گئے ہیں تو......"

"سر...... پروین اور اس کی سہیلیوں سے ایک چھوٹا سا انٹرویو کرلیں۔"

"میرے خیال میں اب اس کی ضرورت نہیں رہی تمہارے ہاتھ میں کوئی عورت مخبر ہے؟" میں نے ایک خیال کے تحت پوچھا۔

"بالکل ہے سر نوراں۔ نام تو اس کا نور پری ہے۔"

"آفاق ہمیں نام نہیں کام چاہیے۔" میں نے اس کی بات قطع کرتے ہوئے کہا۔

"بس...... سر...... وہ آسمان سے تارے توڑ کر نہیں لاسکتی باقی چار دیواری کے راز بلکہ زمین کی تہہ سے بھی راز لاسکتی ہے۔"

"ٹھیک ہے اسے میرے پاس لے کر آؤ۔ میں اسے سمجھاؤں گا کہ کیا کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے؟"

پھر جب نوراں میرے سامنے آئی تو مجھے اے ایس آئی کی بات حرف بحرف صحیح لگی۔

وہ چالیس بیالیس سال کی ایک ہوشیار قسم کی عورت تھی رنگ سانولا' قد درمیانہ اور آنکھوں میں عیاری کے ساتھ ساتھ ذہانت بھی تھی۔

جب بات کرتی تھی تو دائیاں ہاتھ مخاطب کی طرف اٹھادیتی تھی۔ اس کا تعلق نمبردار کے گاؤں کے ساتھ تھا۔

"نوراں...... آفاق تمہارے کام کی بہت تعریف کررہا تھا۔"

"بس تھانے دار صاحب یہ ان کی مہربانی ہے ورنہ ......"

"تم نے جمیل اور انور کے متعلق معلومات حاصل کرنی ہیں اور تمہیں بتانے کی ضرورت تو نہیں ہے کہ......" میں نے اسے آزمانے کے لیے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"آپ بالکل فکر نہ کریں انور کے رشتے دار اور جمیل وغیرہ کے فرشتوں کو بھی کچھ پتہ نہیں چلے گا۔ ویسے اگر آپ ناراض نہ ہوں تو ایک بات پوچھوں؟"

"پوچھو......" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں نے تو سنا ہے کہ انور کو سانپ نے ڈسا تھا پھر آپ یہ تفتیش وغیرہ کیوں کررہے ہیں کیا آپ کو کوئی شک وغیرہ ہے؟"

"تم تو آدھی تھانے دارنی لگ رہی ہو۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ہمیں کاغذوں کا پیٹ بھرنا ہوتا ہے۔"

"بس...... تھانے دار صاحب یہ سب آپ لوگوں کی محبت کا اثر ہے۔"

بہرحال اس کی باتوں سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ عورت مخبری کے لیے پرفٹ ہے۔

دو دن بعد اس نے مجھے رپورٹ دی تو میرا جی خوش ہوگیا۔

میں نے دو پولیس اہلکار بھیج کر جمیل کو تھانے بلوایا۔ یہ دو اہلکار ہیڈ کانسٹیبل اکبر خان اور سپاہی عظمت تھے۔

میں نے سپاہی کو باہر بھیج دیا اور کانسٹیبل کو اپنے کمرے میں رہنے دیا اور اسے ایک مخصوص اشارہ کردیا۔ وہ جمیل کے بالکل پیچھے کھڑا ہوگیا۔

اکبر خان کا تعلق پشاور سے تھا۔ رنگ گورا چٹا تھا ماتھا ذرا تنگ تھا جبڑوں کی بناوٹ اسے سخت گیر ظاہر کرتی تھی۔ ابھی میں اس کی فطرت کو اسٹڈی کررہا تھا ویسے وہ ایک ہٹا کٹا بندہ تھا۔

جمیل ایک خوبرو جوان تھا۔ عمر تیس سال کے اریب قریب ہوگی۔ جب میں نے بغور اس کا جائزہ لیا تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں تھی کہ وہ گھبرایا ہوا ہے اور اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں اضطراب ہلکورے لے رہا ہے۔

"جمیل بھائی کیا حال چال ہے؟"

"جناب...... اللہ کا شکر ہے۔" اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"آواز کیوں بھیک مانگ رہی ہے۔ کیا کوئی جرم کیا ہے؟" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

"تھانے دار صاحب آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ میں ایک شریف آدمی ہوں۔ آپ گاؤں میں جاکر پوچھ لیں آپ نے مجھے ناحق بلایا ہے۔" اس کا لہجہ اس بات کی چغلی کھارہا تھا کہ وہ دلیر بننے کی کوشش کررہا ہے۔

میں نے اکبر خان کو اشارہ کیا۔ اس نے جمیل کے بڑے بڑے بال اپنی مٹھی میں لے کر اسے زمین سے ایک فٹ اوپر لایا۔

وہ کسی ذبح کیے ہوئے بیل کی طرح ڈکرانے لگا۔

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور اپنی اسٹک سے اس کی گردن پر دباؤ ڈالا وہ اور زیادہ بلبلانے لگا اور ہاتھ پاؤں ہلانے لگا۔

”جمیل میں تمہیں پورا ایک گھنٹہ اسی طرح رکھ سکتا ہوں مجھے کافی سے زیادہ باتیں معلوم ہو چکی ہیں...... تم نے کافی حماقتیں کی ہیں۔ سب کچھ سچ سچ بتا دو۔ تو میں اس مصیبت اور اذیت سے نجات دلوا سکتا ہوں۔“

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اکبر خان نے میرے کہنے پر اسے چھوڑ دیا۔ وہ ڈولنے لگا میں نے اسے کرسی پر بیٹھنے کی اجازت دے دی۔

اس نے پانی مانگا میں نے اس کی خواہش پوری کر دی۔ وہ تقریباً دس منٹ بعد بولنے کے قابل ہوا اور جب وہ بولا تو بغیر رکے بولا۔ اس کے بعد اس نے سر جھکا لیا۔

میرا دل چاہا کہ میں اسے لاتوں، مکوں اور ٹھوکروں سے اس وقت تک مارتا رہوں جب تک اس کی روح جسم کا ساتھ چھوڑ دے۔ اس وقت تک میری سروس میں ایسا پہلا کیس آیا تھا۔

لیکن میں تو قانون کا محافظ تھا اس لیے قانون کو ہاتھ میں لینے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

لیجیے قارئین جو کچھ پس پردہ ہے وہ سامنے لاتا ہوں۔ کافی باتیں آپ کے علم میں آ چکی ہیں...... حرف جرم کیسے ہوا اور کیوں ہوا یہ بتانا باقی ہے۔

پہلے یہ بتا دوں کہ انور اور جمیل کا تعلق ایک ہی گاؤں سے ہے۔

جمیل نے محبت کی شادی کی تھی بڑی مشکل اور منت سماجت کے بعد جمیل کے سر پر سہرا اور اس کی محبوبہ کلثوم کے ہاتھوں پر اس کے نام کی مہندی لگ سکی تھی۔

کچھ عرصے کے بعد ان میں لڑائی جھگڑے شروع ہو گئے جمیل غصے کا ذرا تیز تھا۔ ایک دن غصے میں آ کر اس نے کلثوم کو طلاق دے دی۔ تین طلاقیں اکٹھی دے دیں۔

کلثوم روتی دھوتی اپنے ماں باپ کے پاس چلی گئی۔ اس کے ماں باپ شہر کے اسی حصے میں رہتے تھے جو ہمارے تھانے کی حدود میں آتا تھا یہاں سے ایک اور مسئلہ کھڑا ہو گیا۔

اگر یہ مسئلہ کھڑا نہ ہوتا تو شاید یہ واردات بھی نہ ہوتی۔ ادھر جمیل کے والدین نے طعنے مار مار کر اس کا دماغ خراب کر دیا کہ ہم منع کر رہے تھے کہ مجنوں نہ بنو۔ اتنی اچھی تمہاری خالہ زاد تھی ناہید وہ آتی تو اس گھر میں اجالا ہو جاتا۔

دوسری طرف کلثوم کو اس سے بھی زیادہ خراب حالات کا سامنا تھا۔ اس کے ماتھے پر طلاق کا کلنک بھی لگ گیا تھا وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ جس رشتے کو اس نے آگ کے دریا عبور کر کے استوار کیا تھا وہ ایک کانچ کے برتن کی طرح ٹوٹ جائے گا۔ اس نے سوچا کہ وہ اپنی زندگی کو ختم کر لے۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔

ایک دن وہ اپنی قریبی سہیلی فرزانہ کے سامنے رو پڑی اور سارے حالات بیان کر دیئے۔ ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ وہ کچھ کھا کر اپنی زندگی ختم کر لے گی۔ فرزانہ نے اسے کہا۔

”خودکشی حرام ہے۔ ہمت سے کام لو۔ میں تمہارے لیے کچھ کرتی ہوں۔ ایک دن فرزانہ نے جمیل سے ساری بات کہہ دی۔ وہ اسے کھیتوں میں مل گیا تھا۔ وہ تو پہلے ہی پچھتا رہا تھا اوپر سے طعنے تھے۔ اس نے فرزانہ سے کہا۔ اگر میں اس کے ساتھ دوبارہ نکاح کرنا چاہوں تو کیا وہ راضی ہو جائے گی۔

خیر قصہ مختصر۔ جمیل نے حلالہ کے لیے انور کو راضی کیا۔ راضی کیا کیا ان خبیثوں نے سارے شرعی تقاضے پس پشت ڈال دیئے جمیل نے انور سے کہا۔

وہ اسے دس ہزار روپے دے گا۔ اس نے کلثوم کے ساتھ میاں بیوی والا کھیل نہیں کھیلنا اور کچھ دن بعد اسے طلاق دے دینی ہے۔ یہ کھیل (میں اسے کھیل ہی کہونگا) انہوں نے کشتیاں جلا کر کھیلا۔ لیکن بقول جمیل کے انور کے اندر شیطان گھس گیا۔ اس نے کلثوم کو آزاد تو کر دیا لیکن جمیل کو بلیک میل کرنا شروع کر دیا۔ ابھی کلثوم عدت میں

تھی۔

انور نے کہا کہ وہ اس ڈرامے کے متعلق سب کو بتا دے گا۔ اصل میں کافی دن پہلے اس میں شیطان گھس گیا تھا۔ عقل کے اندھے جمیل نے یہ بھی نہ سوچا کہ اس ڈرامے کے متعلق بتا کر انور خود کہاں ہوگا؟ وہ اسے دس ہزار روپے بھی دے چکا تھا۔ میں تو یہی کہوں گا کہ یہاں قدرت اپنا کام کر رہی تھی۔

پھر وہ دن آیا جب انور اور جمیل کی ملاقات خرم کی شادی پر ہوئی بظاہر جمیل انور سے اچھے طریقے سے ملا۔ لیکن چند دن پہلے وہ ایک منصوبہ بنا چکا تھا۔ اس نے گاؤں سے باہر جھگیوں میں جا کر ایک جوگی سے معاملہ طے کر لیا تھا۔

جمیل نے انور کو راضی کیا کہ چلو اکرم کی جیپ لے چلتے ہیں اور جھیل کنارے سیر کر کے آتے ہیں۔ انور کو اپنے انجام تک پہنچنا تھا۔ اس لیے وہ راضی ہو گیا جمیل کے پاس ایک چھوٹا سا تھرموس بھی تھا۔ راستے میں اس نے ایک ہوٹل سے تھرموس کو چائے سے بھروا لیا۔ پھر جھیل کے کنارے جا کر اس نے انور کو خواب آور گولیاں ملی چائے پلا دی۔ اس نے انور کو جھیل میں تیرتی بطخوں کی طرف متوجہ کر کے گولیاں اس کی پیالی میں ڈال دی تھیں۔

پھر وہ کچھ دیر کے بعد جب ذرا اندھیرا پھیل گیا تو وہ انور کو جیپ میں ڈال کر جھگیوں کے پاس لے آیا تھا۔ چائے پلانے کا کام جمیل نے اس وقت کیا تھا جب سب سیاح جھیل سے جا چکے تھے۔ پھر جوگی نے ایک بہت زیادہ زہریلا سانپ انور کو لڑا دیا تھا۔ جب جیپ واپس زمین دار کی حویلی میں پہنچی تھی تو یہ وہی وقت تھا جس کا ذکر پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں آیا تھا۔

جمیل نے حویلی کے ایک نوکر کو بھی ساتھ میں ملایا ہوا تھا۔ اس نے صرف اتنا کہا تھا کہ بوریوں والے کمرے کا عقبی دروازہ کھول دینا اس کو جب قائداعظم کی تصویر والا نوٹ نظر آیا تو اس کی عقل پر بھی پتھر پڑ گئے۔ بہرحال میں نے جمیل، کلثوم جوگی اور نوکر کے خلاف چالان تیار کر کے انہیں تھانوں کے حوالے کر دیا تھا۔

مجھے ایک بات ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ وہ بات میں خرم اور اکرم سے پوچھنا چاہتا تھا۔

چند دن بعد میں سفید کپڑوں میں زمین دار سجاول کی حویلی میں بیٹھا ہوا تھا۔ خرم اور اکرم بھی موجود تھے۔ میں نے خرم اور اکرم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”دیکھو اس وقت میں تھانے دار نہیں ہوں۔ تم مجھے ایک بات تو بتاؤ؟“ میں نے اکرم کو مخاطب کیا۔

”منت کر کے انور کو شادی میں بلایا۔ تم دونوں کے دل میں کیا تھا۔“ ساتھ ہی میں ہنس بھی پڑا۔

”دیکھیں......اب بتانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ہم بھی شادی کے ہنگاموں میں انور کو اس طرح مارنا چاہتے تھے کہ یہ ایک حادثہ لگے۔“

میں نے سنجیدگی سے کہا۔

”دیکھو......برخوردار تمہارے والد صاحب کتنے ہمدرد اور خدا ترس ہیں۔ تمہیں اللہ نے انور کے خون سے ہاتھ رنگنے سے بال بال بچا لیا ہے۔ سانپ بھی مر گیا ہے اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹی۔ تم وعدہ کرو کہ آئندہ کوئی ایسی حرکت نہیں کرو گے جس سے تمہارے والد کی عزت پر حرف آئے۔“

وہ اپنے والد صاحب کے پاؤں میں گر گئے۔ اور بولے۔

”ابا جان ہمیں معاف کر دیں۔ آئندہ انشاءاللہ آپ کو کسی شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔“

قارئین یقین کریں۔ وہ لمحے آج بھی جب میری آنکھوں کے سامنے آتے ہیں تو میری رگ رگ میں ایک طمانیت اور خوشی سرایت کر جاتی ہے۔

زمین دار نے دونوں کو اپنے گلے لگایا تھا او اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اور یہاں یہ بات بھی بتا دوں کہ جیپ کے ٹائروں پر لگی ہوئی مخصوص مٹی نے ہماری رہنمائی جھگیوں تک کی تھی۔

◆

راستہ

صداقت حسین ساجد

اگر نیت سچی ہو تو راستے کی صعوبتیں بھی مسافر کے لیے
پھولوں کی چادر بن جاتی ہے اور وقت کے اندھیرے خود منزل
کا پتا دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

اک جواں ہمت کا احوال، کانٹے اس کے لیے پھول بن گئے تھے

انھیں مجھے پڑھانے کا بڑا جنون تھا، لیکن بھری جوانی میں جس بیماری نے انھیں اپنی گرفت میں لے لیا تھا، اس سے بچنا ناممکن تھا۔ موت کے سوا کوئی اور چارہ نہیں تھا۔ اس وقت اتنی سہولیات نہیں تھیں، اس لیے بیماری کا فوری پتا نہیں چلتا تھا۔ جب پتا چلتا تھا، تب تک دیر ہو چکی ہوتی تھی۔ میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔ ابو، امی سے زیادہ اور امی ابو سے زیادہ مجھے پیار کرتی تھیں۔ گاؤں میں تھوڑی سی زمین ابو کا کل اثاثہ تھا۔ وہاں تھوڑی بہت گندم، چاول یا آگے پیچھے کوئی سبزی وغیرہ کی فصل بیچ کر گھر کا تھوڑا بہت نظام چل جاتا تھا۔ زیادہ تر پاس والے شہر میں جا کر دیہاڑی کرتے، تبھی تو گھر کا چولھا جلتا تھا۔

میرے میٹرک کے امتحان بالکل نزدیک آ چکے تھے، جب ابو کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہو گئی۔ ڈاکٹر کو دکھایا، تو اس نے چند ٹیسٹ کروانے کا کہا۔ ٹیسٹ کی رپورٹس لے کر انھوں نے دوسرے دن آنے کو کہا۔

دوسرے دن میں اکیلا ڈاکٹر کے پاس گیا۔ اس نے بتایا۔

”بیٹا! تم نے اچھا ہی کیا کہ اکیلے چلے آئے۔“

”خیریت تو ہے؟“

”تمھارے ابو کو جگر کا کینسر ہو چکا ہے اور اس وقت وہ آخری مرحلے میں ہے۔“

”اس کا علاج ہو سکتا ہے؟“

”جتنا مرضی علاج کرانا چاہو، کرا لو، لیکن......“

”لیکن کیا؟“

”لیکن انھوں نے بچنا نہیں ہے اور یہ چند دن کے مہمان ہیں۔“

”کیا......؟“ میں دھک سے رہ گیا۔ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ یوں لگا کہ جیسے میرا سب کچھ لٹ گیا ہو۔

”بیٹا! اللہ کی مرضی ہے، وہ جس حال میں بھی رکھے ......تم اور میں کیا کر سکتے ہیں؟“

”ڈاکٹر صاحب! میں کھیت بیچ دیتا ہوں۔“

”اے لڑکے! اگر تم اپنے آپ کو بھی بیچ ڈالو، تو تب بھی انھوں نے نہیں بچنا......“

”پھر میں کیا کروں؟“

”انھیں گھر لے جاؤ اور ان کی جتنی خدمت کر سکتے ہو، کرو۔“

”ڈاکٹر صاحب! ان کی تکلیف کا کیا بنے گا؟“

”جب انھیں تکلیف محسوس ہو، تو یہ دوائی دے دینا۔“ اتنا کہہ کر انھوں نے مجھے دوائی دی۔ پھر وہ بولے۔

”بیٹا! ایک بات غور سے سن لو۔“

”وہ کیا؟“

”انھیں کسی اسپتال نہ لے جانا۔“

”وہ کیوں؟“

”صرف اور صرف پیسہ اور وقت ضائع ہوگا...... میری یہ بات عقل مندوں کی طرح سمجھ لو...... جاؤ! بیٹا! اللہ تعالیٰ

Downloaded From

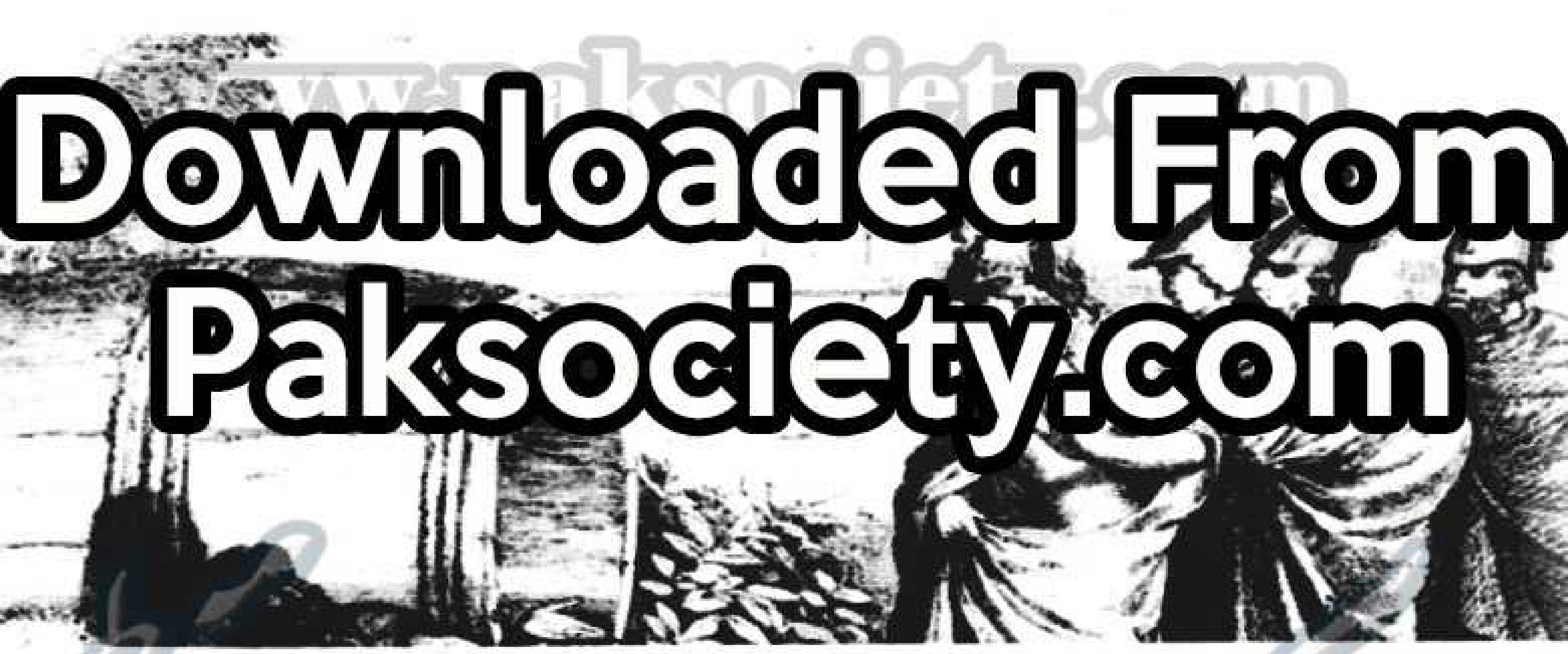

آسانیاں پیدا فرمائے۔“

”ڈاکٹر صاحب! آپ کی فیس اور اس دوائی کے کتنے پیسے ہیں؟“

”کچھ نہیں۔“

”کچھ نہیں...... مطلب؟“

”جب علاج ہی کوئی نہیں ہے، تو پھر پیسے کس بات کے۔“

”ڈاکٹر صاحب! اللہ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔“

میں ڈاکٹر کے کلینک سے نکل کر تقریباً دوڑتا ہوا اپنے گھر آ گیا۔ ابو چارپائی پر لیٹے بڑی مشکل سے سانس لے رہے تھے۔ اگلے دن میٹرک بورڈ کے امتحان کا میرا پہلا پرچہ تھا۔ میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی ابو کہنے لگے۔

”بیٹا! تمھارا کل پہلا پرچہ ہے......“

”جی ہاں!“

”میرے دل کی ایک تمنا پوری کر دو۔“

”ابو جان! کیسی تمنا؟“

”تم بیٹھ کر تیاری کرو......“

”لیکن......“

”لیکن ویکن کچھ نہیں ہے...... مجھے سب پتا ہے کہ مجھے کیا بیماری ہے، میں تمھارے پاس چند دنوں کا مہمان ہوں...... پھر اللہ ہی تمھارا سہارا ہے۔“

”آپ کو کیسے پتا کہ آپ کو کیا بیماری ہے؟“

”بیٹا! میرا دل کہہ رہا ہے، اب میں زیادہ دن نہیں جی پاؤں گا۔“

”ایسی باتیں تو نہ کریں...... اللہ تعالیٰ خیر کرے گا۔“

”بیٹا! جو ہونا ہوتا ہے، وہ ہو کر رہتا ہے۔“

”میں آپ کے پاس ہی بیٹھتا ہوں۔“

پاس بیٹھیں امی غم زدہ لہجے میں بولیں۔

”ہاں ...... بیٹا! میں تمھارے ابو کے پاس بیٹھی ہوں ...... تم جا کر پڑھائی کرو ...... ماں صدقے جائے، جاؤ میرے چاند سے بیٹے!“

میرا پہلا پرچہ ہوا، گھر آیا، تو ابو کو چارپائی پر بیٹھے دیکھ کر دل کو ایک طرح سے تسلی سی ہو گئی۔ اسی طرح آہستہ آہستہ سارے پرچے ہوتے گئے۔ ہر وقت میرا دل اس خیال سے دھڑکتا رہتا کہ آج کوئی بری خبر نہ آ جائے، لیکن اللہ اللہ کر کے میرا آخری پرچہ بھی خیریت سے گزر گیا۔ میں گھر آیا، اپنے ابو کو پرچوں کے ختم اور بہترین ہونے کی خوش خبری سنائی۔ ابو آہستہ سے مسکرائے اور کہنے لگے۔

”بھئی! دیکھ لو...... ہم نے تمھارے پرچے خراب نہیں ہونے دیے، لیکن معاف کرنا......“

”ابو! یہ...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“

”میں اپنا بوجھ تمھارے شانوں پر رکھ رہا ہوں۔“

”کیا مطلب؟“

انھوں نے جیسے میری بات سنی ان سنی کر دی۔ وہ اپنی موج میں کہتے چلے گئے۔

”تمھاری مہربانی ہوگی کہ اس بوجھ کی عزت رکھنا اور اپنی امی کے سر سے چادر نہ اترنے دینا...... محنت کر کے

ہمارے خواب پورے کرنا...... اللہ سوہنا تمہارے لیے خیر ہی خیر کرے گا...... ان شاء اللہ۔“

اتنا کہہ کر ابو خاموش ہو گئے۔ میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا تو بالکل خاموش اور ساکت تھے، تو میں چیخیں مار مار کر انھیں بلانے لگا، لیکن وہ تو ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئے تھے۔

ابو کے کفن دفن سے فارغ ہو کر جب ہم دونوں ماں بیٹا تنہا رہ گئے، تو امی نے مجھے پاس بٹھا کر میرا منہ سر چوما اور کہنے لگیں۔

”اپنے آپ کو یتیم نہ سمجھنے لگنا...... آج سے میں تمہاری ماں بھی ہوں اور باپ بھی...... تم نے اپنے باپ کے خواب پورے کرنے ہیں۔“

”امی! آپ بے فکر رہیں...... ابو نہیں رہے، تو کیا ہوا...... ان کے خواب تو زندہ ہیں...... میں ان شاء اللہ ان کے خواب پورے کروں گا۔“

”شاباش...... بیٹا! مجھے تم سے یہی امید تھی اور ہے۔“

”میں آپ کو کبھی مایوس نہیں کروں گا...... ان شاء اللہ!“

”ان شاء اللہ!“

پھر ہم ماں بیٹا دونوں نے مل کر زندہ رہنے کا ارادہ کر لیا۔ میں نے اپنا کھیت سنبھال لیا اور امی نے گاؤں کی خواتین کے کپڑے سینے کا کام کرنا شروع کر دیا۔

ڈھائی تین ماہ بعد میرا نتیجہ آ گیا۔ میں بورڈ میں پہلے نمبر پر آیا تھا۔ سارے گاؤں نے خوب مبارکیں دیں۔ مجھے اور امی کو ابو رہ رہ کر یاد آ رہے تھے۔ ہم لوگوں سے مبارکیں ہنس ہنس کر وصول کر رہے تھے، لیکن چھپ چھپ کر ابو کو یاد کر کے آنسو بہا رہے تھے۔

فرسٹ ایئر جماعت کے لیے کالجوں میں داخلے کھل گئے تھے۔ کالج کی فیس جمع کرانے کے لیے امی نے کسی نہ کسی طرح سے رقم کا بندوبست کر لیا تھا۔

”امی! یہ تو ہو گیا، لیکن آگے بھی تو بہت سی رقم کی ضرورت پڑے گی...... یوں کام کس طرح چلے گا...... میں کوئی کام ڈھونڈ لیتا ہوں۔“

”آئندہ یہ بات نہ کرنا...... میں تمہارے ابو کے خواب کو پورا کرنے کے لیے جس طرح سے بھی ممکن ہوا، رقم کا بندوبست کرتی رہوں گی...... باقی اللہ خیر کرے گا۔“

میں خاموش کھڑا رہ گیا۔ اب انھیں کیا کہہ سکتا تھا۔ ابو کے خواب کو پورا کرنا میری ذمہ داری تھی۔

ایک دن ہماری پڑوسن ماسی برکت میری امی کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ امی کی بہترین سہیلی تھی۔ دونوں آپس میں آہستہ آہستہ باتیں کر رہی تھیں۔ میں نے غور سے سننے کی کوشش کی، تو حیران رہ گیا۔

امی اسے کہہ رہی تھیں۔

”حمید کا داخلہ تو کالج میں ہو گیا ہے......“

”ماشاء اللہ...... یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔“

”لیکن اب مجھے ایک اور پریشانی ستا رہی ہے۔“

”وہ کیا؟“

”اس کی پڑھائی پر اور بھی تو خرچا ہوتا ہے۔“

”یہ تو ہے...... سو خرچے ہوتے ہیں۔“

”تم ایک کام کرو۔“

”وہ کیا؟“

”مجھے آس پاس کے ایک دو گھروں میں برتن اور کپڑے دھونے کا کام لے کر دے دو، لیکن ایک بات کا خاص خیال رکھنا......“

”کون سی بات کا؟“

”حمید کو اس بات کا پتا نہ چلے۔“

یہ سنتے ہی میری ٹانگوں میں جان نہ رہی۔ مجھے یوں لگا کہ اب میں کھڑا نہیں رہ پاؤں گا۔ میں زمین پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھتا چلا گیا۔ اسی وقت میرے کانوں میں ابو کا جملہ گونجا۔

”اپنی امی کے سر سے چادر نہ اترنے دینا۔“

میں بوکھلا سا گیا اور فوراً بول پڑا۔

”امی! آج تو آپ نے یہ بات اپنے منہ سے نکال لی ہے...... آئندہ اگر آپ نے ایسی کوئی بات کی، تو مجھے آپ کی چادر کی قسم! میں اپنے آپ کو گولی مار دوں گا۔“

یہ سنتے ہی امی بوکھلا گئیں اور تیزی سے اٹھ کر مجھے گلے لگا لیا۔ پھر ہم دونوں ماں بیٹا رونے لگے۔ ماسی برکت بھی اٹھ کھڑی ہوئی اور ہم دونوں کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے

خاموش کرانے لگی۔ ساتھ ہی وہ اپنے آنسو بھی صاف کرنے لگی۔

”آپ نے یہ سوچا بھی کیوں؟“

میں غصے سے لال پیلا ہو رہا تھا۔

”اللہ تمھاری حیاتی کرے! میں نے تو تمھاری کتابوں، کپڑوں اور جوتوں کے لیے کہا تھا...... خالی ہاتھ بیٹھنے سے تو کچھ نہیں ہونے والا ناں!“

”سب انتظام ہو جائے گا...... آپ بے فکر ہو جائیں...... آپ بس اپنی اور میری صحت اور زندگی کے لیے دعا کیا کریں...... آپ خود ہی تو کہتی ہیں کہ اللہ خیر کرے گا اور اب مایوس ہو رہی ہیں۔“

امی بے اختیار سر ہلانے لگیں۔

اگلے دن فجر کے وقت اٹھ کر میں نے امی سے کہا۔

”مجھے کھانا بنا دیں...... ساتھ میں دو روٹیاں رومال میں میرے لیے اسی طرح باندھ دینا، جس طرح ابو کے لیے باندھا کرتی تھیں۔“

امی نے حیران ہو کر کہا۔

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ ہے کہ کالج کی کلاسیں ابھی پندرہ دن بعد شروع ہونی ہیں......“

”پھر......؟“

”میں اتنے دن شہر جا کر دیہاڑیاں کروں گا اور پھر جس دن کالج سے چھٹی ہوا کرے گی، میں شہر جا کر دیہاڑی لگایا کروں گا۔“

امی خاموش بیٹھی رہیں۔ پھر وہ اٹھیں اور کھانا بنانے کی تیاری کرنے لگیں۔

بندے کی نیت اگر نیک ہو، تو اللہ تعالیٰ اسے صلہ بھی اچھا ہی دیتا ہے۔ میری نیت نیک تھی اور میں نہیں چاہتا تھا کہ میری امی بیوگی کا دکھ اپنے گلے میں ڈال کر گھر گھر لوگوں کے برتن مانجھتی پھریں۔ مجھے پتا تھا کہ ابو امی سے بہت پیار کرتے تھے، ان کی ہر خواہش پوری کرتے تھے۔ اب وہ بیوہ ہو کر گھر گھر میں کام کرتی پھریں، میری غیرت اس بات کو کہاں گوارا کر سکتی تھی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مجھے پڑھانے کے لیے محنت مزدوری کرتی ہوئی میری امی کے سر سے چادر اتر جائے اور ابو کی روح قبر میں تڑپتی پھرے۔ میری اس نیک نیت اور اچھی سوچ کا انعام مجھے پہلی دیہاڑی پر ہی مل گیا۔

ہوا کچھ اس طرح کہ میں گاؤں سے نکل کر شہر میں آیا۔ میں ایک نئی تعمیر ہوتی ہوئی کالونی میں داخل ہو گیا۔ میں ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ کہیں کام ہو رہا ہے یا نہیں۔ ایک زیرِ تعمیر گھر پر میری نظر پڑی۔ میں اس کی طرف چل پڑا۔ میں وہاں کھڑے ایک نوجوان سے پوچھا۔

”مزدوری کرنے کے لیے کام مل جائے گا؟“

”تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟“

اس کی آواز بہت بارعب تھی۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ میں ڈر گیا تھا۔

”جناب! میں مزدور ہوں اور ساتھ ہی میرا گاؤں چک چوتالیس ہے۔“

”شناختی کارڈ پاس ہے؟“

”وہ تو ابھی نہیں بنا۔“

خیر ایک دو اور سوال جواب کر کے اس نے مٹی کی ایک ڈھیری کی طرف اشارہ کیا اور کہنے لگا۔

”اس میں توڑی کو ملا دو...... پھر گھانی بنا دو...... اس سے لینٹر کا کالب کرنا ہے...... کیا یہ کام کر لو گے؟“

”جی ہاں! کیوں نہیں......“

”چلو! پھر شروع ہو جاؤ۔“

میں نے جوتا اتارا، شلوار گھٹنوں تک اوپر کر لی، کسی پکڑی اور مٹی کی ڈھیری میں توڑی ملانا شروع کر دی۔ اچھی طرح ملا کر پانی لگانے لگا۔ میرے پاس ہی وہ نوجوان کھڑا تھا۔ اس نے پہلے ہی ربر کا پائپ اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔ پھر اس نے موٹر چلائی اور تیز دھار سے مٹی پر پانی کی دھار مارنا شروع کر دی۔ میں پاؤں اٹھا اٹھا کر مٹی پر مارتا جا رہا تھا۔ یوں جلد ہی گھانی تیار ہو گئی۔ میں کسی پکڑ کر کناروں سے مٹی اندر ڈالنے لگا تاکہ پانی باہر نکلنے نہ لگے۔ ابھی میں گھانی ٹھیک کر ہی رہا تھا کہ پولیس کی ایک گاڑی کچھ فاصلے پر آ کر کھڑی ہوئی۔ ایک افسر اور سات سپاہی چھلانگ مار کر نیچے اترنے لگے۔ میں تو ایک دم ڈر گیا۔ اس افسر نے میرے پاس کھڑے نوجوان کی طرف دیکھ کر اس

سے پوچھا۔

"یہ لڑکا نیار کھا ہے؟"

"ہاں جی!"

ابھی وہ کچھ اور ہی بولنے لگا تھا کہ افسر نے مجھے مخاطب کیا۔

"تمھارا کیا نام ہے اور کہاں سے آئے ہو؟"

میں نے اسے سب کچھ بتا دیا۔

"کتنا پڑھے ہوئے ہو؟"

"جناب! میں میٹرک فرسٹ ڈویژن سے پاس کر چکا ہوں اور بورڈ میں میری پہلی پوزیشن آئی ہے۔"

"پھر کالج میں داخلہ نہیں لیا؟"

میں نے سب کچھ بتا دیا۔ جس وقت میں نے ابو کی بیماری اور موت کے بارے میں بتایا، تو میں چونک پڑا۔ میں نے دیکھا کہ اس افسر کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ مجھے ہاتھ سے اشارہ کر کے کہنے لگا۔

"باہر آؤ!"

"میں تو جیسے گھبرا سا گیا۔ یہ دیکھ کر اس نے پھر پیار سے کہا۔

"باہر آجاؤ...... بیٹا! شاباش...... باہر آجاؤ۔"

میں کھائی تو بنا چکا تھا، آہستہ آہستہ باہر نکل آیا۔ اس افسر نے پاس کھڑے نوجوان سے کہا۔

"اس کے پاؤں دھلاؤ۔"

میں دھک سے رہ گیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے، لیکن ایسا ہو رہا تھا اور مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ بعد میں پتا چلا تھا کہ وہ نوجوان اس افسر کا بیٹا تھا۔ اس نے ہاتھ میں پانی کا پائپ پکڑ رکھا تھا۔ اس نے پانی کی دھار میرے پیروں پر مارنا شروع کر دی۔ افسر نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے اسے غصے سے کہا۔

"نیچے بیٹھ کر اپنے ہاتھوں سے اس کے پاؤں دھلاؤ۔"

وہ نوجوان خاموشی سے نیچے بیٹھ گیا اور میرے پاؤں اپنے ہاتھوں سے دھونے لگا۔ میری تو حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ افسر نے ایک سو روپے کا نوٹ نکالا اور مجھے دے کر کہنے لگا۔

"کل اپنی سندیں وغیرہ لے کر صبح آٹھ بجے تک آ جانا...... اب تم یہ مزدوری نہیں کرو گے...... ان شاءاللہ!"

مجھے یوں لگا، جیسے ابو پولیس افسر کے روپ میں واپس آ گئے ہوں اور اپنے خواب پورے کرنے کے لیے وقت کو اپنی دسترس میں کر کے نزدیک لے آئے ہوں۔ یوں محسوس ہوا، جیسے امی کی امیدوں، خواہشوں اور دعاؤں نے ہماری زندگی میں اپنی جگہ بنانا شروع کر دی ہو۔ مقدر میری نیک نیتی کی وجہ سے میرا بیڑہ پار لگانے کی تیاری کر رہا ہے۔ میں ان کا شکریہ تک ادا نہ کر سکا، کیوں کہ اس وقت میرے پاس الفاظ بھی نہیں تھے۔ آج بھی یہی حال ہے، میرے پاس وہ الفاظ ہی نہیں کہ میں ان کا شکریہ ادا کر سکوں۔

گھر پہنچ کر امی کو ساری کہانی سنائی، تو انھوں نے کچھ کہے بغیر اٹھ کر وضو کیا اور مصلے پر جا کھڑی ہوئیں۔ سجدے میں گئیں، تو بلند آواز سے رونا شروع کر دیا۔ یہ دیکھ کر میں گھبرا سا گیا۔ اگلے دن صبح سویرے میں نے اپنی فائل اٹھائی اور شہر کی طرف چل پڑا۔

اس پولیس افسر کو سب لوگ میاں صاحب کہہ کر بلاتے تھے۔ جب میں ان کے پاس پہنچا، تو وہ بالکل تیار کھڑے تھے۔ اپنے سپاہیوں کی طرف منہ کر کے انھوں نے حکم دیا۔

"اسے ناشتا کراؤ...... چائے وغیرہ پلاؤ اور پھر چلتے ہیں۔"

میں فوراً بولا۔

"سر جی! میں گھر سے ناشتا کر کے اور لسی پی کر چلا ہوں۔"

"اچھا...... چلو...... پھر چلتے ہیں۔"

ڈرائیور نے گاڑی سیدھی کی۔ ایک سپاہی نے بھاگ کر دروازہ کھولا، میاں صاحب گاڑی میں بیٹھے اور سارے سپاہی چھلانگیں مار کر گاڑی کے پچھلے حصے میں بیٹھنے لگے۔ مجھے بھی ایک سپاہی نے ہاتھ سے پکڑ کر اپنے ساتھ والی سیٹ پر بٹھا لیا۔

تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ گاڑی کچہری پہنچ کر ایک مجسٹریٹ کی عدالت کے آگے جا کر کھڑی ہو گئی۔ لگتا ایسے

تھا، جیسے میاں صاحب کی ان کے ساتھ اچھی خاصی دعا سلام ہے۔ سلام دعا کے بعد میاں صاحب نے ان سے کہا ۔

"شاہ جی! آج میں ایک کام سے آپ کے پاس آیا ہوں۔"

"جی! حکم کیجیے۔"

"حکم نہیں، عرض ہے...... اس بچے کا انٹرویو کرلیں اور اسے جونیئر کلرک بھرتی کرلیجیے ...... یہ مستحق بچہ ہے اور ساتھ میں محنتی بھی...... ان شاء اللہ...... آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دے گا۔"

شاہ جی نے میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ہاں بھئی...... نوجوان!"

میں نے آگے بڑھ کر ان سے ہاتھ ملایا اور کہا۔

"السلام علیکم...... جناب!"

پھر پانچ منٹ میں، میں نے انھیں اپنی آپ بیتی سنا دی۔ یہی میرا انٹرویو تھا۔ مجھے آج بھی یاد ہے، ان کا نام سید فدا حسین شاہ تھا اور وہ کلاس ون کے مجسٹریٹ تھے۔ ان کا اسٹینو گرافر وہاں موجود تھا۔ وہ ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ شاہ جی نے اس سے کہا۔

"اس بچے کی فائل تیار کر کے میرے پاس لے آؤ۔"

پھر مجھے بڑی شفقت سے کہنے لگے۔

"بیٹا! ان کے پاس جا کر اپنی فائل تیار کراؤ۔"

قسمت کبھی یوں بھی مہربان ہو سکتی ہے، میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ میں نے جونیئر کلرک کی ملازمت شروع کر دی اور اپنے آپ کو محنت، محنت اور صرف محنت کی چکی میں پیسنا شروع کر دیا۔

مجھے یاد ہے، مجھے پہلی تنخواہ ملی، تو میں سیدھا بازار گیا اور امی کے لیے ایک سوٹ خریدا، ساتھ میں بڑے سائز کی منفرد ڈیزائن والی چادر بھی خرید کر گھر لے آیا۔ امی نے بھیگی آنکھوں سے مجھے اپنے گلے لگا لیا، میرا منہ سر چوما اور ایک ہی سانس میں مجھے سیکڑوں دعائیں دے ڈالیں۔ میں چادر امی کو پکڑاتے ہوئے بولا۔

"امی جان! یہ لیجیے...... ہمیشہ ابو جان کی خواہش پوری کرنا اور اپنے سر سے چادر نہ اترنے دینا۔"

امی ایک بار پھر مجھے دعائیں دینے لگیں۔

ملازمت کے ساتھ ساتھ میں نے تعلیم بھی جاری رکھی، ہر امتحان دیتا رہا اور پاس ہوتا رہا۔ امی نے گاؤں میں ہی دیکھ بھال کر میری شادی کر دی۔ میں نے اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے امی کو ایک منٹ کی تنہائی محسوس نہ ہونے دی۔ ہمیشہ ان کی ہر ضرورت اور ان کے سر کی چادر کا خیال رکھا۔ آخر کوئی ستائیس سال کی بیوگی کی زندگی گزار کر ایک دن امی جان بھی ابو جان کے پاس خاموشی سے چلی گئیں۔

میں خود بال بچوں والا ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو امی اور ابو کے بنا اکیلا ہی محسوس کرتا ہوں۔ امی کے جانے کے بعد میں نے امی کے سر کی چادر آج تک اپنی زندگی کا قیمتی سرمایا سمجھ کر اپنے خاص صندوق میں سنبھال کر رکھی ہوئی ہے۔ والدین کی جدائی میں چھپ چھپ کر آنسو بہاتا ہوا آج ملازمت کے آخری سال میں پہنچ گیا ہوں۔

ایک دن پہلے میری پوسٹنگ میرے گاؤں کے پاس والے اسی شہر کی کچہری میں ہوئی ہے، جہاں میں آج سے کئی سال پہلے جونیئر کلرک بھرتی ہوا تھا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ آج میں یہاں سارے ضلع کا افسر یعنی ڈپٹی کمشنر مقرر کیا گیا ہوں۔ اب میری ریٹائرمنٹ کے دن قریب ہیں۔

امی ابو جنت مکانی بہت یاد آتے ہیں۔

ایک دن میں اپنے بیٹے کو ساتھ لے کر اس پولیس افسر کا گھر دکھانے گیا، جہاں میں پہلے دن مزدوری کرنے گیا تھا اور میری تقدیر نے میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔ میں ہمیشہ اس پولیس افسر کے لیے دعا کرتا ہوں۔

"اللہ تعالیٰ انھیں جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے (آمین)۔"

میں ان کے لیے دعا کیوں نہ کروں، انھوں نے تو مجھے مشکل وقت میں زندہ رہنے کا طریقہ سکھایا اور محنت کر کے اپنی منزل پانے کا گر سمجھایا تھا۔ میرا اس بات پر ایمان ہے، جب قسمت ہاتھ پکڑتی ہے، تو پھر کامیابی کا راستا آسان ہو جاتا ہے۔

◆

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

پاک سوسائٹی پر مُوجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

حسن دو آتشہ

محمد عرفان رامے

تاریخی کہانیوں کا اپنا اک الگ اسلوب ڈھنگ اور حسن ہوتا ہے ڈائجسٹوں نے اس خشک موضوع کو رنگینی دی اور وہ اسلوب دیا کہ جرم وسزا اور رومانس کے شائق قارئین کا ایک بڑا حلقہ اس کا شیدائی ہوگیا جس کے نتیجے میں لکھاریوں کی ایک ایسی کھیپ سامنے آئی جنہوں نے تاریخ کی آڑ میں ہر واقعہ عشق ومحبت کے فسانوں میں بدل دیا تاریخی کہانی کو نئے افق کا مزاج نہیں لیکن منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے کبھی کبھار کوئی نہ کوئی لکھاری اس موضوع پر قلم ضرور اٹھاتا ہے۔

مصر کی کج ادا ملکہ کا فسانہ، جسے لوگ قلوپطرہ کے نام سے جانتے ہیں

وہ حسب معمول قصر کے عقبی حصے میں موجود حوض میں آنکھیں موندے کچھ اس انداز میں لیٹی ہوئی تھی کہ نصف بدن پانی کے اندر اور باقی باہر تھا۔ لبالب بھرے حوض کے ٹھہرے ہوئے پانی میں جب بھی ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوتا تو بے قرار لہریں جسم سے اٹھکیلیاں کرتیں صراحی دار گردن تک جا پہنچتیں اور پھر اچانک ہی اپنی گستاخی کا احساس ہونے پر سہم کر واپس لوٹ آتیں۔ بحر روم کا شور، تیز ہواؤں کی سرگوشیاں اور حوض کا شفاف پانی سب کچھ معمول کے مطابق تھا مگر پھر بھی جانے کیوں آج اس کا دل بہت اداس تھا۔ اکتاہٹ بڑھی تو اس نے قریب بیٹھے سازندوں کو موسیقی کے سُر قید کرنے کا حکم دیا اور خود توبہ شکن انگڑائی لیتے ہوئے پانی سے باہر آگئی۔

اس کے قدم خشکی پر پڑتے ہی کچھ فاصلے پر کھڑی دو کنیزیں مودبانہ انداز میں آگے بڑھیں اور اس عریاں چاند کو ایک نفیس اور مہین چادر میں چھپا دیا گیا۔ پھر کنیزوں نے عقب میں پہنچ کر اس کی ریشمی زلفوں سے گرنے والے شبنمی موتیوں کو ایک نرم کپڑے میں سمیٹا اور بال خشک کرنے لگیں۔

ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ محل کی اندرونی عمارت سے ایک کنیز ہانپتی ہوئی اس کے قریب پہنچی اور پھر اپنی بے ترتیب سانسوں کو معمول پر لاتے ہوئے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ کنیز کی سرگوشی سنتے ہی اس کی آنکھوں میں خوف اور چہرے پر گھبراہٹ کے آثار نمودار ہوئے اور وہ لباس پہن کر تیزی سے قصر کے اندرونی حصے کی جانب لپکی۔ مختلف راہداریوں سے گزرنے کے بعد وہ محل کے اس خاص حصے میں داخل ہوگئی جس سے آگے کسی کنیز یا غلام کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ یہ راستہ اس کے والد شہنشاہ بطلیموس کی خواب گاہ تک جاتا تھا۔ سبک رفتاری سے قدم اٹھاتی جیسے ہی وہ خواب گاہ کے دروازے تک پہنچی اندر سے سنائی دینے والی آواز نے اس کے قدم جکڑ لیے:

”اب وہ وقت آچکا ہے کہ آپ اپنا ولی عہد منتخب کر کے تخت وتاج اس کے حوالے کردیں۔“

یہ جانی پہچانی آواز شاہی کاہنہ طوطیا کی تھی اور وہ بستر مرگ پر موجود شہنشاہ بطلیموس کو اپنا ولی عہد سلطنت منتخب کرنے پر آمادہ کررہی تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

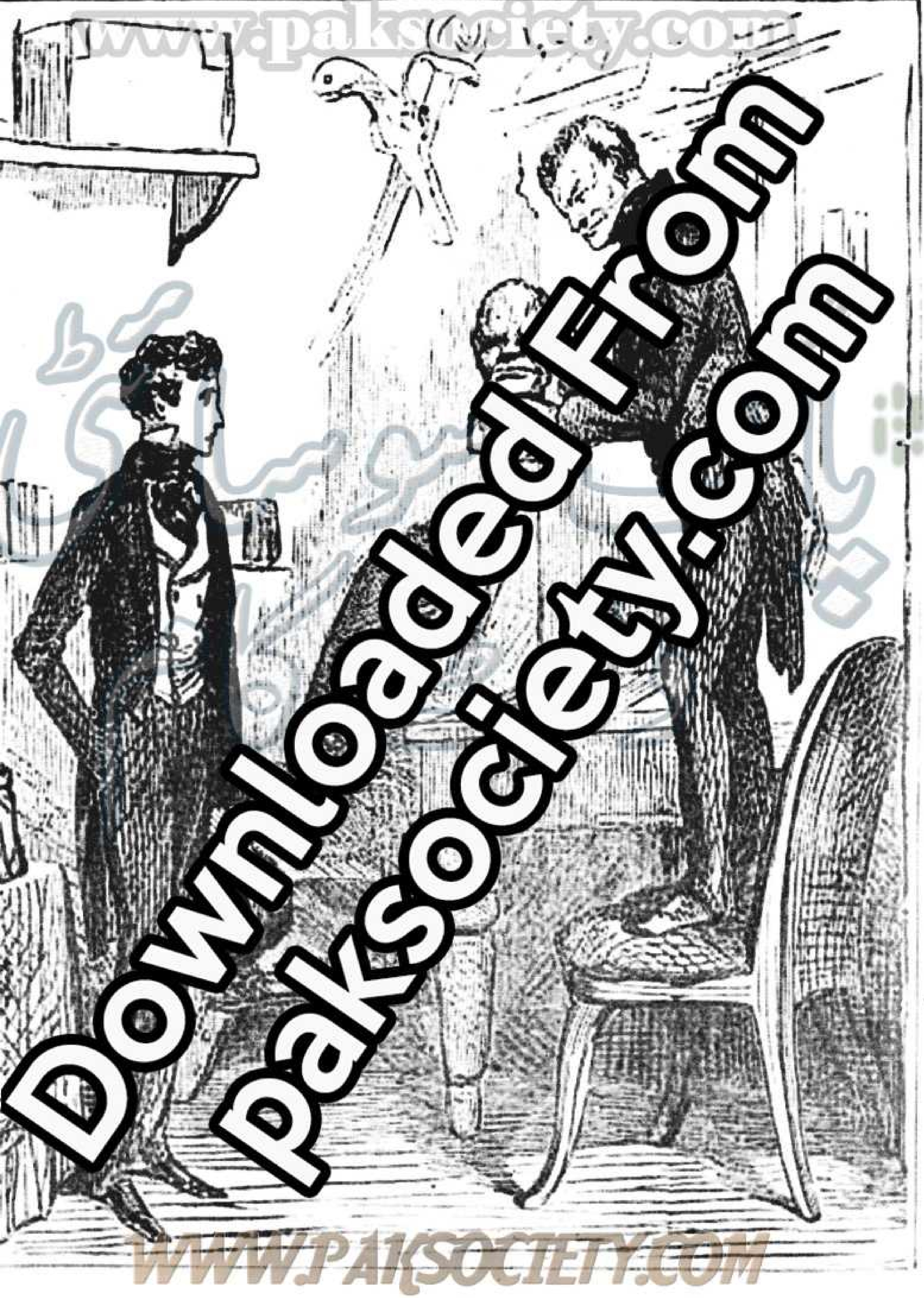

Downloaded From paksociety.com

"تم ٹھیک کہتی ہو۔ میں خود بھی محسوس کر رہا ہوں کہ اب میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ اس لیے میں اعلان کرتا ہوں کہ میرے بعد سلطنتِ مصر کی حکمران شہزادی قلوپطرہ ہو گی۔" شہنشاہ بطلیموس کی آواز باہر کھڑی قلوپطرہ کی سماعت سے ٹکرائی۔

"آپ کا حکم سر آنکھوں پر مگر ملک کے سرحدی حالات ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ تختِ مصر کسی ناتجربہ کار اور کمسن لڑکی کے حوالے کر دیا جائے۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو پوتھی نوس؟" بادشاہ قریب کھڑے وزیرِ اعظم پوتھی نوس کے اختلاف پر نقاہت کے باوجود گرجدار آواز میں بولا۔

"آپ غلط سمجھے ہیں۔ دیوتاؤں کی قسم ہم کسی اور کو نہیں بلکہ شہزادہ فیطلس کو مصر کا حاکم بنانے کے بارے سوچ رہے تھے۔" سپہ سالار اکیلاس نے جلدی سے معاملے کو سنبھالنا چاہا۔

"شہزادہ فیطلس ابھی صرف بارہ سالہ بچہ ہے۔ وہ سلطنت کی ذمہ داریاں کیسے سنبھال سکتا ہے۔ ویسے بھی قانون کے مطابق بڑی شہزادی کے ہوتے ہوئے چھوٹے بیٹے کو حکمران نہیں بنایا جا سکتا۔" طوطیا کو بھی باقی امراء کا اختلاف پسند نہیں آیا تھا۔

"کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ ہمارے فیصلے پر نقطہ چینی کرے۔ یہ طے ہو چکا ہے کہ سلطنت مصر کی آئندہ حکمران قلوپطرہ ہی ہو گی۔" غصے اور جوش کے باعث بطلیموس کا سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگا اور چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اسی لمحے بطلیموس پر شدید کھانسی کا دورہ پڑا تو پردے کی اوٹ میں کھڑی قلوپطرہ کو جیسے ہوش سا آ گیا اور وہ تیزی سے آگے بڑھ کر باپ کی مسہری کے قریب جا پہنچی۔

"والد محترم کیا ہوا آپ کو؟"

وہ بطلیموس کا نیم مردہ ہاتھ تھام کر گلوگیر آواز میں مخاطب ہوئی۔ اسی لمحے جب قلوپطرہ کی نظر قریب کھڑی طوطیا کے چہرے پر پڑی تو اس کی گھبراہٹ میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ شاہی کاہنہ طوطیا، بطلیموس کی مسہری کے گرد چکر کاٹتے ہوئے مسلسل اس پر پھونکتی چلی جا رہی تھی اور عالمِ نزع کی کیفیت میں مبتلا بطلیموس کا سانس تیزی سے اکھڑنے لگا تھا۔ آخری وقت میں اس کی آنکھوں میں زندگی کو کھو دینے کے دکھ کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کمرے میں موجود باقی لوگ بھی سر جھکائے زیرِ لب کچھ پڑھنے میں مصروف تھے۔

اپنی لاڈلی بیٹی کو آخری لمحات میں سامنے پا کر بطلیموس کے خشک ہونٹوں پر لمحہ بھر کے لیے ایک بے نام سی مسکراہٹ تھرتھرائی اور پھر نیم وا آنکھیں ہمیشہ کے لیے بے نور ہو گئیں۔

"آنکھیں کھولیں والد محترم۔۔۔ ہم دیوتاؤں سے التجا کرتے ہیں کہ آپ صحت یاب ہو جائیں۔" قلوپطرہ نے بطلیموس کی بے نور آنکھوں میں جھانکتے ہوئے رندھی ہوئی آواز میں کہا لیکن بہت دیر ہو چکی تھی۔ اب وہ اپنے مردہ باپ کے سینے پر سر رکھے زار و قطار روئے چلی جا رہی تھی جب کہ باقی امراء کے سر ابھی تک تعظیمی انداز میں جھکے ہوئے تھے۔

"ہوش میں آؤ قلوپطرہ! یہ تمہارے رونے کی عمر ہے نہ وقت۔ یہ وقت دانشمندی سے کام لینے کا ہے۔ ورنہ ساری عمر سوائے آنسوؤں کے کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔۔۔ اگر تاعمر حسین رہنا چاہتی ہو تو خود کو آنسوؤں اور دکھوں کے جھنجٹ سے دور رکھنا ہو گا تمہیں۔"

طوطیا نے قریب پہنچ کر سرگوشی کے سے انداز میں دلاسہ دیا اور وزیراعظم پوتھی نوس کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولی:

"وزیراعظم پوتھی نوس! جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں شہنشاہ بطلیموس اب ہم میں نہیں رہے۔ ہمیں فوری طور پر مملکت مصر کو کسی بھی سنگین صورت حال سے بچانے کے لیے ان کی وصیت کے مطابق شہزادی قلوپطرہ کی تاج پوشی کا انتظام کرنا ہو گا۔"

"مگر میں اب بھی اس فیصلے کے حق میں نہیں ہوں اے عظیم کاہنہ۔ بہتر یہی ہو گا کہ ہم شہزادہ فیطلس کو نیا بادشاہ منتخب کر لیں۔" سپہ سالار اکیلاس نے بنا کسی خوف کے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"آپ شاید بھول رہے ہیں کہ قانون کے مطابق شہزادہ صرف اسی صورت میں شریکِ سلطنت بن سکتا ہے اگر وہ شہزادی قلوپطرہ سے شادی کر لے۔" طوطیا نے سخت لہجے میں جواب دیا۔

"میں جانتا ہوں اور اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔ میں اس سلسلے میں شہزادے سے بات کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

”آپ ضرور شہزادے سے مشورہ کریں۔ مگر یاد رہے کہ بادشاہ کی تدفین سے قبل ہمیں ہر صورت قلوپطرہ کو تخت نشین کروانا ہوگا۔ یہی ہمارے ملک کا دستور ہے اور روایت بھی۔“

”میرا خیال ہے عظیم کاہنہ طوطیا کا مشورہ مناسب ہے۔ ہمیں شہزادی کی تاج پوشی میں تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔ شہنشاہ کی تدفین کے بعد شہزادے کی شادی قلوپطرہ سے کروا دی جائے گی۔“

وزیر اعظم پوتھی نوس نے ذہانت سے کام لیتے ہوئے سپہ سالار ایکیلاس کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور قلوپطرہ کی تاجپوشی کے انتظامات کا حکم دینے کمرے سے باہر نکل گیا۔

……☆……☆……

شاہی دربار میں اس وقت جواں سال قلوپطرہ کی رسم تاجپوشی ادا کی جا رہی تھی اور کمسن شہزادے فیلکس بطلیموس کی آنکھوں میں اپنی بہن کے لیے شدید نفرت تھی۔

بادشاہ بطلیموس کی بیماری کے دنوں میں ہی وزیر اعظم پوتھی نوس اور سپہ سالار ایکیلاس نے یہ بات غیر محسوس طریقے سے شہزادے کے ذہن میں بٹھا دی تھی کہ بادشاہ کے بعد حکومت کا اصل حقدار وہی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اپنے باپ کی وصیت اور طوطیا کی بے جا مداخلت نے شہزدے کے حسین خواب چکنا چور کر دیے تھے۔

دربار میں گہری خاموشی تھی اور تمام امراء مودبانہ انداز میں کھڑے تھے۔ جب کہ طوطیا ہاتھ میں پکڑی کتاب بلند آواز میں پڑھ رہی تھی۔ پھر جیسے ہی طوطیا کے حساب کے مطابق تاجپوشی کی مبارک گھڑی آئی تو اس کا اشارہ پاتے ہی وزیر اعظم پوتھی نوس نے جگمگاتا ہوا تاج شہزدی قلوپطرہ کے سر پر رکھ دیا۔

رسم ادا ہوتے ہی ہر طرف سے مبارکباد کے کلمات سنائی دینے لگے تھے۔ طوطیا یہ بات درباریوں کو حتمی طور پر بتا چکی تھی کہ اگر شہزادہ حکومت میں شامل ہونے کا خواہاں ہے تو اسے اپنی بہن سے شادی کرنا ہوگی۔ تاجپوشی کے بعد بطلیموس کی تدفین کی رسم ادا کی گئی۔ ان کاموں سے فارغ ہونے کے بعد مایوس شہزادہ ساتھیوں سمیت واپس اپنے کمرہ خاص میں لوٹ آیا۔ وہ بے چینی کے عالم میں ٹہل رہا تھا جب کہ باقی لوگ ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔

”یہ سب اسی مکار جادوگرنی طوطیا کا کیا دھرا ہے۔ جانے کیا سحر پھونکتی رہتی تھی شہنشاہ پر کہ وہ مجھے نظر انداز کر کے قلوپطرہ کو تخت و تاج دے گئے۔“

”میرا خیال ہے طوطیا کا اس معاملے میں زیادہ قصور نہیں ہے۔ یہ سب قلوپطرہ کی عیاری کا نتیجہ ہے۔ وہ کافی عرصے درباریوں کی رائے اپنے حق میں ہموار کرنے میں کوشاں دکھائی دے رہی تھی۔“ سپہ سالار ایکیلاس جو کہ شاہی کاہنہ کے جادو ٹونے سے خوف زدہ رہتا تھا شہزادے کو سمجھانے کی کوشش کرنے لگا۔

”ایکیلاس ٹھیک کہہ رہا ہے شہزادہ محترم۔“ پوتھی نوس نے بھی اس کی تصدیق کر دی۔

”اگر تم دونوں اس حقیقت سے واقف تھے تو میری راہ ہموار کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی گئی۔“ شہزادہ ان کی بات سن کر مزید بھڑک اٹھا۔

”معاملہ بادشاہ کی وصیت کے باعث خراب ہوا۔ ورنہ درباریوں کی کیا جرات تھی کہ قلوپطرہ کے حق میں رائے دیتے۔“ پوتھی نوس نے دانشمندی سے جواب دیا اور پھر شہزادے کے قریب آ کر بولا: ”بات ابھی بگڑی نہیں ہے۔ قلوپطرہ سے شادی کرتے ہی وہ آپ کی کنیز بن جائے گی اور یوں حکومت کی باگ ڈور آپ کے ہاتھوں میں ہوگی۔“

”مگر میں قلوپطرہ سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔ وہ نہایت خودسر اور ضدی لڑکی ہے۔ میں جانتا ہوں شادی کے بعد بھی وہ حکومت کے معاملات اپنے تک محدود رکھے گی۔“

”آپ کے خدشات بے بنیاد نہیں ہیں محترم شہزادے لیکن فی الوقت اس کے سوا چارہ بھی تو نہیں ہے۔ لہٰذا آپ کو صبر کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔“ پوتھی نوس نے اسے قائل کرنا چاہا تو وہ خاموشی سے کرسی پر جا بیٹھا۔

شہزادے فیلکس کے یہ دونوں خیر خواہ قلوپطرہ کی حکومت سنبھالنے پر خوش نہیں تھے۔ وہ کمسن شہزادے کو تخت پر بٹھا کر اپنی مرضی سے حکومت چلانا چاہتے تھے۔ مگر بادشاہ کی وصیت نے ان کے ارمانوں پر پانی پھیر دیا تھا۔

……☆……☆……

بحر روم کی سمت سے آنے والی ہوائیں اپنے دامن میں خنکی کا احساس لیے ہوئے تھیں مگر پھر بھی قلوپطرہ کو اپنے کمرے میں گھٹن کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کے اشارے پر کنیزوں نے خواب گاہ کے تمام پردے سمیٹ دیے تھے مگر وہ

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

نرم و گداز بستر پر بے چینی سے کروٹیں بدل رہی تھی۔ اس کے سنہرے بال چہرے اور تکیے پر بکھرے ہوئے تھے اور آنکھوں میں اضطراب تھا۔ اپنی اس کیفیت سے نجات حاصل کرنے کے لیے وہ کئی مرتبہ پانی پی چکی تھی مگر سکون اس سے کوسوں دور تھا۔

اسی لمحے خواب گاہ کا پردہ سرکا اور طوطیا باوقار انداز میں چلتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

”کیسی ہو قلوپطرہ؟“

”ایک ناقابل بیان کرب میں مبتلا ہوں۔۔۔ یوں لگتا ہے جیسے کوئی چیز اندر سے مسلسل کاٹ رہی ہو۔“ قلوپطرہ کی بات سن کر طوطیا آگے بڑھی اور اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ دیر بعد طوطیا نے آنکھیں کھول کر قلوپطرہ کے چہرے کی جانب دیکھا اور پھر منتر پھونکتے ہوئے بولی۔

”سب وہم ہے تمہارا۔ بہادر بنو میری بچی۔ مت بھولو کہ اس وقت تم سلطنت مصر کی سب سے طاقتور عورت ہو اور تمہارے ایک اشارے پر لاکھوں جاں نثار اپنی گردنیں کٹوا دینے کا حلف اٹھا چکے ہیں۔“

”تو پھر کیوں مجھے اتنا کمزور بنایا جا رہا ہے کہ میں ایک کمسن اور احمق شہزادے سے شادی کر لوں۔“

”یہ ہماری روایت اور دستور ہے۔“

”مجھے اعتراض اس بات پر نہیں کہ وہ میرا سگا بھائی ہے۔ بلکہ دکھ اس بات کا ہے کہ وہ ایک نوعمر لڑکا ہے۔ اس میں اتنی ذہنی پختگی نہیں کہ میرے ہم قدم چل سکے اور میرے مزاج کو سمجھ سکے۔“ قلوپطرہ کے لہجے میں کرب تھا۔

”یہ بات تمہارے حق میں بہتر ہے کہ وہ ایک نوعمر اور احمق لڑکا ہے۔ تم اس کے دل و دماغ پر قابو پا کر جیسے چاہو استعمال کر سکتی ہو۔۔۔ ویسے بھی یہ شادی جسمانی ضرورتوں کو مدنظر رکھ کر نہیں، اعلیٰ مفادات کو حاصل کرنے کے لیے کی جا رہی ہے اور تمہیں ہر صورت اسے کامیاب بنانا ہو گا۔“ طوطیا نے اسے قائل کرنا چاہا۔

”کیا میں یہ سب کر پاؤں گی۔“

”مجھے یقین ہے کہ تم یہ سب کر لو گی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں کبھی بادشاہ کو تمہارے نام کی وصیت کرنے پر مجبور نہ کرتی۔۔۔ اب تمہیں ثابت قدمی سے کام لینا ہو گا۔“ طوطیا کے سمجھانے پر قلوپطرہ سر ہلا کر خاموش ہو گئی اور شادی کی تیاریاں شروع کر دی گئیں۔

……☆……☆……

قدیم مصری دور میں خون کے رشتوں سے ازدواجی تعلقات قائم کرنا معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے قلوپطرہ اور شہزادہ فیلکس بطلیموس کی شادی پر مصر بھر میں خوب جشن منایا گیا۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس رشتے سے قلوپطرہ اور شہزادہ فیلکس دونوں ہی مطمئن نہیں تھے۔

قلوپطرہ نا صرف شہزدے کو بطور شوہر اہمیت نہیں دیتی تھی بلکہ اسے امور سلطنت میں بھی کوئی خاص مقام نہیں دیا گیا تھا جس کا شہزادے کو دلی رنج تھا۔

اقتدار کی اس کشمکش میں کئی ماہ گزر گئے مگر حالات میں کوئی بہتری نہ آئی۔ لہٰذا جب شہزادے فیلکس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوا تو اس نے ایک بار پھر اپنے مشیروں کو صلاح مشورے کے لیے کمرہ خاص میں طلب کر لیا۔

اس کے ساتھی بھی قلوپطرہ کی نظروں میں کھٹک رہے تھے اور جلد یا بدیر اپنی جانوں سے ہاتھ دھونے والے تھے اس لیے سب نے سر جوڑ کر اس مسئلے کا حل تلاش کرنا شروع کر دیا:

”شادی سے معاملہ حل نہ ہونے کے بعد اب یہی حل بچتا ہے کہ ہم ملکہ کے خلاف بغاوت کا علم بلند کر دیں اور پھر موقع ملتے ہی اسے قتل کر کے تخت پر قابض ہو جائیں۔“ پوتھی نوس نے اپنی ماہرانہ رائے دیتے ہوئے داد طلب نگاہوں سے باقی لوگوں کی جانب دیکھا تو سپہ سالار ایکیلاس منہ بنا کر بولا:

”احمقانہ باتیں کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہ سب اتنا آسان نہیں ہے۔ دربار میں ایسے امراء کی کمی نہیں جو قلوپطرہ کو بہت پسند کرتے ہیں۔“

”کچھ پانے کے لئے خطرہ تو مول لینا ہی پڑتا ہے ایکیلاس! مگر تم فکر مت کرو۔ امراء کی رائے بدلنا میری ذمہ داری ہو گی۔ تم صرف اپنے کام پر توجہ دو۔“ پوتھی نوس کی خود اعتمادی کسی کو پسند نہیں آئی تھی مگر پھر بھی سب خاموش رہے اور منصوبے کو حتمی شکل دینے کی تیاری شروع کر دی گئی۔

……☆……☆……

قلوپطرہ کو اقتدار سنبھالے چند سال ہی گزرے تھے کہ اس نے اپنے مشیروں کی نشاندہی پر ایسے بہت سے لوگوں کو

موت کے گھاٹ اتروا دیا جو کسی بھی صورت اس کے لیے خطرہ بن سکتے تھے۔ لیکن آج کل وہ کافی اداس اور بے چین تھی۔ وجہ یہ کہ اس کی مشیر خاص اتالیق طوطیا نے بہت دور پہاڑی علاقے میں اپنی عبادت کے لیے رخت سفر باندھ لیا تھا۔ جب سے قلوپطرہ نے اقتدار سنبھالا تھا طوطیا پہلی مرتبہ اسکندریہ سے باہر گئی تھی۔ قلوپطرہ اس کی غیر موجودگی میں کچھ خوف محسوس کر رہی تھی اور اسے ہر پل کسی انجانے خطرے کا دھڑکا لگا ہوا تھا۔

اس روز شام ڈھلنے پر وہ اپنی خواب گاہ کی بالکونی میں کھڑی چاند کا نظارہ کر رہی تھی کہ ایک خادمہ دوڑتی ہوئی اندر داخل ہوئی:

"غضب ہو گیا ملکہ عالیہ! شہزادہ فیطلس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر آپ کے خلاف بغاوت کر دی ہے۔۔۔ وہ لوگ محل پر قبضہ کر چکے ہیں اور آپ کی تلاش میں ادھر آنے والے ہیں۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو تم۔" قلوپطرہ یہ خبر سن کر لرز گئی تھی۔

"یہ سچ ہے ملکہ! آپ کو کسی بھی طرح فوراً یہ محل چھوڑنا ہو گا۔"

"مگر میں اس طرح اچانک یہاں سے کیسے جا سکتی ہوں۔"

"آپ کو ہر صورت محل چھوڑنا ہو گا اور اس مشکل میں، میں آپ کے ساتھ چلوں گی۔" اس کی ایک خاص کنیز نے آگے بڑھ کر ادب سے جواب دیا۔

"یہ جان نثار بھی آپ کو تنہا نہیں چھوڑے گا۔" مضبوط جسامت والا ایک لمبا تڑنگا دربان بھی اسی لمحے کمرے میں آن پہنچا تھا۔ "قصر کے ساحلی دروازے کے باہر روانگی کے لیے سواری آپ کی منتظر ہے۔ وقت بہت کم ہے۔ ہمیں فوراً محل سے نکلنا ہو گا۔"

"ٹھیک ہے۔۔۔ روانگی کی تیاری کی جائے۔"

قلوپطرہ نے حسرت بھری نظروں سے اپنی عالیشان خواب گاہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اسی دوران کنیز ایک سیاہ چادر اس کے گرد لپیٹ چکی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ اپنے جاں نثار دربان اور کنیز کے ہمراہ خواب گاہ سے باہر نکل آئی۔ اب وہ تیزی سے چلتے ہوئے اس خفیہ سرنگ میں داخل ہو چکے تھے جو محل سے نکلنے کا ایک خفیہ راستہ تھا۔ اس سرنگ کے بارے میں دربان اور قلوپطرہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا تھا۔۔۔ سرنگ بالکل تاریک تھی اور وہ تینوں اندھیرے میں بنا روشنی کے دیواروں کو ٹٹولتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔

……☆……☆……

محل میں شہزادہ فیطلس کے سپہ سالار ایکیلاس کی فوج قبضہ کر چکی تھی اور سپاہیوں کو ملکہ قلوپطرہ کے قتل کا حکم دے دیا گیا تھا۔

"ملکہ اپنی خواب گاہ میں موجود نہیں ہے۔۔۔ لگتا ہے اسے بغاوت کا علم ہو گیا تھا۔"

ایک سپاہی نے واپس پہنچ کر ایکیلاس کو اپنی ناکامی کا قصہ سنایا تو وہ غصے سے آگ بگولا ہو گیا۔ "کیا بکواس کر رہے ہو تم۔ کہاں جا سکتی ہے وہ بالشت بھر لڑکی۔۔۔ یقیناً وہ محل میں کہیں چھپ گئی ہو گی۔ جاؤ اور تلاش کرو اسے۔ مجھے ہر صورت اس کا سر چاہیے۔"

"زیادہ جذباتی مت بنو ایکیلاس۔ مجھے معلوم ہے وہ کہاں جا سکتی ہے۔" وزیر اعظم پوتھی نوس کمرے میں داخل ہوا "آؤ میرے ساتھ۔ مجھے اس چور دروازے کا علم ہے وہ فرار ہوئی ہو گی۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟" ایکیلاس نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔

"ملکہ کی خواب گاہ سے ایک خفیہ سرنگ ساحل سمندر کی جانب نکلتی ہے۔ ہمیں فوراً سرنگ کے دہانے تک پہنچنا ہو گا۔ اگر وہ محل سے نکلنے میں کامیاب ہو گئی تو ہم کبھی اسے گرفتار نہیں کر پائیں گے۔"

وزیر اعظم پوتھی نوس اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اس سرنگ کی جانب چل پڑا۔ جب کہ شہزادہ فیطلس اس کارروائی سے بے نیاز بالکل خاموش بیٹھا رہا۔ کیونکہ یہ اندھا قدم اٹھانے کے بعد وہ ہر صورت اپنا تخت و تاج چھین لینا چاہتا تھا اور اسے قلوپطرہ کی زندگی سے قطعاً دلچسپی نہیں تھی۔

……☆……☆……

شاہی کاہنہ طوطیا اپنی عبادت مکمل کر کے اسکندریہ واپس لوٹی تو صورت حال بالکل بدل چکی تھی اور تخت پر قلوپطرہ کی بجائے کمسن فیطلس بطلیموس قابض تھا۔ دربار میں آنے پر بادشاہ اور اس کے درباریوں نے طوطیا کا ادب سے استقبال کیا اور اس کی شاہی ذمہ داری واپس سونپ دی گئی۔ لیکن طوطیا

اس تبدیلی سے دلی طور پر خوش نہیں تھی۔

"تم لوگوں نے قلوپطرہ سے تخت چھین کر اچھا نہیں کیا۔۔۔ یاد رہے یہ تخت و تاج اسی کی ملکیت ہے۔ میرا علم کہتا ہے کہ ایک روز وہ بھرپور طاقت سے مصر پر حملہ کرے گی اور اپنا کھویا ہوا وقار واپس چھین لے گی۔"

طوطیا کے الفاظ نے دربار میں خوف کی فضا قائم کر دی تھی۔ درباریوں کو یقین تھا کہ طوطیا کا علم کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ سب سے بری حالت شہزادہ فیطس کی تھی۔ وہ اپنی بہن کے حملے سے اس قدر خوف زدہ تھا کہ اپنی خواب گاہ میں اکیلا سونے سے ڈرنے لگا تھا۔

ایک روز نیا خیال ذہن میں آتے ہی اس نے اپنے ساتھیوں کو دوبارہ مشورے کے لیے طلب کیا:

"کیوں نہ ہم سلطنت روما کے جنرل پومپی سے اس سلسلے میں مدد طلب کریں؟"

"تجویز نہایت مناسب ہے۔ جنرل پومپی کافی حد تک ہمارے حالات سے واقف بھی ہیں اور ماضی میں بارہا ہماری مدد کر چکے ہیں۔۔۔ مگر میں نے سنا ہے کہ ان دنوں سلطنت روما کے حالات زیادہ اچھے نہیں اور جنرل پومپی کی جنرل جولیس سیزر سے ٹھنی ہوئی ہے۔" فیطس کی تجویز سن کر پوتھی نوس نے مایوسی سے جواب دیا۔

"تو پھر کیا کیا جائے؟" فیطس کا چہرہ مرجھا گیا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ ہمیں جلد بازی سے کام لینے کے بجائے خاموش رہ کر صورت حال کا باریک بینی سے جائزہ لینا چاہیے۔" ایکیلاس نے اپنی رائے پیش کی تو وہ دونوں اس کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے سر ہلانے لگے۔

بہت جلد انہیں یہ خبر بھی مل گئی کہ قلوپطرہ محل سے فرار ہو کر شام جا پہنچی ہے اور ان پر حملہ کرنے کے لیے لشکر تیار کر رہی ہے۔ اس اطلاع نے فیطس بطلیموس کی راتوں کی نیند اڑا دی۔ اسے کاہنہ طوطیا کی کہی ہوئی بات درست معلوم ہونے لگی تھی کہ قلوپطرہ بھرپور طاقت کے ساتھ مصر پر حملہ کرے گی اور تخت پر قبضہ کر لے گی۔

موسم سرما کا آغاز ہو چکا تھا اور فضا میں خنکی بڑھ جانے کے باعث صبح کی تازہ ہوا میں ٹھنڈک کا احساس رچ بس گیا تھا۔ ایک روز فیطس بطلیموس اپنے مشیروں کے ہمراہ بیٹھا تھا۔ ملک شام سے آنے والے ایک شاہی جاسوس نے خبر دی تھی کہ ملکہ قلوپطرہ نے اپنا لشکر تیار کر لیا ہے اور وہ خشکی کے راستے مصر پہنچنے کا فیصلہ کر چکی ہے۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ قلوپطرہ خشکی کے راستے مصر پہنچے گی۔" خبر سنتے ہی فیطس بطلیموس کے وجود میں سردی کی لہر دوڑ گئی تھی۔

"عالی جا! ہماری خبروں کا انحصار دوسروں کی کہی ہوئی باتوں پر ہوتا ہے اس لیے غلطی کا امکان بہر حال موجود رہتا ہے۔" وزیر اعظم پوتھی نوس نے ادب سے جواب دیا اور پھر سپہ سالار ایکیلاس سے مخاطب ہوا:

"کیا یہ ممکن ہے کہ ہم قلوپطرہ کو مصر میں داخل ہونے سے روک سکیں؟"

"ممکن تو ہے مگر اس کے لیے ہمیں سکندریہ سے باہر نکلنا ہوگا۔" سپہ سالار نے سوچتے ہوئے کہا۔ جاسوس کی اطلاع سے وہ بھی کچھ پریشان سا ہو گیا تھا۔

"تو آپ کیا چاہتے ہیں کہ ہم محل میں دبک کر بیٹھے رہیں اور قلوپطرہ سکندریہ پہنچ جائے۔" فیطس بطلیموس اس کی بات سن کر دہاڑا۔

"عالی جاہ بالکل پریشان مت ہوں۔ ہم بہت جلد اپنا لشکر لے کر سرحد کی جانب بڑھیں گے اور قلوپطرہ کو جرات نہیں ہو سکے گی کہ مصر میں قدم رکھے۔" سپہ سالار ایکیلاس نے غلطی کا احساس ہوتے ہی پینترا بدلا تو کمسن فیطس بطلیموس کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔

"سپہ سالار آپ تنہا نہیں جائیں گے۔ ہم سب آپ کے ساتھ میدان جنگ میں موجود ہوں گے۔" وہ پر جوش انداز میں بولا تو سب نے جملہ بازی کر کے بادشاہ کے فیصلے کو سراہا اور روانگی کی تیاری شروع کر دی گئی۔

جلد ہی فیطس بطلیموس اپنے بحری اور بری لشکر کے ہمراہ قلوپطرہ کو روکنے کے لیے روانہ ہو گیا اور بندرگاہ کے قریب قلعہ پیلوتیم جا پہنچا۔

انہیں قلوپطرہ کے مصر میں داخل ہونے کی اطلاع مل چکی تھی۔ قلوپطرہ کے لشکر کی اطلاع ملتے ہی شاہ فیطس کی حالت غیر ہو گئی۔ اسے خطرہ تھا کہ قلوپطرہ پہلے ہی حملے میں کامیاب ہو جائے گی۔

رات دھیرے دھیرے گزرتی چلی جا رہی تھی۔ مگر شاہ بطلیموس کو ایک پل سکون نہیں تھا۔ اسی دوران اسکندریہ سے

آنے والے قاصد نے بتایا کہ سلطنت روما کا جنرل پومپی اپنے حریف جنرل جولیس سیزر سے شکست کھا کر پناہ اور مدد کے لیے مصر پہنچ گیا ہے۔ جنرل پومپی کا جہاز ساحل سمندر سے کچھ فاصلے پر ٹھہرا ہوا ہے اور سکندریہ کے گورنر نے اسے وہیں رکنے کا حکم دیا ہے۔ تاکہ آپ سے ہدایات حاصل کر سکے۔

قاصد کا پیغام سننے کے بعد فیطس بطلیموس نے اسے کمرے سے باہر بھیج دیا اور اپنے مشیروں سے مشورہ کرنے لگا۔

قلوپطرہ کے حملے کے پیش نظر وہ ابھی اس حالت میں نہیں تھے کہ جنرل پومپی کی مدد کر سکیں۔ اسی دوران اطلاع ملی کہ ایک رومن جہاز ان کے قلعے کے قریب ساحل کی جانب بڑھ رہا ہے۔ سکندریہ سے آنے والے قاصد نے بھی تصدیق کردی تھی کہ یہی وہ جہاز ہے جس پر جنرل پومپی سوار ہے فیطس بطلیموس بے وقت مصیبت پر مزید گھبرا گیا مگر پوتھی نوس نے ایک انوکھا مشورہ دے کر اس کا دل جیت لیا:

"آپ اس شکست خوردہ جنرل کو قتل کروا کر اس کا سر جولیس سیزر کو تحفے میں بھجوادیں اور ساتھ ہی دوستی کی پیشکش کردیں۔"

تجویز معقول تھی جو فیطس بطلیموس کو بہت پسند آئی۔ اس نے فوراً اس پر عمل درآمد کا حکم جاری کر دیا۔ اس سارے خونی کھیل کی ذمہ داری سپہ سالار ایکیلاس نے اپنے ذمہ لی اور جنرل پومپی کو دھوکے سے مدد کے جھانسے میں ساحل پر بلا کر اس کا سر تن سے جدا کردیا گیا۔

جب جولیس سیزر کو اپنے حریف جنرل پومپی کے مارے جانے کی اطلاع ملی تو وہ بھی تیزی سے مصر کی جانب بڑھا اور اپنی بیشتر فوج سمندر میں بحری بیڑوں پر چھوڑ کر خود سیدھا سکندریہ میں فیطس بطلیموس کے محل میں جا گھسا۔ جولیس سیزر نے پومپی کے قتل پر اطمینان کا اظہار کیا مگر ساتھ ہی اس بات کی مزاحمت بھی کرڈالی کہ پومپی کو دھوکے سے بلا کر قتل کردیا گیا۔

……☆……☆……

رات کی تاریکی میں ایک چھوٹی سی کشتی سمندر کے سیاہ سینے کو چیرتی ہوئی اسکندریہ کی بندرگاہ میں داخل ہوئی اور پھر شاہی محل کی سیڑھیوں کے ساتھ جا لگی۔ کشتی رکتے ہی اس میں سے لمبا تڑنگا غلام نیچے اترا اور پھر ایک قالین اپنے کاندھوں پر لاد کر محل کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

"ٹھہرو۔۔۔کون ہو تم؟"

میں شاہ بطلیموس کا غلام ہوں اور جنرل سیزر کے لیے ان کا بھیجا ہوا قالین کا تحفہ لایا ہوں۔"

غلام نے روکنے والے پہرے دار کو جواب دیا تو وہ خلاف توقع خاموش ہو گیا اور بنا تلاشی لیے اسے آگے جانے کی اجازت دے دی گئی۔ راستے میں غلام کو کئی بار روکا گیا لیکن اس نے ہر بار یہی جواب دے کر پہرے داروں کو خاموش کرادیا۔ حتیٰ کہ وہ جارحانہ انداز میں آگے بڑھتا ہوا اس عالیشان خواب گاہ میں جا پہنچا جہاں ادھیڑ عمر جنرل جولیس سیزر ہاتھ میں جام تھامے کسی گہری سوچ میں گم بیٹھا تھا۔

"کون ہو تم؟"

آہٹ پاتے ہی جولیس سیزر نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے سخت لہجے میں پوچھا۔

"غلام، فاتح عالم کی خدمت میں شاہ بطلیموس کی جانب سے بھیجا ہوا تحفہ پیش کرنا چاہتا ہے۔"

جولیس سیزر حیران تھا کہ یہ غلام سخت پہرے کے باوجود براہ راست اس تک کیسے پہنچ گیا ہے۔

"ہوں۔۔۔اجازت ہے۔"

اجازت ملتے ہی غلام نے قالین احتیاط سے فرش پر رکھا اور اسے ایک جانب لڑھکا کر خود مودبانہ انداز میں کھڑا ہو گیا۔ قالین کھلتا ہوا سیزر کے قدموں تک جا پہنچا اور اس میں لپٹی ہوئی قلوپطرہ توبہ شکن انگڑائی لیتے ہوئے قالین سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

اگلے ہی لمحے اس نے ایک جھٹکے سے اپنے بدن کے گرد لپٹی سیاہ چادر اُتار کر دور اچھال دی تو خواب گاہ اس کے مرمریں وجود سے روشن ہو گئی۔ قلوپطرہ اتنی خوبصورت تھی کہ شراب نوشی میں مشغول جنرل سیزر آنکھیں جھپکانا بھول گیا تھا۔ جنرل سیزر خوبصورت عورتوں کا رسیا تھا مگر ایسا بے مثال ملکوتی حسن اس نے آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

اس کی محویت دیکھ کر قلوپطرہ کے لبوں پر تکبر بھری مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے اشارے سے غلام کو باہر جانے کا حکم دیا اور خود پر وقار انداز میں چلتی ہوئی جنرل سیزر کی جانب بڑھی۔

عورت کے معاملے میں سیزر انتہائی بے باک واقع ہوا تھا۔ وہ ادھیڑ عمر ہونے کے باوجود وجیہہ شخصیت کا مالک تھا۔ چنانچہ اس بات سے بے خبر کہ آنے والی مہ جبیں کون ہے اس نے فوراً ہی استقبال کے لیے اپنے بازو پھیلا دیے لیکن قلوپطرہ اس سے چند قدم کے فاصلے پر ہی ساکت ہوگئی:

"جانتے ہیں آپ میں کون ہوں؟"

"نہیں میں نے پہلے تمہیں کبھی نہیں دیکھا۔ لیکن جو عورت ایک بار میری رات کو رنگین بنادے میں اسے کبھی نہیں بھولتا۔"

"کیا میں آپ کو عام سی عورت دکھائی دے رہی ہوں؟" وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔

"میں سمجھا نہیں۔" سیزر اب سنبھل چکا تھا۔

"میں کوئی عام عورت نہیں دیوتاؤں کی اولاد اور حسن کی دیوی ہوں۔" سیزر اس کی باتیں سن کر محتاط ہوگیا اور بغور دیکھتے ہوئے بولا:

"کون ہو تم؟"

"میں بطلیموس خاندان کی ساتویں حکمران قلوپطرہ ہوں۔۔۔ کیا آپ کو میرے انداز و اطوار، لب و لہجے میں ایسی کوئی خاص بات محسوس نہیں ہو رہی کہ میں کسی شاہی خاندان سے تعلق رکھتی ہوں۔" قلوپطرہ کے لہجے میں طنز تھا۔

"قلوپطرہ۔۔۔ میں معذرت خواہ ہوں ملکہ کہ تمہارا شایان شان استقبال نہ کر سکا۔۔۔ لیکن یقین مانو میں تمہیں محل میں بلوانے کی کوئی صورت سوچ رہا تھا۔" سیزر کا انداز باوقار تھا مگر اس کے لہجے میں معذرت کا عنصر موجود تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ قلوپطرہ اس تک پہنچنے کے لیے اپنی زندگی داؤ پر لگا دے گی۔

"آمد کا یہ انوکھا انداز میری جرات اور ذہانت ہے کہ میں ہزاروں سپاہیوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اس خواب گاہ میں موجود ہوں۔" جواب میں سیزر نے سر ہلا کر اس کے خیال کی تائید کی:

"کیا چاہتی ہو مجھ سے؟"

"میں سلطنت روم کے مختار کل کے سامنے اپنا مقدمہ پیش کرنے آئی ہوں اور چاہتی ہوں کہ میرے باپ کی وصیت کے مطابق مجھے میرا تخت واپس دلایا جائے۔" قلوپطرہ نے چند الفاظ میں اپنا مدعا بیان کیا۔

"تمہاری درخواست ضرور سنی جائے گی مگر دوسرے فریق کی موجودگی میں۔" سیزر نے مختصر جواب دیا اور قلوپطرہ کو ہمراہ لیے اپنی نشست گاہ میں آن بیٹھا۔

"میرا بھائی فیطس بطلیموس قلعہ پیوتیم میں مقیم ہے۔ کیا وہ آپ کے بلانے پر مذاکرات کے لیے یہاں آجائے گا؟"

"اسے بلانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ وہ اسی محل کے ایک زندان میں موجود ہے۔" سیزر کے لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔

"آپ شاید مذاق کر رہے ہیں۔" وہ شہزادہ فیطس کی گرفتاری پر چونکی۔

"نہیں یہ سچ ہے قلوپطرہ۔ فیطس بطلیموس اور وزیر اعظم پوتھی نوس دونوں اس وقت ہماری تحویل میں ہیں۔" قلوپطرہ کی ہر ادا سیزر کو گھائل کیے چلی جا رہی تھی۔ وہ جس قدر خوبصورت تھی اس کی آواز بھی اسی قدر مدھر تھی۔

"تو میں آپ سے کیا اُمید رکھوں؟"

"بے فکر رہو، کل صبح فیصلہ ہو جائے گا۔"

"مجھے آپ کے فیصلے سے نہیں اپنے تخت و تاج سے دلچسپی ہوگی۔" قلوپطرہ نے التجا آمیز نظروں سے سیزر کی جانب دیکھا جیسے وہ اپنے حق کے حصول کے لئے سب کچھ لٹا دینے کا عزم لے کر مقتل میں آئی ہو۔

جنرل سیزر چند لمحے توقف کے بعد اپنی جگہ سے اُٹھ کر دھیرے دھیرے چلتا ہوا اس کے قریب پہنچا اور بنا کسی جھجک کے اسے اپنی بانہوں میں سمیٹتے ہوئے بولا:

"بے فکر ہو جاؤ۔۔۔ مصر کا تخت قلوپطرہ کا رہے گا۔" جواباً قلوپطرہ نے گہری سانس لے کر مسکراتے ہوئے اپنا سر اس کے شانے پر رکھ دیا۔

وہ رات بہت نشیلی تھی اور بحر روم کی بپھری ہوئی لہروں میں کچھ زیادہ ہی اُبال تھا۔ اس رات قلوپطرہ نے جنرل سیزر کو اپنی کتاب محبت کا پہلا سبق پڑھا ڈالا اور یوں طلوع سحر تک سیزر کی تمام ہمدردیاں قلوپطرہ تک محدود ہو چکی تھیں۔

……☆……☆……

شاہ مصر فیطس بطلیموس جسے اپنے ہی محل کے ایک چھوٹے سے کمرے میں قید کیا گیا تھا پریشانی کے عالم میں ٹہل رہا تھا۔ اس کے ساتھ وزیر اعظم پوتھی نوس بھی قید تھا

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

مگر دونوں بالکل خاموش تھے۔

فیطس بطلیموس کو اپنے تخت و تاج کی فکر تھی تو پوتھی نوس کو اپنی جان کی۔ وہ دونوں سوچوں میں گم تھے کہ دروازہ کھلا اور فیطس بطلیموس کو جنرل سیزر کے پاس چلنے کا حکم سنایا گیا۔

اپنے وزیر کے بغیر کمسن بطلیموس کو جنرل سیزر سے ملنے میں ہچکچاہٹ محسوس ہو رہی تھی مگر حکم کے مطابق اسے تنہا جانا تھا۔ چنانچہ وہ ہمت کر کے سپاہیوں کے ساتھ باہر نکل گیا۔ مگر جیسے ہی وہ جنرل سیزر کے کمرے میں داخل ہوا سامنے بیٹھی قلوپطرہ کو دیکھتے ہی اس کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی۔

"قلوپطرہ تم۔۔۔؟"

اس کے منہ سے یہی جملہ نکل پایا تھا کہ جولیس سیزر کی گرجدار آواز کمرے میں گونجی۔

"فطیس بطلیموس تمہارے وزیر کا کہنا ہے کہ معاہدے کی خلاف ورزی قلوپطرہ کی جانب سے ہوئی مگر قلوپطرہ کا موقف سننے کے بعد یہ ثابت ہوتا ہے کہ اصل خلاف ورزی تمہاری طرف سے کی گئی ہے۔۔۔ تمہارے باپ نے قلوپطرہ کے ساتھ تمہیں بھی حکومت کرنے کی سفارش کی تھی۔ حالانکہ مصری دستور کے مطابق مصر کی حکمران بڑی بیٹی بنتی ہے۔ اگر قلوپطرہ چاہے تو اس سفارش کو رد کر سکتی ہے۔ تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ اس سے صلح کر لو۔" جنرل سیزر کی بات سن کر شہزادہ فیطس کا جسم غصے سے کانپ اٹھا تھا۔

"میرے ساتھ دھوکا کیا جا رہا ہے، یہ ظلم ہے۔" وہ بچوں کی طرح چلاتے ہوئے رونے لگا۔ مگر جولیس سیزر اپنے فیصلے پر قائم رہا۔ دوسرے دن جولیس سیزر کی صدارت میں مجلس مشاورت منعقد ہوئی جس میں شہزادے فیطس کی جانب سے شہر کے چند معززین جب کہ قلوپطرہ کی مدد کے لیے صرف شاہی کاہنہ طوطیا موجود تھی۔ جب جولیس سیزر نے با آواز بلند حاضرین کے سامنے شہنشاہ بطلیموس کا وصیت نامہ پڑھا کہ دونوں بہن بھائی مل کر مصر پر حکومت کریں گے تو کسی کے پاس اعتراض کی گنجائش نہ رہی۔

چنانچہ جنگ و جدل سے بچنے کے لیے جولیس سیزر نے ان دونوں کو صلح کرنے کا مشورہ دیا۔ شہزادہ فیطس بطلیموس نوعمر ضرور تھا مگر اس قدر نادان نہیں کہ حالات کی نزاکت نہ سمجھ پاتا۔ وہ فوراً صلح پر رضامند ہو گیا۔

اب قلوپطرہ مصر کی با اختیار ملکہ بن چکی تھی۔ اس موقع پر طوطیا نے اسے جنرل سیزر کا شکریہ ادا کرنے کا مشورہ دیا تو وہ دلفریب ادا سے مسکرائی:

"جنرل سیزر نے ہم پر خاص مہربانی کی ہے۔ ہم ان کا شکریہ عام انداز میں ادا نہیں کریں گے۔" وہ مسکراتی آنکھوں سے آگے بڑھی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

قلوپطرہ کی بات سن کر جنرل سیزر کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ اسے ابھی سے آنے والی رات کا انتظار ستانے لگا تھا۔ یہی نہیں سیزر نے فوری طور پر اپنے خاص رومی خدام کو طلب کر کے خواب گاہ کو از سر نو ترتیب دینے کا حکم جاری کر دیا۔

دوسری طرف قلوپطرہ نے بھی آنے والی رات کی تیاری شروع کر دی تھی۔ بہت سی رومی اور مصری خادمائیں، مشاطائیں اور ماہر حسن طوطیا اسے سجانے سنوارنے میں مصروف تھی۔

رات گئے جب تیاری مکمل ہو چکی تو قلوپطرہ نے نگاہیں اٹھا کر طوطیا کی جانب دیکھا۔ وہ مسکرا کر بولی:

"سنا ہے جنرل سیزر بہت بہادر ہے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ آج کی جنگ وہ کسی صورت نہیں جیت پائے گا۔"

طوطیا کے تعریفی کلمات سن کر قلوپطرہ دھیرے سے مسکرائی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سا تذبذب تھا:

"طوطیا! کیا میرا یہ قدم درست ہے؟"

"کیوں نہیں۔ جس طرح ایک سلطنت کی حفاظت کے لیے مضبوط فوج کی ضرورت ہے اسی طرح حسن و جوانی کو بھی مرد کے مضبوط حصار کی ضرورت ہے۔ ہر سینے میں ایک دل ہے اور اس دل کے کچھ الگ ہی تقاضے ہوا کرتے ہیں۔"

طوطیا کی باتوں نے قلوپطرہ کے خوف کو بہت حد تک دُور کر دیا تھا۔ اب وہ ذہنی طور پر خود سپردگی کے لیے تیار ہو چکی تھی اور باوقار انداز میں جنرل سیزر کی خواب گاہ کی جانب بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

خواب گاہ کے دروازے پر جنرل سیزر نے خود اس کا استقبال کیا۔ اس کی پرکشش آنکھوں میں قلوپطرہ کے لیے بے پناہ محبت تھی۔

اندر داخل ہونے پر وہ دونوں مسکراتے ہوئے ایک دوسرے کے قریب آئے اور پھر سلطنت مصر بے خودی کے

عالم میں سلطنت روما کی مضبوط بانہوں میں جا سمائی۔

……☆……☆……

صبح سویرے قلوپطرہ کی آنکھ کھلی تو کروٹ بدلتے ہی درد کی ایک میٹھی سی لہر نے اس کے نازک وجود میں انگڑائی لی اور گزری رات کے دلنشین لمحات یاد آتے ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کے پہلو میں لیٹا ہوا جنرل سیزر گہری نیند سو رہا تھا۔ ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالنے کے بعد قلوپطرہ مسہری سے اُتر کر آگے بڑھی اور دریچوں کے پردے سرکا دیے۔

اگلے ہی لمحے نرم روشنی اور ہوا کے شریر جھونکوں نے کمرے کی مدہوش فضا کو گدگدا کر آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔ سیزر کی آنکھ کھلی تو پہلو سے قلوپطرہ کو غائب پاتے ہی اُٹھ کر بالکونی کی جانب بڑھا جہاں وہ نیلگوں آسمان کو اتنی محویت سے گھور رہی تھی کہ سیزر کے قریب پہنچنے کا احساس ہی نہ ہو سکا۔

"زندگی کی ایک اور دلکش صبح مبارک ہو۔"

سیزر نے عقب میں پہنچ کر اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔

"آپ کو بھی۔" وہ پلٹ کر اس کے ہونٹوں پر شاہی مہر ثبت کرتے ہوئے بولی۔

"آپ نہیں تم کہو۔ مجھے تم سے روایتی احترام نہیں صرف پیار چاہیے۔ ایسا پیار جو میرے علاوہ کسی کا نصیب نہ بن سکے۔" وہ گہری سانس لے کر اس کے جسم کی بھینی بھینی خوشبو کو اپنی روح کی گہرائیوں میں اتار لینا چاہتا تھا۔ جنرل سیزر کے مر مٹنے کے احساس نے قلوپطرہ کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ بکھیر دی تھی۔

اسی روز قلوپطرہ کی تاج پوشی کی تقریب منعقد ہوئی جس میں چیدہ چیدہ شخصیات کے علاوہ فیلس بطلیموس اور اس کی چھوٹی بہن آرمینیو کو بھی مدعو کیا گیا۔

اس موقع پر قلوپطرہ نے پہلی مرتبہ آرمینیو کی آنکھوں میں اپنے لیے نفرت کی لو محسوس کی۔ اس سے قبل آرمینیو نے کبھی حکومتی معاملات میں دخل اندازی نہیں کی تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے کئی ماہ گزر گئے۔ مگر قلوپطرہ اور جنرل سیزر کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وقت تھم سا گیا ہو۔ وہ ایک دوسرے میں اتنا گم رہتے تھے کہ اپنے اردگرد کی پروا نہیں رہی تھی۔ ویسے بھی حالات مکمل طور پر ان کے قابو میں تھے اور شہزادے فیلس نے ہمیشہ کے لیے ہتھیار ڈال کر سمجھوتہ کر لیا تھا۔

دوسری جانب روم میں جولیس سیزر کا نائب انتونی اسے واپس بلانے کے لیے مسلسل پیغام بھیج رہا تھا۔ لیکن جب بھی انتونی کا پیغام آتا تو قلوپطرہ کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی۔ وہ جانتی تھی کہ مصر کا تخت و تاج اسے سیزر کی وجہ سے ملا ہے اور اس کے جانے کے بعد حالات پھر سے بگڑ سکتے ہیں۔

بظاہر حالات قابو میں تھے مگر اندر ہی اندر سازشیں بھی پنپ رہی تھیں۔ انہی سازشی طاقتوں میں سے ایک نام سابقہ وزیر اعظم پوتھی نوس بھی تھا جو قصر کے ایک زندان میں قید ہونے کے باوجود اپنا کام جاری رکھے ہوئے تھا۔ جب کہ دوسرا اہم نام سپہ سالار ایکیلا اس کا تھا جو کہ شہزدہ بطلیموس کا وفادار تھا۔

سیزر ان دونوں پر خاص نظر رکھتا تھا اور چھوٹے موٹے معاملات اپنی تدبیر سے حل کر لیا کرتا تھا۔ گو قلوپطرہ اور سیزر نے اب تک شادی نہیں کی تھی مگر پھر بھی اہل مصر نے ان دونوں کے ناجائز تعلق کو کھلے دل سے قبول کر لیا تھا۔ البتہ قلوپطرہ کو ہر پل خطرہ ضرور رہتا تھا کہ سیزر واپسی کا ارادہ نہ کر لے۔

دن گزرتے چلے جا رہے تھے کہ ایک شام سیزر کو اس کے فوجی عہدے دار نے اطلاع دی کی قلوپطرہ کی چھوٹی بہن آرمینو محل سے فرار ہو گئی ہے۔

"یہ کیسے ممکن ہے۔"

"وہ ہماری خاص نگرانی میں ضرور تھی مگر اس کے کہیں آنے جانے پر پابندی نہیں تھی۔ کل شام وہ اپنے استاد گینی میڈ کے ساتھ ٹہلتی ہوئی محل سے باہر نکلی اور باغی مصری فوج کے پاس جا پہنچی۔"

"یعنی قلوپطرہ کا اندیشہ درست تھا کہ آرمینیو کی آنکھوں میں بغاوت کی چنگاریاں سلگ رہی ہیں۔" جنرل سیزر بڑبڑایا "میرا خیال ہے اس سازش میں بھی وزیر اعظم پوتھی نوس کا ہاتھ ہوگا۔"

"نہیں عالی جا! ہماری تفتیش کے مطابق اس سازش کا سرغنہ اس کا اتالیق گینی میڈ ہے۔"

"تمہارا خیال درست ہے۔ بطلیموس خاندان پر اتالیقوں

کا کچھ زیادہ ہی اثر ہے۔"

انہی دنوں پوتھی نوس کا ایک سازشی خط منظر عام پر آتے ہی اس کی گردن تن سے جدا کر دی گئی اور یوں شہزادہ فیلکس کا یہ اہم ترین ساتھی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

☆......☆......

اسکندریہ کی فضا پر ایک بار پھر جنگ کے بادل منڈلانے لگے تھے۔ سیزر کو اطلاع مل چکی تھی کہ گینی میڈ شہزادی آرسینیو کو تخت دلانے کے لیے مصر پر حملہ کرنے کی تیاریاں مکمل کر چکا ہے اور حملہ کسی بھی وقت متوقع ہے۔ قلوپطرہ اس صورت حال سے خود بھی فکر مند تھی مگر اسے سیزر پر اندھا اعتماد تھا۔ وہ جانتی تھی کہ سیزر اس موقع پر بھی اس کے لیے ڈھال بن جائے گا۔ اسے اپنی استاد طوطیا کا یہ فقرہ یاد رہتا تھا کہ ہمیشہ جوان اور حسین رہنے کے لیے پریشانیوں سے دور رہنا بہت ضروری ہے۔

قلوپطرہ کو اپنے حسن سے بے پناہ محبت تھی۔ وہ جانتی تھی حسن و شباب کے الاؤ کو روشن رکھنے کے لیے قرب کا ایندھن بہت ضروری ہوتا ہے۔ اسی لیے وہ قربت کے کسی بھی لمحے کو ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔ سیزر جب بھی اس کے ساتھ ہوتا وہ اس کی توجہ خود پر مرکوز رکھتی اور کوشاں رہتی کہ وہ صرف اور صرف اسی کی جانب متوجہ رہے۔ اسی کو سوچے اور صرف اسے ہی محسوس کرے۔ اس مقصد کے لیے وہ نت نئے انداز و اطوار اپنانے میں بہت ماہر تھی۔ جب وہ خود کو خوشبو سے مہکا کر نت نئی طرز کے ملبوسات میں سیزر کے سامنے آتی تو وہ بے خود ہو کر اس کے قدموں میں آن گرتا۔ یہاں تک کہ قربت کے ان لمحات میں سیزر کو اپنا مرتبہ اور جاہ و جلال بھی یاد نہیں رہا کرتا تھا۔۔۔۔ جب کہ چاہتوں کے یہی انداز قلوپطرہ کی بھی کمزوری تھے۔ وہ جب بھی آنکھوں میں قربت کی طلب لیے سیزر کی جانب پیش قدمی کرتی، اسے کبھی ناکامی نہیں ہوتی تھی۔

☆......☆......

سپہ سالار گینی میڈ کا حملہ اسکندریہ پر اس قدر شدید تھا کہ اس نے سیزر کے لشکر کو چیر کر رکھ دیا۔ گینی میڈ اپنے لشکر کے ہمراہ آندھی اور طوفان کی طرح آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا اور سیزر کے سپاہیوں کو گھیر کر قتل عام شروع کر دیا گیا تھا۔ ایک طرف میدان جنگ کا نقشہ بد سے بدتر ہوتا جا رہا تھا تو دوسری طرف جنرل سیزر قلوپطرہ کی ریشمی زلفوں سے کھیلتے ہوئے اس کے گداز جسم کی رعنائیوں میں کھویا ہوا تھا۔

ایک روز ایسے ہی لمحات میں اچانک خواب گاہ کے بند دروازے پر تیز دستک سنائی دی۔

"کون ہے یہ گستاخ؟" قلوپطرہ کو ان لمحات میں دستک دینے والے کی مداخلت سخت ناگوار گزری تھی۔

"عالی مقام جنرل جلدی خواب گاہ سے باہر آیئے۔" دستک دینے والے فوجی افسر کی تیز آواز سنائی دی۔ "ہم دشمن پر اپنی گرفت کھو بیٹھے ہیں۔ ہمارے بیشتر سپاہی مارے جا چکے ہیں اور باقی سمندر کے گہرے پانی میں ڈوب ڈوب کر دم توڑ رہے ہیں۔"

یہ خبر سنتے ہی سیزر کے بدن میں بجلی سی دوڑ گئی۔ اس نے قلوپطرہ کو دھکا دے کر خود سے جدا کیا اور مسہری سے اتر کر دروازے کی جانب بڑھا۔ خواب گاہ سے نکلتے ہی افسر اس کا ہاتھ تھام کر بالکونی کی طرف لے گیا جہاں سے دکھائی دینے والا سمندر کا منظر انتہائی ہولناک تھا۔ سیزر کے سپاہیوں کو چن چن کر موت کے گھاٹ اتارا جا رہا تھا اور بچے کھچے سپاہی جانیں بچانے کی کوشش میں میدان چھوڑ چکے تھے۔

"رچرڈ! مجھے اتنی دیر سے کیوں مطلع کیا گیا؟"

"مجھ سے قبل کئی چھوٹے افسر آئے مگر آپ کو خواب گاہ میں پا کر کسی کو آواز دینے کی جرات نہ ہو سکی۔" رچرڈ کا جواب سن کر سیزر شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ مگر اب وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا۔

"میں اسی وقت اپنے جہاز پر جانا چاہتا ہوں۔" وہ خفت مٹانے کے لیے بولا۔

"اس وقت آپ کا سمندر میں اترنا خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔"

"نہیں رچرڈ! میں سب سے پہلے ایک سپاہی ہوں۔ مجھے یہ خطرہ مول لینا ہوگا۔ تم فوراً جہاز تک پہنچنے کے لیے کشتی کا انتظام کرو۔" سیزر نے تیز لہجے میں کہا تو رچرڈ سر ہلاتا ہوا واپس لوٹ گیا۔

قلوپطرہ کو سیزر کے میدان جنگ میں جانے کا علم ہوا تو اسے بہت کوفت ہوئی۔ قربت کے ان لمحات میں سیزر کا یوں چھوڑ کر چلے جانا اسے بہت برا لگا تھا مگر جنگ کی سنگین صورت حال معلوم ہونے پر وہ خاموش ہو گئی۔ اس جنگ

میں جنرل سیزر کو بہت نقصان اٹھانا پڑا۔ اس نے فوری طور پر سلطنت روما سے ایک طاقتور بحری بیڑا طلب کر لیا۔ جس کے پہنچتے ہی اس کے حوصلے پھر سے جوان ہو گئے۔

شہزادی آرسینیو اور اس کے اتالیق گینی میڈ کا نام زبان پر آتے ہی سیزر کے منہ کا ذائقہ کڑوا ہو جاتا تھا گینی میڈ نے اسے میدان جنگ میں منہ توڑ جواب دے کر پریشان کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے شہزادہ فیلکس سے بھی دلی نفرت ہو گئی تھی۔ لہٰذا نہایت عیاری سے ایک منصوبہ تیار کرنے کے بعد اس نے پہلے شہزادہ فیلکس کو آزاد کر کے محل سے باہر نکالا اور پھر طریقے سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

اب سیزر مصر کا بے تاج بادشاہ تھا۔ شہزادہ فیلکس بطلیموس مر چکا تھا، شہزادی آرسینیو اور اتالیق گینی میڈ کو گرفتار کر لیا گیا تھا جب کہ قلوپطرہ پہلے ہی اس کے دام الفت کی اسیر تھی۔ چنانچہ اہل مصر نے بھی اپنی شکست قبول کرتے ہوئے کھلے دل سے سیزر کی اطاعت قبول کر لی تھی۔

سیزر کو اسکندریہ میں آئے کئی ماہ گزر چکے تھے اور قلوپطرہ کی خود ساختہ سلطنت کو لاحق تمام خطرات دم توڑ چکے تھے۔ اب سیزر کا بحری بیڑا واپسی کے لیے تیار کھڑا تھا۔ انتونی کی خواہش تھی کہ سیزر بیڑے کے ہمراہ واپس لوٹ آئے مگر سیزر ابھی واپس جانے کے لیے تیار نہیں تھا کیوں کہ قلوپطرہ اُمید سے تھی اور بہت جلد سیزر کے بچے کی ماں بننے والی تھی۔

اب قلوپطرہ مصر کے ساتھ ساتھ روم کے بارے میں بھی سوچنے لگی تھی۔ اس کے ذہن میں یہ خیال کلبلانے لگا تھا کہ اگر سلطنت روما کو جمہوری سلطنت کے بجائے ایک مطلق العنان شہنشاہ یعنی جولیس سیزر کے زیر تسلط دے دیا جائے تو اس کے بطن سے پیدا ہونے والا بچہ روم اور مصر کی مشترکہ سلطنتوں کا وارث بن جائے گا اور یہ دنیا کی عظیم ترین سلطنت ہو گی۔

اپنے اس خواب کی تکمیل کے لیے وہ جولیس سیزر کو بھی اپنا ہم خیال بنانا چاہتی تھی اور دھیرے دھیرے اس کے ذہن میں یہ خیال ڈال رہی تھی کہ وہ کوئی عام جنرل نہیں دیوتا کا اوتار ہے۔ سیزر اپنی عمر کا بڑا حصہ گزار چکا تھا۔ اس نے تین شادیاں کیں مگر اولاد کی نعمت سے محروم تھا۔ سرزمین مصر اس کے لیے بہت مبارک ثابت ہوئی تھی۔ یہاں اسے محبت، شہرت اور اقتدار تو ملا ہی تھا اب اولاد بھی ملنے والی تھی۔

انہیں دنوں قلوپطرہ نے ایک خوبصورت بیٹے کو جنم دے کر اس کی زندگی میں یہ کمی بھی پوری کر دی اور انہوں نے بچے کا نام سیزرین رکھا۔

……☆……☆……

اہل مصر قلوپطرہ کو دل کی گہرائیوں سے اپنی ملکہ تسلیم کر چکے تھے۔ سیزرین کی پیدائش کے بعد قلوپطرہ کا مقام اور احترام اور بھی بڑھ گیا تھا۔ مصر کے حالات سے مطمئن ہوتے ہی سیزر نے واپس روم جانے کا ارادہ کیا۔ جس میں قلوپطرہ کی خوشی اور رضامندی بھی شامل تھی۔ وہ اپنے بیٹے کو روم کا ولی عہد بنانے کے شوق میں سیزر سے جدائی برداشت کرنے کے لیے تیار ہو چکی تھی۔

روانگی کی تمام تیاریاں مکمل تھیں اور سیزر نے فیصلہ کیا تھا کہ ایک ماہ بعد قلوپطرہ کو بھی اپنے پاس روم بلوا لے گا۔ اسکندریہ میں وہ آخری رات سیزر نے قلوپطرہ کے ہمراہ مستقبل کے سنہرے خواب بنتے ہوئے گزاری اور اگلی صبح اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گیا۔

جنرل سیزر کا سفری بیڑہ روم کے ساحل پر لنگر انداز ہوا تو پورا شہر اس کے استقبال کے لیے ساحل پر اُمڈ آیا۔ اہل روم میں یہ خبر پھیل چکی تھی کہ سیزر نے مصر میں قیام کے دوران بطلیموس خاندان کی حسین ترین لڑکی قلوپطرہ سے شادی کر لی ہے اور اس کا ایک بیٹا بھی ہے۔

اپنے ہم منصب لوگوں سے ملنے کے بعد وہ دو قریبی ساتھیوں بروٹس اور انتونی کے ہمراہ اپنے گھر کے لیے روانہ ہو گیا۔ جہاں اس کی لاڈلی بیوی پلورنیا اس کی منتظر تھی۔

سیزر کو واپس لوٹے دو دن گزرے تھے کہ سرحدی علاقوں میں بغاوت پھوٹ پڑی۔ یورش اتنی شدید تھی کہ اسے خود میدان میں اترنا پڑا اور پھر اتنا مصروف ہوا کہ چھ ماہ گزر گئے۔ وہ قلوپطرہ سے کیے ہوئے وعدے کے مطابق اسے اپنے پاس نہیں بلوا سکا تھا۔

ایک سال بعد جب وہ روم واپس لوٹا تو فوراً ہی قلوپطرہ کو روم پہنچنے کے لیے پیغام بھیج دیا۔ قلوپطرہ جو کہ گذشتہ کئی ماہ سے سیزر کا غم بھلانے کے لیے دوسرے نوجوانوں کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہی تھی سیزر کا پیغام ملتے ہی روم جانے کی تیاریاں کرنے لگی۔

……☆……☆……

قلوپطرہ کو جس جوش و خروش سے اسکندریہ سے رخصت کیا گیا تھا اتنی ہی گرمجوشی سے روم میں استقبال کیا گیا۔ اس کے ہمراہ سیکڑوں کی تعداد میں مصری غلام اور کنیزیں دیکھ کر اہل روم حیران رہ گئے تھے۔

سیزر نے اپنے دوستوں بروٹس اور انتونی کے ہمراہ قلوپطرہ کا استقبال کیا اور بے اختیار اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ بروٹس اور انتونی بھی اس حسن بے مثال کو دیکھ کر دنگ رہ گئے تھے۔ خاص طور پر انتونی تو اس کے حسن سے کچھ زیادہ ہی متاثر دکھائی دیا تھا۔

سیزر نے قلوپطرہ کی رہائش کے لیے دریائے ٹائبر کے کنارے اپنی دیہاتی اقامت گاہ کا انتخاب کیا تھا جسے قلوپطرہ نے بے حد پسند کیا۔ ویسے بھی سیزر فی الحال اسے شہر کے ہنگاموں سے دور رکھنا چاہتا تھا۔ مصر میں قیام کے دوران قلوپطرہ نے سیزر کے دماغ میں یہ بات راسخ کر دی تھی کہ وہ دنیا کے تمام انسانوں سے افضل ہے۔ اس خیال نے سیزر کو خودسر بنا دیا تھا اور اس نے اپنے بہت سے نئے دشمن پیدا کر لیے تھے۔

جنرل سیزر اب جوانی کی حدود سے نکل چکا تھا۔ مسلسل جنگی مہمات نے اس کا رنگ روپ بھی بدل کر رکھ دیا تھا۔ اب وہ پہلے سے کہیں زیادہ عمر رسیدہ دکھائی دینے لگا تھا۔ اس کے علاوہ مرگی کی بیماری نے بھی اس کی شخصیت پر منفی اثرات مرتب کیے تھے۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود اس کے دل میں چھپی قلوپطرہ کی محبت کم نہیں ہو پائی تھی اور وہ اسے پہلے سے بھی زیادہ ٹوٹ کر چاہنے لگا تھا۔

مگر خراب صحت اور بڑھاپے کے باعث قلوپطرہ کی نظر میں اس کی پہلی جیسی اہمیت نہیں رہی تھی۔ لیکن اس نے ابھی تک اپنے کسی بھی عمل سے اس حقیقت کا اعتراف کر کے سیزر کی نظروں میں گرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ ہر صورت سیزر کو مملکت روم کے تخت پر براجمان دیکھنا چاہتی تھی تاکہ خود ملکہ مصر اور ملکہ روم کہلا سکے اور اس کا بیٹا سیزرین سلطنت روما کا ولی عہد بن سکے۔

روم پہنچ کر جب اپنے اس خواب کو حقیقت کا روپ دینے کے لیے قلوپطرہ نے باریک بینی سے صورت حال کا جائزہ لیا تو اسے اپنے اردگرد دو ہی ایسے افراد دکھائی دیئے جو سیزر کے قریب ہونے کے ساتھ ساتھ بااختیار بھی تھے۔ ان میں سے ایک بروٹس اور دوسرا انتونی تھا۔۔۔ چنانچہ معاملے پر خوب غور کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ اگر بروٹس کے بجائے انتونی کو اعتماد میں لے لیا جائے تو زیادہ بہتر نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔

ویسے بھی انتونی، بروٹس کی نسبت اسے زیادہ پسند آیا تھا۔ وہ زیادہ خوبرو اور کم عمر تھا اور قلوپطرہ کے سراپا پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھوں میں وہ قندیلیں جل اٹھتی تھیں جن کی لو صرف قلوپطرہ ہی محسوس کر سکتی تھی۔ ان سب باتوں کو مدنظر رکھ کر قلوپطرہ نے نوجوان انتونی سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا اور ایک ایسے دن گھر پر ملاقات کے لیے مدعو کر لیا جب سیزر اپنی دوسری بیوی پلپورنیا کے پاس گیا ہوا تھا۔

یہ ان دونوں کے درمیان تنہائی میں پہلی ملاقات تھی۔ لیکن قلوپطرہ نے اپنے مطلب کے لیے کمال مہربانی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے اور انتونی کے درمیان حائل اخلاقیات کی دیوار کو سرے سے ملیامیٹ کر دیا تھا۔ وہ اسے محبت کے اس جہان سے متعارف کروانے میں کامیاب ہو گئی تھی جس کے بارے انتونی کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

☆ ☆

قلوپطرہ کو روم میں آئے تین سال گزر چکے تھے۔ مگر ابھی تک اس کا ملکہ عالم بننے کا خواب پورا نہیں ہو سکا تھا۔ انتونی دل و جان سے اس کے ساتھ تھا مگر سیزر کسی بھی صورت بادشاہت کا اعلان کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ان حالات سے تنگ آ کر قلوپطرہ نے کئی بار مصر واپسی کا ارادہ کیا مگر پھر حالات میں بہتری کی امید پر اپنے قیام کی مدت بڑھاتی چلی گئی۔

انہی دنوں محلاتی سازشوں میں بھی تیزی آ گئی اور روم سے جمہوریت ختم کر کے تخت و تاج پر قابض ہونے کی خواہش رکھنے والے سیزر کو ختم کرنے کے لیے بہت سے بااثر لوگ متحد ہو گئے تھے۔ عین اس روز جب سیزر کے سر پر شہنشاہت کا تاج سجایا جانا تھا اس کے قتل کا منصوبہ تیار کر لیا گیا۔

مقررہ روز دربار میں پہنچنے کے بعد سیزر نے ارکان دربار کی جانب دیکھتے ہوئے اجلاس کی کارروائی شروع کرنے کا اعلان کیا تو ہال میں موجود لوگ غیر محسوس طریقے سے اس کے گرد دائرہ تنگ کرنے لگے۔ جلد ہی سیزر کو خطرے کا

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
ایڈ فری لنکس
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہماراویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بُک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Liked
Message
Get Notifications
Add to Interest Lists...
Unlike
IN YOUR NEWS FEED
See First
See new posts at the top of News Feed
Default
See posts as usual
Unfollow

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

i. Open Paksociety Page.
ii.Click Liked.
iii.Select Get Notifications.
iv.Select See First.

All Done

http://paksociety.com

احساس ہو گیا مگر بروٹس جیسے قابل اعتماد دوست کی موجودگی اس کے لیے حوصلہ افزا تھی۔

پھر اچانک ایک شخص نے آگے بڑھ کر سیزر پر خنجر سے حملہ کر دیا۔ اس نے خنجر سے بچنے کی کوشش کی تو قریب کھڑے دوسرے شخص نے تلوار نکال کر اس پر کاری ضرب لگائی۔ اس مشکل وقت میں سیزر نے پلٹ کر مدد کے لیے بروٹس کی جانب دیکھا تو حیرت کی انتہا نہ رہی کیوں کہ بروٹس خود بھی تلوار سونت کر اس کی جانب بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ یہ ہولناک منظر دیکھ کر سیزر کا دل دھک سے رہ گیا:

”بروٹس تم بھی۔۔۔؟“

اس کے منہ سے یہی الفاظ نکل پائے تھے کہ چاروں طرف سے خنجروں اور تلواروں سے حملہ کر دیا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد سیزر کی خون میں لت پت لاش فرش پر پڑی تھی اور قاتل اس کارنامے پر پھولے نہیں سما رہے تھے۔

☆......☆......

سیزر کی موت کی خبر قلوپطرہ کے لیے اس قدر اچانک تھی کہ وہ یہ صدمہ برداشت نہ کر سکی اور بے ہوش ہو کر کاؤچ پر گر پڑی۔

جلد ہی سیزر کے قتل کی خبر قلوپطرہ کے ان تمام جاں نثار غلاموں تک پہنچ گئی جنہیں وہ اپنے ہمراہ مصر سے لائی تھی۔ انہوں نے محل کے دروازے فوری طور پر بند کر دیے اور اسلحہ سنبھال کر قلوپطرہ کے کمرے کو اپنے حفاظتی حصار میں لے لیا۔۔۔ سیزر کے قتل کے بعد قلوپطرہ اور سیزرین کی جانوں کو شدید خطرہ تھا۔

کافی دیر بعد قلوپطرہ کو ہوش آیا تو وہ خالی نظروں سے چھت کو گھورتی رہ گئی۔ کمرے میں موجود کنیزیں اور غلام اسے صدمے میں دیکھ کر پریشان تھے مگر کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس صدمے کی اصل وجہ سیزر کی موت نہیں بلکہ اس خواب کا چکنا چور ہونا تھا جو قلوپطرہ نے ملکہ روم بننے کے لیے دیکھا تھا۔ اس نے زندگی کے کئی قیمتی سال محض اسی خواہش کی تکمیل کے لیے سیزر کے ہمراہ گزار دیے تھے لیکن عین کامیابی کے روز وہ منزل سے کوسوں دور جا پہنچی تھی۔

قلوپطرہ مایوس نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ وقت گزرتا چلا جا رہا تھا مگر ابھی تک کسی دشمن نے ان کے محل پر حملہ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ سہ پہر کو ایک غلام نے آ کر اطلاع دی کہ سیزر کا دوست مارک انتونی ملکہ سے تعزیت کرنے کا خواہشمند ہے۔

انتونی کی آمد کی خبر سن کر قلوپطرہ کے ذہن میں سب سے پہلے اسی وصیت نامے کا خیال آیا جو اس کی معلومات کے مطابق عوام کے سامنے پیش کیا جا چکا تھا۔

”انتونی کو عزت و تکریم کے ساتھ پیش کیا جائے۔“

ملکہ کی طرف سے اجازت ملنے کے کچھ دیر بعد انتونی گلے میں تلوار لٹکائے کمرے میں داخل ہوا تو قلوپطرہ نے کمرے میں موجود کنیزوں کو باہر جانے کا اشارہ کیا:

”انتونی میں سیزر کے ساتھ تمہاری وفاداری دیکھ کر بہت خوش ہوئی ہوں۔“ قلوپطرہ کی آواز بھر آئی تھی۔ ”مجھے خوشی ہے کہ تم بروٹس کی طرح نمک حرام نہیں ہو۔“

”میں آپ کے اس اعتماد کے لیے بے حد ممنون ہوں۔“ جواب سن کر قلوپطرہ نے اظہار تشکر کے لیے دایاں ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ قلوپطرہ کے چہرے پر آج گہری اداسی چھائی ہوئی تھی مگر اس اداسی میں بھی اس کی شخصیت نہایت دلکش لگ رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ انتونی کو اپنے دل کی دھڑکنیں منتشر ہوتی ہوئی محسوس ہوئیں لیکن اس نے خود پر قابو رکھا اور دو زانو ہو کر اس کے ہاتھ کی پشت پر عقیدت کا بوسہ دیا۔

”انتونی! اس وقت ارض روم میں تمہارے سوا میرا کوئی سہارا نہیں ہے۔“ قلوپطرہ کے لہجے میں بے چارگی تھی۔

”آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔ کوئی آپ کو اور ننھے سیزرین کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ میرے فوجی آپ کی حفاظت کے لیے ہر لمحہ موجود رہیں گے۔“

”مگر میں یہ بھی جاننا چاہوں گی کہ سیزر نے وصیت میں اپنے بیٹے کے لیے کیا چھوڑا ہے۔“ قلوپطرہ کا سوال سن کر انتونی گھبرا سا گیا تھا۔ کیوں کہ سیزر نے اپنی وصیت میں سیزرین کا کہیں ذکر نہیں کیا تھا۔ اس نے قلوپطرہ کو سیزرین کا جائز حق دلانے کی یقین دہانی کروائی اور اجازت لے کر کمرے سے باہر آ گیا۔

جلد ہی سیزر کی وصیت کا چرچا عام ہوا اور لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ سیزر نے اپنے بھانجے آکٹوین کو اپنا جانشین مقرر کیا ہے۔ اس وصیت نے قلوپطرہ کا دل چکنا چور کر دیا تھا۔ لیکن اس موقع پر انتونی نے سیزرین کے حقوق کی آواز بلند کی جس

کے پس پردہ اس کی قلوپطرہ سے محبت تھی۔

وہ سیزرین کو سیزر کا جائز ولی عہد قرار دے رہا تھا۔ مگر اس مطالبے پر ایوان حکومت میں اس قدر احتجاج ہوا کہ انتونی کی آواز دب کر رہ گئی۔

روم کے نئے فرمانروا آکٹوین کے روم پہنچنے تک وراثت کی یہ کشمکش اتنی بڑھ گئی تھی کہ نوبت خانہ جنگی تک پہنچ گئی۔ اب اہل روم سیزر کی موت کو بھلا کر دو گروہوں میں بٹ چکے تھے۔ ایک گروہ آکٹوین کا حامی تھا تو دوسرا انتونی کا کہ روم کا اصل وارث سیزر کا بیٹا سیزرین ہے۔۔۔ جب حالات زیادہ خراب ہوئے تو انتونی نے قلوپطرہ کو فوری طور پر روم چھوڑ کر اسکندریہ چلے جانے کا پیغام بھجوادیا۔

قلوپطرہ کو انتونی سے بہت سی امیدیں وابستہ تھیں مگر انتونی کے اس پیغام نے اسے مایوس کردیا۔ ایک خواب جس کی تعبیر کے لیے وہ گزشتہ تین سال سے اسی شہر میں مقیم تھی آج اسے ریزہ ریزہ ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ واپس جانے سے قبل وہ انتونی سے آخری ملاقات بھی کرنا چاہتی تھی مگر ملکی حالات دیکھ کر اسے اپنا ارادہ ملتوی کرنا پڑا اور سیزرین کو لے کر واپس اسکندریہ روانہ ہوگئی۔

اسکندریہ واپس پہنچ کر قلوپطرہ عجیب ذہنی خلفشار کا شکار ہوگئی جس کی وجہ روم کی خانہ جنگی تھی۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ روم میں کوئی ایسا شخص برسر اقتدار آجائے جو سیزر کے وصیت نامے کے خلاف سیزرین کو روم کا بادشاہ تسلیم کرلے۔ لیکن حالات اس کے حق میں نہیں تھے۔ انتونی نے وعدہ خلافی کرتے ہوئے آکٹوین کے ساتھ مل کر مشترکہ حکومت بنا لی تھی۔

قلوپطرہ ان دنوں خود کو بہت تنہا محسوس کررہی تھی۔ اس کی زندگی میں عاشقوں، خدمت گاروں اور درباریوں کی کمی نہیں تھی مگر ان سب میں ایک بھی شخص ایسا نہیں تھا جسے وہ اپنا کہہ سکے۔

......☆......☆......

کئی برس گزر چکے تھے۔ جنرل انتونی کے چہرے پر اس وقت گہری سنجیدگی تھی۔ وہ اپنے دوست اور مشیر ڈیلیس کے ہمراہ اپنے جہاز کے عرشے پر موجود تھا۔ سلیقہ کی جنگ میں جنرل کیئس کی فوج جسے قلوپطرہ کی مدد حاصل تھی انتونی کے ہاتھوں عبرت ناک شکست کھا چکی تھی۔

”ڈیلیس! آج میرا ایک دیرینہ خواب پورا ہوگیا ہے۔“ عرشے سے واپس اپنے خاص کمرے میں پہنچ کر انتونی نے ایک آرام کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”میں ایک طاقتور بحری بیڑا بنانا چاہتا تھا اور آج میں کامیاب ہوچکا ہوں۔“

”اسی لیے تو میں کہتا ہوں کہ آپ آکٹوین کی بہن اکیوس سے شادی کرکے اپنی سلطنت اور طاقت میں کئی گنا اضافہ کرسکتے ہیں۔“ انتونی کو خوشگوار موڈ میں دیکھ کر ڈیلیس نے اپنا مشورہ دہرایا۔

”ابھی نہیں۔۔۔ ابھی مجھے کسی سے انتقام لینا ہے۔“ اس نے سخت لہجے میں جواب دیا اور سامنے پڑا جام اٹھا کر ہونٹوں سے لگالیا۔ ڈیلیس اس کی بات سن کر خاموش ہوگیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سلیقہ کے میدان میں قلوپطرہ نے انتونی کی بجائے جنرل کیئس کی مدد کی تھی۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ کیئس، بروٹس کے ساتھ سیزر کے قتل میں ملوث تھا۔

”وہ بہت احسان فراموش عورت ہے ڈیلیس۔ وہ ملکہ روم بننا چاہتی تھی میں نے اس کوشش میں ہر قدم پر اس کا ساتھ دیا اور اپنے لوگوں کی دشمنی مول لی۔ سیزر کی موت کے بعد اس کی حفاظت کے لیے اپنے دستے مقرر کیے لیکن اس نے میرے احسانوں کا یہ بدلہ دیا کہ میرے ہی دشمن کی مدد کرکے مجھے شکست دینے کی کوشش کی۔“ نشے میں دھت انتونی کے لہجے میں کرب تھا۔

”کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ بھی اس کے عشق میں مبتلا ہیں؟“

ڈیلیس نے جھجکتے ہوئے کہا تو انتونی چونک کر اس کی جانب دیکھنے لگا۔ بات کچھ غلط بھی نہیں تھی۔ برسوں پہلے جب قلوپطرہ روم آئی تھی تو اس پر پہلی نظر پڑتے ہی انتونی اپنا دل اس کے قدموں میں ہار بیٹھا تھا۔ انتونی کو خاموش دیکھ کر ڈیلیس نے اپنی بات جاری رکھی اور بولا:

”میں ایک مشیر نہیں دوست کی حیثیت سے یہ مشورہ دینا چاہوں گا کہ آپ چاہیں تو اس ادھورے رشتے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کرسکتے ہیں۔“

”مگر وہ بہت شاطر عورت ہے۔“

”بھول جائیں کہ اس نے کیا کیا۔ اس کی خطائیں معاف کردینے کے لیے کیا یہ کم ہے کہ آپ اس سے محبت کرتے ہیں۔“

ڈیلیس کے قائل کرنے پر انتونی نے نیم رضا مندی کا اظہار کیا اور اثبات میں سر ہلا کر خاموش ہو گیا اور دونوں مل بیٹھ کر اس منصوبے کو انجام تک پہنچانے کے طریقے سوچنے لگے۔ جلد ہی یہ طے پایا کہ ڈیلیس، انتونی کے سفیر کی حیثیت سے قلوپطرہ کے پاس مصر جائے گا۔

……☆……☆……

دربار میں اس وقت گہری خاموشی تھی۔ ملکہ مصر قلوپطرہ اپنی تمام تر رعنائیوں سمیت دربار میں داخل ہوئی اور تخت زریں پر براجمان ہونے کے بعد وزیر اعظم سے بارعب لہجے میں مخاطب ہوئی۔

”روم سے آئے ہوئے جنرل انتونی کے سفیر کو عزت و احترام سے پیش کیا جائے۔“

کچھ ہی دیر بعد ڈیلیس کو نہایت احترام سے دربار میں پیش کیا گیا تو قلوپطرہ پر نظر پڑتے ہی وہ آنکھیں جھپکانا بھول گیا۔ قلوپطرہ اس سے کہیں زیادہ حسین تھی جتنا وہ اب تک اس کے بارے سن چکا تھا۔ وہ بھرے دربار میں موجود ہونے کے باوجود اپنی آمد کا مقصد تک بھول گیا تھا۔

”معزز ڈیلیس! میں قلوپطرہ ملکہ مصر تم سے مخاطب ہوں کہ اپنی آمد کا مقصد بیان کرو۔“

قلوپطرہ چوں کہ دل ہی دل میں اس کی گھبراہٹ سے لطف اندوز ہو رہی تھی بارعب لہجے میں بولی۔ اس کی بات سن کر ڈیلیس کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ ہوش کی دنیا میں واپس لوٹتے ہوئے بولا۔

”میں مصر کی اس حسین و جمیل ملکہ کے لیے روم کے جنرل انتونی کا خط لے کر حاضر ہوا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے ہاتھ میں موجود پیغام کھول کر پڑھنا شروع کر دیا جس میں انتونی نے اس بات پر نہایت خفگی کا اظہار کیا تھا کہ قلوپطرہ نے سلیقہ کی جنگ میں جنرل کیٹس کی مدد کی۔۔۔ اب اس نے قلوپطرہ کو حکم دیا تھا کہ وہ فوری طور پر شہر سلیقہ پہنچ کر اس مدد کے سلسلے میں اپنی صفائی پیش کرے یا پھر سنگین نتائج بھگتنے کے لیے تیار ہو جائے۔

قلوپطرہ پیغام سن کر پریشان ہو گئی تھی۔ اس کے بحری بیڑوں کی حالت اتنی اچھی نہیں تھی کہ انتونی کی فوج کا مقابلہ کر سکیں۔ لیکن اس نے اپنا خوف چھپاتے ہوئے ڈیلیس کو جواب دیا کہ ہم اس سلسلے میں کوئی عذر پیش نہیں کر سکتے اور نہ ہی سلیقہ جا کر ان سے ملاقات کریں گے اگر وہ ہم سے مذاکرات کرنا چاہتے ہیں تو ہم اسکندریہ میں انہیں خوش آمدید کہیں گے۔

ڈیلیس نے اپنے طور پر قلوپطرہ کے لیے انتونی سے یہ سخت خط لکھوایا تھا۔ لیکن قلوپطرہ پر نظر پڑتے ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ انتونی کا دیوانہ پن کچھ غلط بھی نہیں ہے۔ وہ انتونی سے وعدہ کر کے آیا تھا کہ قلوپطرہ کو کسی بھی طرح روم کے کسی شہر میں پہنچ کر ملنے پر آمادہ کر لے گا۔ اس لیے معاملہ بگڑتا دیکھ کر اس نے خط کے سخت الفاظ پر معذرت کی اور ملکہ سے دوبارہ جواب کا تقاضا کیا۔

قلوپطرہ کو بھی معاملے کی سنگینی کا اندازہ تھا، اس نے بھی اپنے ارادے میں فوراً لچک کا اظہار کر دیا اور حتمی جواب دینے کے لیے چند دنوں کی مہلت مانگ لی۔

دربار برخاست ہونے کے بعد قلوپطرہ نے اپنی استاد کاہنہ طوطیا کو بلا بھیجا اور طویل صلاح مشورے کے بعد ڈیلیس کو یہ پیغام دے کر واپس رخصت کر دیا کہ وہ انتونی سے شہر سلیقہ میں نہیں بلکہ تارسیس کے ساحل پر ملنے کے لیے رضا مند ہے۔

……☆……☆……

انتونی سے ملنے کی خواہش نے قلوپطرہ کے جسم میں نئی روح پھونک دی تھی اور وہ اپنے حسن پر خاص توجہ دینے لگی تھی۔ بہت سی مشاطائیں شب و روز اس کے حسن کو نئی جلا بخشنے کے لیے مصروف عمل تھیں۔

بیش قیمت ملبوسات تیار کیے جا رہے تھے۔ سفر کے لیے ایک پر آسائش بحری جہاز خصوصی طور پر تیاری کے مراحل میں تھا۔ قلوپطرہ پہلے تاثر کو ہی آخری سمجھنے کی قائل تھی۔ اس لیے تارسیس پہنچتے ہی انتونی کے حواس پر چھا جانا چاہتی تھی۔

تیاری مکمل ہونے کے بعد جہاز اپنی منزل کی جانب روانہ ہو چکا تھا اور وہ اپنے آرام دہ کمرے میں کاؤچ پر نیم دراز انتونی کے خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ اس نے آخری بار انتونی کو اس وقت دیکھا تھا جب وہ سیزر کی موت کے بعد اسے دلاسہ دینے آیا تھا اور قلوپطرہ سے وعدہ کیا تھا کہ سیزرین کے حق میں آواز اٹھائے گا مگر اس کے سکندریہ روانہ ہوتے ہی انتونی نے اپنا وعدہ فراموش کر دیا تھا۔۔۔ لیکن اس کے باوجود قلوپطرہ تارسیس میں اس سے ملنے کے لیے جا رہی تھی۔ اس

کے دل میں انتونی کو خوش کرنے کی خواہش نہیں تھی بلکہ وہ اسے اپنے حسن کے جال میں پھانس کر اپنا مقصد حاصل کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔

قلوپطرہ کا بحری بیڑہ تارسیس کے ساحل پر لنگر انداز ہوا تو اس کی شان وشوکت دیکھ کر تارسس کا ہر شخص دنگ رہ گیا تھا۔ انتونی کا خیال تھا کہ قلوپطرہ خود جہاز سے اتر کر اس کی خدمت میں آن پہنچے گی۔ مگر اس کی جانب سے مکمل خاموشی رہی۔ چنانچہ انتونی نے اپنے ایک خادم کو پیغام دے کر بھیجا کہ جنرل انتونی ملکہ کے منتظر ہیں اور چاہتے ہیں کہ ملکہ رات کا کھانا ان کے ساتھ کھائیں۔

قلوپطرہ نے انتونی کے پیغام کو شکریہ کے ساتھ واپس لوٹا دیا اور جواب دیا کہ معزز انتونی اگر آج رات کا کھانا ہمارے جہاز پر تناول فرمائیں تو ہم ان کے شکر گزار ہوں گے۔ انتونی کی خواہش تھی کہ ملکہ پہلے خود چل کر اس کے پاس آئے مگر پھر بھی اس نے یہ دعوت قبول کرلی اور سر شام ہی اپنے عمائدین سلطنت کے ہمراہ ضیافت کے لیے قلوپطرہ کے عالیشان جہاز پر پہنچ گیا۔

آنے والے مہمانوں کا فقید المثال استقبال کیا گیا اور کنیزوں نے راستوں میں پھول بچھا دیے۔ یہی نہیں نہایت مہین اور نفیس لباس میں ملبوس قلوپطرہ خود بھی اپنی تمام تر رعنائیوں سمیت مہمانوں کے استقبال کے لیے موجود تھی۔

انتونی جب جہاز کے اندر داخل ہوا تو روز اول کی طرح آج بھی قلوپطرہ پر نظر پڑتے ہی اپنی جگہ پر ساکت رہ گیا تھا۔ اس پر ایک عجیب سی بے خودی طاری ہو رہی تھی۔ اس رات ضیافت اتنی شاندار تھی کہ انتونی اور اس کے ساتھی کھلے دل سے تعریف کیے بغیر نہ رہ سکے۔

تیسری شام انتونی نے قلوپطرہ کے اعزاز میں دعوت دی مگر اس کی یہ دعوت کسی طور بھی ملکہ کی دعوت کے شایان شان نہیں تھی۔ جس کے باعث انتونی خود بھی شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔ وہ قلوپطرہ سے بے حد متاثر تھا۔ رات کو ضیافت کے بعد سب مہمان رخصت ہو گئے تو بھی انتونی اس کے پاس بیٹھا رہا۔ آج کی رات قلوپطرہ کے ساتھ گزار کر وہ ان گزرتے لمحات کو امر کر لینا چاہتا تھا۔ اس موقع پر قلوپطرہ نے بھی کھلے دل کا ثبوت دیا اور دونوں یوں دیوانگی کے عالم میں ایک دوسرے سے ملے جیسے برسوں فراق کی آگ میں جلتے رہے ہوں۔

چند دنوں بعد قلوپطرہ انتونی کے ہمراہ واپس اسکندریہ لوٹ آئی۔ جہاں انہوں نے سات ماہ اکٹھے گزارے۔ وہ ایک دوسرے میں یوں کھوئے رہتے تھے کہ دنیا جہان کو فراموش کر بیٹھے تھے۔ پھر انتونی کو روم واپسی کے لیے پیغام آنے لگے تو اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی واپسی کا ارادہ کر لیا۔

قلوپطرہ ان دنوں انتونی کے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ اس حال میں انتونی کا اسے یوں چھوڑ کر چلے جانا کسی کرب سے کم نہیں تھا۔

”تم جانتے ہو کہ میں تمہیں دل کی گہرائیوں سے چاہتی ہوں اور تمہارے سوا میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ پھر کیوں مجھے چھوڑ کر جانا چاہتے ہو؟“

”میرا جانا ضروری ہے قلوپطرہ۔ مگر دیکھنا میں بہت جلد واپس لوٹ آؤں گا اور تمہیں اپنے ساتھ روم لے جاؤں گا۔“

اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا۔ قلوپطرہ نے دل پر پتھر رکھ کر انتونی کو روم کے لیے رخصت کر دیا۔ روم ہمیشہ سے اس کے لیے خواب رہا تھا۔ ایک ایسا خواب جس کی تعبیر ایک بار پھر اسے انتونی کے روپ میں دکھائی دینے لگی تھی۔ انتونی کے جانے کے بعد قلوپطرہ نے جڑواں بچوں کو جنم دیا۔ قلوپطرہ نے یہ خوشخبری روم بھجوائی مگر اپنی مصروفیت کے باعث انتونی اس کا جواب نہ دے سکا۔

روم کے حالات بہت خراب ہو چکے تھے اور جگہ جگہ بغاوت کے علم بلند ہو رہے تھے۔ انتونی نے موقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور اپنی سلطنت کو توسیع دینے کے لالچ میں آکٹوین کی بہن اریوس سے شادی کرلی۔

انتونی کی شادی کی خبر نے قلوپطرہ کو اندر سے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ انتونی جیسے محبت کرنے والے سے اسے اس بے وفائی کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ یہ اطلاع ملنے کے بعد اس کی دلجوئی کرنے والے بہت سے لوگ تھے مگر وہ بہت دل برداشتہ ہو گئی تھی۔

اسی طرح چار سال گزر گئے اور قلوپطرہ جدائی کی آگ میں جلتی رہی۔ پھر ایک دن اچانک اسے انتونی کا پیغام موصول ہوا:

”میں انطاکیہ میں ہوں اور فوراً تم سے ملنا چاہتا

ہوں۔۔۔صرف تمہارا انتونی۔" انتونی ایران کو فتح کرنے کا خیال لے کر روم سے نکلا تھا اور اس نے انطاکیہ پہنچ کر قلوپطرہ کو ملنے کا پیغام بھیجا تھا۔

انتونی کا پیغام پاتے ہی قلوپطرہ کا دل جل کر رہ گیا۔ وہ اسے چاہتی ضرور تھی مگر ایروس سے شادی کر کے اس نے قلوپطرہ کی محبت کی توہین کی تھی اور اپنے جڑواں بچوں سے بے خبر رہا تھا۔ اس موقع پر بھی طوطیا نے اسے سمجھانے کی بھرپور کوشش کی:

"مت بھولو کہ انتونی تم سے آج بھی محبت کرتا ہے۔"

"یعنی آپ کے خیال میں مجھے دوبارہ انتونی سے ناتہ جوڑ لینا چاہیے۔" وہ حیرت سے بولی۔

"کچھ لوگ دلوں میں بستے ہیں۔ زبان کے کہنے سے انہیں بھلایا نہیں جا سکتا۔ انتونی بھی انہی لوگوں میں سے ایک ہے۔" طوطیا کی بات درست تھی۔ قلوپطرہ اثبات میں سر ہلا کر خاموش ہو گئی۔

یہ حقیقت تھی کہ اپنی بے وفائی کے باوجود انتونی اس کے دل پر حکومت کر رہا تھا۔ شاید اسی لیے اتنے سال بعد بھی ضرورت پڑنے پر اس کی طرف دیکھنے کے لیے مجبور ہو گیا تھا۔ ویسے بھی ضرورت صرف انتونی کو اس کی نہیں، اسے بھی انتونی کی تھی۔ یہ سوچ کر اپنا رویہ نرم رکھتے ہوئے قلوپطرہ انطاکیہ کے لیے روانہ ہو گئی۔

انتونی نے انطاکیہ کے ساحل پر اس کا بڑی محبت سے استقبال کیا اور اپنے جڑواں بچوں کو دیکھ کر خوشی سے جھوم اٹھا۔ مگر قلوپطرہ کچھ خفا خفا دکھائی دی۔ انتونی اس کی نس نس سے واقف تھا اور جانتا تھا کہ اسے کیسے منایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اپنی خواب گاہ میں پہنچ کر انتونی نے جیسے ہی اپنی بانہوں کے در وا کیے ناراض قلوپطرہ ہر رنجش، ہر دکھ بھلا کر اس کے گلے سے آن لگی اور وقت ایک بار پھر اپنی دھن میں مست آگے بڑھنے لگا۔

قلوپطرہ اور انتونی خوشگوار زندگی بسر کر رہے تھے۔ قلوپطرہ ایک بار پھر امید سے ہو گئی۔ اس بار بچے کی ولادت سے قبل ہی وہ انتونی سے ہر صورت شادی کر لینا چاہتی تھی۔ مگر اس خواہش کی تکمیل میں سب سے بڑی رکاوٹ سیزر کا بھانجا آکٹوین تھا۔ اس نے انتونی سے ایک بات صاف الفاظ میں کہہ دی تھی کہ قلوپطرہ سے شادی کرنے کی صورت میں وہ اپنے اور انتونی کے علاقوں کا الحاق ختم کر دے گا اور اپنی بہن ایروس کو طلاق دلوا کر اپنے ساتھ واپس لے جائے گا۔

انتونی ان دنوں ایران پر حملہ کرنے کی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ ایسے میں آکٹوین سے ناراضگی مول لینا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ لہٰذا وہ بالکل خاموش ہو گیا۔ اسی دوران قلوپطرہ نے ایک مردہ بچے کو جنم دیا۔

انتونی اپنا لشکر لے کر ایران جانے کے لیے تیار تھا مگر قلوپطرہ ہر صورت اسے روکنا چاہتی تھی۔ مگر وہ بھی سیزر کی طرح فتوحات کا دیوانہ تھا۔ قلوپطرہ نے اسے ٹوٹ کر چاہا تھا۔ مگر وہ بھی جنگ و جدل کا شوقین تھا۔

"سب جنرل ایک سے ہوتے ہیں۔"

قلوپطرہ بے اختیار رو دی تھی۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود انتونی اس کی ضرورت تھا۔ اسے زندگی گزارنے کے لیے ایک مضبوط سہارے کی ضرورت تھی اور وہ کسی قیمت پر اسے کھونا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے انتونی کے اصرار پر اسکندریہ واپس لوٹ گئی تا کہ بوقت ضرورت انتونی کو رقم اور فوج بھجوا سکے۔

انتونی نے ایران پر زوردار حملہ کیا مگر جنگ میں اس کے لشکر کو بری طرح شکست ہوئی۔ قلوپطرہ نے اس موقع پر انتونی کی ہر ممکن مدد کی مگر وہ ایرانی فوج پر غلبہ حاصل نہ کر سکا اور اپنے بیشتر سپاہی مروا کر واپس روم روانہ ہو گیا۔ مگر آکٹوین کے تیار کردہ خصوصی لشکر نے راستے میں ہی اسے واپس پلٹنے پر مجبور کر دیا۔ جس پر اسے مصر کا رخ کرنا پڑا۔

انتونی ایک بحری جہاز پر سوار ہو کر قلوپطرہ کے بحری بیڑے تک پہنچ گیا تو آکٹوین نے قلوپطرہ کے بحری بیڑے پر بھی حملہ کر دیا۔ اس بیڑے کی کمان خود قلوپطرہ کر رہی تھی۔ انتونی اور قلوپطرہ کے جہاز کھلے سمندر میں ساتھ ساتھ چل رہے تھے کہ قلوپطرہ کے دل میں اپنے بیڑے سے دور نکل آنے کا خوف پیدا ہو گیا۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ اور انتونی دشمن کے نرغے میں پھنسنے والے ہوں اور یہ چال انہیں گرفتار کرنے کے لیے چلی جا رہی ہو۔

یہ خیال ذہن میں آتے ہی اس نے بنا انتونی سے رابطہ کیے اپنا جہاز ساحل کی جانب واپس موڑ لیا۔ قلوپطرہ کا یوں واپس لوٹ جانا انتونی کے لیے حیران کن تھا۔ وہ اسے دشمنوں کے نرغے میں تنہا چھوڑ کر واپس بھاگ گئی تھی۔ قلو

پطرہ کی یہ کج ادائی نشتر کی طرح انتونی کے دل میں اتر گئی۔

تب ہی آکٹوین کے جہازوں نے انتونی کو گھیرے میں لے کر گرفتار کرلیا اس جہاز میں پہنچادیا جہاں اس کی بیوی ایروس موجود تھی۔ اس موقع پر ایروس نے قلو پطرہ کی بیوفائی پر انتونی کو کھری کھری سنائیں تو وہ غصے سے بھڑک اٹھا اور قلو پطرہ کو اس بے وفائی کا سبق سکھانے کے لیے ایک بار پھر اسکندریہ روانہ ہوگیا۔

......☆......☆......

قلو پطرہ کو ساحل پر پہنچتے ہی اپنی بے وقوفی کا احساس ہو چکا تھا۔ جب ایک جاسوس نے اسے یہ اطلاع دی کہ انتونی نے اس بے وفائی پر قلو پطرہ کو ختم کردینے کی قسم کھالی ہے اور اس کا جہاز تیزی سے ساحل کی جانب بڑھ رہا ہے تو اس کے ہوش اُڑ گئے۔

وہ انتونی سے بہت محبت کرتی تھی مگر ساتھ ہی اسے اپنی غلطی اور انتونی کے غصے کا احساس بھی تھا۔ اس وقت وہ بہت خوف زدہ ہوگئی تھی۔ پھر جیسے ہی اسے انتونی کے محل میں داخل ہونے کی خبر ملی وہ اپنی ایک خاص کنیز کے مشورے پر اس مینار میں جا چھپی جو ستاروں کی چال دیکھنے کے لیے بنایا گیا تھا۔

اس موقع پر قلو پطرہ اتنی خوفزدہ تھی کہ اس نے اپنی کنیز کو طلب کرکے حکم دیا کہ جاکر انتونی کو اس بات کا یقین دلائے کہ قلو پطرہ نے اس کی جدائی کا دکھ برداشت نہ کرتے ہوئے خودکشی کرلی ہے۔

"اس سے کیا ہوگا؟" کنیز حیرت سے بولی۔

"وہ مایوس ہوکر واپس لوٹ جائے گا۔"

"جی بہت بہتر۔۔۔ میں سمجھ گئی۔"

کنیز مینار کی سیڑھیاں اترتی واپس لوٹ گئی اور انتونی کو قلو پطرہ کی المناک موت کی خبر پہنچادی۔

"آپ کو دشمن کے نرغے میں چھوڑ کر واپس آنے کے بعد انہوں نے اسی غم میں اپنی جان لے لی۔۔۔ لیکن مرتے وقت ان کے لبوں پر آپ ہی کا نام تھا۔ وہ آپ سے پہلے مر جانا چاہتی تھیں اس لیے انہوں نے خود کو سانپ سے ڈسوا کر خودکشی کرلی۔"

کنیز ماتم کرتے ہوئے جھوٹی کہانی سنا رہی تھی جب کہ انتونی حیرت اور بے یقینی کے عالم میں بت بنا اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔۔۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جسے بے وفا سمجھ کر قتل کرنے وہ محل میں آن پہنچا اس نے خود وفا کی ایک نئی تاریخ رقم کردی۔

انتونی کے دل و دماغ پر اس کہانی کا اتنا اثر ہوا کہ اس نے قلو پطرہ کا نام لے کر اپنی تلوار خود اپنے ہی پیٹ میں گھونپ لی اور زمین پر گرتے ہی ابدی نیند سو گیا۔

انتونی کی موت نے قلو پطرہ کو دیوانہ بنادیا اور اسے اپنی زندگی بے رنگ لگنے لگی۔

دوسری جانب فاتح جنرل آکٹوین اپنے لشکر کے ساتھ اسکندریہ کے ساحل پر اتر آیا۔ اسے انتونی کی موت کی خبر ملی تو وہ ہر صورت قلو پطرہ کو گرفتار کرنے پر تل گیا۔ مگر انتونی کی موت نے قلو پطرہ کو اس قدر بددل کردیا تھا کہ وہ زندگی کی قید سے آزاد ہونے کا فیصلہ کر بیٹھی تھی۔

جب مایوسی حد سے بڑھی تو قلو پطرہ نے اپنی اسی کنیز خاص کے ذریعے ایک زہریلا سانپ منگوایا۔۔۔ اور حسن کی اس دیوی نے زہریلے سانپ سے خود کو ڈسوا کر اپنی زندگی کے باب کو ہمیشہ کے لیے بند کردیا۔

اس وقت جب آکٹوین قلو پطرہ کی گرفتاری کے لیے اس کی خواب گاہ میں داخل ہوا تو سامنے پڑا بے جان وجود زندگی کی تمام تر رعنائیاں کھو کر مٹی کا مجسمہ بن چکا تھا اور کنیزیں اس چاند کو سیاہ چادر سے ڈھانپ رہی تھیں جسے اب موت کا گرہن لگ چکا تھا۔

سزا

عارف شیخ

قدرت کے اپنے قوانین اور ضابطے ہوتے ہیں ہر شخص کو انہی ضابطوں اور قواعد کے دائروں میں جینا ہوتا ہے لیکن جب جب انسان ان ضابطوں سے باہر نکلنے کی کوشش کرتا ہے قدرت اسے سزا ضرور دیتی ہے۔

اک سرکاری افسر اور اس کی اردلی کی روداد

اس کا نام سفیر علی تھا۔ لمبا قد بھاری بھرکم جسم چہرے پر سیاہ سفید داڑھی آنکھوں پر موٹی شیشوں والی عینک عمر کوئی پچپن برس وہ ایک سرکاری ادارے میں ڈائریکٹر کی پوسٹ پر کام کر رہا تھا۔ اپنی چونتیس برس کی ملازمت میں اس نے رشوت کی سلور جوبلی مکمل کرلی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس کی شادی کے بھی پچیس برس مکمل ہوگئے تھے۔ وہ حسب معمول آج صبح دس بجے دفتر میں داخل ہوا تھا۔ راستے میں ملنے والے رسمی سلام دعا کے تبادلوں سے گزرتا ہوا آخر کار وہ اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔ اس کے چپراسی رحمت بابا نے اس کا کمرہ آنے سے پہلے اپنی ذمہ داری سمجھتے ہوئے صاف ستھرا کردیا تھا۔

اس کے بیٹھتے ہی رحمت بابا بھی آ گئے وہ دراصل گاڑی سے سفیر علی کی فائلوں کو لے کر آ رہے تھے انہوں نے تمام فائلوں کو سفیر علی کے سامنے رکھ دیا تھا۔

”ساری فائلیں لے آئے ہو۔“ سفیر علی نے فائلوں کی گنتی کر ڈالی تھی۔

”جی جناب جتنی تھیں سب لے آیا ہوں۔“ رحمت بابا جو کمزور بدن کے مالک اور عمر میں سفیر علی سے بڑے تھے۔

”کل تم کوئی بات کرنے والے تھے۔“ سفیر علی کو یاد آیا۔

”جی جناب وہ مجھے دو روز کی رخصت چاہیے تھی۔“

”نہیں چھٹی نہیں دے سکتا۔“ سفیر علی نے کہا۔ ”تم تو جانتے ہو کہ تم ہی میرے بھروسے کے آدمی ہو۔“

”لیکن جناب عالی میری بیٹی کا رشتہ طے ہو رہا ہے۔ اس کے سسرال والے آ رہے ہیں۔“ بابا نے بتایا۔ ”ایسے میں میں آفس میں رہوں کیا یہ مناسب ہوگا۔“

”تم اپنی لڑکی کے سسرال والوں کو اگلے ہفتے کا وقت دے دو۔“ سفیر علی نے کہا۔ ”اگلے ہفتے میں بھی چھٹی کروں گا۔“

”جناب آپ چھٹی کرو گے۔“ بابا کو کافی حیرانی ہوئی تھی کیونکہ برسوں سے اس نے سفیر علی کو چھٹی کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

”ہاں دراصل اگلے ہفتے میری بیٹی کی بھی تاریخ طے ہوگی۔“ سفیر علی نے کہا۔

”تو مجھے چھٹی کرنی ہے۔ تم بھی اسی دن کر لینا۔“

”لیکن جناب میں تو لڑکی کے سسرال والوں سے کل آنا طے کر چکا ہوں۔“ بابا نے لاچاری دکھائی۔

”مجھے تو ہر صورت چھٹی کرنی ہوگی۔“

”تم کوئی راستہ نکالو۔“ سفیر علی نے کہا۔

”کل کا دن اہم ہے مجھے یہ فائلیں مکمل کرنی ہے میں نے کل کا وقت دیا ہے۔“

رحمت بابا جانتا تھا کہ یہ فائلیں جو سفیر علی کے سامنے موجود ہیں یہ ان پرائیویٹ کمپنیوں کی ہیں جو سرکاری محکموں کے لیے رشوت کی کانیں ہوتی ہیں اور سفیر علی جو برسوں سے رشوت کے پیسوں پر بوڑھا ہوا تھا وہ ان فائلوں پر کام کرنے والا تھا۔

Downloaded From

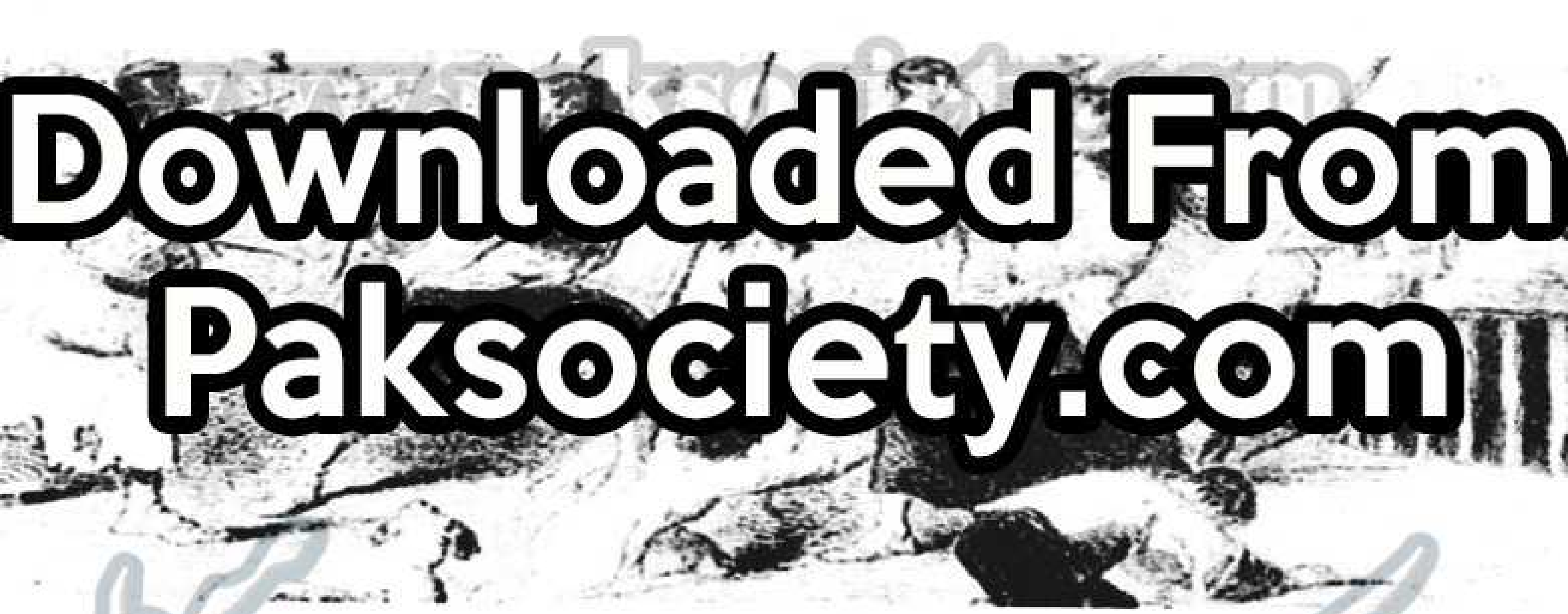

''لیکن میں کل چھٹی کر رہا ہوں۔'' بابا نے فیصلہ سنایا۔

''ویسے بھی آپ کو دو مہینوں بعد کوئی اور چپراسی مل جائے گا۔''

سفیر علی جو خود کو کافی بے بس محسوس کر رہا تھا وہ جانتا تھا کہ رحمت بابا دو مہینے بعد ریٹائر ہو رہے تھے اور ان کی جگہ کوئی اور چپراسی کی ڈیوٹی لگے گی سفیر علی نے ایک مرتبہ پھر بابا کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''تمہارا میرا ساتھ بہت عرصے کا ہے اور میں تم پر بھروسہ کرتا ہوں مجھے تو ابھی یہی فکر ہے کہ تم جب ریٹائر ہو جاؤ گے تو میں کیسے اپنا کام کر سکوں گا۔''

''جناب جیسے کل میرے بغیر ہوگا۔ دو مہینے بعد بھی میرے بغیر سب معاملات ہو جائیں گے۔''

''بابا ان دنوں سختی بہت ہے۔ بہت سے سرکاری افسر انٹی کرپشن کے ہاتھوں پکڑے جا رہے ہیں۔'' وہ نرم انداز میں بابا کو اپنی پریشانی سے آگاہ کر رہا تھا۔

''تم باہر موجود ہوتے ہو تو مجھے ڈھارس رہتی ہے۔''

''میں تو جناب صرف اپنی ڈیوٹی کرتا ہوں۔'' بابا رحمت نے کہا۔ ''اور صرف اللہ سے ڈرتا ہوں آپ بھی اسی کا خوف رکھو۔''

''بابا آپ اب نصیحت مت کرنا۔'' سفیر علی نے منہ بگاڑا۔

''ٹھیک ہے آپ کل دیکھ لینا۔'' رحمت بابا جانے کے ارادے سے پلٹا۔ تو سفیر علی کی آواز سنائی دی۔

''تم ایسا کرو کل آدھے دن کے لیے آ جاؤ۔'' بابا واپس گھومے تو سفیر علی نے بات مکمل کی۔

''میں نے ان لوگوں کو کل کا وقت دے رکھا ہے اور تم جانتے ہو کہ لاکھوں کا معاملہ ہے۔''

''آپ کیوں مجھے شرمندہ کر رہے ہو۔'' بابا رحمت نے تھوڑی سی خفگی دکھائی۔

''میرا میرے گھر پر رہنا بہت ضروری ہے ورنہ میں نے برسوں سے اپنی ڈیوٹی میں کبھی کوئی کوتاہی نہیں کی ہے۔''

سفیر علی اس سے زیادہ بات نہیں کر سکتے تھے وہ سمجھ گئے کہ رحمت بابا نہیں مانے گا اور وہ چپراسی ہی سہی لیکن وہ حکومت کا ملازم ہے لہٰذا وہ اس کے تبادلے سے زیادہ اسے کوئی سزا بھی نہیں دے سکتا اور تبادلہ بھی کیا کرتا رحمت بابا کی تو دو مہینوں بعد ملازمت کی معیاد ہی پوری ہو رہی ہے وہ ساٹھ سال کا ہو کر ریٹائر ہو رہا تھا۔

* * *

سفیر علی رات کے کھانے سے فراغت کے بعد آرام کرنے کی غرض سے اپنے کمرے میں پہنچے تو بیوی بھی پیچھے آ گئی۔ سفیر علی کی تین اولادیں تھیں سب سے بڑی لڑکی تھی پھر بیٹا تھا اور تیسری اولاد بھی بیٹا ہی تھا تینوں ہی جوان ہو چکے تھے۔

''کیا سوچ رہے ہو۔'' سفیر علی کی بیوی بلقیس نزدیک ہی بیٹھ گئی۔

''کل کا دن بڑا اہم ہے۔'' وہ بیوی کو بتانے لگا۔ ''کل دس لاکھ کی ڈیلنگ ہونی ہے۔''

"یہ تو اچھی بات ہے اس میں فکر کیوں ہے۔" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"کل میرے ساتھ رحمت بابا نہیں ہوگا۔"

"کیوں وہ کیوں نہیں ہوگا۔ کیا اس کا تبادلہ ہو گیا ہے۔"

"نہیں تبادلہ تو برسوں سے میں نے اس کا ہونے نہیں دیا۔"

"پھر کیا مجبوری ہے۔"

"وہ کل چھٹی کر رہا ہے اور میں نے پارٹیوں کو کل ہی کا وقت دے دیا ہے۔"

"رحمت بابا چھٹی کیوں کر رہا ہے۔"

"اس کی بیٹی کی تاریخ کل طے ہو رہی ہے بیٹی کے سسرال والے آ رہے ہیں۔" سفیر علی نے تفصیل بتائی۔

"معاملہ گمبھیر ہے۔"

"ہاں ان دنوں اینٹی کرپشن والے ہمارے اوپر ہاتھ ڈال رہے ہیں اب کل معاملہ مکمل ہونا ہے وہ پارٹیاں رقم لے کر آ رہی ہیں اور میرے دروازے پر کوئی نہیں ہوگا۔"

"تم بابا کو سمجھاتے۔"

"بہت سمجھایا۔" سفیر علی نے کہا۔

"میرا مطلب ہے کہ اسے بھی کچھ دے دیتے بیٹی کی شادی کے لیے اسے بھی تو پیسوں کی ضرورت ہوگی۔"

"رحمت بابا برسوں سے میرے ساتھ ہے آج تک اس نے مجھ سے سو روپے بھی نہیں لیے۔" سفیر علی نے کہا۔

"وہ صرف اپنی تنخواہ لیتا ہے۔"

"کیسے گزر بسر ہوتا ہے۔" بلقیس نے بے اختیار کہا۔

"تم تنخواہ بھی اچھی لیتے ہو اوپر کی اتنی آمدنی بھی آتی ہے ہمارا تو گزارا مشکل سے ہوتا ہے وہ زندگی کیسے گزارتا ہے میری تو عقل کام نہیں کرتی۔"

"تم کہاں اپنی باتیں لے کر بیٹھ گئی ہو مجھے کل کی فکر لاحق ہے۔"

"ارے تم فکر مت کرو کچھ نہیں ہوگا۔" بیوی نے تسلی دی۔

"آرام سے سو جاؤ۔" وہ یہ کہتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

* * *

رحمت بابا جن کے دو ہی بچے تھے بڑا بیٹا تھا جو اپنی تعلیم مکمل کر کے دو برس پہلے ایک کمپنی میں ملازم ہو گیا تھا دوسرے نمبر پر بیٹی تھی جس کی شادی کی تاریخ طے ہونی تھی۔ رحمت بابا نے اپنی قلیل آمدنی میں بڑی اچھی طرح سے زندگی گزار دی تھی۔ اس کے ساتھی چپراسی اپنے افسران سے ہر فائل کے اوپر بخشش لیتے تھے رحمت بابا بھی چاہتا تو اپنی تنخواہ ڈبل کر سکتا تھا لیکن وہ جس بھی افسر کے پاس رہا اور اس نے کبھی دس بیس روپے بھی نہیں لیے۔ اس نے اپنی زندگی میں اپنا فرض سمجھتے ہوئے کچھ لوگوں کو حرام حلال کمائی کی بابت سمجھانے کی کوشش کی تھی لیکن اس سے تعلقات خراب ہونے لگے تو اس نے اپنا یہ عمل چھوڑ دیا لیکن خود کو اس لعنت سے دور رکھا تھا۔

رحمت بابا ایک اوسط درجے کی آبادی والے علاقے میں اسی گز کے مکان میں رہتا تھا یہ مکان اس کی ملازمت اور اس کے دو بچے ہی اس کی کل پونجی تھے۔ اسے بڑا سکون تھا کہ اپنی ایمانداری کی زندگی میں اس نے ساری ذمہ داریاں پوری کر لی تھیں۔

* * *

سفیر علی کی صبح ہر صبح کی طرح ہی شروع ہوئی تھی۔ وہ اپنے وقت پر دفتر پہنچ گیا تھا آج رحمت بابا نہیں لیکن اس نے دفتر کے کسی اور چپراسی کو بھی نہیں بلوایا تھا کچھ دیر میں ان لوگوں کی آمد شروع ہو گئی جن کی فائلیں سفیر علی کے قبضے میں تھیں۔

سفیر علی جب معاملات میں مصروف ہوا تو خطرے کے تمام اثرات فراموش کر کے وہ کام نمٹانے لگا۔ دوپہر تک اس نے تمام کارروائی مکمل کر لی تھی اور سکون کا سانس لیا کہ تمام کام خیریت سے مکمل ہو گیا تھا۔

* * *

اگلے روز حسب معمول وہ سب سے پہلے دفتر پہنچے تھے۔ انہوں نے فوراً ہی اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ نصف گھنٹے کے بعد دوسرے لوگوں کی آمد شروع ہوئی۔ ٹھیک دس بجے سفیر علی بھی آ چکے تھے۔

"تمام امور ٹھیک سے طے ہو گئے۔" سفیر علی نے رحمت بابا سے سلام دعا کے بعد پوچھا۔

"ہاں اگلے ماہ کی شادی کی تاریخ طے ہو گئی ہے۔" بابا

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

نے جواب دیا۔

"میں بھی اگلے ماہ کی کوئی تاریخ طے کر کے اپنی بیٹی کی شادی کر دوں گا۔" سفیر علی کا رویہ بڑا اچھا تھا۔

رحمت بابا سمجھ گیا کہ کل سفیر علی نے اپنا کام خوش اسلوبی سے کیا ہے اسی لیے خوش دکھائی دے رہے تھے۔

"اچھا ہے جناب بیٹی اپنے گھر میں آباد ہو جائے اس سے زیادہ خوشی کا کوئی مقام نہیں۔"

"ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو ہم سب کچھ اپنی اولاد کے لیے ہی کرتے ہیں۔" سفیر علی نے کہا۔

اسے بھی اپنی بیٹی بہت عزیز تھی۔

"بس دعا کرو کہ سب اچھا ہو۔"

"اللہ تو سب اچھا ہی کرتا ہے ہم بندے ہی گناہ گار ہوتے ہیں اچھے کو برا کر دیتے ہیں۔"

"چلو اب اچھی سی چائے پلا دو۔ کل بھی تم نہیں تھے میں نے چائے نہیں پی تھی۔" سفیر علی نے موضوع بدل دیا۔ رحمت بابا سر ہلاتے ہوئے چائے بنانے چل دیئے۔

* * *

اگلے وہ دن بھی آ گیا جب سفیر علی کی بیٹی کی تاریخ طے ہوئی تھی گھر میں بڑی رونق تھی مہمانوں کی آمد و رفت جاری تھی سفیر علی جن کا گھر بہت بڑا تھا اپنی کوٹھی ہی میں انتظام کروایا تھا۔ روپے پیسے کی کمی نہیں اس لیے شاندار تقریب منعقد کی گئی تھی سفیر علی کی بیوی نے کہہ دیا تھا کہ پورے خاندان میں واہ واہ ہونی چاہیے۔ سفیر علی بھی بیٹی کو بہت چاہتے تھے اسی لیے دل کھول کر خرچ کر رہے تھے کہ کہیں کوئی کمی نہ رہ جائے۔ اسی لیے اعلیٰ درجے کے کھانوں کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔

سفیر علی کے سارے دفتر میں مٹھائی بانٹی جا رہی تھی سفیر علی نے بیٹی کی بات پکی ہونے کی تقریب میں اپنے دفتر کے لوگوں کو بھی شامل کر لیا تھا۔

رحمت بابا نے بھی مٹھائی کا ٹکڑا منہ میں ڈالا۔

"کیا تاریخ طے ہوئی ہے۔" انہوں نے پوچھا۔

"اگلے ماہ کی بائیس تاریخ۔" سفیر علی نے بتایا۔

"دس دن کا فرق ہے میری بیٹی کی شادی بارہ کو ہے۔" رحمت بابا نے بتایا۔

"میں بہت خوش ہوں کیونکہ مجھے بہت اچھا داماد ملا ہے۔" سفیر علی نے بتایا۔

"وہ بھی سرکاری ادارے میں سترہ گریڈ پر ہے۔"

"اچھا ہے بیٹی خوش رہے گی۔"

"تمہارا داماد کیا کرتا ہے؟" سفیر علی نے پوچھا۔

"پرائیویٹ بینک میں ملازم ہے۔"

"جاب تو ٹھیک ہے۔" سفیر علی نے کہا۔

"ابھی تو سب ٹھیک ہے باقی تو سب کا اپنا اپنا نصیب ہوتا ہے۔"

"میں تمہاری بیٹی کی شادی میں اس وقت آؤں گا جب تم وعدہ کرو میری بیٹی کی شادی میں آؤ گے۔"

"یہ آپ نے کیسی بات کی بیٹیوں کو شرطوں کے ساتھ نہیں جوڑنا چاہیے آپ آؤ یا نہیں آؤ۔ میں آپ کی بیٹی کی شادی میں ضرور آؤں گا۔" رحمت بابا نے کہا۔

"تم کو کسی بھی طرح کی میری مدد کی ضرورت ہو تو تم بتا دینا۔" سفیر علی نے محبت سے کہا۔

"میں ضرور بتاؤں گا لیکن ہم غریب لوگ بیٹی کے پیدا ہونے کے بعد سے ہی اس کی شادی کی تیاریاں شروع کر دیتے ہیں میری بیٹی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا اس کی ماں نے اتنی تیاری کر رکھی ہے کہ مجھے پتہ ہی نہیں چلا۔"

باتیں یاد رکھنے کی

☆ لوگ بیماری کے خوف سے غذا چھوڑ دیتے ہیں لیکن عذاب الٰہی کے خوف سے گناہ نہیں چھوڑتے۔

☆ جو شخص گناہ سے پاک ہو وہ نہایت دلیر ہوتا ہے اور جس میں کچھ عیب ہوں وہ سخت بزدل ہو جاتا ہے۔

☆ برائیوں سے پرہیز کرنا نیکیاں کمانے سے بہتر ہے۔

☆ دنیا مسافر خانہ ہے مگر بدبختوں نے اسے اپنا وطن بنا رکھا ہے۔

شائستہ جٹ...... چیچہ وطنی

''یقیناً تمہاری بیوی اچھی عورت ہے۔'' سفیر علی نے کہا۔

رحمت بابا اور سفیر علی کے پاس کوئی کام نہیں تھا تو دونوں اپنی بیٹیوں کے متعلق کافی دیر تک یونہی بات چیت کرتے رہے۔

* * *

سفیر علی کی بیٹی عین سامنے بیٹھی تھی۔

''میری شادی میں چند روز رہ گئے ہیں مجھے آپ سب کے ساتھ پکنک منانی ہے۔''

''پکنک گھومنا پھرنا تو تمہاری شادی کے بعد بھی جاری رہے گا۔'' سفیر علی بڑی محبت سے اپنی بیٹی کو دیکھ رہے تھے۔

''لیکن وہ پکنک الگ ہوگی مجھے صرف اپنے گھر والوں کے ساتھ پورا دن باہر گزارنا ہے۔''

''مان جاؤ۔'' بیوی کمرے میں داخل ہوئی۔

''اس کی خواہش پوری کردو۔''

سفیر علی نے آخر کار بیٹی کے سامنے ہار مان لی تھی اور فوراً ہی یہ بھی طے ہوگیا کہ کل سفیر علی کا گھرانہ سمندر کے کنارے جارہا ہے سفیر علی کی لڑکی فرح خود اپنے ہاتھوں سے پکنک کی تیاری کررہی تھی اس نے باہر سے خریداری روک دی تھی اور خود گھر میں کھانا تیار کررہی تھی۔ سفیر علی بھی اس روز دفتر نہیں جاسکے تھے۔

سمندر کی موجیں اپنی بھرپور طاقت کی غمازی کرتے ہوئے ساحل پر دور تک پھیل رہی تھی۔ سمندر کافی جوبن پر تھا لیکن جوشیلے اور منچلے بھی سمندر سے الجھ رہے تھے۔

فرح نے بھائی سے فرمائش کردی کہ اسے پانی میں جانا ہے سمجھانے کے باوجود ضد کررہی تھی آخر کار اسے اجازت ملی لیکن دور تک گہرے پانی میں جانے سے منع کردیا گیا تھا۔

فرح پہلے تو کم پانی میں رہی لیکن پھر بھائی کو راضی کرکے وہ گھٹنوں گھٹنوں پانی تک آگئی تھی اس نے مزید آگے بڑھنے کی کوشش کی تو بھائی نے روکا اور بولا۔

''زیادہ آگے مت بڑھو آج سمندر چڑھا ہوا ہے۔''

''کچھ نہیں ہوگا ڈرپوک۔'' وہ ہنسی۔

''مجھے تو آج دور تک جانا ہے۔''

''لیکن میں نہیں جانے دوں گا۔'' اس نے فرح کا بازو تھاما۔

''ارے چھوڑو مجھے تم نے بہت سختی سے پکڑا ہے۔'' وہ بازو چھڑانے کی جدوجہد کرنے لگی۔

دونوں کے درمیان کشمکش جاری تھی کہ فرح کا پیر ایک گڑھے میں گیا جو وہ پانی کے اندر نہیں دیکھ سکی تھی وہ لڑکھڑائی تو اس کے بوجھ سے بھائی بھی اپنا توازن قائم نہیں رکھ سکا۔ فرح نے گرتے ہوئے سہارے کے طور پر بھائی کو پکڑنا چاہا لیکن اسی وقت ایک بڑی موج ان کے اوپر آگئی اور پھر فرح کی آنکھوں میں تاریکی سی چھاگئی تھی دماغ جو جاگ رہا تھا وہ بھی کچھ دیر میں رک گیا۔

* * *

دو گھنٹے کی جدوجہد کے بعد فرح کی لاش غوطہ خوردوں نے پانی سے باہر نکال لی تھی فرح تو باہر آگئی لیکن ہمیشہ کے لیے زمین کے اندر جانے کے لیے۔ سفیر علی اور اس کے خاندان کی تو دنیا ہی اجڑ گئی تھی وہ نہیں جانتے تھے فرح اپنی شادی سے دس روز قبل یوں رخصت ہوجائے گی۔

سفیر علی کی بیوی رو رہی تھی بین کررہی تھی بھائی ماں کو سنبھالنے میں مصروف تھا جب کہ سفیر علی کو یہ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ اب زندوں میں ہے یا مردوں میں۔ اس کی آنکھوں میں کوئی آنسو نہیں تھا۔ وہ پتھرائی نظروں سے بیٹی کی لاش کو دیکھ رہا تھا کہ آخر اسے کس گناہ کی سزا ملی ہے۔

کیوں وہی چیز اس سے لے گئی جو اسے سب سے زیادہ پیاری تھی۔ وہ کیوں اسی طرح رخصت ہوئی کہ کبھی لوٹ کر نہیں آئے گی۔

اچانک سفیر علی کو خیال آیا کہ آج رحمت بابا کی بیٹی کی شادی ہے اس نے وعدہ کر رکھا تھا کہ وہ اس کی بیٹی کی شادی میں آئے گا۔ اس کی عقل نے کام بند کردیا کہ اس کا کیا قصور تھا کہ اس کی بیٹی کی شادی نہیں ہوسکی۔ سفیر علی لڑکھڑایا اور زمین پر ڈھیر ہوگیا۔

دو ماہ کا عرصہ بیت گیا۔ رحمت بابا نے بیٹی کی شادی کردی تھی اور وہ ریٹائر بھی ہوگئے تھے۔ سفیر علی زندہ ضرور تھے لیکن فالج کے اٹیک نے انہیں معذور کرکے بستر پر لیٹا دیا تھا۔

فن پارے

دیس بدیس نئے اور پرانے لکھاریوں کی
رنگا رنگ تحریریں جو آپ کے دل کو چھو لیں گی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

فردوس حزیں	ہاشم خان
قرض	شاداب علی
دکھ کی فصیل	نفیسہ سعید
آنسو کی طاقت	صداقت حسین ساجد
دیر آید	ریحانہ سعیدہ
یقین کامل	فاطمہ عبدالخالق

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

فردوس حزیں

محمد ہاشم خان

آبشار کی زریں لہروں کی بازگشت وصال اور فراق کے زمزمے سنا رہی تھی' دیوار کے پتوں ڈالیوں اور جڑوں پر جمی ہوئی برف بتدریج پگھل کر زمین میں جذب ہو رہی تھی' سردی ہڈیوں میں اتر رہی تھی' سویٹر مفلر اور دستانے خود آتش بدن مانگ رہے تھے اور دور بہت دور چنار کے نرم پتوں کو چوم کر آنے والی نیم برفانی ہوائیں شہر واپسی کا وقت بتا رہی تھیں۔ سطح سمندر سے کوئی پندرہ ہزار فٹ اوپر یہ ایک بے آب و گیاہ وادی تھی ایک شورش زدہ ریاست میں 'شین' کی سرد تپش سے نصف سوختہ مرغزار وادی جہاں صرف برفاب تھے' جھرنے تھے سرو صنوبر اور چھوٹے چھوٹے کوہستانی پیر جن کے پتوں کو کسی زمانے میں لکھنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا جنگلی جانوروں کی آوازیں نہیں آ رہی تھیں' شاید وہ دن ڈھلنے کا انتظار کر رہے تھے دن ڈھل رہا تھا شام کے مہیب سائے دراز ہو رہے تھے اور خورشید رات کی وسیع قبر میں داخل ہونے کی تیاری کر رہا تھا۔ یہ ایک مشہور سیاحتی مقام تھا۔ زمستان میں دور دور سے لوگ برفانی کھیلوں کا لطف لینے آتے تھے۔

''کیا کہا تم نے'' ''تھا؟'' راوی! مجھے اس 'تھا' پر شدید اعتراض ہے۔ سب کچھ حال میں چلنا چاہیے جگہ ابھی زندہ ہے' اس کی طرح ہماری روح سے گرچہ کہیں کہیں زیادہ بوڑھی ہے مگر توانا اور زندگی سے لبریز ہے یاد رہے جگہ نہیں مرتی ہمارے مر جانے کے بعد بھی زندہ رہے گی اور اس فسانے کے ختم ہو جانے کے بعد بھی۔ تمہاری اس کہانی میں میری مداخلت کچھ غیر اخلاقی ہے لیکن امید ہے کہ اس دخل در معقولات کو برداشت کریں گے۔ میں اپنا احتجاج درج کروا چکی ہوں اب تم شوق سے اپنی کہانی جاری رکھ سکتے ہو۔ ہاں تو تم کیا کہہ رہے تھے۔'' زمستان میں دور دور سے لوگ برفانی کھیلوں کا لطف لینے آئے تھے۔

''پھر وہی ماضی کا جبر مسلط کر رہے ہو۔ کیا یہ 'تھا اور تھے' تمہارے شعور کا جزو لاینفک نہیں بن چکے ہیں؟ داستاں گو! ماضی موت اور محرومی یا ہر وہ چیز جو تمہارے قبضہ قدرت سے نکل چکی' ہو عزیز کیوں ہو جاتی ہے؟ ہم حال میں جینا چاہتے ہیں یہ لازم تو نہیں کہ سب کو ماضی عزیز ہو اس لیے 'تھا اور تھے' اس فسانے کا محور کیوں ہیں؟ میں بھی ایک کہانی تھی؟ ان کہی؟ ان سنی؟ اور ان دیکھی...... 'تھا' دراصل تمہاری اجتماعی فکر کا نچوڑ ہے اور یہ صرف چند لمحوں کے گزر جانے پر محیط نہیں بلکہ پوری زندگی پر دال ہے۔ زندگی جو کبھی ہماری دسترس میں تھی ہی نہیں۔ کیا تم ماضی حال اور مستقبل تینوں کو ملا کر کوئی ایک ایسا وقت پیدا نہیں کر سکتے جس میں سب کچھ۔ حال میں ہو اور حسب حال ہو؟ ویل! میں نے اپنا احتجاج درج کرا دیا ہے اب تم شوق سے اپنی کہانی جاری رکھ سکتے ہو۔ معذرت! میری کہانی...... ہاں تو تم کیا کہہ رہے تھے۔

قدسی کا احتجاج نوٹ کر لیا گیا ہے ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ زمستان میں دور دور سے لوگ برفانی کھیلوں کا لطف لینے آتے تھے۔ اس وقت بھی کافی تعداد میں مقامی ہندوستانی اور بیرونی سیاح آئے ہوئے تھے۔ وہ مقامی نہیں تھا لیکن اب تک یہ سمجھ نہیں پایا تھا کہ وہ بیرونی تھا یا ہندوستانی؟ یہ سیاحتی مقام اپنے سیاحوں سے ایک ایک کر کے خالی ہو رہا تھا۔ تقریباً خالی ہو چکا تھا اب صرف وہی لوگ بچے تھے جن کی اپنی دکانیں تھیں۔ وہ کیوں نہیں آئی؟ جگہ تو یہی تھی وقت اور مقام اسی نے متعین کیا تھا۔ پانچ بج رہے ہیں فون نہیں اٹھا رہی ہے۔ اب تو موبائل بھی آؤٹ آف کوریج ایریا بتا رہا ہے۔ اب نہیں آئے گی۔ وہ اضطراب اور اضمحلال کے جاں گسل لمحوں میں ریستوران سے باہر آتا۔ سگریٹ سلگاتا' ایک ہی کش میں پورا سگریٹ پی لینا چاہتا' دھوئیں کے دبیز مرغولے فضا میں یوں رقص کرتے نظر آتے گویا دھندلے بادلوں میں تحلیل ہونے کی خوشی منا رہے ہوں۔ گویا بادلوں کو برشگال کی دعوت دے رہے ہوں' وصال کی دعوت۔ آخری کش تک اپنے خیالوں میں گم رہتا اور سگریٹ ختم ہوتے ہی اسے شدت سے سردی کا احساس ہونے لگتا۔ ہوائیں ہڈیوں کے اندر اترتی ہوئی محسوس ہوتیں۔ عجیب سی الجھن' بے چینی تشویش تردد اور تفکر کی لکیریں اس کے چہرے پر بنتی اور مٹتی رہتیں۔ کیا ہوا ہوگا نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ ایک مثبت اپروچ ایک منفی خیال کی نفی کر رہا تھا۔ حالات اتنے خراب نہیں لیکن پر آشوب ریاست کی شورش زدہ حالات میں وسوسے اور واہمے بھی شورش زدہ اور متوحش ہوتے ہیں۔ وہ سوچ رہا تھا اور پھر انتظار کا اضطراب کسی ایک

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

جگہ سکون سے کہاں بیٹھنے دیتا ہے۔ ویٹر بھی چائے پلا پلا کر عاجز نظر آ رہا تھا۔ غلے پر بیٹھا ہوا شخص اب عجیب ذریدہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اور پھر اس نے محسوس کیا کہ ریستوران میں موجود تمام لوگ اسے مشکوک نگاہوں سے دیکھنے لگے ہیں۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ غیر مرئی طور پر ریڈار پر ہے۔ کوئی ایک سایہ اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ نہیں کوئی ایک نہیں بلکہ کئی سائے اس کا تعاقب کر رہے ہیں۔ ہاں، آرمی ایجنسی اس کی اپنی شوریدگی اور قدسی آزمائشوں کو دعوت دینا کوئی اچھی بات نہیں اور یہ سوچتے ہوئے بے جان قدموں سے نیچے اترنے لگا۔ آبادی کیمپ ہوٹل اور فردوس بریں تین ہزار فٹ نیچے تھے کچھ چہرے نظر آئے تر و تازہ ہشاش بشاش اور کچھ جوڑے بھی تھکے ہوئے بوجھل مگر زندگی سے بھرپور۔

قدسیہ سے ملنے کی یہ آخری کوشش تھی جو رائگاں چلی گئی۔ وہ سوچنے لگا کہ سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس پر جوان ہونے والی محبتیں قابل اعتنا ہیں؟ تقریباً ایک سال اچھا خاصا وقت ساتھ میں گزارنے کے بعد بھی سب کچھ خیالی وہمی اور پرفریب ہی رہا۔ کہنے کو تو سب کچھ ایک کلک کی دوری پر تھا مگر وہ ایک کلک؟ سب فریب خیال ہے اور شاید یہی حقیقت ہے۔

◆ …… ◆ …… ◆ …… ◆

تقریباً سال بھر پہلے کی بات ہے اسے شہر میں آئے ہوئے کوئی دو تین ماہ ہوئے تھے۔ اس نے بوریت سے بچنے کے لیے اپنے شب و روز کو تین حصوں میں بانٹ دیا۔ صبح دس سے چار بجے تک فیلڈ میں ہوتا، بھانت بھانت کے لوگوں سے ملاقات اور بھانت بھانت کی کہانیاں، قصے اور محرکات جنگجوئیت فوج انسانی حقوق کی پامالی، انفارمر کولیبوریٹر اور سیاسی مکاری یہ پسندیدہ موضوعات تھے پانچ سے دس بجے تک آفس میں اور دس سے بارہ بجے تک سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس پر۔ دانشوری۔ دفتر پہنچتے ہی سب سے پہلے میل، آرکٹ اور فیس بک چیک کرتا اور اس کے بعد معمول کے کام میں مصروف ہو جاتا۔ دفتری عملے کے علاوہ دو چار لوگوں سے شناسائی تھی برائے نام اور برائے کام ویٹر اور کمپوزر صحافی بن بیٹھے تھے، وہ سب پست ذہن تھے محدود جغرافیائی وسائل میں ملنے والے محدود فکر کے لوگ چھوٹے شہروں کی اپنی محرومیاں ہوتی ہیں اور یہ ان ہی محرومیوں کی پیداوار تھے۔ قدسی بھی انہی دنوں کی ایک امید تھی اس نے ان بکس چیک کیا ایک نیا میل منتظر تھا۔

”آداب آپ بہت اچھا لکھتے ہیں۔ آپ کی اسٹوریز اور مضامین بہت بولڈ ہوتے ہیں لیکن ان جنرل ان کا کوئی فائدہ نہیں، یہ صرف زخموں کو کریدتے ہیں۔ وہ زخم جو کچھ مندمل ہو رہے ہوتے ہیں۔ یہ کہنا کہ فوج نے ظلم کیا بہت آسان ہے، فلاں کے ساتھ ظلم ہوا ہے یہ بھی آسان ہے۔ لیکن یہ کہنا کہ فوج کی فلاں بٹالین کے فلاں کمانڈر یا فلاں سپاہی نے فلاں کا قتل کیا ہے اور فلاں کا ریپ کیا ہے تقریباً ناممکن ہے۔ یہ لکھنے کی ہمت آپ کے اندر نظر نہیں آ رہی ہے۔ اگر آپ لوگوں نے یہ لکھا ہوتا تو شاید حالات وہ نہیں ہوتے جو نظر آ رہے ہیں۔ میں وہ تحریریں دیکھنا چاہوں گی جو آفیشل ٹروتھ سے اوپر ہوں۔ ہماری ہمدردیاں حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اس کی کچھ قیمت بھی ادا کیجیے۔

قدسیہ امین صاحبہ آپ کا میل پڑھا، یقین کیجیے حیرت کے ساتھ ساتھ بے انتہا خوشی بھی ہوئی۔ آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں میرے اندر کمٹ منٹ کا وہ لیول نہیں جو آپ دیکھنے کی متمنی ہیں۔ میں بنیادی طور پر سے بہت بزدل آدمی ہوں، کوئی دانشور بھی نہیں ہوں۔ ابھی تو میری کل عمر ہی 25 سال ہے، 15 سال بعد کہیں وجدان و عرفان کا دعویدار ہو سکتا ہوں۔ نبوت اس لیے نہیں کہا کہ مبادا کفر کا فتویٰ نہ عائد کر دیں۔ مجھے زندگی ہر صورت عزیز ہے اسی لیے موت کی زیادہ بات کرتا ہوں۔ میں چیک جمہوریہ کے ایک ادیب کی بات نقل کرنا چاہوں گا، اقتدار کے خلاف ایک آدمی کی جدوجہد فراموشی کے خلاف یادداشت کی جدوجہد ہے۔ یعنی جبر کو یاد رکھنا بھی اقتدار کے خلاف ایک جدوجہد ہے اور اس طرح جبر کے خلاف میری جدوجہد جاری ہے۔ یہ غلط فہمی ہے کہ میں آپ لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ میری اس کاوش کو ضمیر کی مجبوری کہہ لیجیے یا ملازمت کی۔ ویسے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں نے آپ کو وضاحت کیوں پیش کی ہے خیر خوش رہیے۔

بیسٹ ریگارڈس۔ احمد سعید۔

”خوش کیسے رہ سکتی ہوں، چپے چپے پر فوج ہے پولیس ہے ناکہ بندی ہے۔ گھر گھر میں جنگجو ہیں۔ کوئی ایسا گھر نہیں جس میں کوئی ایک کرسی خالی نہ ہو۔ دو ماہ سے کرفیو زدہ حالت میں ہیں۔ خوش کیسے رہ سکتی ہوں؟“

http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

جنت کے پتے
نمرہ احمد
WWW.PAKSOCIETY.COM
مصحف
نمرہ احمد
www.Paksociety.com
نمل
نمرہ احمد
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
آبِ حیات
عُمیرہ احمد
WWW.PAKSOCIETY.COM
ہم سفر
فرحت اشتیاق
داستان ایمان فروشوں کی
جلد اول
التمش
بن روئے آنسو
فرحت اشتیاق
www.paksociety.com
عبداللہ
ہاشم ندیم
پیرِ کامل
عمیرہ احمد
متاعِ جاں ہے تو
فرحت اشتیاق
WWW.PAKSOCIETY.COM
من و سلویٰ
Man-o-Salwa
عمیرہ احمد
www.paksociety.com
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو
فرحت اشتیاق
WWW.PAKSOCIETY.COM
خدا اور محبت
ہاشم ندیم
بارِش
شمیرا حمید
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
ٹوٹا ہوا تارہ
سمیرا شریف طور
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
قراقرم کا تاج محل
نمرہ احمد

"میں آپ کو جانتا نہیں ہوں اس لیے مزید بات نہیں ہو سکتی' آپ اپنا نمبر ڈراپ کر دیجئے' اور کچھ تصویریں بھی۔ مجھے بھی تو معلوم ہونا چاہئے کہ میں کسی سائے کسی دیوار یا کسی حویلی سے ہم کلام نہیں ہوں۔ اگر نمبر نہیں دینا چاہتی ہیں تو یہ میرا نمبر ہے کبھی بھی کال کر سکتی ہیں۔"

"وہ کیا بات ہے اگر کال کروں گی تو میرا نمبر آپ تک نہیں پہنچ جائے گا؟ اچھا حس مزاح رکھتے ہیں۔ یہ لگژری صرف آپ ہی لوگ افورڈ کر سکتے ہیں۔ بہر حال یہ آپ کا Escapism ہے۔ نہ میں نمبر دوں گی اور نہ ہی تصویریں۔ اور ہاں اپ ہی کی زبان میں نہ میں کوئی سایہ کوئی دیوار اور کوئی حویلی ہوں پولیٹیکل سائنس سے ایم اے کیا ہے اور ہیومن رائٹس ایکٹیویسٹ ہوں۔ میرے والدین ٹیچر تھے انسر جنسی کی نذر ہو گئے۔ ماموں کی کفالت میں رہتی ہوں میں نے پوچھا تھا کہ آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟"

"آپ کیوں جاننا چاہتی ہیں؟ اتنی جلدی کسی نتیجے پر نہیں پہنچتے اور میں محسوس کر رہا ہوں کہ آپ نہ صرف ایک نتیجے پر پہنچ گئی ہیں بلکہ میرے اوپر الزام بھی لگا رہی ہیں۔ نزاعی یا بہت زیادہ حساس معاملات پر میرے اپنے تحفظات ہیں کچھ سوالوں کا جوب آپ کو خود بخود مل جائے گا۔ آپ پڑھی لکھی خاتون ہیں لیکن لہجے سے اندازہ ہو رہا ہے کہ آپ مفروضوں کو یقین سمجھنے لگی ہیں اب میرے جانے کا وقت ہو گیا ہے پھر کبھی بات ہو گی اللہ حافظ۔"

"تحفظات کیا ہی جامع لفظ ہے۔ ہم لوگوں کی ترجمانی کے لیے آپ لوگوں کے پاس اس سے بہتر کوئی اور لفظ نہیں؟ بہت خوب مفروضوں کو یقین سمجھنے لگی ہوں؟ یقین کیجئے اس سے بڑی گالی کسی نے آج تک ہمیں نہیں دی تھی۔"

"آپ اپنی بات کیجئے۔ میرا خیال آپ کو گالی لگا' مجھے بے حد افسوس ہے۔" اسے آفس سے نکلے ہوئے بھی دس منٹ ہوئے ہوں گے کہ موبائل وائی بریٹ کرنے لگا۔ غیر معلوم نمبر سے کال تھی۔

"ہیلو! جی فرمائیے کس سے بات کرنی ہے؟"

"آپ سے ہی بات کرنی ہے میں قدسی بول رہی ہوں۔"

"قدسی کون؟"

قدسی ایک متوسط اور خوشحال گھرانے کی لڑکی تھی جو تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد وقت گزاری کے لیے جبری گمشدہ افراد کی تلاش سے متعلق ایک این جی او میں رابطہ کار کا فریضہ انجام دے رہی تھی۔ اس پر جدید فیشن کا لمس لیے ہوئے دیہی پیرہن بہت اچھے لگتے تھے' خاص طور سے تھوڑی لمبی اور قدرے ابھری ہوئی ناک پر سرخی مائل نتھنی ایک عجیب وجدآمیز کشش پیدا کرتی تھی۔ وہ اپنے پہناوے اور رکھ رکھاؤ میں اس بات کا خاص خیال رکھنے کی کوشش کرتی تھی کہ وہ نیم وحشی نظر آئے۔ ایسے ہی جیسے ہم شہروں میں رہتے ہوئے اپنے دل میں ایک گاؤں بسائے رکھتے ہیں۔ نیم دیہاتی نظر آنے کے لیے یا پھر ایک تعلق کو مرنے سے بچانے کے لیے...... اور غور سے دیکھنے پر نظر بھی آتی تھی۔ آنکھیں بڑی نیل گوں اور حسب تناسب نکلی ہوئی۔ چنار کے پتوں کی طرح تمام پتوں سے الگ...... اس کا کہنا تھا پہاڑی لڑکیوں میں آبشار کی آواز جیسی میوزیکل روانی ہوتی ہے۔ لہٰذا اگر وہ میوزیکل نظر آنے کی کوشش کرتی ہے تو اس میں قباحت کیا ہے؟ حسب جبلت رکھ رکھاؤ کے تعلق سے تبدیلیاں پیدا کرتی رہتی تھی۔ اس کا کوئی ایک رنگ اور کوئی ایک مزاج نہیں تھا ہر رنگ اور ہر مزاج میں ایک جیسی ہی دکھتی تھی۔ نیم جنگلی۔

"میں قدسیہ امین ابھی آپ سے چیٹ ہو رہی تھی۔" اور پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ فون پر بات کم ہی ہوتی تھی۔ رات دس بجے ایک میسج کے پاپ اپ ہونے کا انتظار رہتا۔ کبھی اس طرف اور کبھی اس طرف۔ منحصر تھا کہ رات کس نے کس کو کتنا ناراض کیا ہے۔ زندگی موت جسم' روح عشق ہوس سیکس خاندان کا کون سا ایسا موضوع تھا جو باقی بچا ہو۔ اگر بات نہیں ہوتی تھی تو ان خونچکاں واقعات کی۔ زمین اور اس کی پامالی کی' مکینوں اور ان پر جبر کی فوج اور ان کے سیاسی آقاؤں کی۔ جنگجو اور ان کے مرشدین کی جس کے راوی چنار کے پتے دیوار کی ڈالیاں فلک بوس پہاڑوں کی گپھائیں چناب اور جہلم تھے۔

اب قدسی' احمد کے ساتھ ساتھ چلنے لگی تھی۔ خیالوں میں تقریباً ہر جگہ رات اور دن کا فرق مٹ چکا تھا۔ اب اس کا اپنا

کام باقاعدہ ڈسٹرب ہونے لگا تھا۔ ایسے ہی کئی ماہ گزر گئے اب تک نہ تو اس نے ملنے کی کوئی خواہش ظاہر کی تھی اور نہ ہی کوئی حوصلہ افزائی۔ بالآخر ایک دن وہ ڈھیر ساری بحث کے بعد وقتی جھجک اور ٹال مٹول کے بعد ملاقات پر راضی ہوگئی۔

”فلاں تاریخ کو ہم لوگ ایک سیمینار کررہے ہیں ہم چاہتے ہیں کہ آپ اس میں شریک ہوں۔“

”مجھے سیمینار میں کوئی دلچسپی نہیں ہے یہ صرف وقت اور پیسے کی بربادی ہے۔“

”پھر کس میں دلچسپی ہے؟“

”تم میں۔“

”اوہ...... اور یہ ان کی خوبصورت جگہوں میں نہیں؟“

”دنیا کی ہر وہ جگہ خوبصورت ہے جہاں موت نہ آتی ہو۔“

”اور موت کیا ہے؟“

”یہ نہیں شاید! **A Parting kiss of life!**“

”کبھی محسوس کیے ہو؟“

”ہلکا سا‘ ابھی لائیوان کاؤنٹر کور کرکے آیا ہوں۔“

”اور زندگی کیا ہے؟“

”بقول ایک ادیب ایک طویل موت کا نام ہے۔“

”لیکن یہاں موت طویل نہیں ہوتی۔“

”کیا سب پیدا ہوتے ہی مرجاتے ہیں۔“

”نہیں جوان ہوتے ہی ماردیے جاتے ہیں۔“

”ایک بات بتاؤ تم پریڈے سے ہو کیا؟“

”ہاں پچھلے بیس سال سے۔“

کوئی آٹھ گھنٹے کے طویل سفر کے بعد وہ شہر آشوب میں داخل ہورہا تھا۔ ایک مناسب ہوٹل میں کمرہ بک کیا‘ تھکن کی گرد کو غسل خانے میں جھاڑ کر سیمینار میں شریک ہونے کے لیے چلا گیا۔ سیمینار ہال مختلف شعبہ ہائے جات کے تعلیم یافتہ افراد سے بھرا ہوا تھا۔ ایک نوجوان لڑکی کنوینر کا فریضہ انجام دے رہی تھی۔ ماورائے عدالت مہلوکین کا اعداد وشمار پیش کررہی تھی۔ ایک لاکھ سے زائد افراد اب تک جاں بحق ہوچکے ہیں کچھ فوج کے ہاتھوں کچھ جنگجوؤں کے ہاتھوں اور ایک بڑی تعداد کولیٹرل ڈیمج کا شکار ہوئی ہے۔ فیگر ڈراپ کرتے ہوئے اس کے چہرے پر تغیر پذیر رمق واضح طور سے دیکھی جاسکتی تھی۔ پہلے تو اسے لگا کہ شاید یہی قدسیہ ہے لیکن پھر اس نے اپنا خیال مسترد کردیا کیونکہ جھلمل دوپٹے سے جھانکتے ہوئے اس کے پستان کچھ زیادہ بڑے نظر آرہے تھے۔ اور قد بھی اور شکل بھی بیضوی نہیں تھے۔ یہ یقیناً عروسہ ارسلان ہوگی۔ ایک گھنٹے بعد لنچ بریک ہوگیا۔

”ہائے میں احمد سعید‘ قدسیہ نے مدعو کیا تھا۔“

”اوہ تو آپ ہیں وہ اسپیشل گیسٹ‘ بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ پلیز فیل فری‘ کہیں مت جائیے گا پروگرام ختم ہونے کے بعد آرام سے ملتی ہوں۔ اطمینان رکھئے آپ بور نہیں ہوں گے۔“ پھر اس نے ایک ہینڈسم جوان کو مدعو کیا۔

”ارسلان! یہ احمد ہیں‘ وہی احمد اور احمد! یہ ارسلان ہیں میرے ہزبینڈ۔“

احمد سمجھ نہیں پایا کہ ’وہی احمد‘ سے کیا مراد ہے اور پھر عروسہ کے چہرے کی مسکراہٹ؟ معنی خیز شرارت آمیز اور خوف انگیز۔ احمد اس پراسرار مسکراہٹ کو کوئی مفہوم عطا نہیں کرپارہا تھا۔

”اوکے لیکن قدسی کیوں نہیں نظر آرہی ہے۔ آپ لوگوں نے اسے کہاں غائب کردیا؟“

”وہ اپنی ایک کزن کی منگنی میں گئی ہوئی ہے یہاں سے کوئی سو کلومیٹر دور۔ آج نہیں آپائے گی تب تک آپ ارسلان کی

کمپنی انجوائے کریں۔ یہ سافٹ ویئر انجینئر ہیں۔ بنگلور کی ایک کمپنی میں پروجیکٹ منیجر ہیں۔ لٹریچر اور فلسفے سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ مجھ سے محبت کرتے ہیں باقی اور کوئی نقطہ اتفاق نہیں۔ آپ کے لیے ان کا ورژن شاید زیادہ درست اور Unbiased ہو۔

ارسلان نہایت زندہ دل اور خوش مزاج تھا۔ عروسہ کی ان سرگرمیوں کو وہ پسند نہیں کرتا تھا اس کا خیال تھا کہ یہ اسٹیٹس کو پچاس سال کے جبر کی پیداوار ہے۔ دو نسلیں تباہ ہو چکی ہیں پہلی دو نسلیں تنازع اور تذبذب کی نذر ہوئی ہیں اور یہ تیسری نسل متضاد ذہنیت کی شکار ہو رہی ہے۔"

"یہ مہلوکین کا ڈیٹا آپ کے پاس کہاں سے آیا؟"

"یہ سرکاری اعداد و شمار نہیں ہیں لیکن ہمیں معلوم ہے کہ ہر گھر میں ایک کرسی خالی ہے کیا اتنے گھر نہیں ہیں اس پوری ریاست میں؟"

"لیکن ہم آئے نہیں تھے ہم کو بلایا گیا تھا۔ احمد نے فوج کی آمد کے تعلق سے ایک تاریخی اشارہ کیا۔

"آپ مہمان تھے نا چلے جاتے۔"

اس نے عروسہ کے لہجے میں بیگانگی اور بے زارگی دونوں کو محسوس کیا۔ بات ایک تنازعہ کی طرف بڑھ رہی تھی پچاس سال پیچھے دائروں کا سفر شروع ہونے والا تھا اور وہ ڈنر کا لطف پھیکا نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ایک خوبصورت اور خوش حال لڑکی ایک پرامن زندگی کیوں نہیں گزارنا چاہتی۔ قومیت کیا واقعی اتنا اہم ہے کہ اس کے بغیر مستقبل کا تصور ناممکن ہے؟ ارسلان کو ان باتوں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی اس کا خیال تھا کہ نیلم کا پانی اب اتنا مٹ میلا نہیں ہے۔ رات میں عشائیہ کے بعد اس نے قدسی کو واپس اپروچ کیا اور دوسرے دن بارہ بجے ملاقات طے پائی۔

* * *

اور قدسی نہیں آئی۔ جب وہ تین ہزار فٹ نیچے مرکز پر آیا تو معلوم پڑا کہ ٹرانسپورٹ کی سہولت منقطع کردی گئی ہے۔ بہرحال کسی طرح سے وہ رات نو بجے تک اپنے ہوٹل پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ استقبالیہ پر دانش موجود تھا۔ اس نے خبر دی کہ بس ابھی کچھ دیر پہلے کوئی ایک لڑکی آپ کے بارے میں پوچھ رہی تھی یہ خبر صدیوں کی تھکان اتارنے کے لیے کافی تھی اس وقت وہ کمرہ کے 203 کے باہر تھا۔

"جی میں احمد سعید۔"

دروازہ ہلکی سی آواز کے ساتھ کھلا۔ تھوڑا تھوڑا کر کے پہلی بار دونوں آمنے سامنے تھے۔ دم بخود ساکت بھاری سانسوں کے ساتھ۔ ایسے ہی نہ جانے کتنے سیکنڈ گزر گئے کسی کے لب نہیں ہلے۔

"کیا سوچ رہی ہو؟ یقین نہیں آرہا ہے؟"

"نہیں اب سوچنے کے لیے کچھ نہیں بچا ہے۔"

"لگتا ہے تم ابھی آئی ہو بال ابھی مکمل طرح سے سوکھے نہیں ہیں۔"

"جی ہمارے یہاں حالات اچانک خراب ہوگئے۔ ملٹری نے پورے ایریا کو کورڈن آف گھیرے میں لے لیا ہے۔ موبائل نیٹ ورکس جام کردیے ہیں۔ کئی گھنٹوں تک فائرنگ ہوتی رہی۔ بالآخر اس مکان کو بارود سے اڑا دیا گیا جس میں ملی ٹینٹ چھپے ہوئے تھے۔ اور جب وہاں سے نکلنے کی پرمیشن ملی تو راستے میں گاڑی خراب ہوگئی۔ حد ہے میں وضاحت پیش کررہی ہوں حالانکہ تم کو تو اب ان تمام چیزوں کی عادت ہو جانی چاہیے تھی۔"

"تھا، تھی اور تھے پر تمہارا اعتراض مجھے یاد ہے۔ اس لیے مجھے عادت ہوگئی ہے جسے تم زبان کا جبر کہتی ہو وہ مجھے تم سے سیکھنا ہے لیکن بدن کے جبر سے آزاد ہونے کے بعد۔" اس نے معنی خیز مسکراہٹ کو نوٹ کرلیا۔

"نیا رسو لگر۔" دونوں کو بھوک لگی ہوئی تھی۔ دونوں نے ساتھ میں ڈنر کیا۔ ڈنر سے فارغ ہونے کے بعد اس نے ہوٹل کے لان میں حسب معمول چہل قدمی کی خواہش ظاہر کی جسے قدسی نے منع کردیا۔

"ہنی! حالات اتنے خراب تو نہیں۔" اس نے کمزور سا احتجاج کیا۔

"تمہیں کچھ پتہ نہیں یہاں کبھی کبھی پرچھائیاں بھی گولی چلاتی ہیں۔"

دونوں کمرے میں آ گئے۔ باتیں تھیں کہ ختم نہیں ہو رہی تھیں۔ مسام اندام محبت کے ہارمونز کا تبادلہ کر رہے تھے۔ زندگی بہت آگے نکل چکی تھی۔ ایک ہلکی سی چیخ یک ساعت میٹھا درد اور تھپ تھپ کی ہم وزن آوازوں کے ساتھ مکمل ہو گئی تھی۔ تشنگی کے صحرا میں بھٹکنے والی روحوں کو 'آب حیات' نے سیراب کر دیا تھا۔ تنگنائے غزل سے کچھ قطرے نکل کر تپتی رانوں کے ریگزار پر مصرعوں کی صورت پھیل چکے تھے لیکن جب پیاس عین شباب کی ہو تو ایک دو قطروں سے بجھتی نہیں بلکہ اور بڑھ جاتی ہے اور پھر یہ تو ریت کے بدن تھے جو شب دیجور میں سمندر کا مدوجزر مانگ رہے تھے گھڑی پر ان کی نظر پڑی' رات کے چار بج رہے تھے وقت بہت تیزی سے گزر گیا تھا اور ساتھ میں زندگی کا سب سے بہترین پل بھی۔

"تم کو الگ سے روم لینے کی کیا ضرورت تھی؟"

"ابھی جب ایک گھنٹے بعد ملٹری والے روم کی تلاشی لیں گے تو ان کو کیا جواب دو گے؟"

"بول دوں گا یہ میری جان ہے اور یہ میرا کارڈ ہے۔" اس نے حکومت کی طرف سے جاری کردہ مراعات یافتہ کارڈ دکھاتے ہوئے کہا۔

"پھر میرا کارڈ مانگے گا اور پھر میں ریڈار پر آ جاؤں گی۔ اور اس کے بعد اور اس کے بعد دونوں پھر ہم آغوش ہو گئے۔ تین دن کا قیام عشرے میں تبدیل ہو گیا۔ شہر کے سارے اچھے ریستوران تفریحی باغات مقامات اور چنار کے چار بڑے پیڑوں کی چھال پر رقم Q.A ان کی محبت میں ہم زمزمہ تھے۔

"قدسی شادی کے بارے میں تم نے کچھ بتایا نہیں؟"

"مجھے لگ رہا ہے کہ اس دس دن میں میں نے پوری زندگی جی لی ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"پہلے میں زندگی سے نہیں ڈرتی تھی اب ڈرنے لگی ہوں شاید یہی دس دن جینے کے لیے میں پیدا ہوئی تھی۔"

* * *

شہر آشوب سے لوٹنے کے بعد قدسی سے کچھ دنوں تک رابطہ رہا اور پھر اچانک سارا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ گھڑی سہ پہر تین بجے کے کانٹے پر آ کر رک گئی تھی۔ جس این جی او میں وہ کام کر رہی تھی وہاں فون کرنے پر معلوم پڑا کہ نہ تو مذکورہ نام کی کوئی لڑکی یہاں کام کرتی ہے اور نہ ہی گزشتہ چار سال سے کوئی نیا اسٹاف بھرتی کیا گیا ہے۔ اور جو ہیں وہ سب زندہ اور صحیح سالم ہیں۔ عروسا آخری لنک تھی لیکن وہ بھی سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس سے غائب تھی۔ نہ اس نے فون نمبر مانگا تھا اور نہ عروسہ نے دیئے۔ اسی انتظار کشمکش اور امید وبیم میں ایک ماہ اور گزر گئے کہ شاید ققنس اپنی راکھ سے دوبارہ جنم لے شاید کوئی فون آئے۔ شاید۔

"ہیلو! جی سوامی ناتھن جی کیسے ہیں اتنے دنوں بعد اچانک کیسے یاد کیا؟"

"صاحب ملنا چاہتے ہیں' گاڑی لے کر آ رہا ہوں فلاں جگہ سے آپ کو پک کر لیں گے۔"

"وہ صاحب سے دوسری بار ملنے جا رہا تھا۔ پہلی بار اس وقت ملاقات ہوئی تھی جب اس نے ڈیوٹی جوائن کی تھی اور اب چھٹی حس بیدار ہو گئی اوہ مائی گارڈ۔"

بریگیڈیئر منوج شامر اس کے علاقے کے رہنے والے تھے نرم گو خلیق اور ملنسار آفیسر تھے انہوں نے چائے کا آرڈر دیا اور سیدھا اصل مدعا پر آ گئے۔

"سنا ہے کل آپ کسی افغانی کی قبر تلاش کر رہے تھے؟ ہم سے کہا ہوتا ہم بتا دیتے۔" کسی۔ پر انہوں نے خاص زور دیا۔

"سر آپ کو کیسے معلوم پڑا؟" احمد حیران تھا کہ جب وہ قبرستان گیا تھا تو اس وقت اس کے فوٹو گرافر قاسم پیرزادہ کے

علاوہ کوئی اور نہیں تھا۔

"آپ کو معلوم ہے کہ یہاں تمام قبرستان کے دروازے ہماری چابیوں سے کھلتے اور بند ہوتے ہیں۔"

"یہ تو پوری دنیا جانتی ہے سر۔" احمد نے بھی لطیف سا طنز کیا۔

"احمد صاحب یہ طنز کرنے کا وقت نہیں اور آپ کے اختیار میں بھی نہیں۔ آپ کو پتہ ہوگا کہ آپ کو ٹریٹمنٹ کر دیا گیا ہے۔"

"یہاں تو سب کچھ آپ کے رحم و کرم پر ہے۔ احمد کو اب کوئی حیرانی نہیں تھی۔ اسے مزاحمت کاروں فوج اور کولیبوریٹرز کے مابین سنڈیکیٹ کا کچھ مبہم ادراک ہونے لگا تھا۔

"آپ کرپٹ نہیں ہیں اور یقین کیجیے میں آپ سے بہت متاثر ہوں۔ اس لیے میرا مشورہ ہے کہ ناشکروں کے درمیان خود کو ضائع مت کیجیے۔" چائے ختم ہوگئی جب وہ بریگیڈیئر شرما کے آفس سے نکل رہا تھا تو پیچھے سے ان کی آواز آئی۔

"احمد صاحب! آپ کو کوئی اور قبر تلاش کرنی چاہیے تھی۔ آپ بہت بھولے ہیں۔"

"سمجھا نہیں سر آپ کا شارہ کس طرف ہے؟" احمد کے قدم جہاں تھے وہیں رک گئے۔

"جلد ہی سمجھ جائیں گے۔ ویسے میں نے جو مشورہ دیا ہے اس پر غور کیجیے گا۔" شرما صاحب کے لہجے میں کوئی دھمکی نہیں تھی لیکن اکثر بڑے لوگ حکم یا دھمکیاں مشوروں کی شکل میں ہی دیتے ہیں۔ جب وہ شرما صاحب کے دفتر سے باہر نکلا تو اس کی نظر دفتر رابطہ عامہ کے باہر چہل قدمی کرتی ہوئی ایک جواں سال عورت پر پڑی۔ وہ گوگل پہنے ہوئے تھی اور موبائل پر کسی سے بات کر رہی تھی۔ وہ فوراً گاڑی سے اتر گیا۔ پہلے تو اسے یقین نہیں آیا پھر حیرت اور خوشی دونوں نے اس کے جذبات کو شل کر دیا۔ ایک آزاد ملک کی ایک کٹر حامی یہاں کیا کر رہی ہے؟ عروسہ کے چہرے پر ایک رسمی تاثر تھا گویا اسکرپٹ میں یہ ملاقات پہلے سے لکھی ہوئی ہو۔ اسے قدسی کی بات یاد آئی۔ عروسہ سے ذرا محتاط رہنا اور اس نے ہنستے ہوئے بات کا رخ پلٹ دیا تھا۔ بے فکر رہو میں womanizer نہیں ہوں۔"

"ہائے آپ یہاں پر!!! سب خیریت؟"

"جی! شرما صاحب سے ملنے آئی تھی کچھ ڈیٹا کے لیے۔" اس کی آواز میں لرزش تھی۔ عروسہ کو دیکھتے ہی قدسی اس کے ذہن میں دوڑنے لگی۔ اس وقت اسے قدسی کی خیر و عافیت جاننے کے علاوہ کچھ اور سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

"قدسی کا کچھ پتہ نہیں چل رہا ہے۔ تمہارا نمبر نہیں تھا دفتر میں فون کیا تو معلوم ہوا کہ تمہارا اور ان کا تعلق صرف ایک اسائنمنٹ تک تھا۔"

"احمد وہ جنگجوؤں کے ساتھ ایک فوجی کارروائی میں......"

عروسہ کے گوگل سے اسے یاد آیا کہ یہی وہ گوگل تھا جس میں وہ کتنی سندر لگ رہی تھی۔ اب بھی لگ رہی ہوگی؟؟؟ اتھنک لباس' سر پر سرخ دوپٹہ' جس سے تھوڑی قدامت پسند اور پھر وے فیر ریز کا رے بین جس سے تھوڑی فیشن پرست اور پھر اس امتزاج سے پیدا ہونے والی سادگی شائستگی اور نفاست۔ یہ خوش خرام میرے مقدر میں کیوں نہیں تھی؟

قدسی قطرہ بن کر پلکوں پر آ کر ٹھہر گئی۔

"احمد تم کو معلوم ہے زندگی کا حسن کیا ہے؟ ایک دن سب کو مرنا ہے۔"

☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

قرض

شاداب علی

''مسٹر شاھان! آپ کو کل اپائنٹمنٹ لیٹر مل جائے گا۔ آپ دو دن بعد ہماری کمپنی جوائن کر سکتے ہیں۔''

میری سماعتوں میں یہ الفاظ گونجے تو میں نے چونک کر مخاطب کی جانب دیکھا مجھے لگا میں نے غلط سنا ہے۔

''جی؟'' تھوڑا سا سن کر میں نے تصدیق چاہی۔

''جی آپ کی سلیکشن ہو چکی ہے۔''

دوبارہ سنا تو میں نے یقین کرلیا۔ یہ الفاظ اور یہ جملہ سننے کے لیے میرے کان برسوں سے ترس رہے تھے۔ میری آنکھوں میں ماں کی صورت آ گئی ان کی ہر امید آنکھیں، وہ خواب جو آنکھوں میں سجا کر رکھے تھے اور میں...... میں ......ایک ناکام اور ناکارہ سا انسان آج...... آج اس مقام پر تھا تو میری ماں میرے پاس نہ تھی...... میرے ساتھ نہ تھی میری آنکھیں بھیگنے لگیں اور میں ماضی کے دھندلکوں میں کھونے لگا۔

✱ ...... ✱ ...... ✱ ...... ✱

شاھان! بیٹا اٹھ جاؤ آج تمہارا انٹرویو ہے۔'' سلیمہ بیگم نے شاھان کو آواز دی۔

''کیا ہے اماں آپ کو ہر وقت یہی پریشانی رہتی ہے میری عمر کے سارے لڑکے کھیل کود میں لگے رہتے ہیں اور آپ کو پتہ نہیں کیا بیر ہے مجھ سے اور میری نیند سے۔ سونے دیں مجھے۔'' میں نے جھلا کر اماں پر غصہ اتارا اور دوبارہ چادر تان کر لیٹ گیا۔

''بیٹا بات کو سمجھ لیا کرو مجھے تم سے دشمنی نہیں ہے بوڑھا بیمار باپ کب تک گھر چلائے گا۔ تین تین جوان بہنوں کی ذمہ داری کیسے پوری ہوگی۔ تھوڑا سا خیال کرو بیٹا۔ تم چھوٹے بچے نہیں ہو۔'' اماں نے محبت سے سمجھانے کی کوشش کی۔

''اماں ابھی چلی جائیں اٹھ جاؤں گا خود ہی۔'' میں نے بدتمیزی سے کہا اوندھا ہو کر بستر پر تکیہ رکھ لیا گویا آگے سننے کا موڈ نہیں ہے۔ اماں چپ چاپ کمرے سے نکل گئیں اور میں دوبارہ نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

''میرے ابا جی ایک مل میں معمولی جاب کرتے تھے۔ مجھ سے بڑی ایک بہن اور دو چھوٹی بہنیں تھیں ہم لوگ نہایت تنگدستی سے دن گزار رہے تھے۔ میری بڑی بہن نے میٹرک کرلیا تھا دو سال سے گھر میں بیٹھ کر سلائی کر رہی تھی۔

اماں بھی بیمار رہتیں۔ غربت ہی سب سے بڑی بیماری تھی۔ اوپر سے تین جوان بیٹیوں کا بوجھ۔ میں نے میٹرک کرلیا تھا۔ میری خواہش اور ضد پر ابا نے بمشکل مجھے پرائیویٹ فرسٹ ایئر کرنے کی اجازت دی تھی اور خیر سے تین بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا ابا اور اماں بہت پیار کرتے' میرا سب سے زیادہ خیال رکھتے' میری ہر ضد پوری کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے، میں اور زیادہ خود سر ضدی ہو گیا تھا۔

پچھلے دو ماہ سے میری اماں کو ٹی بی جیسا موذی مرض ہو گیا تھا۔ کہتے ہیں اس مرض میں اچھی غذا ضروری ہے ہمیں تو دو وقت کی روٹی نصیب نہ ہوتی۔ مگر اماں میرے لیے میری فرمائشوں کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور چھپا کر رکھتیں۔ کبھی کبھی گھر میں فاقے ہو جاتے مگر میری ضروریات زندگی میں کوئی کمی نہ ہوتی۔ اماں کبھی کبھی مجھے کہتی کہ مجھے گھر کے لیے کچھ کرنا چاہیے مگر میرے کانوں پر جوں نہ رینگتی۔ ابا جی بے چارے دن رات محنت کرتے میری بڑی بہن سلائی اور چھوٹی بہن لفافے بنا کر گھر کے اخراجات میں ہاتھ بٹاتی اور میں...... میں نہ جانے کیوں اتنا بے حس ہو گیا تھا مجھے کچھ احساس ہی نہیں تھا مسلسل محنت سے ابا جی بھی بیمار رہنے لگے بلآخر اماں کی بیماری حد سے بڑھی تو انہیں سرکاری اسپتال میں داخل کروا دیا گیا۔

سارا گھر پریشان تھا سب سے زیادہ پریشانی مجھے تھی کیوں کہ اماں کی غیر موجودگی میں میرے لیے کہیں سے پیسوں کا انتظام نہیں ہو پاتا میری جھنجلاہٹ عروج پر ہوتی۔ خواہ مخواہ بہنوں پر غصہ نکالتا تھا اول فول بکتا اور بدتمیزیاں کرتا۔ آہ اس وقت مجھے وقت کی نزاکت کا احساس ہو جاتا پھر ماں کی حالت بگڑتی چلی گئی وہ خون تھوکتے تھوکتے نڈھال ہو جاتیں۔

ان کے نحیف چہرے پر کرب آ جاتا۔ اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں باہر نکل آتیں ان کی تکلیف پر سب ہی تڑپ جاتے۔ ابا جی زیادہ پریشان ہو جاتے تو رونے لگتے۔ بہنیں الگ روتیں اور اماں کی صحت کے لیے دعائیں مانگتیں۔ اس حالت میں بھی میری اماں میرے لیے دعائیں کرتیں۔ میری بہتری کے لیے روتی رہتیں۔ اس روز اماں کی طبیعت بہت زیادہ خراب تھی ہم سب اسپتال میں جمع تھے اماں باری باری سب کو دیکھ رہی تھیں۔

کھانستے کھانستے نڈھال ہوئی جا رہی تھیں۔ اس روز میں بھی حقیقت میں پریشان تھا۔ انہوں نے اشارے سے مجھے بلوایا میں قریب گیا مجھے سینے سے لگا کر اس وقت بھی میرے لیے ان کے لبوں پر صرف دعا ہی تھی......اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے میری آنکھوں کے سامنے میری اماں مجھے چھوڑ کر ہم سب کو چھوڑ کر چلی گئیں۔ میں آنکھیں پھاڑے اماں کے بے جان وجود اور ان کی پتھرائی ہوئی آنکھوں کو دیکھ رہا تھا۔

وہ آنکھیں جو میرے لیے میرے اچھے مستقبل کو دیکھنے کی حسرت میں مرنے کے بعد بھی کھلی رہیں۔ وہ ہاتھ جو میرے لیے دعا کرتے تھے وہ ہاتھ ہمیشہ کے لیے بے جان ہو چکے تھے۔ میں چیختا رہا چلاتا رہا مگر میری اماں کو میری چیخیں بھی واپس نہ لا سکیں۔ تب میرے اندر سوچ کا ایک نیا در کھلا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میں نے آج کتنی بڑی نعمت کھو دی ہے۔ میں نے اپنی اماں کو کھو دیا تھا۔ اب سوائے پچھتانے کے اور کچھ نہ تھا۔ میں تڑپ رہا تھا پچھتا رہا تھا بس ایک ہی راستہ ایک ہی بات میرے ذہن میں آئی اماں کی نصیحتوں کو مان لوں۔ ان کی چھوٹی چھوٹی نصیحتوں کو پورا کروں کہ اماں نہیں تھیں مگر مجھ کو اپنے سکون کا حل بھی تلاش کرنا تھا۔ اماں کی تدفین ہوئی اور میں نے اپنے لیے راہ راست کا انتخاب کیا۔

میں اب پہلے والا شاحان نہیں تھا۔ میں نے اپنے اندر بہت ساری تبدیلیاں پیدا کر لی تھیں۔ بہنوں کے ساتھ پیار محبت سے بات کرتا جو ملتا کھا لیتا۔ ضد اور ہٹ دھرمی بھول کر نماز کا پابند ہو گیا تھا اور ساتھ ہی نوکری کی تلاش شروع کر دی میں ابا جی کو آرام کروانا چاہتا تھا گھر کی ذمہ داریاں اٹھانا چاہتا تھا۔ اماں کی دعا سے مجھے آج فیکٹری میں اچھی نوکری مل گئی تھی۔

”بیٹا اذان ہو گئی ہے؟“ ابا جی کی آواز پر میں اپنے خیالات سے چونکا۔ ابا جی کی ڈیوٹی کا ٹائم بھی ہو رہا تھا۔

”ابا جی! آپ نوکری پر نہیں جائیں گے مجھے نوکری مل گئی ہے آپ گھر پر بہنوں کے پاس رہیے میں اپنی ذمہ داریاں نبھاؤں گا۔“ میں اپنی بات پوری کر کے نماز پڑھنے کے لیے گھر سے باہر آ گیا۔

آج نماز کے بعد اماں کی قبر پر جا کر خوش خبری بھی تو دینی تھی۔ یہ فیصلہ کر کے مجھے آج جو سچی خوشی ملی تھی شاید اس کا تصور کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ میں ماں کی محبتوں کا ان کی دعاؤں کا مقروض ہوں آپ لوگ میرے لیے دعا کیجئے میں وہ قرض اتارنے کے قابل ہو جاؤں۔ (آمین)

......☆☆......

دکھ کی فصیل

نفیسہ سعید

خبر تھی یا کوئی دھما کا جو صبح صبح جاگتے ہی مجھے امی کے ذریعے ملی۔

”سبین جل گئی ہے بیٹا دعا کرو اس بے چاری کا بڑا برا حال ہے۔“

پہلی بار تو مجھے ایسا لگا جیسے میرے کانوں نے سننے میں غلطی کی ہو۔

”کس کی بات کر رہی ہیں امی آپ میں سمجھی نہیں؟“

”ارے بیٹا تمہاری دوست سبین جو گلی کے آخری سرے والے گھر میں رہتی ہے۔“

”اوہ......سامنے۔“

اس کے ساتھ ہی سبین کا سراپا چھم کر کے میری آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ سر جھاڑ منہ پھاڑ حلیے میں ساری دنیا سے بے

نیاز اپنے آپ میں گم سبین۔

"یہ سب کس طرح ہوا؟" میں ابھی بھی بے یقینی کی کیفیت میں تھی۔

"اللہ بہتر جانے بیٹا ہم کچھ نہیں کہہ سکتے سنا ہے اس نے خودکشی کی ہے ویسے اس کی ماں کل رات سے اس کے گھر میں تھی اور یہ بھی سنا ہے کہ سب کچھ اس کی موجودگی میں ہوا۔ ظاہر ہے وہ بہتر جانتی ہے کہ اس کی بیٹی نے اگر خودکشی بھی کی ہے تو کیوں؟ وہ اسی فیصد جل چکی ہے اور میرا نہیں خیال کہ بچ پائے گی۔"

"چلیں میں زونیر کو اسکول سے لے کر آتی ہوں۔"

"اچھا بیٹا اللہ حافظ۔"

اور پھر امی کے فون رکھتے ہی میں وہیں قریب موجود کرسی پر بیٹھ گئی۔ سبین کا تصور میرے دل کو رلا رہا تھا۔ جس کے ساتھ میں ماضی میں پہنچ گئی وہ ماضی جہاں بے فکری کا دور دورہ تھا۔ اور ایسے میں سبین جسے سب باولی سمجھتے تھے بکھرے بال اور پھٹا ڈوپٹہ سارا دن گلی میں پھرتی حیرت کی بات نہ تھی کہ اس کی زیادہ تر دوستی لڑکوں سے تھی لڑکیوں میں تو میں واحد اس کی دوست تھی ورنہ لڑکیاں اسے بالکل پسند نہ تھی پرانی باتیں یاد کر کے میرے لب خود بخود مسکرا دیے اور دل ودماغ ماضی کی یادوں میں گم ہو گیا۔

……

حسب روایت اماں صبح سے غائب تھی وہ کہاں جاتی تھی سبین کو قطعی علم نہ تھا۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ جب وہ گھر واپس آتی تو خوب لدی پھری ہوتیں جن میں زیادہ تر کھانے پینے کا سامان ہوتا۔ سبین کی ماں سنبل سبین کا بالکل الٹ تھی جہاں سبین معمولی شکل وصورت کی کالی سی لڑکی تھی جس کا رہن سہن بالکل لڑکوں جیسا تھا وہاں اس کی ماں ایک بے حد خوب صورت عورت تھی کبھی کبھی اسے لگتا کہ جیسے سبین اس کی سگی بیٹی نہ ہو جتنا وہ خود اپنا خیال رکھتی تھی اس میں سے ایک فیصد بھی اسے اپنی بیٹی کا احساس نہ تھا وہ ایسے تھا جیسے گھر میں کوئی ملازمہ آیا ہو جسے سنبل نے اپنے بچوں کی دیکھ بھال کے لیے رکھ چھوڑا تھا۔

سنبل کی کیا مصروفیات تھیں یہ تو کسی کو علم نہ تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ محلے میں زیادہ تر لوگ اسے پسند نہ کرتے تھے اس کا شوہر تلاش معاش کے سلسلے میں بیرون ملک رہتا جہاں سے وہ سال میں ایک بار کچھ دنوں کے لیے ضرور آتا اور میں نے جب پہلی بار سبین کے ابا کو دیکھا تو مجھے احساس ہوا کہ وہ بالکل اپنے باپ جیسی ہے سبین کے ابو بھی قدرے کالے اور بھدے نقوش والے تھے جن کا کوئی میل سنبل جیسی خوب صورت عورت سے نہ تھا لیکن وجہ شاید ان کی کمائی تھی جسے مدنظر رکھتے ہوئے ایک حسین عورت اس کا مقدر بن گئی لیکن جو بھی تھا سچ یہ تھا کہ سنبل اپنے شوہر کا بے حد خیال رکھنے والی عورت تھی یہ ہی وجہ تھی انکل جتنے دن پاکستان میں رہتے آنٹی سنبل گھر سے باہر نہ نکلتیں ہر دم بجی سنوری اپنے میاں کے ساتھ ہی دکھائی دیتیں اور ان چند دنوں میں سبین کی قسمت بھی بدل جاتی کیونکہ انکل رحمان کو اپنی اکلوتی بیٹی سے بہت محبت تھی جس کے باعث وہ اس کا بے حد خیال رکھتے۔ لیکن ان کے واپس جاتے ہی وہ پھر سے پرانی والی سبین بن جاتی جو سارا دن ماسیوں والے حلیے میں اپنے چھوٹے بھائیوں کو سنبھالتی اور ذرا نہ تھکی تھی۔

……

"آ جاؤ تمہیں سائیکل کا ایک چکر دوں؟" دلاور کی نظر جیسے ہی دروازے پر کھڑی سبین پر پڑی وہ بھاگ کر اس کے قریب آ گیا اور سبین خوشی خوشی اس کی سائیکل پر بیٹھی ہی تھی کہ جانے کہاں سے کسی دیو کی مانند بھائی سلیم آن وارد ہوئے۔

"کیا کر رہی ہو تم اس کے ساتھ میں نے منع کیا تھا نہ کہ باہر مت نکلنا ورنہ کھال اتار دوں گا۔"

ان کی خوف ناک دھاڑ سے دلاور بھاگ گیا جب کہ تھر تھر کانپتی سبین گھر کے اندر واپس بھاگی بھائی سلیم اس کے پیچھے ہی اندر آ گیا۔

"کہاں ہے چاچی اس سے پوچھوں بھلا ایک لڑکی نہیں سنبھالی جاتی۔"

سلیم اس کے سگے تایا کا بیٹا تھا سخت مزاجی کے باعث سبین اس سے بہت ڈرتی تھی۔

”اماں گھر پر نہیں ہے۔“ اس کے حلق سے منمناتی ہوئی آواز نکلی ظاہر ہے ماں کو سارا دن گھومنے سے فرصت ملے تو بیٹی پر دھیان دے اس کے جیسی ماں کو کیا پتہ اولاد کا۔“

اسے گھورتا ہوا سلیم گھر سے باہر نکل گیا اس کے باہر نکلتے ہی سبین بھاگ کر دروازے پر آ گئی اور اس کی اوٹ سے اس وقت تک اسے دیکھتی رہی جب تک وہ گلی عبور نہ کر گیا جیسے ہی وہ نظروں سے اوجھل ہوا ننگے پاؤں سرپٹ دوڑتی وہ سامنے میدان میں جا پہنچی جہاں دلاور سائیکل چلا رہا تھا اسے دیکھتے ہی وہ سب کچھ چھوڑ کر اس کی جانب آ گیا۔

”چلا گیا تمہارا خون خوار بھائی سلیم؟“

”ہاں دفع کرو اسے جب اماں مجھے منع نہیں کرتی تو جانے اسے کیا تکلیف ہے ہر وقت مجھ پر نظر رکھتا ہے۔“

برا سا منہ بناتی وہ دلاور کی سائیکل پر بیٹھ گئی جو اسے گراؤنڈ میں گول گول چکر دے رہا تھا۔

سلیم باہر روڈ پر کھڑا تھا جب اس کی نگاہ سنبل پر پڑی جو خوب تیار ہو کر کسی سفید گاڑی سے باہر نکلی تھی اسے دیکھتے ہی سلیم کا حلق اندر تک کڑوا ہو گیا جانے چاچا رحمان پر اس عورت نے کیا جادو کیا تھا جو انہیں کچھ سمجھ ہی نہ آتا تھا کہ ان کی بیوی ان کی غیر موجودگی میں کیا گل کھلا رہی ہے حالانکہ کئی بار سلیم نے اس کو یہ سب بتانے کی کوشش کی تھی مگر ہمیشہ ناکام رہا کیونکہ اپنی بیوی کے خلاف وہ ایک لفظ سننے کو تیار نہ تھا وہ ان ہی سوچ میں گم اپنی جگہ کھڑا دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا جب مسکراتی ہوئی سنبل اس کے قریب آن کھڑی ہوئی۔

”کیا بات ہے مجھے دیکھتے ہی تمہاری شکل کیوں بگڑ گئی ہے؟“ وہ سلیم کی اندرونی حالت سے اچھی طرح واقف ہونے کے باعث خوب مزہ لیتی ہوئی پوچھ رہی تھی۔

”اب اپنے چاچا کو فون کر کے بتا دینا کہ چاچی کسی غیر مرد کے ساتھ گاڑی میں آئی ہے۔“

جانتی تھی کہ سلیم اس کے متعلق ساری اطلاعات بحرین رحمان تک پہنچاتا ہے اس لیے جتاتی ہوئی بولی۔

”اس لیے میں پہلے ہی بتا دوں یہ میری گاؤں والی خالہ فہمیدہ کا بڑا بیٹا شہباز تھا جسے رحمان اچھی طرح جانتے ہیں اس لیے بلاوجہ کال کے پیسے ضائع مت کرنا۔“

اپنے دل کی ساری بات کہہ کر بنا اس کا جواب سنے وہ آہستہ آہستہ چلتی سلیم کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ سنبل روز کسی نہ کسی نوجوان لڑکے کے ساتھ نظر آتی اور ہر لڑکا اس کا دور پار کا رشتہ دار ہوتا جن سے فیملی میں کوئی واقف نہ تھا سوائے سنبل کے۔ یہ ہی وجہ تھی جو وہ اپنی جوان ہوتی بیٹی سے بالکل بے خبر تھی کیونکہ اپنے تئیں ابھی وہ خود کو اتنا جوان سمجھتی کہ پندرہ سالہ سبین اس کے نزدیک بچی کی مانند تھی جس کے بڑے ہونے کا اسے کبھی احساس ہی نہ ہوا۔

* * *

دو دن سے سبین اسکول نہ آئی تھی یہ ہی وجہ تھی جو میں شام ہوتے ہی اس کی خیریت پوچھنے گھر چلی گئی دیکھا تو وہ صحن میں بیٹھی رو رہی تھی اسے اس طرح ہچکیوں میں روتا دیکھ کر میں تیزی سے اس کی جانب بڑھی اور کندھے پر ہاتھ رکھ کر جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔

”کیا بات ہے سبین کیوں اس طرح رو رہی ہو۔“

”بھائی سلیم نے مارا ہے۔“

بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اس نے روانی کے ساتھ بتاتے ہوئے اپنا چہرہ میرے سامنے کر دیا اس کی گالوں پر چھپے انگلیوں کے نشان بائی سلیم کی سفاکی بیان کر رہے تھے۔

”کیوں؟“ مجھے حیرت ہوئی کس بری طرح انہوں نے ایک جوان لڑکی پر ہاتھ اٹھایا تھا جب کہ ہمارے گھروں میں ایسا قطعی نہ ہوتا۔

”باتھ روم کا نلکا ٹوٹ گیا تھا دلاور بے چارا اسے ٹھیک کر رہا تھا کہ بھا آ گیا اور بنا پوچھے پہلے اسے مارا اور پھر مجھے۔“

''اوہ۔'' میں ساری بات سمجھ گئی۔

''جب تم گھر پر اکیلی تھی تو کیا ضرورت تھی دلاور کو بلانے کی؟''

''تو کیا ساری ٹینکی کا پانی بہہ جانے دیتی تاکہ گھر واپس آ کر اماں مجھے جوتیاں مارتیں۔''

معصومیت سے کیے جانے والے اس کے اس سوال پر میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

''اس لیے میں جس مقصد کے لیے آئی تھی وہ ہی پوچھ لیا۔

''تم دونوں سے اسکول کیوں نہیں آ رہی؟''

''طبیعت خراب تھی۔'' اس نے چھینکتے ہوئے مجھے جواب دیا تو پتہ چلا کہ اس کا گلا بھی خراب تھا جب کہ میں سمجھ رہی تھی کہ رونے کی وجہ سے اس کی آواز بھر آئی ہوئی تھی۔

''طبیعت خراب تھی تو آرام کر جھاڑو آنٹی خود کر لیں گی۔'' اسے ہاتھ میں جھاڑو لے کر کھڑا ہوتا دیکھ کر میں نے روکنا چاہا۔

''وہ تو شام میں آئیں گی مندرآباد خوشی میں گئی ہیں۔''

آہستہ سے کہتی وہ جلدی جلدی صفائی کرنے لگی اور میں سمجھ گئی کہ اسے کھیلنے باہر جانا ہے اور جلد ہی میرا اندازہ درست ہو گیا جب وہ بولی۔

''ابھی دلاور آئے گا میں نے اس کی سائیکل چلانی ہے۔''

کچھ دیر قبل والی ماروہ بالکل بھول گئی تھی اور ایک بار پھر سے پرانی والی سبین بن گئی تھی ساری دنیا سے بے نیاز صرف اپنی فکر کرنے والی۔

''چلو میں گھر جا رہی ہوں تمہیں کسی مضمون کا کام چاہیے ہو تو مجھ سے لے لینا۔''

فراخ دلی سے آفر کر کے میں گھر واپس آ گئی حالانکہ جانتی تھی کہ اسے کبھی بھی اسکول کا کام مکمل کرنے میں کوئی دل چسپی نہ ہوتی تھی جس کی وجہ سے ہمیشہ اسکول میں بھی سزا ملتی۔

……

سجاد احمد قریشی نامی وہ بندہ جانے کون تھا مگر آج کل اس کا سبین کے گھر بہت آنا جانا تھا جس کے باعث وہ محلے بھر کا موضوع گفتگو بنا ہوا تھا۔ کالا اور بھدا ایسا سجاد قریشی جس کی توند اتنی آگے نکلی ہوتی کہ جب وہ چلتا قد دیکھ کر ہنسی آ جاتی اس پر اس کا قد کاٹھ جو چھ فٹ سے بھی زیادہ تھا۔ ایسے لگتا جیسے وہ کوئی دیو ہو بالکل کالا دیو جو ہنستا تو سفید سفید دانت اس کے چہرے پر عجیب سی بہار دکھا رہے ہوتے۔

ان سب باتوں سے قطع نظر وہ ایک مال دار آسامی تھا۔ لفظ آسامی اس کے لیے اکثر وہ خواتین استعمال کرتیں جو کبھی کبھار شام میں اماں کے پاس آ کر محفل جمایا کرتیں اور ایسے میں سجاد کا ذکر لازمی ہوتا جو روزانہ نت نئی گاڑیوں میں سبین کے گھر صبح آتا اور جب شام میں نکلتا تو بھی سنوری سنبل اس کے ساتھ ہوتی جس کی واپسی اکثر ہی رات گئے ہوتی۔ سننے میں آیا تھا وہ انکل رحمان کا بہت پرانا دوست تھا جو بحرین سے انکل دیے ہوئے کچھ تحائف پہنچانے سبین کے گھر آیا تھا۔

اور اس کی یہ آمد سنبل سے ہونے والی دوستی کی وجہ بن گئی اور پھر ان دونوں کی دوستی کا یہ قصہ اس تیزی سے پھیلا کہ ان دن سلیم نے گھر میں گھس کر اپنی سگی چچی پر ہاتھ اٹھایا اور اندر موجود سجاد قریشی کو بھی مار بھگایا اور جیسے ہی یہ خبر انکل رحمان تک پہنچی وہ فوراً سے پیشتر پاکستان پہنچ گئے اس سارے معاملے میں سبین کی گواہی طلب کی گئی جو ماں کے خوف سے ایک لفظ اس کے خلاف نہ بول سکی اور وہ جو کہتے ہیں نہ کہ عورت کے آنسوؤں میں بہت طاقت ہوتی ہے تو وہ سچ ہے آنٹی نے رو دھو کر انکل کو یہ یقین دلایا کہ سلیم ایک اوباش نوجوان ہے جو اپنی سگی چچی پر غلط نظر رکھتا ہے اور اس الزام کے نتیجہ میں دونوں بھائیوں کے گھر ایک دوسرے کے لیے میدان جنگ بن گئے جس میں سارا فائدہ سنبل کو ہوا کیونکہ واپس بحرین جاتے ہوئے انکل اپنے بڑے بھائی کو سختی سے منع کر گئے تھے کہ ان کا بیٹا سلیم کبھی بھی اپنے چچا کے گھر نہیں جائے گا خاص کر اس

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

وقت جب سنبل اور سبین تنہا ہو اور اس پابندی کا فائدہ جہاں سنبل کو ہوا وہاں سبین کے بھی مزے ہو گئے۔
ابھی وہ بھائی سلیم کے خوف سے آزاد سارا دن گلیوں میں گھوما کرتی جس کی پرواہ اس کی ماں کو نہ پہلے تھی اور نہ اب۔

''ایک بات بتاؤ سبین۔''

آج وہ کئی دنوں بعد پھر سے ملی تھی اور میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ سجاد قریشی کی اپنے گھر آمد کو لے کر وہ خاصی ڈسٹرب ہے وجہ شاید عمر کے ساتھ اس میں بیداری والا شعور تھا۔

''جب تمہیں سجاد قریشی اس قدر نا پسند تھا تو تم نے کیوں انکل رحمان کو وہ سب نہیں بتایا جو مجھے بتا رہی ہو۔''

''سچ بتاؤں'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

''ظاہر ہے سچ ہی بتاؤ گی تو مجھے ہر بات پتہ چلے گی۔''

''اماں نے کہا تھا کہ میرے چھوٹے سے جھوٹ کے نتیجہ میں میری اور ان کی جان بھائی سلیم چھوٹ جائے گی اور بس اپنے ذرا سے فائدے کے لیے میں نے ابا کو وہ سب کہہ دیا جو میری ماں نے چاہا۔'' بات کے اختتام میں وہ خاصی شرمندہ تھی۔

''پھر اب کیا کرو گی؟ اب تو تمہاری بات پر کوئی یقین نہیں کرے گا اور نہ ہی بھائی سلیم نے تمہارے کسی کام آنا ہے۔''

اس نے جب سے مجھے بتایا تھا کہ وہ سجاد قریشی کی الٹی سیدھی حرکتوں سے پریشان ہو رہی ہے مجھے بھی اس کی فکر لاحق ہو گئی تھی مگر سمجھ نہ آ رہا تھا کہ اس مسئلہ کا کیا حل نکالا جائے۔

''پتہ نہیں۔''

بے چینی سے انگلیاں مروڑتی وہ مجھے دیکھ رہی تھی اور بس پھر اس کا اسکول میں آخری دن تھا پھر وہ کبھی اسکول نہ آئی یہاں تک کہ اس نے نویں کلاس کے بورڈ کے پرچے بھی نہ دیئے اور میں جب بھی گھر اس سے ملنے گئی آنٹی نے دروازے سے ہی یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ سبین گھر پر نہیں ہے وہ کہاں تھی؟ یہ چاہتے ہوئے بھی میں نے ان سے کبھی نہ پوچھا اور نہ ہی اب سبین گلیوں میں کھیلتی نظر آتی وہ کئی عرصے سے دلاور سے بھی نہ ملی تھی۔ جسے لے کر وہ بھی خاصا پریشان تھا اور پھر کچھ عرصے بعد جب میرا آخری پریکٹیکل تھا اور میں اسکول سے گھر واپس آ رہی تھی راستہ میں ایک ایسی خبر میری منتظر تھی جس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا اس دن کافی عرصہ بعد میں نے سبین کو دیکھا جو پہلے سے خاصی کمزور ہو گئی تھی وہ آنٹی سنبل کے ساتھ کہیں سے آ رہی تھی اور باوجود آنٹی کے نہ چاہنے کہ میں اس کے پاس جا پہنچی۔

''تم نے اسکول کیوں چھوڑ دیا۔''

آنٹی کو بالکل نظر انداز کر کے میں نے تیزی سے سوال کیا۔

''اس کی شادی ہو رہی ہے اب اس نے اسکول آ کر کیا کرنا ہے۔'' سبین کے بولنے سے قبل ہی آنٹی نے جلدی سے جواب دیا اور میں ایک دم چونک گئی کہ سبین کی شکل دیکھی وہ خاموشی سے گردن جھکائے کھڑی تھی جب کہ اس کا ہلکا ہلکا لرزتا وجود بتا رہا تھا کہ وہ رو رہی ہے۔

''سبین کی شادی؟'' میں نے حیرت سے دہرایا۔

''کس سے ہو رہی ہے تمہاری شادی؟'' سبین کا ہاتھ تھامتے میں نے اسے اپنی جانب متوجہ کرنا چاہا۔

''اس کا ابا آ جائے بحرین سے پھر تمہارے گھر کارڈ پہنچ جائے گا۔ پڑھ کر دیکھ لینا کس سے ہو رہی ہے۔'' سبین کا ہاتھ تھامے وہ تیزی سے آگے بڑھ گئیں اور میں اپنی جگہ ہکا بکا کھڑی رہ گئی۔

……

انکل رحمان جب سے پاکستان واپس آئے خاصے پریشان تھے اور اتنے سالوں میں پہلی بار محلے والوں نے ان کے گھر سے لڑائی اور شور شرابے کی آوازیں سنیں جب کہ آج سے پہلے کسی نے انکل کی زوردار آواز نہ سنی تھی اور پھر یک دم سارے گھر پر خاموشی چھا گئی پتہ چلا آنٹی دونوں بیٹوں کے ساتھ گھر چھوڑ گئی ہیں۔ کچھ دن تو انکل اور سبین نے اکیلے

گزار لیے مگر جیسے ہی ان کی واپسی کا وقت قریب آنے لگا انکل پریشان ہو اٹھے کیونکہ ان حالات میں تنہا سبین کو چھوڑ کر جانا ممکن نہ تھا لہٰذا بحالت مجبوری وہ آنٹی کو منا کے لے آئے اور ان کی اس مجبوری نے سبین کی زندگی بھی تاریک کردی۔ آنٹی کے گھر واپس آتے ہی محلے والوں نے ایک ایسی دھماکہ خیز خبر سنی جس نے سب کے وجود کو دھماکے سے اڑا دیا۔

* * *

میرا میٹرک کا آخری پرچہ تھا۔ جسے دے کر میں گھر واپس آئی تو سامنے ٹپائی پر رکھے شادی کارڈ نے میری توجہ اپنی جانب مبذول کروالی۔

"امی یہ شادی کارڈ کہاں سے آیا؟"

امتحانات سے فراغت کے ساتھ ساتھ شادی میں شرکت کا تصور مجھے خوش کرگیا اور اسی خوشی میں سرشار جیسے ہی میں نے آگے بڑھ کر کارڈ کھولا اس پر لکھا نام دیکھ کر چونک گئی۔

"سبین کی شادی کا کارڈ ہے۔" میری حالت سے بے خبر چاول چنتی امی نے جواب دیا۔

"آپ نے یہ پڑھا اس کی شادی کس سے ہو رہی ہے؟"

"ہاں۔"

وہ خاموشی سے اپنے کام میں مصروف رہیں۔

"امی سبین کی شادی اس دیو سے ہو رہی ہے۔ جس سے وہ سخت نفرت کرتی تھی۔"

"دیکھو بیٹا یہ ان کے گھر کا معاملہ ہے۔ جس میں بولنے کا ہمیں کوئی حق نہیں اگر وہ شخص سبین کو ناپسند تھا تو اس کے والد کو یہ رشتہ نہیں کرنا چاہئے بصورت دیگر اب جو ہوگیا وہ اس کا نصیب ہے قبول کرنے میں ہی اس کی بہتری ہے۔"

امی نے ہر بات کی وضاحت کردی مگر وہ دکھی تھیں اس کا اندازہ مجھے ہوچکا تھا اور پھر کچھ دن بعد ہی سبین کا نکاح کردیا گیا جب کہ رخصتی دو سال بعد تھی مجھے حیرت ہوئی اگر ابھی رخصتی نہیں کرنی تھی تو اس کا اسکول چھڑوا کر گھر بٹھانے کا فائدہ مگر ظاہر ہے دیگر تمام باتوں کی طرح یہ بھی ان کے گھر کا ذاتی مسئلہ تھا جس پر ہم تبصرہ ضرور کرسکتے تھے مگر اسے حل کرنا ہمارے بس میں نہ تھا۔

دوسری طرف قسمت کی کرنی ایسی ہوئی کہ میٹرک کا رزلٹ آتے ہی میری شادی ولید سے کردی گئی ولید میری سگی پھوپھو کا بیٹا تھا اور چونکہ پھوپھو کافی بیمار تھیں لہٰذا وہ چاہتی تھیں کہ اپنی زندگی میں اکلوتے بیٹے کے سر پر سجا سہرا دیکھ لیں جس کے لیے مجھے قربان ہونا پڑا نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر میں پھوپھو کے گھر آن آباد ہوئی اور سبین کے ساتھ بہت کچھ اسی محلے میں چھوڑ آئی مگر ایک دن اچانک میری اس سے ملاقات ہوگئی۔

عذیر کی پیدائش سے تین ماہ قبل کی بات ہے جب میری طبیعت اچانک کافی خراب ہوگئی اور ایمرجنسی میں مجھے اپنی لیڈی ڈاکٹر کے پاس جانا پڑا جہاں پہلے سے ہی سبین اور آنٹی موجود تھیں یہ ایک گائنی کلینک تھا یہی وجہ تھی جو ان دونوں کو یہاں دیکھ کر میں تھوڑا حیران ضرور ہوئی مجھے سب سے زیادہ حیرت اس بات پر تھی کہ چیک اپ آنٹی کا تھا چونکہ ان کا نمبر مجھ سے پہلے تھا لہٰذا جیسے ہی وہ کلینک کے اندر گئیں سبین میرے پاس آن بیٹھی میں نے دیکھا وہ کافی بدل گئی تھی۔ صاف ستھرا لباس اور قرینہ سے جمے بال ہونٹوں پر لگی ہلکی سی لپ اسٹک۔

"ایک بات بتاؤ سبین تمہیں تو سجاد ہاشمی سخت ناپسند تھا پھر کیوں اس دیو سے شادی کرنے پر آمادہ ہوئیں؟" اتنی مشکل سے ملنے والا موقع میں کھونا نہیں چاہتی تھی اس لیے جلدی سے پوچھ بیٹھی۔

"اس لیے کہ وہ میری ماں کو بہت پسند تھا اور چونکہ اس مسئلے پر بھائی سلیم بہت واویلا ڈال چکا تھا اس لیے امی نے سوچا کیوں نہ اس رشتہ کو ایسا شرعی بنایا جائے کہ دوبارہ کوئی سجاد کے اس گھر آنے جانے پر اعتراض نہ کرے اور یہ اس صورت ہی میں ممکن تھا جب مجھے اس کی زوجیت میں دے دیا جاتا اور دیکھ لو میری ماں کی یہ چال کامیاب ہوگئی اب وہ گینڈا کھلے عام ہمارے گھر آتا ہے اور کسی میں بولنے کی ہمت نہیں کون ہے بھلا جو یہ کہہ سکے کہ ساس کا بیٹے سمان داماد سے چکر چل رہا ہے

اب بھی سب کچھ ویسا ہی ہے وہ ہی گاڑیاں اور گھومنا پھرنا مگر بڑے دھڑلے کے ساتھ کہ جی داماد کے ساتھ جا رہی ہوں۔“

بات ختم کرتے ہی وہ زور سے ہنسی دی اور میں منہ کھولے ہکا بکا اسے تکنے لگی۔

”ایسے کیوں دیکھ رہی ہو میں جھوٹ نہیں بول رہی۔ جو سچ ہے وہ بتا دیا ویسے اچھا ہی ہے اماں اسی طرح اس سے چکر چلائیں رکھیں کم از کم میں تو بچی رہوں گی کیونکہ اپنے ہوتے ہوئے وہ کبھی مجھے سجاد کے گھر نہ بھیجیں گی۔ اگرچہ پہلے میں یہ سب کچھ نہ سمجھتی تھی مگر اب چونکہ شادی شدہ ہو چکی تھی اس لیے سبین کی ہر بات سمجھ کر حیران ہی رہ گئی کہ کیا کوئی ماں اس قدر بھی گر سکتی ہے جتنا آنٹی سنبل گر چکی تھیں۔

* * *

عذیر دو سال کا تھا جب سبین کی رخصتی کی خبر مجھے ملی یہ بھی سننے میں آیا کہ اس کے والد شاید اپنی نوکری چھوڑ کر پاکستان واپس آنے والے ہیں مگر ایسا نہ ہوا البتہ سبین بیاہ کر اپنے گھر چلی گئی میں جو نت نئی گاڑیوں کے حوالے سے سجاد قریشی کو کوئی بہت بڑا آدمی سمجھ رہی تھی یہ سن کر حیران رہ گئی کہ سبین رخصت ہو کر ایک فلیٹ میں گئی ہے جب کہ میرے حساب سے تو اسے کسی بنگلے کی مالکن ہونا چاہیے تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی پتہ چلا کہ سجاد گاڑیوں کا کاروبار کرتا ہے پرانی گاڑی خرید کر اسے بیچنا اور جو گاڑی وہ لیتا اسے کچھ دن اپنے زیر استعمال رکھتا یہ ہی سبب تھا جو وہ تمام محلے کو نت نئی گاڑیوں میں آ کر اپنا بھرم جھاڑتا جو بھی تھا آنٹی اور اس کے درمیان پرانا کھیل ابھی بھی کھیلا جا رہا تھا فرق صرف اتنا آیا تھا کہ اب وہ اس محلے میں نہ آتا بلکہ آنٹی روز ہی سبین کے گھر پہنچ جایا کرتیں جس کا ذکر وہ اکثر وہ مجھ سے کرتی میں شاید آپ کو بتانا بھول گئی کہ آخری بار جب سبین مجھ سے ملی تھی تو جاتے سے چپکے سے اپنا فون نمبر مجھے تھما گئی تھی اور اب اسی نمبر سے وہ اکثر میسج کے ذریعے مجھ سے رابطہ کر لیتی۔ اس کے کبھی کبھار آنے والے میسج پڑھ کر میں جان چکی تھی کہ وہ اپنی زندگی میں خوش نہیں ہے۔

* * *

”تمہیں پتہ ہے سبین اپنے گھر واپس آ گئی ہے۔“

وہ مجھ سے دو ماہ سے میرے رابطہ میں نہ تھی اس کا موبائل بھی بند تھا یہ بھی وجہ تھی جو اس کے گھر واپس آنے کا مجھے کوئی علم نہ تھا۔

”کیوں امی خیریت۔“

”خیریت کیا ہوگی میاں تو سارا دن ساس کو لے کر گھومتا رہتا تھا کبھی وہ آ گیا کبھی یہ چلی گئی ایسے میں بتاؤ بھلا بیوی کیا بساتا۔“

”مطلب جو بات سبین کر رہی تھی وہ اہل محلہ جان چکے تھے جس کا ثبوت امی کی حالیہ گفتگو تھی ورنہ وہ بنا جانے بوجھے اپنی بات کبھی نہ کرتیں۔

”پھر تو اس کے ناراض ہو کر اپنے گھر آنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں۔“ میں نے امی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”گھر میں تو وہ بھی عورت موجود ہے جس کا وجود اس کے گھر کی بربادی کا سبب بن رہا ہے۔“

”بس بیٹا بڑا ہی برا زمانہ آ گیا ہے اپنے کرتوتوں پر پردہ ڈالنے کے لیے سگی ماں نے اسے دلاور کے ساتھ بدنام کر دیا کہ یہ دلاور سے ملنے میرے گھر آتی ہے اور یہ کہ دلاور کی محبت اسے اپنا گھر بسانے نہیں دے رہی توبہ استغفار اس زمانہ میں تو سچ پہچاننا بھی ایک مشکل کام ہو گیا ہے۔“

”اوہ...... اتنی گھٹیا حرکت اس کی سگی ماں نے کی۔“ مجھے تو یقین ہی نہ آیا ایسا لگا جیسے زمین پیروں کے نیچے سے سرک گئی ہو۔

ہاں بھئی اور پھر دو دن قبل تو جانے ایسا کیا ہوا رات سلیم ان کے گھر آیا پورے دو سال بعد سنا ہے چچی نے فون کر کے بلوایا تھا اتنا کہہ کر امی سانس لینے کے لیے رکیں۔

”پھر......“

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

میں جلد از جلد سب جاننا چاہتی تھی اس لیے امی کا سانس لینا بھی مجھے کھٹک رہا تھا۔

”پھر یہ کہ اس نے بیچاری ثمین کو بہت مارا۔“

”بھائی سلیم نے مارا۔“ مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔

”ہاں بیٹا آج کل اس کی اپنی چچی سے کافی دوستی ہے۔“ امی نے ایک آہ بھری۔

”اوہ......“ جیسے میں ہر بات سمجھ گئی۔

سنا ہے ساتھ والے پڑوسیوں نے جا کر چھڑوایا بچی کا بازو ٹوٹ گیا ہے جب سنبل پلاسٹر کروا کر لا رہی تھی تب خدیجہ نے دیکھا۔ خدیجہ آنٹی ان کے گھر کے قریب ہی رہتی تھیں اور امی کی ایک اچھی دوست تھیں۔

”جانے آنٹی سنبل کس ٹائپ کی عورت ہیں۔“

دراصل ہمارے مذہب میں مرد کو تین ماہ سے زیادہ گھر سے دوری کی اجازت نہیں وجہ شاید یہ ہی تھی کہ عورت بے راہ رو نہ ہو جائے ایسے میں جو لوگ پیسہ کمانے گھروں سے نکل جاتے ہیں اور دو دو سال تک مڑ کر نہیں آتے ان کی بیویاں یوں ہی برباد ہوا کرتی ہیں۔ امی کا کہنا کافی حد تک درست تھا مگر ہر عورت سنبل آنٹی نہیں ہوتی جسے اپنے میاں کی مزدوری سے زیادہ اپنی عیاشی کی فکر ہو جو بھی تھا اس ساری چکی میں ثمین گیہوں کے آٹے کی طرح پس رہی تھی جس کا مجھے بے حد افسوس تھا اس کے بعد میں واپس اپنے گھر آ گئی جس کے دو ماہ بعد ثمین بھی سجاد کے ساتھ چلی گئی۔

انکل رحمان شاید ہمیشہ کے لیے واپس آ گئے تھے اور ان کی کوششوں سے ہی ثمین اپنا گھر بسانے پر آمادہ ہوئی میرے لیے یہ کوئی اتنی اچھی خبر نہ تھی مگر پھر بھی میں نے دل سے اس کے بسنے کی دعا کی جو کامیاب نہ ہوئی اور نتیجے کے طور پر آج اس کے جلنے کی خبر سن کر میرا دل دہل گیا۔

............*......*

شام میں جب میں امی کے گھر پہنچی تو ایک افسوسناک خبر میری منتظر تھی۔ ثمین مر گئی تھی۔ وہ ثمین جو اپنی دنیا میں مگن رہتی تھی دنیا چھوڑ کر خاموشی سے چلی گئی۔

”وہ اپنے گھر واپس جانا نہ چاہتی تھی ماں نے زبردستی بھیجا نتیجہ میں اس نے خودکشی کر لی۔“

امی کی طرح دیگر لوگوں کی بھی یہ ہی رائے تھی مگر میں شاید وہ واحد ہستی تھی جو جانتی تھی کہ ثمین نے خودکشی نہیں کی اس رات آنٹی نہ صرف اس کے گھر بلکہ اس کے کمرے میں تھیں جب کہ وہ غریب باہر لاؤنج میں اپنے دونوں بھائیوں کے ساتھ بیٹھی ڈرامہ دیکھ رہی تھی اور ساتھ ہی مجھ سے میسج پر بات بھی کر رہی تھی جس میں اپنی ماں اور سجاد کے متعلق بہت کچھ تھا ایسا سب کچھ جو پڑھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور اس دن بھی ثمین نے مجھ پر ایک ایسا انکشاف کیا جو شاید کوئی نہ جانتا تھا۔

”میں سنبل کی سگی بیٹی نہیں ہوں۔“

”تم سے یہ کس نے کہا۔“

مجھے لگا شاید مسلسل صدمات سے اس کا دماغ ماؤف ہو گیا ہے۔

”سنبل خود ابھی وہ یہ بات سجاد کو بتا رہی تھی جو میں نے اپنے کانوں سے سنی۔ میری ماں گاؤں میں رہتی ہے اور جانتی ہو اس عورت کی محبت میں میرے باپ نے میری بے گناہ ماں کو چھوڑ دیا اور شاید اسی کی کسی بددعا نے میری زندگی برباد کر دی۔“

”اس کی بددعائیں تمہیں کیوں لگیں گی تم تو اس کی سگی اولاد ہو۔“

”میں اب یہ گھر چھوڑ کر بھاگ جاؤں گی۔“ میری بات پر توجہ دیئے بنا اس کا نیا میسج آ گیا اور اس کے نئے میسج نے مجھے چونکا دیا۔

”دماغ خراب ہے تمہارا بھاگ کر کہاں جاؤ گی۔“

پاک سوسائٹی پر مُوجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد
نمرہ احمد
فرحت اشتیاق
قُدسیہ بانو
نگہت سیما
نگہت عبدُاللہ
رضیہ بٹ
رفعت سراج

صائمہ اکرام
سعدیہ عابد
عفت سحر طاہر
تنزیلہ ریاض
فائزہ افتخار
سباس گُل
رُخسانہ نگار عدنان
اُمِ مریم

عُشنا کوثر سردار
نبیلہ عزیز
فائزہ افتخار
نبیلہ ابر راجہ
آمنہ ریاض
عنیزہ سید
اقراء صغیر احمد
نایاب جیلانی

اشفاق احمد
نسیم حجازی
عنایتُ اللّٰہ التمش
ہاشم ندیم
مُمتاز مُفتی
مُستنصر حُسین
علیمُ الحق
ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com

”گاؤں اپنی ماں کے پاس۔“

”تمہیں کیا علم وہ کس گاؤں میں رہتی ہے؟“

”وہ میرے ابا کی سگی خالہ زاد تھی تو یقیناً اسی گاؤں میں رہتی ہوگی جہاں میرے ابا کا خاندان رہتا ہے میں جانتی ہوں قصور کے قریب ہے ہمارا گاؤں بس اب میں یہاں سے نکل کر سنبل کے گھر نہیں جاؤں گی بلکہ بس میں بیٹھ کر سیدھی گاؤں چلی جاؤں گی۔“

”پاگل ہو تم‘ اکیلی لڑکی کا گاؤں جانا اتنا آسان نہیں۔“ پھر سبین کا کوئی جواب نہ آیا‘ کچھ دیر رک کر میں نے فون کیا تو اس کا نمبر بند تھا اور میسج پر خبر کہ سبین نے خودکشی کرلی مجھے لرزا گئی کوئی کچھ بھی کہتا میں اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ اپنی ماں سے ملنے کے لیے کس قدر بے تاب تھی اور ایسی حالت میں‘ وہ کبھی خودکشی نہ کرسکتی تھی ورنہ مجھ سے ضرور ذکر کرتی کوئی ایسا میسج ضرور آتا جو یہ ظاہر کرتا کہ اس کی ذہنی حالت اسے خودکشی کی طرف لے جارہی ہے اس کے آخری میسج میں بھی اپنا کوئی ذکر نہ تھا پھر بھلا اس نے کیسے اور کیوں خودکشی کی؟

یہ ایک راز تھا جو سبین مرنے کے بعد قبر میں اپنے ساتھ ہی لے کر دفن ہوگئی۔ مگر جانے کیوں مجھے آج بھی یقین ہے کہ سبین نے خودکشی نہیں کی بلکہ اس کا قتل ہوا تھا اور یہ قتل کس نے کیا میرا خیال ہے میرے بتانے کی ضرورت نہیں آپ سب اچھی طرح جان گئے ہوں گے کہ سبین کا قاتل کون ہوسکتا ہے؟ وہ تو دنیا چھوڑ گئی مگر میں آج بھی منتظر ہوں شاید اللہ کی طرف سے انصاف ہو اور ایک غریب مظلوم لڑکی پر ظلم ڈھانے کی سزا اسجاد اور سنبل کو ضرور ملے۔

……☆☆……

آنسو

صداقت ساجد

کبھی آپ نے اپنے خواب وخیال میں بھی نہیں سوچا ہوگا کہ آنسو کسی کی زندگی بچا سکتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر بات یہ ہے کہ وہ آنسو کسی خاتون کے ہوں۔ آپ حیران ہو رہے ہوں گے کہ خواتین کے آنسو تو مگر مچھ کے آنسو کہلاتے ہیں، بھلا یہ کس کام کے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ آنسو میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ وہ کسی انسان پر اثر انداز ہوسکیں اور کسی کی زندگی بچا سکیں۔ یہ صرف نمکین پانی کے چند قطرے نہیں ہوتے اور بھی بہت کچھ ہوتے ہیں۔ یہ ’اور بھی بہت کچھ‘ کے بارے میں آپ کو یہ واقعہ پڑھ کر پتا چل جائے گا۔ آپ بے ساختہ پکار اٹھیں گے کہ واقعی! آنسو بہت کچھ ہوتے ہیں اور یہ بہت طاقت ور بھی ہوتے ہیں۔

میں اس وقت تقریباً نوے سال کا ہوں۔ میں نے اس دوران بہت سے نشیب وفراز دیکھے ہیں۔ اگر میں اپنے تجربات ومشاہدات کو احاطہ تحریر میں لاؤں، تو شاید کئی سال لگ جائیں، لیکن اگر صرف انوکھے اور منفرد واقعات ہی آپ کے سامنے لاؤں، تو پھر بھی دو تین کتب تو بن ہی جائیں گی۔ میں اب اتنا بوڑھا ہو چکا ہوں کہ ہاتھوں میں رعشہ آچکا ہے۔ الفاظ درست نہیں لکھے جاسکتے۔ اگر کچھ لکھ بھی لوں، تو اب یہ نوبت ہے کہ ’لکھے موسیٰ، پڑھے خدا‘ والی کہاوت مجھ پر صادق آتی ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ ان منفرد واقعات کو کسی ذریعے سے آپ کے علم میں لاؤں۔

یہ ان دنوں کی بات ہے، جب میں نوجوان تھا اور اس وقت برصغیر پر انگریزوں کا راج تھا۔ برصغیر میں دوسری ریاستوں کی طرح ایک ریاست ’توگاپور‘ تھی۔ دیکھنے میں تو یہ چھوٹی سی ریاست دکھائی دیتی تھی، لیکن اس پر انگریزوں کا ویسا قبضہ نہیں تھا، جیسا کہ دوسری ریاستوں پر تھا۔ اسے دوسری ریاستوں کی نسبت مکمل آزادی حاصل تھی۔ انگریزی حکومت بھی اس کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی نہیں کرتی تھی۔ کچھ لوگ اس کی وجہ یہ بتاتے تھے کہ اس ریاست کا راجا آکسفورڈ یونی ورسٹی سے تعلیم یافتہ تھا اور نوجوان سا تھا۔ پورے برطانیہ میں اور خاص طور پر لندن میں اسے ’بوبی‘ کے نام سے جانا پہچانا جاتا تھا۔ برطانیہ میں تو وہ بالکل ایک انگریز بن کر رہتا تھا، لیکن اپنی ریاست میں اس کا لباس، رہن سہن، طور

طریقے، غرض سب کچھ مقامی تھا۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ یہ وہی بوبی ہے، جو برطانیہ میں انگریزوں کے طور طریقے استعمال کرتا ہے۔ اگر کوئی اسے برطانیہ میں دیکھ لیتا، تو وہ یہی سمجھتا کہ یہ انگریز ہی ہے، لیکن اپنی ریاست میں تو وہ پکا راجپوت تھا۔ اس کے 'خاص کارناموں' کی وجہ سے لوگ اس کی پیٹھ پیچھے اسے 'خونی راجا' کے نام سے یاد کرتے تھے۔

اس راجا نے اپنی ریاست میں ایک ملک کی طرح کے سب انتظامات کر رکھے تھے۔ وہاں وزیر مشیر تھے، سول سروس تھی، پولیس تھی، ایک لائبریری تھی، ایک تھیٹر تھا اور ایک اسپتال بھی تھا، لیکن ان سب چیزوں کے علاوہ ایک اور بھی چیز تھی، جسے 'چیخوں کا کنواں' کہا جاتا تھا۔ میری اس داستان کا تعلق بھی اسی چیخوں کے کنویں اور وزارت خزانہ سے ہے۔

اس کنویں کے بارے میں بتاتا چلوں کہ یہ زیادہ گہرا نہیں تھا، لیکن اس کی چوڑائی بہت زیادہ تھی۔ اس کا جو دائرہ تھا، اس کے اوپر بنی ہوئی دیوار ایک عام سے آدمی کے سر سے کچھ ہی بلند تھی۔ اتنی بھی کم بلند نہیں تھی کہ کسی کے ہاتھ اس تک پہنچ جاتے۔ کنویں میں بے شمار زہریلے سانپ موجود تھے۔ ان سانپوں کی آنکھوں میں ایسی چمک تھی کہ ان کا غیر معمولی سحر آدمی کو اپنی گرفت میں لے لیتا تھا اور وہ چاہے جتنی بھی کوشش کرتا، اس سحر سے خود کو بچانا ناممکن تھا۔ کنویں کی تہ ہموار تھی اور اس پر ریت بچھی ہوئی تھی۔ کنویں کے بالکل درمیان میں ایک بہت لمبا لکڑی کا ستون گاڑا گیا تھا۔ یہ لکڑی کا ستون بہت ہی مضبوط لکڑی سے بنا ہوا تھا۔ لکڑی گرہ دار تھی۔ یہ کنویں کے دہانے سے بہت اونچا تھا۔ کافی فاصلے پر جو لوگ کھڑے ہوتے تھے، انھیں بھی یہ آسانی سے دکھائی دے جاتا تھا۔ کنویں کے چاروں اطراف عوام کے لیے سیڑھیاں بنائی گئی تھیں۔ یہ سیڑھیاں ایسی تھیں، جیسی کسی سرکس یا کھیل کے میدان میں بنائی گئی ہوتی ہیں۔ راجا اور اس کے مصاحب خاص کنویں کی دیوار کے قریب کھڑے ہوتے تھے۔ کنویں کی تہ سے اس پر چڑھ کر اوپر آ جانا کوئی مشکل نہیں تھا، کیوں کہ اس کی لکڑی گرہ دار تھی، جو اس پر چڑھنے میں آسانی فراہم کرتی تھی، لیکن اس پر کوئی شخص چڑھ کر باہر چھلانگ لگانے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا، کیوں کہ کنویں کی چوڑائی اتنی زیادہ تھی کہ دوبارہ تہ میں گرنے کا سو فی صد خطرہ ہوتا تھا۔ ایک بار جو تہ میں گر جاتا، اس کا بچنا محال تھا۔ جب بھی کسی کو اس کنویں میں ڈالا جاتا، تو وہ نیچے گرتے ہی فوراً ہی سانپوں سے اپنی جان بچانے کے لیے اس لکڑی کے ستون پر چڑھ جاتا تھا اور اس سے اس وقت تک چمٹا رہتا تھا، جب تک اس کے ہاتھوں میں طاقت رہتی تھی۔ جب اس کی ہمت جواب دینے لگتی تھی اور اسے پتا چل جاتا کہ اب تب میں وہ نیچے گرنے والا ہے، تو وہ خوف کے مارے چیخنے چلانے لگتا تھا۔ کچھ سانپ کنویں کی تہ میں ہر وقت موجود رہتے تھے اور جب لکڑی کے ستون سے چمٹا بد نصیب شخص نیچے گرتا، تو وہ ایک دم اس پر اپنے زہریلے پھنوں سے حملہ کر دیتے، کچھ ہی دیر کے بعد اس کی چیخیں ہمیشہ کے لیے دم توڑ دیتیں۔

میں اس ریاست کی وزارت خزانہ سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس واقفیت کی وجہ وہ کاروباری تعلق تھا، جو میرے اور ان کے درمیان میں تھا۔ یہ وزارت تین افراد پر مشتمل تھی۔ اس کا وزیر ایک مسلمان تھا، جس کا نام علی داد تھا اور اس کا تعلق ایران سے تھا۔ اس کے ماتحت دو کلرک تھے۔ ان دونوں کا تعلق ڈوگرہ راجپوت خاندان سے تھا۔ ان میں سے ایک جوان تھا، جس کا نام چرن داس تھا اور دوسرا ادھیڑ عمر کا ہرنام سنگھ تھا۔ چرن داس سنگھ کا قد چھوٹا، جسم بھاری اور مسکراتا ہوا چہرہ تھا، جب کہ ہرنام سنگھ کا قد لمبا اور جسم دبلا تھا۔ اس کے چہرے پر ہر وقت ایک خاص قسم کی سختی پھیلی ہوتی تھی۔ ایک قوم ہونے کے بعد ان میں صرف ایک اور بات مشترک تھی۔ وہ مشترک بات یہ تھی کہ وہ دونوں بہت ذہین، محنتی اور تجربہ کار تھے۔ وہ اپنے رجسٹروں میں سب کچھ انگریزی میں تحریر کرتے تھے۔ دونوں کو اس کام کا بہت تجربہ تھا اور اس کام کے وہ ماہر تھے۔ اسی وجہ سے تو علی داد انھیں ہر ماہ تیس روپے تنخواہ دیتا تھا۔ اس وقت کے تیس روپے آج کے ایک لاکھ سے زیادہ بنتے ہیں اور اس وقت اتنی زیادہ تنخواہ کا تصور بھی کوئی نہیں کرتا تھا۔ خاص طور پر کلرک تو اتنی تنخواہ کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔

اس وزارت کا کام انتہائی رازداری سے ہوتا تھا۔ راجا اور علی مراد آپس میں مل کر یہ بات طے کرتے تھے کس چیز پر ٹیکس لگانا ہے اور یہ ٹیکس کتنا ہوگا۔ دونوں کلرک مل کر ریاست کا بجٹ تیار کرتے تھے۔ ٹوگا پور میں ایک بار جو ٹیکس لگا دیا جاتا تھا، وہ ہر قیمت پر وصول کیا جاتا تھا۔ راجا کو دولت اتنی پیاری تھی، جتنی اسے اپنی جان پیاری تھی، اسی لیے تو وہاں یہ ظالمانہ قانون

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

راج تھا کہ جو پہلے مطالبے پر ٹیکس دینے میں آنا کانی کرتا، یا نہ دیتا، تو اسے دوسرا موقع نہیں ملتا تھا، اسے پکڑ کر چیخوں کے کنویں میں پھینک دیا جاتا تھا۔ کنویں موجود زہریلے سانپ بھوکوں کی طرح اس پر ٹوٹ پڑتے اور کچھ ہی دیر کے بعد اس کا خاتمہ ہو جاتا تھا۔

ریاست میں میری حیثیت شاہی مہمان کی سی ہوتی تھی۔ اس بار میرے قیام کے دوران راجا نے اپنے کچھ ملازم فارغ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس کام کے لیے اس نے سول سروس کو چنا۔ سول سروس میں اس کی نگاہ وزارتِ خزانہ پڑی۔ اوپر سے ایک بہانہ بھی اسے مل گیا۔ ہوا یوں کہ راجا اور علی داد نے مل کر جو نئے ٹیکس لگانے کا فیصلہ کیا تھا، وہ بجٹ بننے سے پہلے ہی لوگوں کے علم میں آگئے تھے۔

خاص کر ایک ٹیکس جو تاجروں پر لگایا جانا تھا، اس کا علم انھیں وقت سے پہلے ہی ہوگیا تھا، اس لیے جب وہ ٹیکس لگایا گیا، تو بہت کم رقم وصول ہوئی۔ راجا جتنی رقم کا خواب دیکھ رہا تھا، وصول ہونے والی رقم اس کا آدھا حصہ بھی نہیں تھی۔ راجا کو بہت غصہ آیا اور اس نے فیصلہ کرلیا کہ اس 'عظیم گناہ' کرنے والے والے کو عبرت ناک سزا دی جائے گی۔

اس ٹیکس کے بارے میں صرف چار بندوں کو پتا تھا۔ راجا، علی داد اور اس کے دو کلرک۔ راجا خود تو اس کے بارے میں کسی کو نہیں بتا سکتا تھا۔ اگر وہ ایسا کرتا، تو وہ رقم سے محروم ہو سکتا تھا اور رقم اسے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھی۔ اسے یقین تھا کہ یہ کام علی داد اور اس کے دو کلرکوں میں سے کسی کا ہے۔ راجا چلا اٹھا۔

''انھوں نے یہ کام کر کے اپنی شامت کو خود دعوت دی ہے...... میں ان کا وہ انجام کروں گا کہ سب عبرت حاصل کریں گے اور آیندہ کسی کو جرأت نہیں ہوگی کہ وہ میرے احکام کی خلاف ورزی کر سکے۔''

علی داد چوں کہ وزیر تھا، اس لیے سب سے پہلے اس کی شامت آئی۔ راجا نے اس پر یہ الزام لگایا کہ اس نے اپنا فرض ادا کرنے سے کوتاہی برتی ہے، اس لیے اسے اپنی صفائی کا موقع دیے بغیر ہی چیخوں کے کنویں میں پھینکوا دیا۔ علی داد نیچے گرتے ہی فوراً لکڑی کے ستون پر چڑھ گیا۔ یوں اس نے کچھ دیر کے لیے تو خود کو سانپوں سے بچا لیا، لیکن...... لیکن آخر کب تک......!

تہ میں موجود سانپ پھن اٹھا اٹھا کر اس کی طرف گھور رہے تھے۔ علی داد بری طرح سے چلا رہا تھا۔ جیسے جیسے اس کی چیخیں بلند ہو رہی تھیں، ویسے ویسے کنویں میں موجود سوراخوں میں سے سانپ باہر نکل نکل کر تہ میں جمع ہو رہے تھے۔ اب علی داد کے ہاتھ سن ہو چکے تھے۔ اس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ آخر لکڑی کے ستون پر سے اس کے ہاتھوں کی گرفت کم زور پڑتے پڑتے ختم ہوگئی اور لکڑی کا ستون اس کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ وہ ایک کرب ناک چیخ نکالتے ہوئے تہ میں سانپوں کے اوپر جا گرا۔ سانپ تو کب سے اس موقع کے انتظار میں تھے۔ انھوں نے ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیا اور اس پر پل پڑے۔ صرف چند لمحے گزرے تھے کہ ٹوگا پور اپنے وزیر خزانہ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم ہو گیا۔

سب کا خیال تھا کہ راجا نے اپنی اس حکم عدولی کا انتقام لے لیا ہے، لیکن یہ ان کی خام خیالی تھی۔ اس کا انتقام ابھی کہاں پورا ہوا تھا۔ ابھی دو ڈوگرا کلرک موجود تھے۔ راجا کا خیال تھا کہ ان دو میں سے کسی ایک نے یا دونوں نے نئے ٹیکس کے بارے میں تاجروں کو وقت سے پہلے آگاہ کیا ہے۔ راجا تو انسانی خون کا پیاسا تھا۔ وہ بہت اذیت پسند تھا، اسی لیے تو ہر جرم کی سزا ایسی چیخوں کا کنواں ہوتی تھی۔ اس کی تو مرضی تھی کہ یہی سزا ان دونوں کلرکوں کو بھی ملے، لیکن اب وہ مجبور تھا۔ اس کی مجبوری یہ تھی کہ اگر وہ دونوں کلرکوں کو ختم کر ڈالتا، تو پیچھے کوئی ایسا آدمی نہیں تھا، جو ان کی طرح وزارتِ خزانہ کو سنبھال سکے۔ ان جیسا تجربہ کار فرد پوری ریاست میں نہیں تھا، جو ان ہی کی طرح اپنے کام کو بڑی خوب صورتی اور جان فشانی سے سرانجام دے سکے۔

راجا چاہتا تھا کہ ان میں سے ایک زندہ رہے، تاکہ وہ اپنا کام سنبھالے رکھے اور دوسرے کو سزا ملے، تاکہ زندہ بچ جانے والے کو آیندہ کسی قسم کی کوتاہی کرنے کی ہمت نہ ہو۔ اب ان دونوں میں سے ایک نے زندہ رہنا تھا، لیکن سوال یہ تھا کہ کون زندہ رہے گا؟ وہ دونوں خود کو بہت اصرار کے ساتھ بے گناہ کہہ رہے تھے۔ فیصلہ تو مشکل دکھائی دے رہا تھا، لیکن راجا نے

بھی تو اپنی پیاس بجھانا تھی، اس لیے اس نے ایک راہ نکال ہی لی۔

راجا کچھ معاملات میں بڑا عملی انسان تھا۔ اسے ان دونوں کلرکوں سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ اس کی نظر میں دونوں برابر تھے۔ وہ تو ایک کو ختم کر کے اپنی پیاس بجھانے کے چکر میں تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ان میں سے جو کام اور کارکردگی کے لحاظ سے بہترین ہوگا، اسے زندہ رکھا جائے گا۔ یہ ایک عملی فیصلہ تھا، اس لیے کسی نے اعتراض نہ کیا۔ اگر عملی فیصلہ نہ بھی ہوتا، تو کس میں جرأت تھی کہ وہ اس کے خلاف بات کرتا یا سوچتا۔ راجا نے اس فیصلے کو استعمال میں لانے کے لیے امتحان کا جو طریقہ سوچا، وہ بھی سو فی صد عملی اور منطقی تھا۔ اس نے چرن داس اور ہرنام سنگھ کا امتحان لینے کا یوں انتظام کیا کہ پوری ریاست بھی اس سے محظوظ ہو سکے۔ اصل میں وہ دوسروں کو خوف اور تکلیف میں مبتلا کر کے لطف اندوز ہوتا تھا۔

راجا کا مہمان ہونے کی وجہ سے مجھے بہت سی سہولیات میسر تھیں۔ مجھے اس امتحان گاہ میں جا کر یہ سب کچھ دیکھنے کی خصوصی دعوت دی گئی۔ میں وہاں پہنچا، تو دیکھا کہ امتحان گاہ ایک کھلے میدان میں بنائی گئی تھی۔ وہاں ایک اونچا چبوترہ بنایا گیا تھا۔ اس چبوترے کے تین اطراف میں کپڑا تان کر ایک کمرا سا بنا دیا گیا تھا۔ سامنے تھیٹر کے چبوترے کی طرح پردہ گرا ہوا تھا۔ چبوترے کے سامنے صفوں اور کرسیوں کی کئی قطاریں تھیں۔ کرسیوں پر ریاست کے عہدے دار اور دوسرے معززین بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے راجا اور اس کے مصاحبینِ خاص کے ہمراہ پہلی قطار میں ایک صوفے پر بیٹھنے کی جگہ ملی۔

جہاں تک میرا تعلق تھا، میں چرن داس کے حق میں تھا۔ اس کی بھی ایک وجہ تھی۔ وہ وجہ یہ تھی کہ وہ ہرنام سنگھ سے عمر میں کم تھا۔ اس کے چہرے سے معصومیت جھلکتی تھی، یا پھر شاید یہ وجہ تھی کہ اس کی بیوی تھی اور ایک خوب صورت پھول سا بچہ تھا۔ دوسری طرف جو ہرنام سنگھ تھا، وہ بڑا پختہ کار اور خود اعتماد دکھائی دیتا تھا۔ یہ امتحان اصل میں دونوں کلرکوں کی قوتِ برداشت کا مقابلہ تھا، اس لیے اکثر لوگوں کا اس بات پر اتفاق تھا کہ یہ مقابلہ ہرنام سنگھ جیت جائے گا اور چرن داس کے حصے میں چیخوں کا کنواں آئے گا۔

چبوترے کا پردہ اٹھا دیا گیا۔ اسے ایک دفتر کی طرح تیار کیا گیا تھا۔ دو بڑی سی میزیں سامنے رکھی ہوئی تھیں۔ ان کے ساتھ کرسیاں تھیں۔ میزوں پر فائلوں کا ایک انبار سا لگا ہوا تھا۔ روشنائی، قلم، پنسل، فٹ رول اور وہ تمام اشیا وہاں موجود تھیں، جن کی ضرورت ایک کلرک کو ہوتی ہے، یا پڑ سکتی ہے۔ دونوں میزوں پر بالکل ایک جیسی اشیا رکھی گئی تھیں۔ ہر میز کے پیچھے ایک ایک کرسی رکھی ہوئی تھی، جس پر دونوں کلرکوں نے بیٹھنا تھا۔ ان کرسیوں کے پیچھے تین اور کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ان کرسیوں پر آ کر اس مقابلے کے ججوں نے بیٹھنا تھا۔

ابھی میں یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا کہ گھنٹی بج اٹھی۔ پھر میں نے دیکھا کہ چبوترے کے ایک طرف سے چرن داس اور دوسری طرف سے ہرنام سنگھ نمودار ہوا۔ چرن داس کی حالت دیکھنے والی تھی۔ وہ بہت پریشان اور اداس دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے برعکس ہرنام سنگھ ہر لحاظ سے مطمئن اور پرسکون دکھائی دے رہا تھا۔ دونوں اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے۔ ان کے سامنے حساب کتاب کے لیے کئی سادہ رجسٹر بھی رکھے ہوئے تھے۔ انھیں متعلقہ فائلوں سے تمام اندراجات ان رجسٹروں پر منتقل کرنے تھے۔ یہ اندراجات ان افراد کے بارے میں تھے، جو ریاست کو ٹیکس دیتے تھے۔ ان رجسٹروں پر ان کے بارے میں یہ تحریر کرنا تھا کہ ان کا نام کیا ہے، پتا، پیشہ، آمدن اور وہ کتنا ٹیکس ادا کرتا ہے؟ یہ تمام معلومات مختلف فائلوں میں محفوظ تھیں۔ یہ معلومات انھیں اپنے سامنے رکھے ہوئے سادہ رجسٹروں میں منتقل کرنی تھیں اور ساتھ ساتھ رقوم کا میزان بھی رکھنا تھا۔

پھر دوسری گھنٹی بجی، تو میں نے چونک کر دیکھا کہ مقابلے کے تین جج پیچھے سے نمودار ہوئے اور آ کر ان مخصوص کرسیوں پر بیٹھ گئے، جو ان کے لیے رکھی گئی تھیں۔ میں نے تماشائیوں کی طرف نظر دوڑائی، تو مجھے یوں لگا جیسے پوری ریاست یہ بے رحمانہ امتحان دیکھنے کے لیے آ گئی ہو۔ اتنے میں تیسری گھنٹی بج اٹھی اور ساتھ ہی مقابلہ شروع ہو گیا۔ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ چرن داس کی حالت بہت خراب تھی۔ اس کے چہرے پر زردی چھائی ہوئی تھی۔ ہاتھوں میں رعشہ سا تھا اور اس کے ہاتھوں کی انگلیاں کپکپا رہی تھیں۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ ابھی سے اپنے بارے میں مایوس ہو چکا

ہے اور وہ اپنے آپ کو چیخوں کے کنویں میں گرتا ہوا محسوس کر رہا ہے۔ اس کے برعکس ہرنام سنگھ نے بڑی خود اعتمادی سے اپنا کام شروع کر دیا۔ وہ ایک فائل اٹھاتا اور رجسٹر میں کالموں کے اعتبار سے بڑی برق رفتاری سے اندراج کر دیتا۔ کام کرتے کرتے کسی کسی وقت وہ سر اٹھاتا اور چرن داس کی طرف دیکھتا۔ اس کی پتلی اور پریشان حالت کو دیکھ کر وہ طنزیہ انداز میں مسکرانے لگتا۔ یہ دیکھ کر چرن داس کی حالت اور خراب ہو جاتی۔ جب یہ سلسلہ کافی دیر تک کے لیے جاری رہا، تو چرن داس کو بھی جوش آ گیا۔ اس نے اپنا جھکا ہوا سر اوپر اٹھایا، تو ہرنام سنگھ کو معمول کی طرح حقارت سے مسکراتے ہوئے دیکھ لیا۔ یہ دیکھ کر اس کی رگوں میں موجود ڈوگرا راجپوت خون جوش مارنے لگا۔ اس کا چہرہ جذبات سے سرخ ہو گیا۔ اس کے اندر پختہ عزم کا ظاہر ہونا ہی تھا کہ اس میں اعتماد پیدا ہو گیا۔ اس نے تیزی سے کام کرنا شروع کر دیا۔ اس کے ہاتھ اب تیزی سے چل رہے تھے۔ جلد ہی اس نے ہرنام سنگھ جتنا کام مکمل کر لیا۔ یہ مقابلہ تب تک جاری رہنا تھا، جب تک کہ کام مکمل نہیں ہو جاتا تھا، اس لیے دونوں کے کام کرنے کی رفتار تقریباً برابر تھی۔ فائلوں کا انبار ایک طرف سے کم ہو کر دوسری طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ یہ بڑھتا ہوا فائلوں کا نیا انبار وہ تھا، جو کام مکمل ہونے کے بعد میز کے دوسرے کونے میں لگایا جا رہا تھا۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا، ہرنام سنگھ پر تھکن سوار ہونے لگی۔ اب واضح طور پر دکھائی دے رہا تھا کہ وہ پہلے والی چستی سے کام نہیں کر رہا ہے۔ اب شام ہو چکی تھی۔ روشنیوں کا وہاں پہلے سے ہی انتظام تھا۔ یہ انتظام مشعلوں کی صورت میں تھا۔ فوراً ہی مشعلیں جلا دی گئیں۔ ہرنام سنگھ واضح طور پر تھکا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ سر سے پاؤں تک پسینے میں شرابور ہو چکا تھا۔ یہ دیکھ کر وہ لوگ بہت خوش دکھائی دے رہے تھے، جو یہ سمجھتے تھے کہ چرن داس بے گناہ ہے۔ انھیں امید تھی کہ اب یہ مقابلہ چرن داس جیت جائے گا۔ وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ ہرنام سنگھ اتنی تھکن کے باوجود بھی زیادہ پیچھے نہیں ہے۔ اب اس کے ہاتھ زیادہ تیزی سے چل رہے تھے، کیوں کہ کام اختتام کے قریب تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے چرن داس نے اپنا سارا کام مکمل کر لیا تھا، جب کہ ہرنام سنگھ کے سامنے ایک فائل ابھی بھی باقی پڑی تھی۔ لوگوں نے تالیاں بجا کر خوشی کا اظہار کیا، لیکن ان کی تالیوں میں زیادہ جوش نہیں تھا، کیوں کہ انھیں پتا تھا کہ کام مکمل کر لینا ہی کافی نہیں ہے۔ چند منٹ ہی گزرے تھے کہ ہرنام سنگھ نے بھی اپنا کام مکمل کر لیا۔ اب جج اپنی جگہوں سے اٹھ کر آگے آئے اور ان کے کام کا جائزہ لینے لگے۔ انھوں نے بڑے غور سے ان کے رجسٹروں کا جائزہ لیا۔ پھر انھوں نے چرن داس کو آگے بلایا اور اس کے آخری رجسٹر کا آخری صفحہ کھولا۔ پھر ایک جگہ انگلی رکھ کر اس سے کچھ پوچھا۔ چرن داس کا رنگ ایک دم فق ہو گیا۔ غالباً وہ اتنی پھرتی اور تیزی کی وجہ سے کوئی غلطی کر گیا تھا۔ اس کے برعکس انھیں ہرنام سنگھ کے رجسٹروں میں کوئی غلطی یا خامی دکھائی نہیں دی تھی۔ اس کا کام مکمل طور پر درست تھا۔ یوں چرن داس کامیابی کے بالکل قریب پہنچ کر بھی ہار گیا تھا۔ اسے کہتے ہیں کہ 'ٹوٹی کہاں کمند...... جب لبِ بام دو چار ہاتھ رہ گیا'

ججوں نے بغیر کسی تاخیر کے ہرنام سنگھ کی فتح کا اعلان کر دیا۔ اس کے حامی مسرت اور خوشی سے اچھل اچھل کر چلا رہے تھے، گا رہے تھے اور ناچ رہے تھے۔ کافی دیر تک یہ شور شرابا برپا رہا۔ پھر راجا اپنی جگہ سے اٹھ کر چبوترے پر چڑھا اور بلند آواز سے بولا۔

"سب کے سامنے منعقدہ مقابلے نے ثابت کر دیا ہے کہ چرن داس مجرم ہے، اس لیے اس کی سزا چیخوں کا کنواں ہے ...... ہم حکم دیتے ہیں کہ اسے کل چیخوں کے کنویں میں پھینک دیا جائے ...... اس کے علاوہ کل عام تعطیل ہے...... سب لوگ چرن داس کا انجام دیکھیں، تاکہ انھیں عبرت حاصل ہو کہ جو بھی اپنے فرائض سے کوتاہی برتے گا...... اس کا انجام یہی ہوگا۔"

یہ سن کر کچھ لوگ تو بہت خوش ہوئے اور کچھ افسردہ ہو گئے، لیکن کسی کے بس میں کچھ نہیں تھا۔ جو فیصلہ ہونا تھا، وہ ہو چکا تھا، اسے بدلنا کسی طرح سے بھی ممکن نہیں تھا۔ سب لوگ سر جھکائے اپنے گھروں کو چل دیے۔

دوسرے دن چھٹی ہونے کی وجہ سے لوگ صبح سویرے ہی چیخوں کے کنویں کے پاس اکٹھے ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ساری ریاست وہاں یہ ظالمانہ تماشا دیکھنے آئی ہوئی تھی۔ راجا کے حکم پر تاخیر سے چرن داس کو کنویں میں پھینکا گیا۔ اصل

میں وہ چاہتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس کا انجام دیکھ کر خود کو سنبھال لیں اور آیندہ راجا سے غداری کا سوچیں بھی نا! جہاں تک نظر پہنچتی تھی، لوگ ہی لوگ دکھائی دیتے تھے۔ جب چرن داس کو کنویں میں پھینکا گیا، اس وقت دوپہر تھی۔ میں سرکاری مہمان تھا، اس لیے راجا نے مجھے اپنے ساتھ کھڑا ہونے کا موقع دیا۔ ہم کنویں کی دیواروں کے پاس کھڑے تھے۔ چرن داس جوں ہی کنویں کی تہ میں گرا، فوراً ہی دہشت زدہ ہو کر لکڑی کے ستون پر چڑھ گیا۔ اسے پتا تھا کہ جب تک وہ لکڑی کے ستون پر موجود ہے، سانپوں سے محفوظ ہے۔ وہ سب کی توقع سے بڑھ کر جرأت مند اور حوصلہ مند ثابت ہوا تھا۔ خوں خوار سانپ دیکھ کر بھی وہ ذرا سا بھی خوف زدہ نہیں ہوا تھا۔

سانپ تو حسب معمول اپنے پیاسے پھن اٹھائے اسے بری طرح سے گھور رہے تھے۔ ان کی پھنکاریں دور دور تک سنائی دے رہی تھیں۔

”مجرم بہت بہادر بن رہا ہے...... مگر آپ دیکھنا کہ سانپ اسے اپنی آنکھوں کے حیرت انگیز سحر سے جلد ہی نیچے کھینچ لیں گے۔“ راجا نے مجھ سے کہا۔

میں سر ہلانے کے علاوہ کچھ اور نہ کر سکا۔

راجا پھر بولا۔

”اگر یہ نظارہ شراب پیتے ہوئے دیکھا جائے، تو اس کا لطف ہی دوبالا ہو جاتا ہے۔“

پھر اس نے اپنے ایک ملازم کو اشارہ کیا، تو ہمیں دو عدد بلوریں جام پیش کر دیے گئے۔ ان میں انتہائی قیمتی شراب موجود تھی۔

ان دنوں آتش جوان تھا اور آپ کو تو پتا ہی ہے کہ جوانی دیوانی ہوتی ہے، اس لیے میں بھی اپنی جوانی کے دور میں کبھی کبھی پینے پلانے کا شوق پورا کر لیتا تھا۔ عادی شرابی تو نہیں تھا، لیکن میں نے کبھی اتنی نہیں پی کہ میں ’ٹُن‘ ہو جاؤں۔ شراب پینے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میرے زیادہ تر تعلقات انگریزوں کے ساتھ تھے اور ان کی دعوتوں میں، میں اکثر شریک ہوتا رہتا تھا۔ وہیں سے یہ عادت مجھے چمٹ گئی۔ اب تو اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس ام الخبائث سے کب کی جان چھوٹ چکی ہے۔ اس وقت تو میں ویسے بھی انکار نہیں کر سکتا تھا، کیوں کہ راجا کا خاص مہمان ہونے کی وجہ سے مجھے راجا کی شاہی شراب دی گئی تھی۔ اگر میں پینے سے انکار کر دیتا، تو راجا اس بات کو محسوس کر سکتا تھا۔ پھر اس بچھو کی فطرت والے شخص سے کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ میرے ساتھ کیا سلوک کرتا۔

میں اور راجا اپنے اپنے بلوریں جام اپنے اپنے ہاتھوں میں تھامے کنویں کی دیوار پر جھک کر نیچے کا منظر دیکھنے لگے۔ سانپ اپنے شکار کو ڈسنے کے لیے بہت بے چین دکھائی دے رہے تھے۔ مگر چرن داس چیخ نہیں رہا تھا، بلکہ وہ تماشائیوں کے ہجوم میں ایک طرف دیکھ کر مسلسل مسکرا رہا تھا۔ میں نے اس کی نظروں کا تعاقب کیا، تو چونک پڑا۔ جس طرف وہ دیکھ کر مسکرا رہا تھا، وہاں اس کی بیوی اور خوب صورت پھول سا بچہ کھڑے دکھائی دیے۔ راجا اتنا ظالم تھا کہ اس نے حکم دیا تھا کہ چرن داس کی بیوی اور بچے کو کنویں کے بالکل قریب لا کر کھڑا دیا جائے، تاکہ یہ اپنے شوہر کی اس گھٹیا حرکت پر ملنے والی سزا سے عبرت پکڑے۔ راجا کے حکم کی فوراً تعمیل کی گئی اور چرن داس کی بیوی کو ہم سے کچھ دور کنویں کی دیوار کے پاس کھڑا کر دیا۔ اس کے ساتھ وہ معصوم سا بچہ بھی تھا۔ میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا، تو وہ بالکل خاموش کھڑی تھی۔ جب چرن داس اس کی طرف دیکھتا، تو وہ زبردستی اپنے ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ سجا لیتی تھی، مگر اس کی حالت سے مجھے اچھی طرح سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اس وقت کتنی غم زدہ اور افسردہ ہے۔ وہ غم زدہ اور افسردہ کیوں نہ ہوتی، کچھ ہی دیر کے بعد اس کی قیمتی متاع اس سے ہمیشہ کے لیے چھن رہی تھی اور وہ ہمیشہ کے لیے بے سہارا ہو رہی تھی۔

ہم سب اس انتظار میں مبتلا تھے کہ مجرم کب اپنے انجام کو پہنچتا ہے۔ راجا جام پر جام چڑھا رہا تھا اور ادھر چرن داس کی گرفت لکڑی کے ستون پر سے کمزور پڑنے لگی اور وہ آہستہ آہستہ نیچے کی طرف پھسلنے لگا۔ یہ دیکھ کر سانپ اور زیادہ مستعد ہو گئے۔ اب ان کا جوش دیکھنے والا تھا۔ بہادر راجپوت لکڑی کے ستون سے لپٹا یوں کانپ رہا تھا، جیسے کوئی پتا درخت سے

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

گرنے سے پہلے جھرجھری لیتا ہے۔ اس وقت یوں لگتا تھا کہ وقت کی رفتار جیسے تھم گئی ہو، لوگوں نے اپنے سانس روک لیے ہوں، کیوں کہ وقت انجام آن پہنچا تھا۔

"وہ گر رہا ہے......" ہجوم میں سے کوئی چلایا۔

پھر اچانک ایک دل خراش چیخ سنائی دی۔ دھوپ کی روشنی میں ایک جسم کنویں میں گرتا ہوا دکھائی دیا۔ دھم کی ایک ہلکی سی آواز آئی اور پھر ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ یہ گرنے والا چرن داس نہیں تھا۔

پھر کون تھا؟

یہ خونی راجا تھا، جو اپنے ہی بنائے ہوئے چیخوں کے کنویں کا شکار ہو گیا تھا۔ وہ شراب کے نشے میں کنویں کی دیوار پر ضرورت سے زیادہ جھک گیا تھا۔ یوں اس کا توازن بگڑا اور وہ کنویں میں جا پڑا۔

ریاست میں ایسا کوئی فرد بھی نہیں تھا کہ جسے یہ جان کر خوشی نہ ہوئی ہو کہ ظالم اپنے ہی کھودے ہوئے گڑھے کا شکار ہو گیا ہے۔ راجا کسی بزدل کی طرح نیچے گرا اور پھر فوراً اٹھ کر دیوار پر چڑھنے کے لیے بھاگا، لیکن اس وقت تک سانپوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ راجا کا نشہ ہرن ہو چکا تھا۔ اب اسے اپنی جان بچانے کی پڑی ہوئی تھی۔ سانپوں کو چرن داس کے نیچے گرنے کا اتنا انتظار کرنا پڑا تھا کہ وہ پاگل ہو چکے تھے۔ وہ تیزی سے اس پر ٹوٹ پڑے۔ اس سے پہلے کہ وہ دیوار پر چڑھتا، سانپوں نے اسے جا لیا اور اس سے لپٹ گئے۔ ان کے زہریلے پھن بار بار اٹھتے اور اسے ڈس جاتے۔ راجا بری طرح سے تڑپ رہا تھا اور حلق پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہا تھا، چلا رہا تھا، لیکن وہاں ایک بھی ایسا نہیں تھا، جو اس کی چیخیں سن کر افسردہ ہوا ہو۔ مجھے یقین ہے کہ اس وقت ضرور راجا کو احساس ہوا ہوگا کہ وہ لوگوں پر کتنے ظلم کرتا تھا، لیکن اب اس کے پاس اتنا بھی وقت نہیں تھا کہ وہ افسوس کرتا، یا ان مظالم کا ازالہ کرنے کی کوشش کرتا۔

سانپ اپنے اس شکار میں اتنا مصروف تھے کہ ان میں سے کسی کی توجہ چرن داس کی طرف نہیں گئی تھی، جو لکڑی کے ستون سے پھسلتے ہوئے نیچے آ گیا تھا۔ نیچے آتے ہی اس نے موقع دیکھ کر کنویں کی دیوار کی طرف چھلانگ لگا دی۔ اس کی ہمت اور حوصلہ دیکھتے ہوئے لوگوں نے خوشی کے نعرے لگانا شروع کر دیے۔ پھر انھوں نے چرن داس کو باہر نکلنے میں مدد دی اور دوسرے ہی لمحے اسے کھینچ کر باہر نکال دیا۔ تب تک راجا اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔ لوگوں کو دہری خوشی ملی تھی......

ایک چرن داس کے بچ جانے کی اور دوسرے راجا کے مرنے کی۔

وہ اپنے اپنے مذہب کے مطابق شکرانے کی مذہبی دعائیں مانگ رہے تھے۔ پھر انھوں نے چرن داس کو اپنے کندھوں پر سوار کر لیا اور خوشی سے چیختے چلاتے اور گاتے ناچتے واپس چل دیے۔ اب چرن داس کی بیوی کا سارا حزن و ملال ختم ہو چکا تھا۔

اگر آپ کا جانا ریاست ٹوگا پور ہو، تو آپ وہاں کے لوگوں سے اس سلسلے میں پوچھیں، تو ان کا جواب یہی ہوگا کہ راجا شراب کے نشے میں اتنا دھت تھا کہ اسے احساس تک نہ ہوا اور وہ اتنا جھکا کہ خود کو سنبھال نہ سکا اور کنویں میں جا گرا۔

لیکن...... لیکن یہ حقیقت نہیں ہے۔

آپ یقیناً سوچ رہے ہوں گے کہ اگر یہ حقیقت نہیں ہے، تو پھر حقیقت کیا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ اسے ایک آنسو نے مارا تھا۔

اب آپ پھر حیران ہو رہے ہیں ناں!

میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ اسے اصل میں ایک ایسے آنسو نے مارا تھا، جو چرن داس کی بیوی کی آنکھ سے نکلا تھا اور اسے میں نے دیکھا تھا......

صرف ایک آنسو......

اسے بھی اس نے جلدی سے پونچھ لیا تھا، تا کہ کوئی اسے دیکھ نہ لے۔ خاص طور پر چرن داس نہ دیکھ لے، لیکن میں نے دیکھ لیا تھا۔ اس ایک نظر دیکھنے سے میں ایک دم بدل گیا اور ایک بہت بڑا فیصلہ کر بیٹھا، جس پر مجھے آج بھی فخر ہے۔

میں ان دنوں جوان تھا اور آپ کو تو پتا ہی ہے کہ جوانی میں رگوں میں خون پارے کی طرح دوڑتا ہے اور اتنا گرم ہوتا ہے کہ حد سے زیادہ ظلم برداشت نہیں کر سکتا۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ چرن داس کی بیوی کی آنکھ سے نکلے صرف ایک آنسو میں اتنی قوت تھی کہ اس نے مجھے اس حد تک جانے پر مجبور کر دیا کہ میں نے وہ کام کر ڈالا، جس کی کسی کو بھی توقع نہیں تھی۔ میں اتنا مجبور ہو گیا تھا کہ میں بہت خاموشی سے نیچے جھکا اور دوسرے ہی لمحے انتہائی پھرتی سے راجا کو چیخوں کے کنویں میں اچھال دیا۔

مجھے یہ یقین تھا کہ پورے مجمع کی نگاہیں لکڑی کے ستون پر سے پھسلتے ہوئے چرن داس کی طرف لگی ہوئی ہیں، اس لیے میری یہ حرکت کوئی نہیں دیکھ سکے گا اور سب یہی سمجھیں گے کہ راجا نشے میں دھت تھا اور جوش میں زیادہ ہی آگے جھک گیا تھا۔ پھر اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور کنویں میں جا گرا۔ لوگوں نے بھی وہی سمجھا، جو میں نے چاہا تھا، اس لیے آج تک کسی کو میری اس حرکت کا علم نہیں ہے۔

اب آپ کو ایک آنسو کی طاقت کا تو بخوبی اندازہ ہو گیا ہو گا۔ اب میرا آپ سے ایک سوال ہے......

وہ یہ کہ چرن داس کی بیوی کی آنکھ سے بہتے ایک آنسو کو دیکھ کر جو ردِعمل میں نے ظاہر کیا تھا، آپ کے خیال میں وہ درست ہے یا غلط؟

مجھے آپ کے جواب کا انتظار رہے گا۔

......☆☆......

دیر آید

ریحانہ سعیدہ

''یار کبھی میں سوچتی ہوں کہ کاش میں ایک اُڑتا پرندہ ہوتی اور جہاں کھانے پینے کی چیز نظر آتی وہیں اتر جاتی۔'' روما نے ثانیہ کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''دفعہ ہو جاؤ لڑکی تم نے میرے اتنے رومانٹک موڈ کا ستیاناس کر دیا۔ کہاں میں نے اپنے منگیتر پرندے کے ساتھ اُڑنا تھا پھر اپنا آشیانہ بنانا تھا اور ہائے تم نے میرا آشیانہ تنکے تنکے کر دیا ثانیہ نے آہیں بھرتے ہوئے کہا یعنی حسرت ان غنچوں پر جو بن کھلے مرجھا گئے میں تو تمھاری کھانے کی عادت دیکھ کر سمجھی تھی کہ شاید جہاں تمھیں برگر چاٹ سموسہ نظر آئے گا تم وہاں اُتر کر انہیں ٹھونگنا شروع کر دوں گی مجھے کیا پتہ آج تم رومانٹک موڈ میں ہو ویسے خیریت تو ہے ناں کوئی چکر وکر تو نہیں شروع ہو گیا تمھارا اس سے پہلے کہ تم مزید الٹا سیدھا سوچو چلو کیفے ٹیریا چلتے ہیں آج وہاں کڑھی چاول پکے ہیں دیکھا میں نے صحیح کہا تھا کہ تم کھانے والی چیزوں پر ہی نظر رکھو گی چاہے تم پرندہ کیوں نہ بن جاؤ روما نے فائل پکڑ کر اُٹھتے ہوئے کہا روما اور ثانیہ کی دوستی بچپن سے اسکول کالج اور اب یونیورسٹی تک محیط تھی گھر بھی پاس پاس تھے اور مزاج بھی ایک جیسا سو دونوں کی دوستی میں کسی تیسرے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی یونیورسٹی میں بھی لڑکوں کے لئے مشکل ٹارگٹ فرینڈلی لیکن اپنے کردار کی حفاظت اور پاسداری کرنے والی روما کا تعلق نسبتاً ثانیہ سے بہتر خاندان سے تھا۔ اس کے ابو باہر تھے اور بھائی بھی بچپن سے تعلیم کے سلسلے میں ابو کے ساتھ باہر تھا جبکہ ثانیہ کا تین بہنیں اور ایک چھوٹے بھائی پر مشتمل خاندان تھا گورنمنٹ کی نوکری اور حلال کی کمائی سو سفید پوشی کا بھرم برقرار رکھتے ہوئے تینوں بہنیں اور بھائی اسکول کالج اور یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھے ثانیہ سب سے بڑی تھی۔

''واہ جی آج تمھارے گھر سے بڑے مزے کی خوشبوئیں آ رہی ہیں۔''

''اور جناب رہ نہ سکیں اور ہمارے کچن میں قدم رنجہ فرما دیا۔'' روما نے ثانیہ کو دیکھتے ہوئے اس کی بات کا جواب دیا۔

''جی نہیں میں نے اپنی ذات سے آپ کے کچن کو رونق بخشی او ہو آج بریانی کوفتے کباب ٹرائفل کون سے خاص

مہمان آرہے ہیں۔"

"مہمان تو خاص ہی ہیں آج مابدولت کے بھائی جان آرہے ہیں چھوٹے سے تھے جب ابو کے ساتھ باہر گئے تھے اب ایم بی اے کر کے لوٹ رہے ہیں اور یہیں اپنا بزنس شروع کریں گے۔"

"یہ تو اچھی خبر ہے کیونکہ آنٹی اکثر بھائی کو یاد کرتی ہیں اب ان کا بی پی کنٹرول میں آجائے گا۔"

"واقعی امی کی آدھی بیماری تو بھائی کو دیکھنے سے اور آدھی بیماری بھائی کے یہاں رہنے سے ختم ہوجائے گی اگر تم شاندار دعوت اُڑانا چاہتی ہو تو کباب فرائی کرو ٹرائفل میں پھل کاٹو اور رائتہ بنالو کیونکہ امی کے لاڈلے کی فرمائش کے مطابق کھانا تیار کر کے تو میں تھک گئی ہوں تم میرے لئے فرشتہ ثابت ہوئی ہو بلکہ میں احمق ہوں جو مجھے پہلے یہ خیال کیوں نہیں آیا۔"

"مار ڈالا ظالم اس دعوت سے تو بہتر تھا کہ میں گھر میں پکنے والی دال کھالوں اور سو جاؤں کیا یہ میرے خوبصورت ہاتھ تم چولہے میں جھونکو گی نہ صرف ہاتھ چولہے میں جھونکوں گی بلکہ برتن بھی دھلواؤں گی چلو ثانی اب تماشہ شروع ہو جاؤ میں نہا لوں ورنہ تو بھائی مجھے ماسی سمجھیں گے۔"

ثانیہ اپنے دھیان میں سلاد کاٹ رہی تھی جب اس کے بالوں کو کسی نے کھینچا وہ چونک کر مڑی۔

"او تم کون ہو رومی کہاں ہے رومی ہاتھ لے رہی ہے میں بھی سوچ رہا تھا یہ پری چہرہ لڑکی روما تو نہیں ہوسکتی ایک چڑیل جتنا بھی میک اپ کرلے پری تو نہیں ہوسکتی۔" ہادی نے روما کو آتے دیکھ کر فقرہ مکمل کیا۔

"ظاہر ہے ہادی بھائی بھوت ہوں تو بہنیں چڑیل ہی ہوں گی۔" یہ کہتے روما بھائی کے گلے لگی ثانیہ دوبارا اپنے کام میں مشغول ہوگئی۔ کھانے کے دوران بھی ہادی نے اپنی نظریں ثانیہ سے نہیں ہٹائیں ثانیہ نے جلد ہی اس بات کو محسوس کرلیا اور روما کو خدا حافظ کہہ کر گھر جانے لگی۔

"رکو ثانی یار میں تمہیں مزے داری کافی پلاتی ہوں۔"

"نہیں بہت دیر ہوگئی امی نے کہا تھا جلدی آنا امی نے پھوپو کی طرف جانا ہے۔"

"اچھا ابھی ٹھہر کے میں چکر لگاتی ہوں آخر میرا بھائی اتنے عرصے بعد باہر سے آیا ہے چاکلیٹس تو لایا ہی ہوگا سو میں اپنی اکلوتی سہیلی کو چاکلیٹ دینے آؤں گی آج کل تم ہماری طرف آنا بھول گئی ہو ثانی تم سے اس دغابازی کی امید نہیں تھی میرا بھائی آیا ہے یار بہن نہیں آئی میں پھر سے اکیلی ہوں تمہارے بغیر نہ مجھ سے پڑھائی ہوتی ہے نہ چائے حلق سے اترتی ہے۔"

"دراصل رومی ہادی بھائی آئے ہوئے ہیں تو میرا خیال تھا کوئی نہ کوئی مہمان تمہارے گھر آئے ہوں گے اس لئے گھر پر ہی اسٹڈی کرلوں گی اور یقین کرو مجھے بھی اسٹڈی کا مزہ نہیں آرہا کیونکہ تمہارے ساتھ پڑھنے کی عادت ہے تو بس پھر طے ہوگیا کہ کل سے تم میری طرف آؤ گی تم بھی تو میرے غریب خانے پر آسکتی ہو مسئلہ تمہارا اور میرے گھر کا نہیں"

"میں سکتھ میں تھی جب بھائی باہر گئے تھے اور تب سے ہم لوگ اکٹھے پڑھنا شروع ہوئے تھے میرے کمرے میں سو تمہارے بنا وہ کمرا کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے اور کہیں اور پڑھنا مشکل لگتا ہے تو کمنٹس مور کل سے تم میری طرف آرہی ہوں او کے۔"

"جو حکم سرکار کا۔"

"آج آپ بڑے دنوں بعد آئیں۔" ہادی نے ثانیہ کو دیکھا تو کہنے لگا آپ کو کوئی کام تھا ہادی بھائی ثانیہ نے بھائی پر خاصا زور دیتے ہوئے کہا۔

"نہیں یوں ہی پوچھا ہے اور بھائی تو میں صرف روما کا ہوں آپ مجھے اپنا فرینڈ سمجھ سکتی ہیں۔"

"ہادی صاحب یہ امریکا نہیں پاکستان ہے روما کے بھائی ہونے کی حیثیت سے میں نے آپ کو جو عزت دی تھی وہ بھی صرف سلام دعا کی حد تک تھی ورنہ تو میں آپ کو بلانا بھی پسند نہ کروں۔"

"آپ میری بے عزتی کر رہی ہیں خود کو سمجھ کیا رہی ہیں ۱۹۶۵ کی ہیروئن یہ پاکستان جس کا آپ ڈھنڈورا پیٹ رہی

ہیں اسی پاکستان کی لڑکیاں میری ایک کال پر کورٹ میرج کے لئے تیار ہو جائیں یہ تو دل ہے جو آپ پر آ گیا ورنہ لڑکیاں مجھ پر پروانوں کی طرح منڈلاتی ہیں۔"

ثانیہ نے ایک نظر ہادی کے سرخ سفید چہرے کی طرف دیکھا پھر ہاتھ میں ڈالے رنگ برنگے بینڈز پر نظر ڈالی اور دھیرے سے سخت لہجے میں بولی۔

"تو ہادی صاحب آپ شمع بن کر اپنے اردگرد پروانیاں اکٹھی کریں اور مجھے معاف کریں میرا ذوق اتنا خراب نہیں کہ میں آپ پر دوسری نظر بھی ڈالوں۔"

ہادی نے سارا غصہ دروازے پر نکالا اور چلا گیا ثانیہ نے شکر کا سانس لیتے ہوئے دل میں کہا یہی وجہ تھی جو میں تمہارے گھر نہیں آتی تھی سو یہ معاملہ بھی ختم ہوا۔

"لیں جناب گرما گرم چائے اب تھیوریز پلے پڑیں گی۔" روما نے ثانیہ کو گرم گرم چائے پکڑائی شکر ہے پیپرز ختم ہوئے اب ہم عملی زندگی میں قدم رکھیں گے تم تو ثانی کچن میں قدم رکھو گی۔" روما نے اس کے کھانے پینے کی عادت پر چوٹ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ بھی سچ ہے کیونکہ اماں نے بہت کام کر لیا اب رزلٹ آنے تک میں انشاءاللہ دھوبن ماسی اور باورچن کی حیثیت سے گھر میں کام کروں گی رانیہ ہانیہ مجھ سے چھوٹی ہونے کے باوجود امی کے ساتھ گھر کا کام کرتی رہی ہیں۔"

"ہم تو بھائی کا رشتہ ڈھونڈیں گے تم بھی ہمارے ساتھ رشتے دیکھنے چلنا بچی بڑا مزہ آئے گا۔"

"جی نہیں میں آپ کے ساتھ جانے کی بجائے اپنے گھر اپنا رشتہ دیکھنے آنے والوں کے لئے مزے مزے کے کھانے بناؤں گی۔

"اوہو آج تو بھیا جی لینے آئے ہیں چلو ثانی۔"

اور نہ چاہتے ہوئے بھی ثانیہ گاڑی میں بیٹھ گئی ہادی کی ڈرائیونگ کرتے ہوئے بھی نظر ثانیہ پر تھی روما اتر کے اندر گئی ثانیہ اترنے لگی تو ہادی نے اسے روکتے ہوئے کہا۔

"پلیز ثانی ایک منٹ بات سنو میرا نام ثانیہ ہے ثانی میں صرف اپنی فیملی اور فرینڈز کے لئے ہوں۔"

"او کے سوری مس ثانیہ یہ آپ کی سادگی ہے یا آپ کا حسن نظر مجھے یوں لگتا ہے میں آپ کے بنا نہیں رہ سکتا دیکھیں آپ میچور ہیں اور اس طرح کی ان میچور باتیں آپ کو سوٹ نہیں کرتیں اس لئے اس فضول بات کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔

"اچھا اگر میں اپنا رشتہ آپ کے گھر بھیجوں تو۔"

"میرے لئے رشتے کا انتخاب کرنا میرے والدین کا حق ہے۔"

"آپ انکار تو نہیں کریں گی رشتے کے لیے ہاں یا نہ کرنے کا اختیار میرے والدین کا ہے اگر آپ ان کی کسوٹی یا معیار پر پورے اترے تو اقرار یا انکار وہی کریں گے۔"

"اب مجھے جانا چاہئے۔"

"شکریہ ثانیہ بات سننے کا۔"

"ثانی تم کھانے میں آج کیا بنا رہی ہو؟"

"رات کے لئے تو کدو بنا رہی ہوں۔"

"فٹافٹ بریانی کباب قورمہ کڑاہی بنانا شروع کرو۔"

"کیوں جناب کی برتھ ڈے ہے یا میری لاٹری نکل آئی ہے۔"

"نہیں اس سے بھی بڑی بات ہے مابدولت بنفسِ نفیس اپنی اماں کے ساتھ تمہارا رشتہ لینے تمہارے گھر آ رہے ہیں اور تم نے کہا تھا جو میرا رشتہ دیکھنے آئے گا اسے میں مزے مزے کے کھانے کھلاؤں گی اب دروازہ بھی کھول دو

تمھارے گھر کے دروازے پر کھڑی ہوں۔"

"لیکن روما......

"لیکن ویکن چھوڑو بھائی نے خود تمھارا نام لیا ہے اور اب میں بیل پر ہاتھ رکھنے لگی ہوں۔"

ثانیہ جلدی سے دروازہ کھولنے چلی گئی اور پھر پتا ہی نہیں چلا وقت گزرنے کا اور ثانیہ مسز ہادی بن کر حجلہ عروسی میں پہنچ گئی سب لوگ دونوں کو چاند سورج کی جوڑی کہہ رہے تھے ہادی پر وقار سوٹ میں ڈیسنٹ لگ رہا تھا تو ثانیہ شرماتی ہوئی معصوم حسن کا شہکار جب ہادی کمرے میں داخل ہوا تو ثانیہ کا دل دھڑ کنے لگا ہادی نے ایک نظر ثانیہ پر ڈالی اور کہنے لگا۔

"محترمہ آج آپ کا مشرقی پن کہاں گیا آج تو آپ میری دسترس میں ہیں اگر آپ سمجھ رہی ہیں کہ میں نے آپ کے حسن سے متاثر ہو کر آپ سے شادی کی ہے تو یہ خیال اپنے دل سے نکال دیں میں نے اپنی ضد اور آپ کے غرور کی سزا آپ کو دینے کے لئے آپ سے شادی کی ہے ورنہ شادی تو مجھے اپنی گرل فرینڈ سے کرنی ہے جو امریکا میں ہے سو اب اپنے حسن اور مشرقی پن پر فاتحہ پڑھتے ہوئے سو جاؤ ہاں اگر مجھ سے معافی مانگ لو جو تم نے میری دوستی ٹھکرا کر کی تھی تو میں شاید چند حسین پل تمہاری جھولی میں ڈال دوں۔"

ثانیہ نے ایک نظر اپنے مجازی خدا پر ڈالی بیڈ سے اتری اور واش روم میں چلی گئی ہادی کی انا پر ایک اور ضرب پڑی اور وہ تلملا کر رہ گیا۔ ثانیہ نے کپڑے چینج کیے سادہ لباس پہنا بیڈ سے تکیہ اٹھایا اور فرش پر لیٹ گئی ہادی نے غصے میں لائٹ آف کی اور بیڈ پر لیٹ گیا۔

"او میری پیاری بھابھی۔" روما نے آواز لگائی ثانیہ نے اسے روکتے ہوئے کہا۔

"بھابھی نہیں ثانی صرف تمہاری دوست۔" ہادی نے ایک کٹیلی نظر ثانیہ پر ڈالی اور جب روما کپڑے سلیکٹ کرنے کے لیے اٹھی تو ہادی نے دبی آواز میں ثانیہ کو دھمکاتے ہوئے کہا۔

"ہمارے بیڈروم میں کیا ہوتا ہے اس بات کی خبر امی اور روما کو نہیں ہونی چاہیے۔

ثانی جب سے تمہاری شادی ہوئی ہے تم چپ چپ سی ہو گئی ہو کیا بات ہے مجھے نند نہ سمجھو پلیز اگر ہادی بھائی کی بھی کوئی بات ہے تو مجھ سے شیئر کرو یہ بات تمھارے اور میرے درمیان رہے گی۔ ثانیہ نے ایک لمحے کے لئے سوچا پھر دھیرے دھیرے شادی سے پہلے اور بعد کی ساری باتیں بتا دیں۔

"ثانی تم فکر نہ کرو تم نے ہادی بھائی کو ہر بات کا صحیح جواب دیا ہے ایک لڑکی کو ضد کی خاطر نہیں اپنایا جاتا تمھیں کبھی جھکنا نہیں پڑے گا ان شاء اللہ ہادی بھائی کو ان کی غلطی کا احساس میں دلاؤں گی بس جس طرح میں کہوں تم نے ویسا ہی کرنا ہے شریف لڑکیوں کی عزت نیلامی کے لئے نہیں پارسائی کے لئے ہوتی ہے اور مجھے بے انتہا خوشی ہے کہ میرے باپ کی نسل کی امین ایک پارسا اور مضبوط کردار کی عورت ہے۔ ثانی تم پر یہ سرخ رنگ کتنا سوٹ کرتا ہے۔"

روما نے ہادی کو آتے ہوئے دیکھا تو کہا ہے نہ بھائی ثانی اس رنگ میں کھلتا گلاب لگ رہی ہے نا ہادی نے ایک نظر ثانی پر ڈالی جو واقعی گلاب لگ رہی تھی پھر ہاں میں سر ہلا دیا۔

"بھائی تم کتنے خوش قسمت ہو تمھیں کتنی خوبصورت اور ذہین دلہن ملی۔

"اچھا باتیں نہ بناؤ میرے لئے کافی بنا کر لاؤ میرے سر میں شدید درد ہے ہادی نے چڑتے ہوئے کہا۔

"کافی اور میں میری بنی ہوئی کافی صرف میں ہی پی سکتی ہوں دوسرے کے لئے کافی پینا ایک امتحان ہے کافی تو ثانی کمال کی بناتی ہے جس دن آپ آئے تھے اس دن بھی ثانیہ کچن میں تھی اور کتنا زبردست کھانا بنایا تھا نا ثانی بھائی کے لئے کافی بنا کر رات کے لئے بریانی تو بنا لو۔

"ثانیہ کافی بنانے کے لئے اُٹھ گئی امی ابو نے ابھی تک بھابھی کو نہیں دیکھا کیوں نہ بھائی کو ہنی مون کے لئے امریکا بھیج دیں اور آپ اور میں بھی امریکا چلیں ابو کب سے کہہ رہے ہیں۔"

"اور ہمارا ابھی وزٹ ہو جائے گا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو ہادی نے گھبراہٹ میں کہا ثانی کیسے جا سکتی ہے۔"

"کیوں بھائی کیا ثانی کو انگلش نہیں آتی ثانی نے یونیورسٹی میں ٹاپ کیا ہے اچھا ہے ابو کو بھی شوق ہو رہا ہے ثانی سے ملنے کا۔"

"ہاں بیٹا رومی ٹھیک کہہ رہی ہے تمہارے ابو کئی بار آنے کا کہہ چکے ہیں میں رومی کی وجہ سے انکار کر دیتی تھی اب روما بھی فارغ ہے اچھا ہے بچیاں گھوم پھر لیں گی۔ میں تمہارے ابو کو کہتی ہوں وہ سب کے ویزوں کا انتظام کر دیں گے۔

"ثانی میں تمھیں پہلے ہی بتا رہا ہوں مجھ سے کسی قسم کی توقع مت رکھنا تم امی اور روما کے کہنے پر جا رہی ہو چھ مہینے تک مجھے رخصتی سے ہی شادی کرنی ہے اس لئے وہاں جا کر میرے سر پر مت سوار ہونا۔"

"میں یہاں بھی آپکے سر پر کبھی سوار نہیں ہوئی تو وہاں کیوں ہوں مجھے کوئی غرض نہیں آپ ایکس وائی زیڈ کسی سے بھی شادی کریں میں صرف اپنی طرف سے پہل نہیں کرنا چاہتی کیونکہ ایک تو اللہ کے نزدیک سب سے ناپسندیدہ لفظ طلاق ہے اور دوسرا مجھ سے چھوٹی بہنیں ہیں میری طلاق ان کی آنے والی زندگی پر برا اثر ڈال سکتی ہے ہاں اگر آپ مجھے خود طلاق دیں گے تو میں مظلوم اور آپ ظالم کہلائیں گے دوسرا میں اپنی دوست کی اور آنٹی کی محبت کی وجہ سے خاموش ہوں ورنہ نہ مجھے آپ کی سو کالڈ محبت سے کوئی غرض ہے اور نہ ہی آپ کے ساتھ گھومنے پھرنے کا کوئی شوق میں تو پھر آپ کی ضد ہوں لیکن آپ کی ذات میرے لئے جسٹ فار نتھنگ یعنی کچھ بھی نہیں۔"

ثانیہ نے سرد لہجے میں بات کو مکمل کیا اور ہادی اتنی واضح بے عزتی پر تلملا کے رہ گیا۔

ثانیہ اور روما شاپنگ کے بعد تھک گئیں تو ریسٹورنٹ کی طرف بڑھیں۔

"یار یہ امریکہ میں حلال اور اچھی چیز کھانا کتنا مشکل ہے مجھے تو لاہور یاد آ رہا ہے شاپنگ کے بعد کبھی انارکلی کے بھورے رینگل کی چاٹ گوالمنڈی کی ناشتہ فوڈ اسٹریٹ کی ریفرشمنٹ اور کھانا واقعی لاہور لاہور ہے۔" ثانی نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"ثانی آج تم مجھے بڑے عرصے بعد پرانے موڈ میں نظر آئی ہو مجھے اچھا لگ رہا ہے آؤ اس خوشی میں میں تمھیں لنچ کرواتی ہوں۔"

روما نے محبت سے ثانی کو دیکھتے ہوئے کہا روما نے ریسٹورنٹ کا دروازہ کھولا سامنے کی ٹیبل پر ہادی ایک شولڈر کٹ بالوں والی لڑکی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا عریاں لباس پہنے اس لڑکی کا ہاتھ ہادی کے ہاتھ پر تھا ثانی مڑنے لگی تو روما نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

اس سے اچھا موقع پوری زندگی نہیں ملے گا بے وقوف خود کو کمپوزر رکھو اور اگر ہادی بھائی نے کوئی بات کی تو منہ توڑ جواب دینا کم آن یار۔"

روما ہنستے ہوئے ٹیبل کی طرف بڑھی ہادی انہیں دیکھ کر پریشان ہو گیا۔

"روما تم یہاں کیا کر رہی ہو۔"

"بھائی ریسٹورنٹ میں لوگ کیا کرنے آتے ہیں کھانا کھانے سو ہم بھی کھانا کھانے آئے ہیں۔"

یہ کہتے ہی روما چیئر پر بیٹھ گئی اور ثانی کو بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔"

"بھائی امریکا آ کے تو آپ اخلاقیات ہی بھول گئے ہیں نہ اپنی بہن کو کھانے کا پوچھا اور نہ اپنی بیوی کو۔"

"واٹ ربش ہادی کیا یہ تمہاری بیوی ہے۔" لڑکی نے تیزی سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"میری بات سنو رخشی میں تمھیں ساری بات بتاتا ہوں۔"

"بھائی یہ آپ کی فرینڈ ہیں۔" روما نے پوچھا۔

"سوری ہم آپ کی پرائیویسی میں مخل ہوئے ہمیں اخلاقیات نبھانی آتی ہے۔ چلو روما کہیں اور لنچ کرتے ہیں۔" ثانیہ نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

‘‘امی بھائی تو امریکا آ کے بالکل بدل گئے ہیں وہ بھول گئے ہیں کہ وہ ہمارے ساتھ آئے ہیں روز صبح نکلتے ہیں رات کو گھر لوٹتے ہیں یوں جیسے امریکا ان کے لئے نیا ہو حالانکہ انہیں چاہیے تھا کہ یہ مجھے اور ثانی کو امریکا دکھاتے اور آج جب ہم ایک ہوٹل میں کھانا کھانے گئیں تو بھائی اپنی کسی گرل فرینڈ کے ساتھ بیٹھے تھے نہ انھوں نے ہمارا تعارف کروایا اور نہ کھانے پینے کا پوچھا میں تو بہن ہوں میری تو خیر ہے لیکن ثانی تو ان کی بیوی ہے امی سوچیں ان کی اس حرکت سے اس پر کیا گزری ہوگی ایک بیوی تھوڑی نہ برداشت کرتی ہے کہ اس کا میاں کسی اور لڑکی کے ساتھ وقت گزارے اور لڑکی بھی وہ جس دیکھ کر شرم سے آنکھیں جھک جائیں ایسا بیہودہ لباس پہن رکھا تھا جیسے کوئی ایکٹرس ہو۔’’ روما نے ثانی کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہادی کی امی سے کلاس لگوائی امی نے ہادی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

‘‘ثانی بچی مجھے شروع سے پسند تھی پڑھی لکھی شریف سلجھی ہوئی اور ہمارے ماحول میں رچی بسی پھر بھی میں اشارے سے بھی ان سے بات نہیں کی کہ تم باہر پلے بڑھے ہو جہاں تمھاری مرضی ہوگی وہیں تمھاری شادی کروں گی پھر تم نے خود ثانی کا نام لیا اور وہ تمھاری خواہش پر تمھاری زندگی میں شامل ہوئی لیکن میں بھی یہ بات نوٹ کر رہی ہوں کہ تمھارا اور اس کا رشتہ کاغذی سا لگتا ہے اپنے آپ کو درست کرو اور ثانی کو ٹائم بھی دو اور محبت بھی وہ میرے لئے بالکل روما جیسی ہے۔’’

ہادی نے شرمندگی کے عالم میں سر جھکایا اور کہا۔

‘‘امی آئندہ آپ کو مجھ سے شکایت نہیں ہوگی۔

‘‘رخشی تم مسلم ڈریس کیوں نہیں پہنتی ہادی اور رخشی ایک ہوٹل میں لنچ کر رہے تھے جب ہادی نے اس کے اسکرٹ پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

‘‘مسلم ڈریس کیا مطلب۔’’

‘‘یعنی ایسا لباس جو جسم کو عریاں نہ رہنے دے۔

‘‘ہادی تم اتنے سال امریکا میں رہنے کے باوجود ایسی بات کر سکتے ہو بلیو نہیں ہو رہا تم پر تمھاری پینڈو بیوی کا اثر تو نہیں ہو گیا واقعی تمھارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے ایسی دبو اور دوپٹے میں لپٹی لڑکی تمھارے قابل نہیں جس طرح تمھاری آؤٹ کلاس ایجوکیشن ہے اور تم نے بزنس رن کرنا ہے تمہیں مجھ جیسی لڑکی سوٹ کرتی ہے جو بزنس کمیونٹی میں تمھارے ساتھ قدم سے قدم ملا کے چل سکے۔

‘‘او کے یار جیسے تم خوش۔’’

ثانی اپنے لمبے بال سلجھا رہی تھی جب روما نے ہادی کو آتے دیکھا تو کہنے لگی۔ ثانی تمھارے بال کتنے خوبصورت ہیں اس دن بھائی کی پرکٹی کبوتری دوست کو دیکھ کر مجھے احساس ہوا امی ٹھیک کہتی ہیں عورت کی خوب صورتی اس کے بالوں میں ہوتی ہے امی جب بھی تمھارے لمبے بال دیکھتی تھیں تو مجھے گنجی کبوتری کہتی تھیں شکر ہے کہ اب میرے بال گھٹنوں تک پہنچ گئے ہیں ہادی نے بھی پہلی مرتبہ ثانی کے بالوں کو ستائشی نظروں سے دیکھا ورنہ اس نے ہمیشہ بالوں کو چٹیا میں لپیٹ کے رکھا ہوتا تھا

ہادی کمرے میں داخل ہوا تو ثانی نے بالوں کو لپیٹا سر پر دوپٹہ لیا اور نماز پڑھنے لگی روما کمرے سے باہر گئی تو ہادی بیڈ پر لیٹ کر فرصت سے اسے دیکھنے لگا معصوم حسن اور پاکیزگی کا مرقع چہرے پر نور نماز کی وجہ سے تھا یا معصومیت کی وجہ سے ہادی فرق نہ کر پایا اسے یوں لگا جنت کی حور راستہ بھول کر آ گئی ہو ثانی نے نظروں کی تپش محسوس کی اور ایک کڑی نظر ہادی پر ڈال کر اپنا تکیہ بیڈ سے اٹھانے لگی۔

‘‘یہیں سو جاؤ۔’’

‘‘بہت بہت شکریہ ہادی صاحب میں اپنی جگہ پر ہی ٹھیک ہوں۔’’

‘‘رخشی تم بھی بال بڑھاؤ بالوں میں عورت کا حسن ہوتا ہے۔’’

‘‘لمبے بال مجھے پسند نہیں اور مجھ سے لمبے بال سلجھائے بھی نہیں جاتے ویسے بھی مجھے کٹنگ پسند ہے

ثانی میں نے کل بھائی کو دیکھا تھا وہ چوری چوری تمھاری طرف دیکھ رہے تھے۔

لیکن روما مجھے ایسی زبردستی کی محبت نہیں چاہیے جو تم انھیں میری طرف متوجہ کر کے چاہ رہی ہو نہیں ثانی میں جانتی بھائی تمھیں واقعی پسند کرتے ہیں محض اپنی انا اور ضد کے قیدی ہیں اور تم تھوڑی نہ جھک رہی ہو چیر اپ یار خوش رہو

ثانی تمھیں شوخ کلرز تو سوٹ کرتے ہی ہیں لیکن یار تم لائٹ کلرز میں تو اور ڈیسنٹ اور پروقار لگتی ہو ہادی نے ثانی کو دیکھا جو آف وائٹ سوٹ میں ڈول لگ رہی تھی۔

“پبلک پلیس پر جانا ہو تو لائٹ کلرز مناسب ہوتے ہیں تاکہ لوگ گھور گھور کے نہ دیکھیں چلو اب چلیں۔”

رخشی نے آج آتشی کلر کا اسکرٹ پہنا ہوا تھا جب دونوں بار میں ایک ساتھ داخل ہوئے تو کئی لوگ ہوس بھری نظروں سے رخشی کے شارٹ اسکرٹ سے عریاں بدن کو دیکھا۔”

“رخشی تم نے میرے ساتھ آنا ہو تو ریزن ایبل لباس اور کلر پہنا کرو تاکہ لوگ تمھیں گھور گھور کے نہ دیکھیں۔

“ہادی تم میں کسی جاہل انسان کی روح آ گئی ہے یا تمھاری سو کالڈ بیوی کا تم پر اثر ہو گیا ہے ابھی میں شاپنگ مال میں اسے اور تمھاری بہن کو دیکھ کر آئی ہوں ماسیوں والے رنگ پہنے کم تر لوگوں جیسی جن پر کوئی ایک کے بعد دوسری نظر نہ ڈالے تم مجھے ان کی طرح دیکھنا چاہتے ہو میں تم جیسے ڈبل پرسنالٹی کے لوگوں کو پسند نہیں کرتی۔

“گیٹ لاسٹ اب مجھے اپنی شکل نہ دکھانا میری بیوی ان پڑھ پینڈو اور ماسی نہیں جو ڈگری تم نے رو رو کے نقل کر کے لی ہے اس نے وہ ڈگری یونیورسٹی سے ٹاپ کر کے لی ہے وہ خوب صورت اتنی ہے کہ جو پہنے اسے جچ جاتا ہے اسے ضرورت نہیں کہ وہ تمھاری طرح اپنے آپ کو عریاں کرے وہ جنت کی حور ہے اور تم پرکٹی شیطانی کبوتری گو ٹو ہیل ہادی نے غصے سے ہاتھ چھڑایا اور بار سے باہر آ گیا

“ثانی آجکل بھائی نہ سیل پر بزی ہوتے ہیں نہ باہر جاتے ہیں اور نہ کافی دنوں سے وہ رخشی عرف رکشہ ان کے ساتھ نظر آئی ہے ان کی پریشانی اور اداسی کے لیے بس آخری چوٹ کی ضرورت ہے جس کا میں نے بندوبست کر لیا ہے۔

“تم کیا کرنے لگی ہو روما۔”

“یہ تمھارے لئے بھی سرپرائز ہے۔”

“روما آج واک کرنے پارک میں نہیں جانا۔”

“نہیں ثانی آج طبیعت ٹھیک نہیں تم چلی جاؤ گھر کے سامنے تو پارک ہے۔” ثانی چہل قدمی کر رہی تھی جب اس نے اپنے یونیورسٹی فیلو ارمان کو دیکھا۔

تم یہاں کیسے۔

مجھے یہاں جاب مل گئی ہے۔

سو منڈا روپیہ کمانے یہاں آ گیا۔

دونوں واک کرتے ہوئے یونیورسٹی کی یاد کرنے لگے۔

ہادی بھائی آپ کہاں ہیں ٹیرس پر آئیں اتنا اچھا موسم ہو رہا ہے کمرا بند کیے پڑے رہتے ہیں۔

روما ہادی کو زبردستی کھینچتے ہوئے ٹیرس پر لائی۔

ارے یہ ثانی کے ساتھ کون کھڑا ہے روما نے ثانی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

کون ہے یہ ہادی غصے میں بولا۔

میری طرف تو دیکھتی بھی نہیں اب کیسے ہنس ہنس کے بات کر رہی ہے دماغ درست کرتا ہوں اس کا ہادی جلدی باہر کی طرف بھاگا روما ہنستے ہوئے واپس چلی گئی

تم جیسی یونیورسٹ میں تھی اب بھی بالکل ویسی ہی ہو میں نے تمھیں لائک کرتا تھا پر روما نے صحیح دوستی نبھائی اور تمھیں لے اڑی اور میرا چانس مار دیا تم یونی میں اتنا لئے دئے رہتی تھی کہ بات کرنے کی ہمت نہیں ہوئی لیکن میں اپنی امی کو

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
ایڈ فری لنکس
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety
پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1
پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بُک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

i. Open Paksociety Page.
ii.Click Liked.
iii.Select Get Notifications.
iv.Select See First.

All Done

Liked
Message
Get Notifications
Add to Interest Lists...
Unlike
IN YOUR NEWS FEED
See First
See new posts at the top of News Feed
Default
See posts as usual
Unfollow

http://paksociety.com

تمھارے گھر رشتے کے لیے بھیجنے والا تھا۔

ہادی نے ثانی کا ہاتھ پکڑا اپنی امی کو کہیں اور بھیجیں یہ میری بیوی ہے چلو تم۔

آپ میری بات تو سنیں مجھے اخلاقیات نبھانی نہیں آتیں اور یہ بات تم اچھی طرح جانتی ہو۔

روما تمھارا بھائی بالکل جنگلی ہے پارک میں مجھے ارمان مل گیا وہ مجھ سے بات کر رہا تھا اور تمھارا جنگلی بھائی اتنی اکورڈ سچویشن کر کے مجھے وہاں سے لے آیا پتہ نہیں ارمان میرے بارے میں کیا سوچے گا۔

کچھ نہیں سوچے گا وہ میری دریافت ہے اور اس نے میرے مطابق کام کیا اور بھائی تم سے محبت کرتے ہیں ورنہ رخشی کو کل دوسرے لڑکے کے ساتھ دیکھ کر ان پر کوئی اثر نہیں ہوا اور تمھارے لئے بھاگتے ہوئے گئے میرا بھائی سدھر گیا ہے سو تم بھی میری دوست سے میری بھابھی کے عہدے پر سرفراز ہو جاؤ کیونکہ اب میں نند کا رول پلے کرنے لگی ہوں۔

تم سے تو اللہ بچائے۔

ثانی حسب معمول اپنا تکیہ اُٹھا کر نیچے سونے لگی تو ہادی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا سوری ثانی میں غلطی پر تھا لڑکیوں کو تمھاری طرح ہونا چاہئے تمھاری جگہ نیچے نہیں میرے دل میں ہے اب مجھے معاف کر دو۔

ہادی نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

پلیز ہادی ایسے مت کریں دیر آید درست آید ہوتا ہے آپ کے تو نام کا مطلب بھی ہدایت والا ہے مجھے خوشی ہے کہ اب آپ اسم بامسمیٰ ہو گئے ہیں ثانیہ نے ہنستے ہوئے کہا روشن راہیں اب ان کی منتظر تھیں۔

……☆☆……

یقین کامل

فاطمہ عبدالخالق

جب انسان یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اس کی تپسیا کامیاب ہوئی تبھی ٹھوکر اسے منہ کے بل گراتی ہے۔

کہتے ہیں خواب دیکھنا انسان کا پیدائشی حق ہے، ہر شخص اپنا اک جہاں آباد کرتا ہے چھوٹے چھوٹے خواب، تتلیوں کی مانند رنگا رنگ، ایسا ہی اک خواب نگر اس کا بھی تھا لیکن اس کے حصے میں تعبیر کی بجائے کرچیاں آئی تھیں جنھوں نے اس کی ذات کو لہولہان کیا تھا کانچ کے ٹکڑوں کی طرح اسے بکھیرنا چاہا تھا مگر اس کی خوبی یہ تھی کہ وہ سمیٹنے کے ہنر سے واقف تھی وہ یقین کامل رکھتی تھی اور یقین کامل کبھی بھی کسی نفس کو بکھرنے نہیں دیتا چوٹ کتنی ہی گہری کیوں نہ ہو، گھاؤ کیسا ہی جان لیوا کیوں نہ ہو یقین کامل بالکل ایسے ہی مرہم لگا کر پرسکون کرتا ہے جیسے کسی زخمی کے گھاو پر پھاہا رکھ دیا جائے تو درد کی شدت آہستہ آہستہ کم ہوتے ہوتے ختم ہو جاتی ہے اسی طرح لیلی کے درد کی شدت بھی کم ہوتے ہوتے اپنا وجود مٹا گئی نقش کچھ باقی تھے مگر وقت اسے بھی مٹا نا دیتا ہے وہ صرف ایک عزت دار زندگی گزارنا چاہتی تھی اسنان علی نے خود ہی اس کا ہاتھ تھاما تھا مگر جیسے ہی اسے اصلیت پتہ چلی وہ دامن چھڑا گیا کیونکہ وہ بھی ایک نام نہاد معاشرے کا مرد تھا۔

مگر اس کے الفاظ ستارہ بیگم کو از بر تھے کس طرح سے ایک پاک دامن پر بہتان لگایا گیا تھا یہی طرز اب معاشرے میں پروان چڑھ رہا تھا وہ بے بس تھیں ازالہ کیسے کرتیں۔

……☆☆……

لیلی ہوسٹل بند ہونے کی وجہ سے حویلی آئی ہوئی تھی تنہا بیٹھی وہ کسی سوچ میں گم تھی چونکی تب جب ستارہ بیگم نے اس کی کندھے پر ہاتھ رکھا اور مخاطب ہوئیں

”میری بات مان لو لیلی! اور گھنگھرو سے ناتہ جوڑ لو ہمارے خاندان کا اور ان گھنگھروں کا برسوں کا ساتھ ہے۔ تیری ماں نے بھی ان کا ساتھ چھوڑا تھا تو انگاروں پر ننگے پاوں چلی تھی تبھی تو دنیا سے منہ موڑ گئی۔“

اس کی نانی ستارہ بائی اسے سمجھاتے ہوئے آبدیدہ لہجے میں بولیں۔

"نانو! میں عزت کی زندگی جینا چاہتی ہوں، میں محفل کی نہیں گھر کی زینت بننا چاہتی ہوں، عام عورتوں کی طرح میرے بھی چھوٹے چھوٹے خواب ہیں میں ان میں حقیقت کا رنگ بھرنا چاہتی ہوں۔ لازم تو نہیں میری ماں کے ساتھ کسی مرد نے برا کیا تو میرے ساتھ بھی یہی ہو۔" ملیلی شدت دکھ سے بولی تھی۔

مگر اسنان علی نے تو ایسا ہی کیا ہے نا؟

"چندا میری جان تم ستارہ بائی کی نواسی اور شینا جانم کی بیٹی ہو اس معاشرے کا کوئی مرد تیرے خوابوں میں حقیقت کا رنگ بھرنے نہیں آئے گا، تمہاری پاک دامنی کا یقین کون کرے گا، باہر کی دنیا کی کالی بھیڑوں سے اپنے کوٹھے کا راج اچھا ہے کم از کم عزت تو محفوظ رہتی ہے۔" ستارہ بائی لیلی کو قائل کرنے کے انداز میں بولیں۔

"گھنگھرو باندھ کر غیر مرد کا دل لبھانا اور ادائیں دکھانا' اس کام سے مجھے سخت نفرت ہے میں یہ کام نہیں کروں گی۔" ملیلی سختی سے بولی۔

"ملیلی! یہ مردوں کا معاشرہ ہے شینا جانم کی بیٹی کو عزت سے جینے نہیں دے گا۔ دیکھ میری بات مان لے۔ اب تو تیرا یونیورسٹی کا بھی آخری سمیسٹر ہے۔ میری زندگی کا کیا بھروسہ میرے بعد یہ بھیڑیے تجھے نوچ کھسوٹ لیں گے۔" ستارہ بائی آہ بھرتے ہوئے بولیں۔

"نانو! سارے مرد ایک جیسے نہیں ہوتے، اچھے مرد بھی اسی دنیا کا حصہ ہیں۔ مجھے یقین ہے وہ آئے گا اور میری پاک دامنی کا یقین کرے گا۔ میں اپنے بنانے والے پر یقین رکھتی ہوں' وہ مجھے میرے خواب حقیقت کے رنگ بھر کر لوٹائے گا' یہی میرا یقین کامل ہے۔ اسنان ایک دھوکا تھا' آزمائش تھا۔ آپ اسے بھول جائیں۔ میں بھی اسے بھول گئی ہوں۔" ملیلی مستحکم لہجے میں بولی تھی۔

"ملیلی! میری جان تم کن مردوں کی بات کر رہی ہو؟ کردار کے ہلکے، ظاہری حسن کا دم بھرنے والے، حسن و ہوس کے پجاری۔ تم مان کیوں نہیں لیتی کہ تم ستارہ بائی کی پوتی ہو اور اس کی قسمت بھی یہی کوٹھا ہے۔"

"نانو! دنیا میں اچھے مرد بھی ہوتے ہیں مضبوط کردار کے حامل اور انہیں ظاہری خوب صورتی سے زیادہ باطنی خوب صورتی متاثر کرتی ہے۔" ملیلی نے دلکشی سے مسکراتے ہوئے ستارہ بیگم کو وضاحت دی۔

ستارہ بیگم چند لمحے خاموشی سے اس کا چہرہ تکتی رہیں اور پھر آہستگی سے بولیں۔ "میرے ساتھ وعدہ کر لیلی! اگر اب کی بار تجھے خوابوں کے رنگ نہ ملے تو تو ان گھنگھروں کی ساتھی بنے گی اور اپنی خوب صورت آواز کا سحر پھونکو گی۔

"نہیں نانو! میں مرتے دم تک یہ کام نہیں کروں گی میں ساری زندگی انتظار تو کر سکتی ہوں مگر گھنگھروں کا ساتھ نہیں نبھا سکتی۔"

"ملیلی میری جان! یہ دنیا بڑی بھیانک ہے' ایسی ٹھوکر لگاتی ہے کہ بندہ خاک چاٹنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔" ستارہ بیگم تھکے ہارے لہجے میں بولی تھیں۔

"نانو! جسے یقین کامل ہو وہ کبھی منہ کے بل نہیں گرتا بلکہ مالک کائنات اسے اپنے سائے میں پناہ دیتا ہے۔"

ستارہ بیگم کو نواسی کے یقین نے حیرت زدگی کا شکار بنا دیا۔ وہ گم صم ہو گئیں جیسے الفاظ کھو گئے ہوں اور پھر مدہم سے لہجے میں بولیں۔

"میں دعا کروں گی تیرا یقین کامل رہے چلو اب سو جاؤ رات بہت ہو گئی ہے صبح تم نے ہوسٹل واپس جانا ہے۔" ستارہ بیگم لیلی کی پیشانی کا بوسہ لیتے ہوئے اٹھ گئیں اور لیلی کے کمرے کی لائٹ بند کر کے اپنے کمرے کی جانب چل دیں آج کی رات ان پر بھاری پڑنے والی تھی۔ وہ ایک بار پھر اذیت سے گزر رہی تھیں۔ شینا جانم کی یاد پھر سے ان پر حملہ آور ہوئی اور وہ بیٹی کی یاد میں آنسو بہاتے بہاتے نجانے کب نیند کی وادیوں میں کھو گئیں

……☆☆……

اس کا یونیورسٹی میں آخری سمیسٹر چل رہا تھا، اسکول سے لے کر کالج تک اس نے کوئی دوست نہیں بنائی تھی یہی روش اس کی یونیورسٹی میں تھی کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی اس کے خاندان کے بارے میں سوال پوچھے کیونکہ اس کے پاس انہیں دینے کے لیے کوئی جواب نہیں تھا اس لیے وہ خاموش، محتاط اور اپنی ذات میں مگن رہتی تھی بہت سی لڑکیاں اسے مغرور ساحرہ کے نام سے پکارتی تھیں ان کے خیال میں لیلیٰ زبیری کو اپنے حسن پر بہت غرور ہے اکثر لڑکیاں اسے دیکھ کر ایک دوسرے کے کان میں کھسر پسر کرتیں، ہاتھ پر ہاتھ مارتیں اور قہقہے لگاتی نظر آتیں مگر وہ انہیں نظر انداز کر دیتی آج بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ مگر وہ انھیں نظر انداز کرتی کلاس کی جانب چل دی آج سر نجھان کی اسائنمنٹ جمع کروانے کی آخری تاریخ تھی یہی سوچ کر اس کے قدموں میں تیزی آ گئی

کلاس میں آئی ابھی تک سر نہیں آئے تھے وہ ایک طرف خاموشی سے بیٹھ گئی ہمیشہ کی طرح وہ کلاس سے الگ ہی تھی سر کلاس میں آئے اور کلاس کے آخر میں جاتے جاتے کلاس سے کہہ گئے سب اپنی اسائنمنٹ مس لیلیٰ کو جمع کروائیں اور پھر اس سے مخاطب ہوتے ہوئے بولے مس لیلیٰ آپ اسائنمنٹ لے کر میرے آفس آیئے گا اور یہ جا وہ جا وہ سر کی بات پر الجھ گئی تھی خاموشی سے کلاس سے اسائنمنٹ لیں اور ابھی ابھی سر نجھان کے آفس کی جانب چل دی

”مے آئی کم ان سر؟“ آفس کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے بولی

”یس کم ان۔“ سر نجھان کی آواز آئی۔

اس نے جھجکتے ہوئے سامنے ٹیبل پر اسائنمنٹ رکھ دی اور واپس پلٹنے لگی تھی کہ سر نجھان بولے۔

”رکیے مس لیلیٰ۔“

وہ پلٹی اور خاموشی سے کھڑی رہی۔

”بیٹھیے مس لیلیٰ! آپ سے بات کرنی تھی۔“

وہ ابھی ابھی ہی بیٹھ گئی آج سر کا رویہ عجیب سا تھا۔

”کیا آپ کی کسی سے کمٹڈ یا انگیج ہیں؟“

اس نے حیرانی سے سر اٹھا کر سر نجھان کی طرف دیکھا۔ سر اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔

نظر جھک گئی اور مضبوط لہجے میں بولی۔ ”یہ میرا ذاتی معاملہ ہے آپ کا یہ سوال پوچھنے کا مقصد کیا ہے؟“ پرانے زخم تازہ ہوئے تھے۔

”میں کوئی گھما پھرا کر بات نہیں کرنا چاہتا مس لیلیٰ! آپ مجھے اچھی لگتی ہیں۔ میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور اس کے لیے آپ کے گھر آنا چاہتا ہوں اسی لیے پوچھ رہا ہوں۔“

”کوئی اچھا لگے تو کیا اس سے شادی کر لیتے ہیں اس کے بارے میں جانے بغیر؟“ اس کا لہجہ عجیب سا تھا۔

”میں جانتا ہوں آپ مضبوط کردار کی لڑکی ہیں اس سے زیادہ مجھے کچھ نہیں جانتا۔ میں کسی ٹین ایجر لڑکے کی طرح اظہار محبت نہیں کروں گا مگر اتنا وعدہ کرتا ہوں کہ میری سنگت میں آپ کی زندگی خوشگوار ہو گی ان شاء اللہ۔“

”میری سنگت حاصل کرنے کے لیے اگر آپ کو کانٹوں بھرے رستے کا سفر طے کرنا پڑے تو؟“ وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔

سر نجھان اس کے لہجے پر مسکرائے ضرور تھے اور بولے۔ ”میں آپ کا ساتھ ہر راستے پر نبھاؤں گا آپ ہر موڑ پر مجھے اپنے ساتھ پائیں گی۔“

”کیا آپ ہمیشہ ان الفاظ کا پاس رکھیں گے؟“ وہ بے اعتباری سے بولی۔

”میرا عمل میرے الفاظ کی ترجمانی کرے گا۔“ سر نجھان بولے۔

”آپ جلد بازی میں فیصلہ کر رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے مستقبل میں آپ اس فیصلے پر پچھتائیں۔“ وہ بولی۔

”مس لیلیٰ! ڈھائی سال کم نہیں ہوتے کسی فیصلے پر کاربند ہونے کے لیے۔“ اس بار سر نجھان دلکشی سے مسکرائے تھے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

وہ چند لمحے سرنجھان کی طرف دیکھتی رہی اور پھر گویا فیصلے پر پہنچی اور بولی۔

"چلیں ٹھیک ہے میرے والدین حیات نہیں ہیں میں اپنی نانو سے آپ کا ذکر کروں گی۔"

"مس لیلی! میں آپ کو خوش رکھوں گا بے فکر رہیں۔" سرنجھان سرشار سے لہجے میں بولے۔

جاتے جاتے اچانک لیلی کی نظر سرنجھان پر پڑی آج سے پہلے کبھی اسے سرنجھان کی مسکراہٹ اتنی خوب صورت نہیں محسوس ہوئی تھی سرنجھان اسی کی طرف دیکھ رہے تھے وہ نظریں چرائی خدا حافظ کہہ کر ان کے آفس سے نکل گئی۔ یہ دیکھے بغیر کہ اس کی ہاں نے ان کے چہرے پر محبت کے کتنے خوب صورت رنگ بکھیرے تھے

......☆☆......

جیسے ہی وہ یونیورسٹی سے ہاسٹل واپس آئی سب سے پہلے اس نے ستارہ بیگم کو فون کیا تھا اور انھیں ساری صورت حال بتا دی تھی جو آج اس کی سرنجھان سے گفتگو ہوئی تھی۔

ستارہ بائی کو لیلی کی باتیں سن کر یقین سا ہوا کہ نجھان ضرور ان کی نواسی سے محبت کرتا ہے مگر انہیں معاشرے کی نام نہاد عزت کے ٹھیکے داروں کا بھی علم تھا۔ تب ہی وہ بولیں۔

"میری چندا! تم نے اسے بتایا تو نہیں کہ تم شینا جانم کی بیٹی ہو؟"

"نہیں نانو! میں نے نہیں بتایا مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی مگر میں چاہتی ہوں انھیں آپ بتائیں۔"

"نہیں لیلی! اگر تمہیں عزت سے سر اٹھا کر جینا ہے تو تجھے نجھان بیٹے سے یہ بات چھپانا ہوگی۔" ستارہ بیگم بولیں۔

"مگر نانو! ہم جھوٹ کیوں بولیں؟ آپ نے کون سا گناہ کیا ہے؟ سر اور سنگیت کے ساتھ ہی تو زندگی جوڑی تھی۔ لوگ آپ کے فن کی قدر کرتے ہیں تو پھر یہ سب کیوں نانو کیوں؟" لیلی تڑپ کر بولی۔

"میری جان! تم بہت معصوم ہو تمہیں اس معاشرے کے نام نہاد مردوں کا نہیں پتہ وہ دوسری عورت کو یہ سب کرتے دیکھ کر سر دھنتے ہیں مگر شادی نہیں کرتے اور اگر کر بھی لیں تو نبھا نہیں پاتے۔ میں نہیں چاہتی کہ ایک اور شینا جانم جنم لے پھر اسنان کی مثال تمہارے سامنے ہے۔" ستارہ بیگم بولیں۔

"مگر نانو! جھوٹ پر مبنی رشتوں کی بنیادیں بھی کمزور ہوتی ہیں۔" لیلی الجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ "اور لازم تو نہیں ہر مرد اسنان کی طرح سطحی سوچ کا مالک ہو۔"

"تم چاہتی کیا ہو آخر لیلی! سوچ لو، تمہیں جھوٹ بول کر خوشیوں کا ہاتھ تھامنا ہے یا پھر گھنگھرو باندھ کر سر کی لے پر ڈانس کرنا ہے کیونکہ کسی مرد کا ظرف اتنا نہیں کہ وہ ایک بائی کی پوتی سے شادی کرے اور اگر کوئی ستارہ بائی کی پاک دامن پوتی پر تہمت لگائے تو یہ ستارہ بائی کو منظور نہیں۔" ستارہ بیگم درشتی سے بولی تھیں۔

"ٹھیک ہے نانو جیسا آپ چاہیں مگر اگر میں سچ نہیں بولوں گی تو جھوٹ بھی نہیں بولوں گی آپ جو چاہے کریں میں آپ کو نہیں روکوں گی۔" لیلی ہارے ہوئے لہجے میں بولی تھی۔

"سدا خوش رہو میری چندا۔" ستارہ بیگم نے دعائیں دیتے ہوئے فون بند کردیا۔

......☆☆......

ستارہ بیگم نے نجھان کے والدین سے ملاقات کرنے اور لیلی کی شادی طے کرنے کے لیے ایک فلیٹ کرایے پر لے لیا وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ ان کی حویلی آئیں اور وہ ان کی حقیقت سے آگاہ ہوں

آج نجھان کے والدین ستارہ بیگم سے ملنے آنے تھے۔ ستارہ بیگم نے ان کا پرتپاک استقبال کیا نجھان کی والدہ محبت پاش نظروں سے لیلی کو بار بار دیکھتی تھیں۔

خوشگوار ماحول میں باتیں ہورہی تھیں کہ اچانک ستارہ بیگم بولیں۔ "میں چاہتی ہوں کہ لیلی اور نجھان کی شادی سادگی سے ہو اور مسجد میں نکاح پڑھایا جائے جہیز کی بجائے میں نے لیلی کے اکاؤنٹ میں پیسے جمع کروا دیے ہیں۔ لیلی جو لینا چاہے شادی کے بعد اپنی مرضی سے لے سکتی ہے۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

''ہمیں جہیز وغیرہ نہیں چاہیے۔ ہمارے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ ہمیں بس آپ کی نواسی آپ کے جگر کا ٹکڑا چاہیے۔'' نجھان کی والدہ محبت سے بولیں۔

''میں ذرا جلدی شادی چاہتی ہوں۔ مجھے ملک سے باہر جانا ہے اس لیے جانے سے پہلے میں لیلی کے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتی ہوں۔''

نجھان کے والد بولے۔ ''اگلے جمعے کا دن رکھ لیتے ہیں ہم نے سادگی سے نکاح ہی پڑھانا ہے۔''

یوں ایک ہفتے بعد ان کے نکاح کی تاریخ رکھ دی گئی تھی۔

تاریخ مقرر کرنے کے بعد نجھان کے والدین نے اجازت چاہی اور ستارہ بیگم انہیں دروازے تک رخصت کرنے گئی تھیں۔

نجھان کے والدین کے جاتے ہی وہ پھٹ پڑی۔ ''نانو! آپ کو آخراتنی جلدی کیوں ہے اور آپ نے باہر کیوں جانا ہے؟ کہاں جانا ہے؟ کس کے پاس جانا ہے؟''

''پنڈی میں پرانی حویلی جاؤں گی اور یہ فلیٹ خالی بھی تو کرنا ہے کرایے کا ہے میں نے یہ جھوٹ تیرے لیے بولا ہے میری جان تا کہ تمہارے خواب بکھرنے نہ پائیں۔'' ستارہ بیگم سمجھانے والے انداز میں بولیں۔

لمحے بھر لیے اس نے ستارہ بیگم کی طرف دیکھا اور آنکھوں میں آنسو اور ہونٹوں پہ مسکراہٹ سجاتے ہوئے۔

''آپ دنیا کی سب سے اچھی نانو ہیں۔'' وہ ستارہ بیگم کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے پیار سے بولی۔ ستارہ بیگم ہولے سے مسکرا دیں

......☆☆......

ایک ہفتہ لمحوں میں گزرا اور شادی کا دن آن پہنچا، ستارہ بیگم کی خواہش کے مطابق نکاح مسجد میں پڑھایا گیا اور سادگی سے رخصتی کر دی گئی

وہ کمرے میں بیٹھی نجھان کا انتظار کر رہی تھی دروازہ کھلا اور نجھان کے قدم بیڈ کی جانب بڑھنے لگے اور اس کے قریب بیٹھ گئے وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی اسے سمجھ نہیں آیا کیا بات کرے کہ اچانک نجھان نے اس کا گھونگھٹ الٹ دیا وہ نظریں جھکائے کانپ رہی تھی اور نجھان مبہوت سا بے خودی کے عالم میں اسے تک رہا تھا۔

''تم واقعی ساحرہ ہو لیلی! تمہارا یہ حسن میرے دل و دماغ پر سحر طاری کرتا ہے۔ میرے حواسوں پر تم چھا جاتی ہو میں خود کو بے بس محسوس کرتا ہوں۔ میں آج بہت خوش ہوں میری لگن اور میرے جذبے سچے تھے تبھی آج منزل میرے سامنے مجسم شکل میں موجود ہے میں تم سے ایک جائز رشتے سے اظہار محبت کرنا چاہتا تھا۔ تم میری زندگی کا وہ خوب صورت سپنا ہو جس کی تعبیر سہانی ہے۔'' وہ حیرت زدہ انداز میں نجھان کو سن رہی تھی۔ شرم سے سر جھکا جا رہا تھا۔

نجھان نے جب اپنی باتوں کے جواب میں سر جھکاتے دیکھا تو شرارت سے بولے۔

''لیلی! کوئی چلہ وغیرہ کاٹنا ہے جو مراقبے میں ہیں۔'' وہ مزید گھبرا گئی اور وہ میں یہ وہ کرتی رہ گئی نجھان نے آگے بڑھ کر اسے بانہوں میں بھر لیا چہرے سے چہرہ ملا، سانسوں کی سرگم ملی تو نجھان نے خوابیدہ لہجے میں لیلی کے کان میں سرگوشی کی۔

''میری شدتیں تمہیں مجھ سے بے پناہ محبت پر مجبور کر دیں گی۔ نجانے کیوں لیلی کی آنکھ سے ایک آنسو ٹپکا تھا۔ ''نہیں میری جان! اب رونا نہیں پلیز میں تمہاری ان ساحر آنکھوں میں آنسو نہیں اپنی محبت کے رنگ دیکھنا چاہتا ہوں۔'' وہ روتے روتے مسکرائی تھی۔ نجھان مبہوت سا دھوپ چھاؤں کا تال میل دیکھ رہا تھا۔ ''وہ میں دراصل یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ ہمیں اپنی زندگی کی شروعات رب کے حضور شکرانے کے نوافل ادا کرتے ہوئے کرنی چاہیئے۔''

نجھان مسکرا دیا اسے لیلی پر اپنی محبت اپنے انتخاب پر فخر محسوس ہوا اور یوں ایک پاکیزہ محبت نے خدا کے حضور سر جھکاتے ہوئے خالق کائنات کا شکر گزارتے ہوئے نئی زندگی کا آغاز کیا تھا۔

صبح کاذب جب لیلی کی آنکھ کھلی تو نجھان پہلو میں سو رہا تھا وہ محویت سے اسے تکنے لگی، اچانک نجھان نے آنکھیں کھول

دیں وہ ایک دم گھبرا گئی جیسے چوری پکڑی گئی ہو۔

نجھان کی آنکھوں میں شرارت واضح نظر آرہی تھی۔ ”غور سے دیکھ لو میں آنکھیں بند کر لیتا ہوں‘ آپ کی ذاتی جاگیر ہوں‘ آپ کو چوری چوری تکنے کی کیا ضرورت ہے۔“

”بس آپ کو باتیں بنانی آتی ہیں۔ اٹھیں نماز فجر کا وقت ختم ہو جائے گا۔“ وہ ذرا خفگی سے خالصتاً بیویوں والے انداز میں رعب جماتے ہوئے بولی تھی۔

”ہاں نماز پڑھ لیں پھر ہم نے کہیں جانا ہے ایک خاص سرپرائز ہے۔“ وہ جلدی سے تولیہ اٹھاتے ہوئے فریش ہونے چل دیا۔

وہ الجھی بیٹھی سوچنے لگی۔ ”پتہ نہیں اب ویسے سے پہلے ہی دلہا صاحب دلہن کو کہاں لے جانا چاہتے ہیں۔“

پھر سوچوں کو جھٹک کر نماز کے لیے وضو کرنے چل دی۔

نماز کی ادائیگی کے بعد وہ اسے ہاتھ پکڑ کر گاڑی تک لایا گاڑی میں بٹھایا اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر خاموشی سے گاڑی اسٹارٹ کی ایک بے معنی پر اسرار خاموشی چھا گئی کچھ فاصلہ طے کرنے پر گاڑی جانے پہچانے راستوں پر دوڑ رہی تھی لیلی نے خوفزدہ انداز میں نجھان سکندر کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ اندیشے وسوسے دل میں جگہ بنانے لگے۔ وہ خالی دماغ پریشان بیٹھی تھی۔ اسے لگا وہ کسی بھی لمحے مر جائے گی کیونکہ گاڑی کا رخ ستارہ بیگم کی حویلی کی طرف تھا اس کا چہرہ لمحوں میں ہی مرجھا گیا اب قسمت نجانے کیا کھیل کھیلنے والی تھی ہوش تو تب آیا جب نجھان نے بالکل حویلی کے سامنے گاڑی کو بریک لگایا۔ گاڑی سے اترا اور اسے بھی ہاتھ پکڑ کر اتارا۔ نجھان نے بیل بجائی تیسری بیل پر ستارہ بیگم نے پھاٹک کھول دیا وہ نجھان اور لیلی کو یوں اس وقت اچانک سامنے دیکھ کر پریشان ہو گئیں اور ان کی سوالیہ نظریں لیلی کی طرف اٹھیں لیلی نظریں چرا گئی۔

وا ہموں نے ستارہ بیگم کا پلو پکڑا ہی تھا کہ اچانک نجھان خوشگوار لہجے میں لیلی سے بولا۔ ”کیسا لگا میرا سرپرائز، میں نے سوچا ہم ناشتا آج نانو کے ساتھ کرتے ہیں چلیے نانو جلدی سے کچھ بنائیں بہت بھوک لگی ہے۔“ وہ ستارہ بیگم اور لیلی کی طرف دیکھے بغیر یوں بولا جیسے صدیوں سے اسی حویلی کا باسی ہو ستارہ بیگم جہاندیدہ تھیں پہچان گئیں کہ نجھان کو ان باتوں سے فرق نہیں پڑتا وہ ایک پڑھا لکھا مہذب شخص ہے چنانچہ وہ کچن کی جانب چل دیں تاکہ ایک اچھے ناشتے کی تیاری کروا سکیں۔

لیلی شاک کی کیفیت سے نکلی۔ ”آپ جانتے تھے سارا کچھ؟ پہلے کیوں نہیں بتایا۔“

”میں سب کچھ جانتا ہوں میری پیاری بیگم! مگر ہم نے اس لیے کچھ ظاہر نہیں کیا تاکہ نانو کہیں انکار ہی نا کر دیں کیونکہ وہ آنٹی شینا کے تجربے سے ڈر گئی تھیں۔ اس لیے ہم نے سوچا ان کا بھرم رکھیں۔“

”آپ کے مما پاپا بھی جانتے ہیں......“ وہ حیرانی سے بولی تھی۔

”ہاں جی کیونکہ آنٹی شینا‘ ماما کی کالج کی دوست تھیں اور اسی لیے وہ چاہتی تھی کہ ان کا بیٹا ان کی دوست شینا کی بیٹی سے شادی کرے تاکہ نانو کی تکالیف کا مداوا ہو جائے۔“

”آپ بہت برے ہیں مجھ سے سب کچھ چھپایا۔“ وہ منہ پھیرے ناراضگی سے بولی۔

نجھان نے اسے بازوں سے پکڑ کر اپنی طرف گھمایا اور بولا۔ ”آپ نے بھی تو چھپایا چلو اب وعدہ کرتے ہیں ہم ایک دوسرے سے کبھی کچھ نہیں چھپائیں گے۔“ نجھان نے آگے ہاتھ بڑھایا اور لیلی نے نجھان کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ اس کے خوابوں میں حقیقت کا رنگ بھر دیا گیا تھا۔ اس کا یقین کامل ٹوٹا نہیں تھا کیونکہ وہ کامل یقین رکھنے والوں کو کبھی خالی ہاتھ لوٹاتا ہی نہیں سکتا۔ اس کی بیکراں رحمت اپنے بندے کو نواز دیتی ہے وہ بھی نواز دی گئی تھی اب اس پر سجدہ شکر واجب تھا کیونکہ اس کا محبوب شوہر اس کے ساتھ تھا اس کا ہاتھ تھامے ہوئے۔

کرن

مہتاب خان

تاریکی میں روشنی کی ایک کرن بھی غنیمت بلکہ قدرت کا عطیہ قرار دی جاتی ہے۔ زندگی کے خاردار راستوں پر سفر میں پہلا قدم اگر پورے عزم اور حوصلے سے اٹھایا گیا ہو تو منزل کا نشان بن جاتا ہے۔

اسٹریٹ چلڈرن کے پس منظر میں لکھی جانے والی ایک خوب صورت تحریر

وہ مال بردار ٹرک پنجاب سے سامان لے کر کراچی جا رہا تھا۔ کراچی پہنچ کر لیاری ٹرک اڈے پر ڈرائیور بادشاہ خان نے سڑک کے کنارے سے ہوٹل کے پاس ٹرک کو بریک لگایا۔ ٹرک ایک جھٹکے سے رکا تو ٹرک کے اوپر رکھے ہوئے سامان پر سوئے ہوئے معصوم صورت چھ سات سالہ نذیرے کی نیند ٹوٹ گئی وہ جلدی سے اٹھ بیٹھا اور چاروں طرف نظر دوڑائی۔ رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا مگر برقی قمقموں نے پورے ماحول کو روشن کیا ہوا تھا۔ اس نے ٹرک سے نیچے جھانکا۔ اسی وقت لمبی لمبی مونچھوں والا خاصا تیم شحیم شخص ٹرک کا دروازہ کھولتا ہوا نیچے اترا۔ اس کے ساتھ ہی ایک دبلا پتلا بیس بائیس سال کا نوجوان بھی نیچے اترا۔

ٹرک ایک ہوٹل کے پاس رکا ہوا تھا۔ کھانے کی اشتہا انگیز خوشبو نے نذیرے کی بھوک کو اور چمکا دیا۔ لیکن اجنبی جگہ اور اجنبی لوگوں کو دیکھ کر وہ بری طرح گھبرا گیا تھا۔

”اوئے بشیرے ٹرک اچھی طرح صاف کر کے اوپر سامان پر ترپال ڈال دینا۔“ بادشاہ خان نے ساتھ کھڑے لڑکے سے کہا۔

بشیرا! ”اچھا جی۔“ کہتا ہوا ٹرک پر چڑھنے لگا۔ اسے اوپر آتا دیکھ کر نذیرا ایک کونے میں دبک گیا۔ ابھی وہ سامان پر ترپال ڈال ہی رہا تھا کہ اس کی نظر نذیرے پر پڑی۔ اس نے ٹرک ڈرائیور کو آواز دی۔

”استاد جی ادھر آؤ...... یہ دیکھو ٹرک پر کیا ہے؟“ ٹرک ڈرائیور جو ہوٹل کی سمت جا رہا تھا پلٹ آیا۔

”کیا ہے بشیرے؟“

”ایک بچہ ہے یہاں چھپا بیٹھا ہوا ہے۔“

”کون ہے...... نیچے لا اسے۔“ ڈرائیور بولا۔

”چل اوئے نیچے اتر۔“ بشیرے نے نذیرے کو شانے سے پکڑ کر اٹھایا۔ وہ نیچے آیا تو بادشاہ خان نے نذیرے سے پوچھا۔

”کون ہے تو......؟ کہاں سے میرے ٹرک میں آ گیا؟“

”وہ...... میں...... میں۔“

”کیا بکری کی طرح میں میں لگائی ہوئی ہے۔ سیدھی طرح بتا۔“ بادشاہ خان نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

”وہ...... چاچا مجھے مار رہا تھا اس کے ڈر سے اس ٹرک میں چھپ گیا تھا۔“ نذیرا اٹک اٹک کر بولا۔ وہ خوفناک صورت بادشاہ خان سے ڈر گیا تھا۔

”ماں پیو (باپ) کہاں ہیں تیرے؟“ ”وہ نہیں ہیں مر گئے ہیں۔“

”اچھا بیٹھا کہاں سے ٹرک میں؟“ بادشاہ خان نے پوچھا۔

”جی وہ بگوال سے۔“

”ہو نہ ہو تو ملتان کے قریب سے بیٹھا ہے...... چل کوئی گل نہیں آ میرے ساتھ روٹی شوٹی کھائے گا؟“ بادشاہ خان

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

Downloaded From

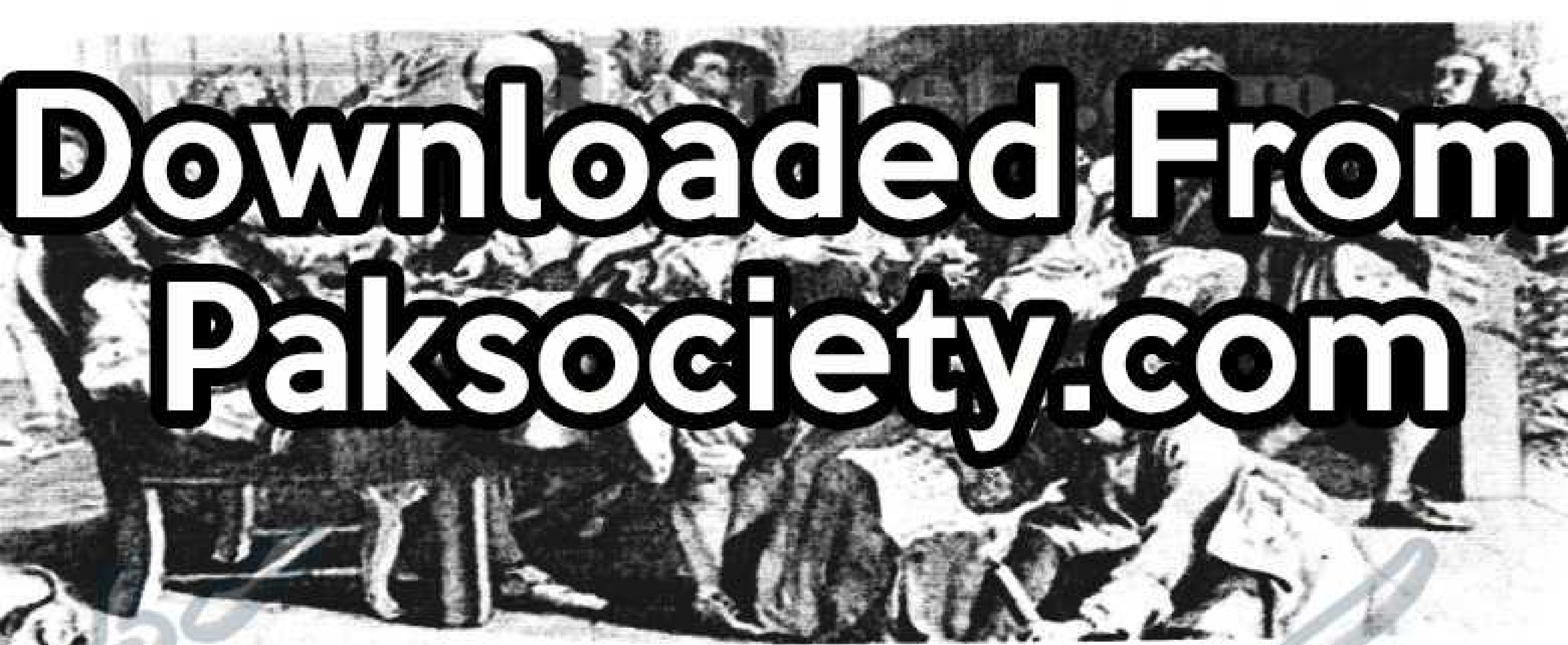

نے اس کا گال سہلاتے ہوئے بولا۔

"ہاں جی بڑی بھوک لگی ہے۔" نذیرا جلدی سے بولا۔

ہوٹل پہنچ کر وہ ایک میز کے گرد بیٹھ گئے۔ بادشاہ خان اب بغور اسے دیکھ رہا تھا۔ سنہرے بالوں اور گورے رنگ والے اس چھ سات سالہ بچے کے چہرے پر بڑا بھول پن اور معصومیت تھی۔

وہ نذیرے کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ ہوٹل کا بیرا ان کی میز پہ آیا اور بولا۔

"السلام وعلیکم استاد جی کیا حال ہے؟"

"وعلیکم السلام کیا حال ہے بھائی تیرا؟"

"بس ٹھیک ہے استاد جی۔" پھر کچھ دیر رک کر وہ بولا۔

"استاد جی! سبزی' دال' تکہ' چکن کڑائی یا کچھ اور کھاسو؟"

"یار کڑائی بنوالا۔"

"استاد جی مسالہ زیادہ یا کم؟"

"اوئے مسالہ ذرا زیادہ کرا دینا۔" بادشاہ خان مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا بولا۔

"یہ لو پانی پیو۔ میں بس یوں گیا اور یوں آیا۔" بیرے نے پانی کا گلاس اور جگ اس کی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"کوئی کمرہ شمرہ خالی ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے ذرا کمر سیدھی کرلوں۔" وہ راز داری سے نذیرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ اس کی آنکھوں میں یہ کہتے ہوئے شیطانیت ناچ رہی تھی۔

"استاد جی میں کچھ بندوبست کرناواں۔ تسی آرام نال کھانا شانا کھالو۔"

نذیرے کو بادشاہ خان سے بڑا خوف آرہا تھا۔ جیسے تیسے اس نے کھانا کھایا۔ اس کا ننھا سا ذہن یہاں سے دور بھاگ جانے کی ترکیبیں سوچ رہا تھا۔ لمبی مونچھوں والا بادشاہ خان اسے کوئی جن لگ رہا تھا۔

"چپ کیوں بیٹھا ہے کچھ بول نہ سونیا۔" بادشاہ خان نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

"میں ہمیشہ تجھے اپنے ساتھ رکھوں گا۔ رہے گا نہ میرے ساتھ؟"

نذیرا چپ رہا پھر کچھ دیر بعد بولا۔ "مجھے باتھ روم جانا ہے۔"

"اوہ اچھا...... اوئے سن ادھر آ۔" بادشاہ خان نے اسی بیرے کو آواز دی۔ وہ قریب آیا تو بولا ذرا۔ اسے باتھ روم لے جا اور خیال رکھیں اس کا۔"

"ٹھیک ہے استاد۔" لڑکا نذیرے کو ساتھ لے جاتے ہوئے بولا۔

باتھ روم اس ہوٹل کے عقب میں بنا ہوا ہے۔ راستے میں بیرے نے نذیرے سے پوچھا۔

"بادشاہ خان تجھے کہاں سے پکڑ کر لایا ہے؟"

"میں غلطی سے اس کے ٹرک میں بیٹھ گیا تھا۔" نذیرا بولا۔

"تجھ سے بہت بڑی غلطی ہوگئی۔ یہ بڑا خبیث آدمی ہے تو بھاگ جا جتنی جلدی اور جتنی دور ہوسکے بھاگ جا...... سن رہا ہے نا۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

”ٹھیک ہے میں جاتا ہوں۔ پر میں کہاں جاؤں؟“

”جہاں مرضی جا مگر یہاں سے بھاگ جا پھر دوبارہ کبھی ادھر کا رخ نہ کرنا سمجھ گیا نا۔ شاباش میرا ویرا اب دوڑ لگا دے۔“

نذیرا بھاگا چلا جا رہا تھا بے سمت نہ منزل کا نشان تھا نہ اسے راستوں کی کوئی خبر تھی۔ لیاری کی تنگ و تاریک گلیوں میں وہ دوڑ رہا تھا۔ آخر راستہ ختم ہوا اور لیاری ندی نے اس کا راستہ روک لیا وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی ندی کے کنارے سڑک کے ساتھ اسے ایک ورک شاپ نظر آیا۔ اس کے ساتھ ہی لکڑی اور گتوں سے بنا ہوا کمرہ بھی تھا۔ کمرے کا ٹین سے بنا دروازہ بند تھا وہ دروازے سے ٹیک لگا کر زمین پر بیٹھ گیا اپنی بے بسی پر اسے بے تحاشہ رونا آنے لگا۔

”جیرے او جیرے اٹھ دیکھ کسی کے رونے کی آواز آ رہی ہے۔ کاشو نے جیرے کا کندھا ہلاتے ہوئے کہا جو بے خبر سویا ہوا تھا۔

”او یار سونے دے تیرے کان بج رہے ہیں۔“

”یار اٹھ تو سہی سن کسی کے رونے کی آواز آ رہی ہے۔“

جیرا نامی اٹھارہ سال کا لڑکا بڑبڑاتا ہوا اٹھ گیا۔ کچھ دیر وہ دونوں کان لگائے سنتے رہے۔ واقعی وہاں کسی کے رونے کی آواز آ رہی تھی اور یہ آواز دروازے کی سمت سے آ رہی تھی۔

”چل وہاں چل کر دیکھتے ہیں۔ اس وقت کون مصیبت کا مارا رو رہا ہے۔“ کاشو نے کہا۔

کاشف عرف کاشو نے دروازہ کھولا تو دیکھا وہاں ایک بچہ بیٹھا رو رہا تھا۔

”کون ہے بھائی تو اور یہاں بیٹھا کیوں رو رہا ہے؟“ کاشو اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔

”مجھے اندر آنے دو بھائی میں سب بتا دوں گا۔“ وہ روتے ہوئے بولا۔

”آ جا اندر آ“ کاشو اسے لے کر اندر آ گیا۔ جیرا ہنوز بستر پر نیم دراز جمائیاں لے رہا تھا۔

”بیٹھ جا۔“ کاشو نے زمین پر بچھے میلے کچیلے بستر پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”پانی پیئے گا؟“

”ہاں گلا سوکھ رہا ہے۔“ نذیرے نے کہا۔

”او بھائی! جان چھڑا اس سے کوئی فراڈیا نہ ہو۔“ جیرے نے کہا۔

”بکواس نہ کر اتنا چھوٹا بچہ کیا فراڈ کرے گا۔“ کاشو ناراضگی سے بولا اور پانی کا گلاس نذیرے کی طرف بڑھایا۔ نذیرا ایک ہی سانس میں پورا پانی پی گیا۔

”ہاں بھائی اب بتا کون ہے تو؟ کہاں سے آیا ہے؟ اور کیوں رو رہا ہے؟“ کاشو نے ایک ساتھ اس سے کئی سوال کر ڈالے۔ نذیرے نے فوراً گزری تمام بپتا اسے کہہ سنائی کہ اس کی ماں اس وقت فوت ہو گئی تھی جب وہ سال بھر کا تھا۔ دو سال کے بعد باپ بھی مختصر علالت کے بعد مر گیا۔ یوں اس کا چاچا اسے اپنے گھر لے گیا۔ چچا کے پہلے ہی چھ بچے تھے۔ اس کے حالات بھی ٹھیک نہیں تھے گھر پر پہلے بھی غربت کا راج تھا اور چچی ایک تیز طرار اور جھگڑالو عورت تھی۔

اس نے نذیرے کو اپنے گھر میں رہتے دیکھا تو بڑی ناراض ہوئی کہ یہاں اپنے بچے تو سنبھالے نہیں جاتے اوپر سے یہ بوجھ آ گیا ہے۔ وہ نذیرے کے ساتھ برا سلوک کرتی تھی۔ گھر کے سارے کام اس سے کرواتی پھر چچا سے اس کی شکایتیں بھی لگاتی تھی۔ کبھی کبھار وہ اس کی باتوں میں آ کر نذیرے کو دھنک کر رکھ دیتا تھا۔ اس دن بھی ایسا ہی ہوا تھا نذیرے کا چچا ڈنڈا لے کر اس کے پیچھے مارنے دوڑا تھا اور وہ مارے ڈر کے باہر بھاگ گیا تھا اور سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے ٹرک پر جا کر چھپ گیا تھا۔

پھر وہاں چھپے ہوئے نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی اور وہ بے خبر سو گیا۔ آنکھ کھلی تو کراچی پہنچ گیا تھا۔ بعد میں سارے واقعات بھی اس نے کاشو کو بتا دیئے۔

”چل مٹی پا...... آج سے تو ہمارے ساتھ رہے گا۔“ کاشو ہمدردی سے بولا۔

”کیسے رہے گا ہمارے ساتھ؟“ جیرا چونک کر بولا۔

”یہاں پہلے ہی ہمیں پیٹ بھرنے کو روٹی نہیں ملتی اسے کیسے پالیں گے؟“

”او میرے یار اس رب نے دانے دانے پر مہر لگائی ہوئی ہے۔ یہ اپنے نصیب کی روٹی کھائے گا تو کیوں فکر کرتا

ہے۔ یہ بھی تو سوچ رب نے کھانے کے لیے ایک منہ دیا ہے تو کام کرنے لیے دو ہاتھ بھی تو دیئے ہیں۔ نذیرا ہماری طرح اس گیراج میں کام کرے گا۔ میں استاد سے خود بات کرلوں گا۔ وہ میری بات نہیں ٹالے گا مجھے امید ہے وہ اسے کام پر رکھ لے گا۔" جیرا بڑبڑاتے ہوئے سونے کے لیے لیٹ گیا تھا۔ "اب تو بھی سو جا سویرے بات کریں گے۔"

صبح کاشو اور جیرا گیراج گئے تو کاشو نے گیراج کے مالک غلام حسین سے نذیرے کے بارے میں بات کی کہ وہ اسے گیراج میں کام دے دے اور ان کے ساتھ یہاں رہنے کی اجازت بھی دے دے۔

"کاشو ایسے کسی پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔ کیا پتہ یہ لڑکا جھوٹ بول رہا ہو۔ ایسے لڑکے بڑی چوریاں چکاریاں کرتے ہیں۔"

"وہ ایسا نہیں ہے استاد آپ ایک بار اس سے مل کر دیکھیں بڑا معصوم اور بھولا بھالا ہے...... میں ابھی اسے لے کر آتا ہوں۔" یہ کہتا ہوا کاشو تیزی سے کمرے کی سمت چلا گیا۔

استاد غلام حسین نے جو سنہرے بالوں اور گوری رنگت والے معصوم صورت نذیرے کو دیکھا تو اسے بھی اس پر پیار آ گیا۔

"ٹھیک ہے کاشو تو اس کی ذمہ داری لیتا ہے تو رکھ لیتا ہوں اسے کام پر مگر اسے پچاس روپے روز دوں گا۔"

"شکریہ استاد بڑی مہربانی...... آج سے ہی کام شروع کروا دیں۔"

استاد نے اثبات میں سر ہلایا۔

"لے بھئی راجو تیرا کام تو بن گیا۔" کاشو خوش ہوتا ہوا بولا۔

"میرا نام نذیرا ہے راجو نہیں۔" نذیرا نے جھٹ بولا۔

"تو آج سے میرا راجو ہے۔" کاشو نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"بڑا آیا...... تو تو پیو (باپ) بن گیا اس کا۔" جیرا جو ان کے قریب سے گزر رہا تھا رک کر بولا۔

کچھ شرم کر کچھ حیا کر جیرے چھوٹا سا بچہ ہے یہ۔ تو نہ جانے کیوں اس سے چڑنے لگا ہے۔"

آنچل کی جانب سے ایک اور آنچل

ماہنامہ
حجاب
کراچی

اگلا شمارہ ان شاء اللہ
سالگرہ نمبر ہوگا

ملک کی مشہور معروف قلمکاروں کے سلسلے وار ناول، ناولٹ اور افسانوں سے آراستہ ایک مکمل جریدہ گھر بھر کی دلچسپی صرف ایک ہی رسالے میں موجود جو آپ کی آسودگی کا باعث بنے گا اور وہ صرف "**حجاب**" آج ہی ہاکر سے کہہ کر اپنی کاپی بک کرالیں۔

سالگرہ نمبر میں شامل ہونے کیلئے بہنیں جلد از جلد اپنی نگارشات ادارے کو بذریعہ ڈاک یا ای میل بھیجیں۔

خوب صورت اشعار منتخب غزلوں
اور اقتباسات پر مبنی مستقل سلسلے

اور بہت کچھ آپ کی پسند اور آرا کے مطابق

Infoohijab@gmail.com
info@aanchal.com.pk

کسی بھی قسم کی شکایت کی صورت میں
021-35620771/2
0300-8264242

وہاں کام کرتے ہوئے نذیرے کو پندرہ دن ہو گئے تھے۔ آج پہلی تاریخ تھی۔ گیراج میں کام کرنے والوں کو آج تنخواہ ملنی تھی۔

"سن کاشو جیرا اس کے نزدیک آ کر بولا آج شام کو پارٹی کریں گے۔ کچھ اچھا کھائیں گے۔ کیا خیال ہے۔"

"ٹھیک ہے چلیں گے۔" کاشو ایک کار کا بونٹ بند کرتا ہوا بولا۔ شام کو وہ تینوں ایک ہوٹل میں بیٹھے تھے۔

"اوئے آج تو دل بھر کر کھائیں گے تکا کڑاہی۔ چل راجو بول۔ تو کیا کھائے گا؟" کاشو نذیرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"میں دال چاول کھاؤں گا۔" نذیرے کے کہا۔

"چپ اوئے دال تو ہم روز ہی کھاتے ہیں آج تو اسپیشل کھانا کھائیں گے...... یہ لے میرا حصہ۔" جیرے نے کچھ نوٹ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"اور یہ میری طرف سے۔" کاشو نے بھی جیب سے نوٹ نکال کر میز پر رکھے۔

"چل اوئے راجو پیسے نکال؟" جیرے نے نذیرے سے کہا۔

"نہیں یار راجو ہمارا مہمان ہے یہ پیسے نہیں دے گا۔"

"اوئے بس کر یہ بھی کھائے گا تو پیسے کیوں نہیں دے گا؟"

"بس یار آج کے دن باقی پھر اپنا اپنا خرچہ کریں گے۔" کاشو بولا۔

اتنے میں بیرا ان کی میز پہ آیا تو یہ بحث ختم ہوئی۔

"ہاں جی! کی کھاسو دال یا سبزی؟"

"او نہیں نہیں......" جیرا جلدی سے بولا۔

"لے فیر کیا مرغ اڑانا اے؟"

"ادھر ایک لمبے بالوں والا بیرا ہوتا تھا وہ نظر نہیں آ رہا۔" کاشو نے بیرے سے پوچھا۔

"ادھر کئی آئے اور چلے گئے اور سنو بل تم لوگ پہلے دو گے پھر آرڈر تیار ہوگا۔" بیرے نے ان کے میلے کچیلے کپڑے اور کپڑوں میں میلا ان کا وجود دیکھتے ہوئے کہا۔

"ایسا کرو کڑاہی لے آؤ؟" کاشو بولا۔

"آدھی یا پوری؟"

"آدھی لے آ اور سات روٹی۔"

"سات نہیں دس لا۔" جیرا جلدی سے بولا۔ چار تیری چار میری اور دو اس چھوٹو کی۔

"چلو اب جیب ڈھیلی کرو۔" کہتے ہوئے بیرے نے ہوٹل والے کو آواز لگائی آدھی کڑاہی دس روٹیاں۔"

جیسے ہی کھانا آیا تینوں کھانے پر پل پڑے جیسے نہ جانے کب کے بھوکے ہو۔

"واہ یار مزا آ گیا۔ کتنے عرصے بعد اتنا مزے کا کھانا کھایا ہے۔" جیرا بولا پھر کچھ دیر کے بعد بولا۔

"سن کاشو ٹھنڈی بوتلیں بھی منگوالیں؟"

"نہیں یار پہلے ہی بڑا خرچہ ہو گیا ہے گھر جا کر دودھ پتی بنا کر پیئں گے۔ چل اب چلتے ہیں۔"

رات ہو چکی تھی وہ تینوں پیدل گیراج کی سمت روانہ ہو گئے۔ تاریک سڑک کے کنارے وہ چلے جا رہے تھے باتیں کرتے ہوئے ہنستے کھیلتے کہ اچانک پولیس کی ایک موبائل ان کے پاس آ کر رکی۔ پولیس کو دیکھتے ہی کاشو اور جیرا تیزی سے بھاگے ان کی دیکھا دیکھی راجو بھی بھاگا۔ ایک پولیس والا بھاگتا ہوا ان کے پیچھے آ رہا تھا۔

"رکو میں کہتا ہوں رکو ورنہ گولی مار دوں گا۔"

وہ تینوں ایک دم رک گئے۔ پولیس نے ان کے نزدیک پہنچ کر کاشو کا گریبان پکڑ لیا۔

"کیا واردات کر کے بھاگ رہے ہو تم لوگ؟"

"ہم نے کچھ نہیں کیا جی......" کاشو بولا۔

"چلو انسپکٹر صاحب کے پاس۔" وہ کاشو کو گھسیٹتا ہوا موبائل کے پاس لے گیا۔ اتنی دیر میں انسپکٹر بھی پولیس موبائل سے اتر آیا تھا۔

"لگتا ہے سر ان لوگوں نے کوئی واردات کی ہے جب ہی یہ ہمیں دیکھ کر بھاگے تھے۔"

"ہاں بھئی تم لوگ بھاگے کیوں تھے؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

وہ تینوں خاموش کھڑے رہے پھر نذیرا آگے بڑھا اور انسپکٹر کے قریب آ کر بولا۔

"سر ہم لوگ ادھر گیراج میں مزدوری کرتے ہیں ہم چور نہیں ہیں۔ آپ کو یقین نہیں تو ہمارے ساتھ چلیں ادھر

قریب ہی ہمارا گیراج ہے۔"

"اتنی رات کو ادھر کیا کر رہے تھے؟" انسپکٹر نے بغور ان کا حلیہ دیکھ رہا تھا سوال کیا۔

"آج تنخواہ ملی تھی نا صاحب ہم ادھر ہوٹل میں کھانا کھانے آئے تھے۔" نذیرے نے بے خوف لہجے میں کہا۔

"چھوڑ دو انہیں بچہ جھوٹ نہیں بول رہا۔ چلو اپنے ٹھکانے پر جاؤ۔ شکر کرو بچت ہوگئی تم لوگوں کو اس بچے نے بچالیا اور سنو آئندہ پولیس کو دیکھ کر بھاگنا نہیں۔" یہ کہتا ہوا پولیس والا موبائل میں بیٹھ گیا۔

"اوئے راجو چھا گیا تو۔" کاشو نذیرے کے کندھے پر ہاتھ مارتا ہوا بولا۔

"تو تو بڑا استاد نکلا یار۔" جیرا ہنستا ہوا بولا۔ تینوں ہنستے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔ جیرا زور زور سے گانے لگا۔

مائی اوئے گا

میں پھلاں نال دھرتی سجاواں گی

"اوئے نذیرے آج سے تو ہمارا پکا ساتھی بن گیا ہے۔" جیرا ہنستے ہوئے بولا۔

"میں نے تجھ سے کہا تھا نا راجو بڑا برکتی ہے۔ پولیس تو اپنے پیو کو نہیں بخشتی اور دیکھ ہمیں کتنی آسانی سے چھوڑ دیا۔ واہ جگر واہ چل اسی بات پر تجھے دودھ پتی پلاتا ہوں۔" کاشو نے راجو کو گلے سے لگاتے ہوئے کہا۔

گیراج میں کام کرتے ہوئے نذیرے کو ایک مہینہ ہوگیا تھا وہ یہاں اوپر کے چھوٹے موٹے کام کرتا تھا۔ اس سے زیادہ محنت طلب کام نہیں لیا جاتا تھا۔ نذیرا بڑا خوش اور مطمئن تھا۔ اس دن استاد نے کاشو کو کچھ سامان لینے کے لیے مارکیٹ بھیجا تھا۔ وہ بس میں مارکیٹ گیا۔ مارکیٹ پہنچ کر وہ بس سے اترا تو ایک دبلا پتلا گنجا ادھیڑ عمر شخص اس کے پیچھے چلنے لگا۔ وہ گیراج سے اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ کچھ دور جا کر اس نے کاشو کو آواز دی۔

"تجھ سے ملنے کو تو میں ترس گیا۔ ادھر تیرا استاد مجھے گیراج میں آنے نہیں دیتا۔" کاشو آواز سن کر یک لخت پلٹا اور بولا۔

"جا ابا جا پیسے ویسے نہیں ہیں میرے پاس۔ میں محنت مزدوری کرتا ہوں اور تو نشے کے لیے مجھ سے پیسے مانگنے آجاتا ہے۔ اسی لیے استاد نے تجھ پر پابندی لگائی ہے۔" وہ واپس مڑا اور چل دیا۔ اس کا باپ بدستور اس کے پیچھے آ رہا تھا۔

"او پتر بس آج دے دے۔ قسم ہے پیدا کرنے والے کی پھر نہیں مانگوں گا بس آج دے دے۔"

"تیری انہیں حرکتوں سے ماں مجھے بے آسرا چھوڑ کر مر گئی۔ یہ قسم تو نے کئی بار کھائی ہے...... ابا چھوڑ۔" اس نے اپنا کندھا اس کے ہاتھ سے چھڑا کر کہا اور جانے کے لیے قدم بڑھائے۔

"باپ ہوں تیرا جب تک پیسے میری ہتھیلی پر نہیں رکھے گا میں نہیں چھوڑوں گا تجھے۔" اس نے اب کاشو کا گریبان پکڑ لیا تھا۔

"چھتی کر چھتی میرا نشہ ٹوٹ رہا ہے۔" وہ چلاتے ہوئے بولا وہ اس کا گریبان بدستور پکڑے ہوئے تھا کاشو نے اپنی قمیض کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور کچھ نوٹ نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیئے۔ جنہیں وہ مٹھی میں دبا کر تیزی سے چلا گیا کاشو کچھ دیر وہیں کھڑا رہا اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

کاشو گیراج واپس آیا تو بڑا چپ چپ تھا۔ جیدے نے اس کی اداسی کا سبب پوچھا تو کاشو نے بتایا۔

"ابا ملا تھا باہر۔"

"پھر تم سے پیسے اینٹھ کر لے گیا ہوگا ہے نا۔"

"کیا کرتا یار اس کی حالت دیکھ کر بڑا افسوس ہوتا ہے۔ استاد نے اس کا علاج کروانے کی بڑی کوشش کی تھی پر یہ وہاں سے بھاگ آیا پھر دوبارہ نشے میں پڑ گیا۔ میں نے بھی اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا کیا کرتا میں نے تو اسے چھوڑ دیا پر وہ مجھے نہیں چھوڑتا۔" جیدا اسے تاسف سے دیکھتا رہا۔

اس دن کاشو گیراج میں ایک گاڑی ٹھیک کر رہا تھا۔ نذیرا بھی اس کے پاس کھڑا تھا۔ یہ ایک اسکول وین تھی اس میں اسکول کے بچے بھی سوار تھے کہ اتنے میں ایک بچہ جو تقریباً نذیرے کا ہی ہم عمر تھا وین سے اتر آیا اس نے ایک کتاب بھی پکڑی ہوئی تھی وہ کاشو کو کام کرتے ہوئے بڑی دلچسپی اور انہماک سے دیکھ رہا تھا کہ وین ڈرائیور کی آواز آئی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

”چلو بچے وین میں بیٹھو جا کر میں نے منع کیا تھا نا کہ نیچے نہیں اترنا۔

وین پر واپس سوار ہوتے ہوئے سیاید وہ کتاب بچے کے ہاتھ سے گر گئی۔ گاڑی ٹھیک ہوگئی تھی وین والا گاڑی لے کر چلا گیا تو نذیرے کی نظر اس کتاب پر پڑی وہ وہیں بیٹھ کر کتاب دیکھنے لگا۔ کاشو نے جو کتاب اس کے ہاتھ میں دیکھی تو اس کے پاس آ کر بولا۔

”کیا پڑھ رہا ہے راجو؟“

”تصویریں دیکھ رہا ہوں پڑھنا مجھے نہیں آتا۔“

”سن تو پڑھنا چاہتا ہے؟ اسکول جانا چاہتا ہے؟“

”ہاں کاشو بھائی مجھے پڑھنے کا بڑا شوق ہے۔“ ”میں نے اپنے چاچا کو بولا تھا مجھے اسکول داخل کرا دیں پر اس نے نہیں سنی۔“

”اچھا میں کچھ کرتا ہوں۔“ کاشو پر سوچ انداز میں بولا۔

اس بات کو ایک ہفتہ گزرا تھا کہ اس دن وہ تینوں کھانا وغیرہ کھا کر گھر آئے تو کاشو بولا۔

”تم دونوں میرے پاس آ کر بیٹھو مجھے بہت اہم بات کرنی ہے۔“

”واہ جی تیری اہم بات ماں صدقے چھیتی بول۔“ جیدا مزاحیہ انداز میں بولا۔

”یہ دیکھ یہ کیا ہے۔“

”گتے کا ڈبہ ہے اور کیا ہے...... یہ ہے تیری اہم بات۔“ جیدا ہنستے ہوئے بولا۔

”او صبر تو کر میری اصل گل تے شروع وی نہیں ہوئی۔“

”اچھا فرماؤ۔“

”کل سے ہم تینوں اس ڈبے میں دس روپے روز ڈالا کریں گے۔“

”وہ کس خوشی میں بھائی۔“

”ہم راجو کو اسکول میں داخل کریں گے اسے پڑھائیں گے یہ پڑھ لکھ کر وڈا افسر بنے گا۔ ہماری طرح ہاتھ منہ کالے نہیں کرے گا کوئی صاف ستھرا کام کرے گا۔“

”سچ بھائی میں اسکول جاؤں گا؟“ نذیرے کی خوشی دیدنی تھی۔

”ہاں نذیرے انشاء اللہ...... بس یہ سمجھو کہ یہ ڈبا بنک ہے جس میں نذیرے کی پڑھائی کے لیے اکاؤنٹ میں پیسے جمع ہوں گے۔ جب پیسے پورے ہو جائیں گے تو نذیرا اسکول جانا شروع ہو جائے گا استاد سے میں بات کرلوں گا کہ نذیرے کو آدھے دن چھٹی دے دیں۔ وہ دل کا بڑا اچھا ہے مان جائے گا...... کیوں جیدے تو کیوں چپ ہے کچھ بول۔“

”یار سوچ رہا ہوں دس روپے اتنی بڑی رقم تو نہیں میں نکال سکتا ہوں۔ ٹھیک ہے میں تیار ہوں...... لیکن کون سے اسکول میں داخل کریں گے اسے اس کی بھی تو معلومات لینی ہوں گی۔“

”میں نے سب پتا کرلیا ہے۔“ کاشو اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

”سامنے جو ٹیچر رہتا ہے نا اقبال بابو اس سے میں نے سب پتا کرلیا ہے وہ گورنمنٹ اسکول میں پڑھاتا ہے پچھلی گلی میں تو اسکول ہے اس نے بتایا ہے کہ دو مہینے بعد اسکول میں ایڈمیشن شروع ہونے والے ہیں اب تو کتابیں بھی حکومت کی طرف سے مفت ملتی ہیں ہمیں بس راجو کے لیے یونیفارم جوتے اور اسکول بیگ خریدنا ہوگا۔ دو مہینے ہیں ہمارے پاس اتنے پیسے جمع ہو جائیں گے کہ آسانی سے یہ سب چیزیں خرید لیں گے۔“

”واہ یار اندر ہی اندر تو نے کارروائی ڈالی ہوئی تھی ہمیں اب بتا رہا ہے۔ شاباش یار۔“ جیدا خوشی سے بھرپور آواز میں بولا۔

دو ہفتے گزر گئے تھے وہ تینوں ایمانداری سے اپنے حصے کا دس کا نوٹ گتے کے اس ڈبے میں جمع کر رہے تھے۔ راجو روز رات کو ڈبے کے نوٹ گنتا اور خوش ہوتا تھا۔

”او یار بار بار گننے سے نوٹ بڑھ نہیں جائیں گے۔“ جیدا اس سے مذاق کرتا۔ دوسرے دن کی بات ہے وہ تینوں گیراج میں کام کر رہے تھے جیدا ایک کار کا لاک جو پھنس گیا تھا اسے ٹھیک کر رہا تھا کہ ایک بیس پچیس سالہ نوجوان جیدے کو تلاش کرتا ہوا اس کے پاس پہنچا جیدا اسے دیکھتے ہی اٹھا اور اس سے بغل گیر ہوگیا۔

”ارے تو کب آیا بالے؟“

"آج ہی آیا ہوں۔"

"آجا ادھر سائے میں بیٹھتے ہیں۔" وہ کچھ دور گھنے درخت کے نیچے رکھی کرسیوں پر جا کر بیٹھ گئے۔

"تو اتنے سالوں سے گھر نہیں آیا اور نہ پیسے بھیجے چاچا بڑا پریشان تھا۔"

"یار ابے نے خود ہی تو کہا تھا شنو کی شادی کرنی ہے اور پھوپھی نے صاف کہہ دیا ہے کہ شنو کو خالی ہاتھ رخصت نہیں کرنا ورنہ برادری میں ان کی ناک کٹ جائے گی۔ تو بس میں اسی کے جہیز کے لیے پیسے جمع کرنے میں لگا ہوا تھا اسی چکر میں گھر بھی نہیں گیا کہ کچھ پیسے ہاتھ میں ہوں تو جاؤں پر یار اتنی سخت محنت کے باوجود زیادہ جمع نہیں کر سکا سال دو سال اور لگ جائیں گے۔"

"اب اس کی ضرورت نہیں ہے جیدے۔" اس نے جیدے کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ وہ اپنی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کو چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"کیا ہوا بالے بتا نا کیا ہوا کیا پھوپھی نے رشتہ توڑ دیا بتا نا مجھ سے کچھ نہیں چھپا۔"

"نہیں یار دراصل پیسوں کا انتظام ہو گیا ہے۔"

"ارے واہ یہ تو خوشی کی خبر ہے پر تیری آنکھوں میں آنسو کیوں ہیں؟"

"او چھوڑ یار میں تو تجھے لینے آیا ہوں اگلے جمعہ کو شانو کی شادی ہے چاچا اور چاچی نے خاص تاکید کی ہے کہ تجھے ساتھ لے کر آؤں۔ تو بس تیاری پکڑ۔ گھر میں بڑے کام پڑے ہیں تیری پھوپھی نے پورے پنڈ کو دعوت دے دی ہے۔" بالے نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

"نہیں بالے تو جب تک مجھے نہیں بتائے گا کہ پیسے کا انتظام کیسے ہوا میں نہیں جاؤں گا۔" جیدا اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

"وہ......وہ تیرے ابا نے اپنا گردہ بیچ دیا ہے۔" وہ اٹکتے ہوئے بولا۔

"کیا؟" جیدا سکتے میں رہ گیا۔

"ابے نے ایسا کیوں کیا؟"

"کیا پوچھتا ہے یار ہمارے پنڈ کی تو آدھی آبادی ایک گردے والی ہے کسی نے اپنے قرض اتارنے کے لیے گردہ بیچا اور کسی نے اپنی بیٹی کی شادی کے لیے تو کسی نے اپنے گھر والوں بیوی بچوں کو فاقوں سے بچانے کے لیے۔" آنکھوں میں آنسو لیے وہ بڑے دکھ سے بتا رہا تھا۔

"ابا اب کہاں ہے کیسا ہے؟ اسپتال میں ہے یا گھر میں؟" جیدا آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔

"آپریشن کے بعد ایک ہفتے اسپتال میں رہا تھا پھر اسپتال والوں نے دوائیاں دے کر چھٹی دے دی۔ ابھی گھر میں ہے پر اسے بڑا درد ہوتا ہے بہت کمزور ہو گیا ہے۔"

"آخر اسے اتنی جلدی کیا تھی۔ میں محنت مزدوری کر رہا تھا نا میں خود آ کر شانو کی شادی کرواتا۔ یہ ابا نے کیا کیا؟"

"جلدی چاچا کو نہیں پھوپھی کو تھی اس نے دھمکی دے دی تھی کہ ایک مہینے میں شادی کرو ورنہ وہ یہ منگنی توڑ دے گی۔"

"چاچا نے جب تیرا بتایا تو پھوپھی اور ناراض ہو گئی کہ اب جیدا واپس نہیں آئے گا وہ شہر کی رنگینیوں میں کھو گیا ہے۔ تو نے بھی اتنے عرصے پلٹ کر خبر نہیں لی تھی چاچا بے چارہ ڈر گیا تھا۔ ہر طرف سے مایوس ہو کر ہی اس نے یہ قدم

فلسفہ محبت

- عورت کی مٹی محبت سے گندھی ہے اور مرد اس مٹی کے زرخیز پن سے ناآشنا ہے۔
- عورت محبت نہ ملنے پر اکتفا کر لیتی ہے مگر مرد ایک عورت پر کبھی بھی اکتفا نہیں کرتا۔
- عورت بانٹی ہوئی محبت کبھی نہیں لیتی۔
- محبتوں کے کاروبار میں خسارے ہمیشہ عورتوں کے کھاتے میں آتے ہیں۔
- عورت مجسم وفا، خلوص پیار اور چاہت ہے۔
- عورت قربانی کا دوسرا نام ہے۔
- عورت قربانی دینا جانتی ہے قربانی لینا نہیں۔

فیاض اسحاق مہیانہ......سلانوالی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

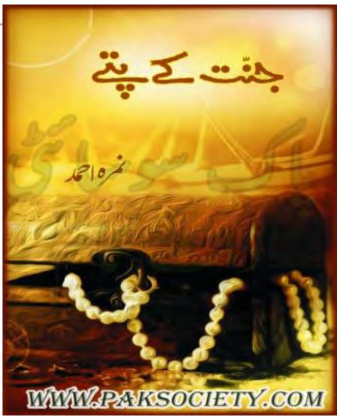
جنّت کے پتے
نمرہ احمد
WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
مصحف
نمرہ احمد
www.Paksociety.com

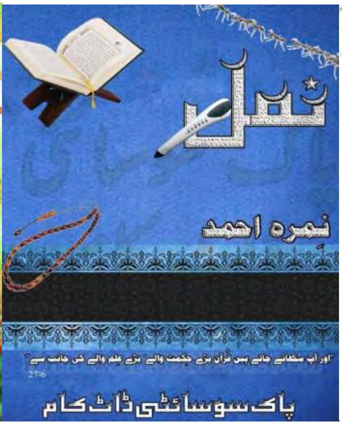
نمل
نمرہ احمد
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

آبِ حیات
عُمیرہ احمد
WWW.PAKSOCIETY.COM

ہم سفر
فرحت اشتیاق
http://www.paksociety.com

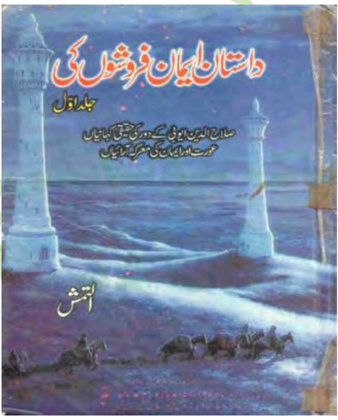
داستان ایمان فروشوں کی
جلد اول
التمش

بن روئے آنسو
فرحت اشتیاق
www.paksociety.com

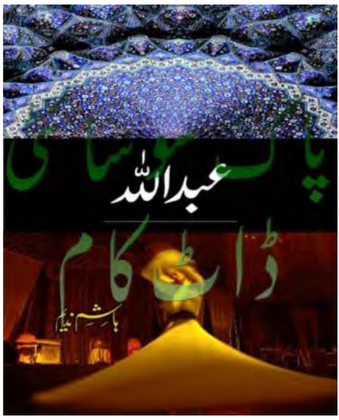
عبداللہ
ہاشم ندیم

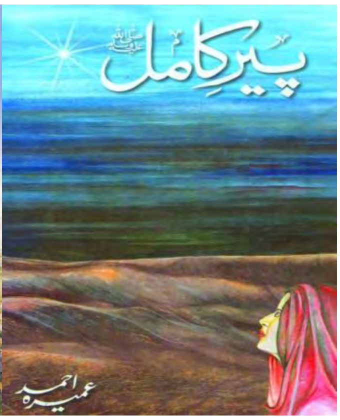
پیرِ کامل
عمیرہ احمد

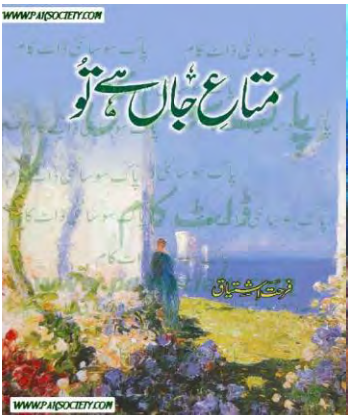
WWW.PAKSOCIETY.COM
متاعِ جاں ہے تو
فرحت اشتیاق
WWW.PAKSOCIETY.COM

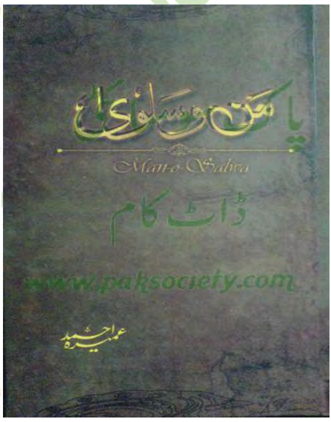
من و سلویٰ
Man-o-Salwa
www.paksociety.com
عمیرہ احمد

جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو
فرحت اشتیاق
WWW.PAKSOCIETY.COM

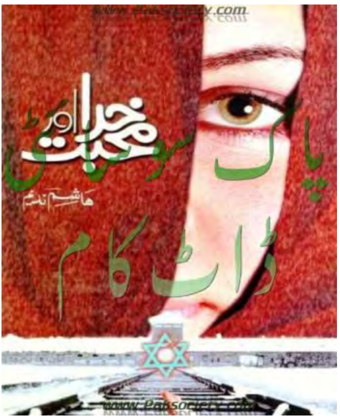
خدا اور محبت
ہاشم ندیم

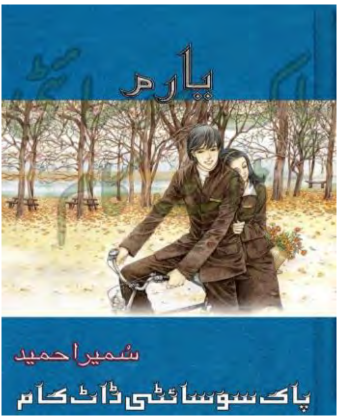
بارش
شمیرا حمید
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

ٹوٹا ہوا تارہ
سمیرا شریف طور
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

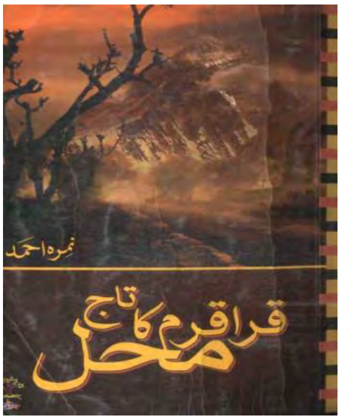
نمرہ احمد
قراقرم کا تاج محل

اٹھایا تھا۔"

"چل بھائی گھر چلتے ہیں......" پھر رکا اور بولا۔

"تو ایک منٹ ادھر بیٹھ میں استاد کو بتا کر آتا ہوں۔" وہ گیراج کے اندر کی سمت جاتے ہوئے بولا۔

استاد سے چھٹی لے کر وہ کاشو کے پاس آیا اور بولا۔

"کاشو میں دو تین دن کے لیے گھر جا رہا ہوں۔"

"سب خیر تو ہے جیدے تو کچھ پریشان لگ رہا ہے۔"

"واپس آ کر تجھے سب بتاؤں گا ابھی میں جلدی میں ہوں۔" وہ ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے بولا۔ سیالکوٹ سے دو کوس دور خدا کی بستی نامی گاؤں میں اس کا گھر تھا۔ جیدا گھر پہنچا تو اس نے دیکھا ماں صحن میں بیٹھی کپڑے دھو رہی تھی۔ اس کا گھر مٹی اور پتھر سے بنا ایک کمرہ اور چھوٹے سے صحن پر مشتمل تھا۔ اس کا باپ برآمدے میں چارپائی پر لیٹا کراہ رہا تھا۔ ماں اسے دیکھتے ہی بولی۔

"آ گیا جیدے بڑی جلدی آ گیا بیٹا دیکھ تیرے ابے کا کیا حال ہے میں نے اسے بہت منع کیا تھا پر یہ میری ایک نہیں مانا۔ اب درد سے کراہ رہا ہے۔ دیکھ اپنے باپ کے کارنامے۔"

وہ اپنے ابا کے پاس چارپائی پر بیٹھا تاسف اور دکھ سے اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

"کیسی طبیعت ہے ابا؟ تجھے گردہ بیچنے کی کیا ضرورت تھی تو نے اتنا بڑا فیصلہ اکیلے کیسے کر لیا؟"

"بڑا آیا ہمدردی جتانے کچھ خبر ہے تو کتنے سال بعد گھر آیا ہے؟" اس کی ماں تیزی سے بولی۔

"اللہ کا واسطہ ہے اماں مجھے ابا سے بات کر لینے دے۔"

"کر لے کر لے بات۔" وہ ناراضگی سے بولی۔

"چل ابا جو ہوا سو ہوا جو رب کو منظور مگر میں تجھے اس حالت میں یہاں نہیں رہنے دوں گا۔ تو میرے ساتھ ابھی شہر چل وہاں میں تیرا علاج کراؤں گا۔"

"شنو کی شادی ہو جائے پھر چلوں گا تیرے ساتھ...... ہائے۔" وہ کراہا۔

"ٹھیک ہے ابا پھر میں چلتا ہوں شنو کی شادی کے بعد آؤں گا اور تجھے اپنے ساتھ شہر لے جاؤں گا۔"

"تو کہاں جا رہا ہے بہن کی شادی میں شریک نہیں ہو گا۔" اس کی ماں بولی۔

"ماں شنو کی شادی کا کھانا میں نہیں کھا سکوں گا مجھے لگے گا کہ میں ابا کا گردہ کھا رہا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"رک جا بیٹا کہاں جا رہا ہے۔" اس کا ابا اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔

"یہ رکھ ابا یہ پیسے میں شنو کی شادی کے لیے جمع کر رہا تھا۔" یہ کہتا ہوا وہ تیزی سے پلٹا اور تیز تیز قدموں سے گھر سے نکل گیا۔

وہ کراچی پہنچا تو رات ہو چکی تھی۔ گھر پہنچ کر اس نے ٹین کا دروازہ بجایا۔ کسی نے دروازہ نہیں کھولا غالباً کاشو اور نذیرا سو چکے تھے اس نے دوبارہ زوردار آواز میں دروازہ کھٹکھٹایا۔

"کون ہے بھائی۔" کاشو کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز آئی۔

"میں ہوں جیدا۔"

"آ گیا تو۔" کہتے ہوئے کاشو نے دروازہ کھولا۔

"بڑی جلدی آ گیا۔" جیدا خاموش رہا اور کمرے میں آ کر زمین پر بچھے ہوئے بستر پر ایک کنارے سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ کمرے میں گونجتی آوازوں سے نذیرے کی نیند بھی ٹوٹ گئی تھی وہ بھی جیدے کے پاس آ بیٹھا۔

"جیدے بھائی آ گئے۔"

جیدے نے ایک دم منہ چھپا کر رونا شروع کر دیا۔

کاشو اس کے قریب آ گیا اور اسے خود سے لگاتے ہوئے کہا۔

"بول جیدے کیا ہوا گھر میں سب خیر تھی نا؟"

"خیر نہیں ہے یار۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"میرے ابا نے میری بہن کی شادی کے لیے اپنا گردہ بیچ دیا۔ وہ بڑی تکلیف میں ہے یار۔"

"اوہ یہ کب ہوا؟"

"جیدے بھائی کیا انسان کا گردہ بکتا ہے؟" نذیرے نے معصومیت سے سوال کیا۔

"ہاں بیٹا یہاں آنکھیں جگر اور گردہ سب بکتا ہے غریب کو اپنی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو خریدنے کے لیے اپنے آپ کو بیچنا پڑتا ہے۔"

"چل کوئی نہیں یار اللہ مالک ہے مٹی پا۔" کاشو اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دیتا ہوا بولا۔

"تو نے کھانا کھایا؟"

"صبح سے کچھ نہیں کھایا۔"

"میں تیرے لیے چائے بنا کر لاتا ہوں۔ راجو ڈبل روٹی رکھی ہے نا۔" اس نے نذیرے کی طرف دیکھا۔

"ہاں ادھر چولہے کے پاس ہی رکھی ہے۔" کاشو چائے بنانے کے لیے اٹھ گیا۔ وہ تینوں ایک دوسرے کے دم ساز بن گئے تھے ایک دوسرے کو دلاسے دیتے آنسو پونچھتے کچھ اور وقت بیتا۔ نذیرے کا ایڈمیشن اسکول میں ماسٹر اقبال کی مدد سے ہو گیا تھا اور کل سے اسے اسکول جانا تھا شام کو جیدا اور کاشو اس کے لیے یونیفارم وغیرہ لے آئے تھے۔

جیدا اسے اسکول کا یونیفارم دیتے ہوئے بولا۔

"یہ لے نذیرے تیرے اسکول کے کپڑے۔ کام پر انہیں نہیں پہننا ورنہ خراب ہو جائیں گے اور یہ جوتے رکھ صبح چم چم کرتا جائیں اسکول کہ تجھے دیکھ کر ماسٹر صاحب بھی خوش ہو جائیں۔"

صبح اٹھ کر جیدا اور کاشو نذیرے کو اسکول کے لیے تیار کر رہے تھے نذیرے نے نہا دھو کر صاف ستھرا یونیفارم اور جوتے پہن رکھے تھے کاشو کنگھے سے نذیرے کے بال بنا رہا تھا۔ پھر وہ نذیرے کو سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے بولا۔

"دیکھ تو جیدے اپنا راجو کیسا جنٹلمین لگ رہا ہے۔" وہ دونوں نذیرے کو اسکول کے گیٹ پر چھوڑ کر اسکول کی دیوار کے ساتھ ساتھ آگے چلنے لگے دیوار پر کلاس روم کی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں وہ ایک ایک کلاس روم میں جھانکتے آگے بڑھ رہے تھے۔ ایک کلاس روم میں انہیں نذیرا بیٹھا نظر آ گیا۔ اسے دیکھ کر دونوں نے ہاتھ ہلایا۔

"واہ کیا بات ہے کتنا پیارا لگ رہا ہے میرا راجو۔" کاشو بولا۔

"دل لگا کر پڑھیں......دل لگا کر۔" جیدا چلا کر بولا۔

"اوئے چل چل اسے پڑھنے دے۔" کاشو جیدے کو کھینچتے ہوئے بولا۔

"یہاں کیا ہو رہا ہے کاشو۔" اقبال ماسٹر کی آواز پر دونوں چونک گئے۔ وہ نہ جانے کب سے ان کے پیچھے کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔

"بس ماسٹر جی نذیرے کو دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ ہم تو کبھی اسکول کی شکل نہیں دیکھ سکے دل میں بڑے ارمان تھے مگر حالات نے اجازت ہی نہیں دی۔" کاشو بولا۔

"اگر پڑھنا چاہتے ہو تو اب بھی پڑھ سکتے ہو۔"

"کیسے ماسٹر صاحب؟"

"اسکول میں نہ سہی میرے پاس گھر آ جایا کرو۔ میں شام کو گھر پر ٹیوشن پڑھاتا ہوں بچوں کو تم لوگ بھی آ جایا کرو کچھ لکھنا پڑھنا تو سیکھ ہی لو گے۔" ماسٹر اقبال نے کہا۔

"ایسا ہو سکتا ہے ماسٹر صاحب۔"

"کیوں نہیں ہو سکتا ہے تم لوگ کام سے فارغ ہو کر آج ہی آ جانا۔"

پھر یوں ہوا کہ کاشو اور جیدا بھی ماسٹر صاحب کے گھر پڑھنے جانے لگے ان کی دیکھا دیکھی گیراج میں کام کرنے والے اور لڑکے اور بچے بھی جانے لگے اور تو اور اس دن ہوٹل کا بیرا بھی کاشو کے پاس آیا کہ وہ بھی شام کو اس کے ساتھ ماسٹر صاحب سے پڑھنے جائے گا۔ ماسٹر اقبال بڑا نیک طبیعت اور ہمدرد شخص تھا وہ بہت معمولی فیس لے کر انہیں پڑھایا کرتا تھا اور جو فیس نہیں دے سکتے تھے وہ ان سے ایک پیسہ نہیں لیتا تھا۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ اس کے گھر میں اب جگہ کم پڑنے لگی تھی طالب علموں کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔

گیراج کے مالک استاد غلام حسین کو جب اس مسئلے کا پتا چلا تو اس نے اپنے گیراج کا ایک حصہ اسکول کے لیے دے دیا۔ یوں یہاں اقراء اسکول کی بنیاد رکھی گئی۔ افتتاح کے دن جیدا کاشو اور ماسٹر اقبال خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے ماسٹر اقبال نے یہ تختی خود اپنے ہاتھوں سے اسکول کے گیٹ پر نصب کی تھی جس پر لکھا ہوا تھا۔

"تعلیم سب کے لیے۔"

◆

ذوق آگہی

سباس گل

خوف خدا

ایک بار اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ فلاں بستی میں جاؤ اور فلاں شخص سے اپنے حق میں دعائے خیر کرا آپ حیران ہوئے یہ حکم سن کر پھر سوچا یقیناً وہ شخص بڑا عابد زاہد اور تقویٰ میں یکتا ہوگا جو اللہ نے اپنے نبی کو اس سے دعائے خیر کرانے کا حکم دیا پھر آپ حکم خداوندی کی تعمیل میں چل پڑے لوگوں سے پوچھتے پوچھتے آپ اس بستی تک پہنچ گئے، ایک راہ چلتے شخص سے اس عابد زاہد کے بارے میں پوچھا اس نے جواب دیا تھوڑا اور آگے کی طرف چلیے وہ نکڑ پر بیٹھا ملے گا وہ موچی ہے لوگوں کی جوتیاں گانٹھتا ہے آپ ایک بار پھر حیران ہوئے پھر اس طرف چل پڑے کچھ دور چلے وہ آپ کو نظر آ گیا وہ واقعی لوگوں کی جوتیاں گانٹھ رہا تھا آپ نے اس کی طرف قدم بڑھائے پھر یہ سوچ کر رک گئے کہ براہ راست اس سے ملنے کے بجائے کیوں نہ دور بیٹھ کر اس کا مشاہدہ کروں اور دیکھوں کہ یہ ایسا کون سا مستحسن فعل انجام دیتا ہے کہ اللہ کا منظور نظر بن گیا ہے آپ دور بیٹھ کر اس کا مشاہدہ کرنے لگے لوگ اس کے پاس آ رہے تھے آپ نے دیکھا کہ وہ ہر آنے والے شخص کا چہرہ چند لمحوں تک بغور دیکھتا پھر اپنے کام میں لگ جاتا فاصلے کی وجہ سے اس کی حرکات و سکنات آپ کی نظر میں تھیں مگر چہرے کے تاثرات اوجھل تھے پھر نماز کا وقت ہوا تو وہ شخص کام چھوڑ کر نماز پڑھنے چلا گیا آپ نے بھی نماز ادا کی۔ جب نماز پڑھ کر وہ شخص واپس آیا تو آپ اس کے پاس چلے گئے اور بری طرح چونکے اس کا چہرہ دیکھ کر کیونکہ اس کا چہرے کا رنگ ہلدی سے بھی زیادہ پیلا تھا چہرے کی ایسی زرد رنگت آپ نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی، اسی دوران ایک اور شخص جوتیاں سلوانے آ گیا تھا اس نے اس شخص کو بھی بغور دیکھا اور اس کے چہرے کی رنگت اور زیادہ زرد ہو گئی۔ حضرت موسیٰ کی سمجھ میں نہ آیا کہ ایسا کیوں ہوا آپ نے اس شخص سے اپنا تعارف کرایا بھائی میں اللہ کا رسول موسیٰ ہوں مجھے اللہ تعالیٰ نے آپ کے پاس بھیجا ہے کہ آپ سے اپنے حق میں دعائے خیر کراؤں، آپ ایسا کون سا نیک عمل کرتے ہیں کہ اللہ نے آپ کو یہ رتبہ دیا۔ وہ بولا جناب میں حق حلال کھاتا ہوں برائیوں سے خود کو بچاتا ہوں اور پانچوں نمازیں وقت پر ادا کرتا ہوں ہو سکتا ہے کہ اللہ نے مجھ پر اسی لیے کرم کیا ہو اس کی بات سن کر آپ کے دل میں خیال آیا کہ اللہ کے سارے نیک بندے یہ کام کرتے ہیں مطلب یہ تھا کہ یہ تو کوئی ایسی بات نہیں، فوراً غیب سے آواز آئی موسیٰ اس سے پوچھ کہ تیرے چہرے کا رنگ اتنا زرد کیوں ہے آپ نے اس سے سوال کیا یہ تمہارے چہرے کا رنگ اتنا زرد کیوں ہے اس نے جواب دیا خوف خدا کی وجہ سے میں شخص کو بھی دیکھتا ہوں مجھے لگتا ہے یہ بخشا جائے گا میں پکڑا جاؤں گا اسی خوف خدا کی وجہ سے میرے چہرے کی رنگت دن بدن زرد پڑتی جا رہی ہے اس کی بات سن کر آپ بے حد متاثر ہوئے فوراً اللہ سے اپنے میں آنے والے خیال پر معافی مانگی اس سے اپنے حق میں دعا خیر کرائی اور اللہ کی حمد و ثنا کرتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

گل مہر...... کراچی

۱۰ محرم الحرام کے اہم واقعات

☆ اللہ نے اس روز حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ قبول کی۔

☆ حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی اسی روز "جودی" نامی پہاڑ پر ٹھہری تھی۔

☆ اس روز حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ولادت ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے انہیں خلیل بنایا۔ اسی روز نمرود سے محفوظ رکھا۔

☆ اسی روز حضرت سلیمان علیہ السلام کو حکومت واپس ملی۔

☆ عاشورہ کے روز ہی اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو سلامتی سے سمندر پار کرایا اور فرعون کو غرق کیا۔

☆ اسی روز اللہ تعالیٰ نے حضرت یونس علیہ السلام کو مچھلی کے پیٹ سے نجات دلائی۔

☆ اسی روز اللہ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان کی طرف اٹھالیا۔

شازیہ اختر...... ٹمن نور پور

یاد رکھنے کی باتیں

کیا خوب لکھا ہے کسی نے بخش دیتا ہے خدا ان کو جن کی قسمت خراب ہوتی ہے وہ ہرگز نہیں بخشے جاتے ہیں جن کی نیت خراب ہوتی ہے۔ نہ میرا ایک ہوگا نہ تیرا لاکھ ہوگا نہ تعریف تیری ہوگی نہ مذاق میرا ہوگا غرور نہ کر شاہ شریر کا میرا بھی خاک ہوگا تیرا بھی خاک ہوگا، زندگی بھر برانڈڈ، برانڈڈ کرنے والوں یاد رکھنا کفن کا کوئی برانڈ نہیں ہوتا کوئی رو کر دل بہلاتا ہے اور کوئی ہنس کر درد چھپاتا ہے کیا کرامات ہے قدرت کی، زندہ انسان پانی میں ڈوب جاتا ہے اور مردہ تیر کر دکھاتا ہے موت کو دیکھا تو نہیں پر شاید وہ بہت خوب صورت ہوگی کمبخت جو بھی اس سے ملتا ہے جینا چھوڑ دیتا ہے۔ غضب کی ایکتا دیکھی لوگوں کی زمانے میں زندوں کو گرانے میں اور مردوں کو اٹھانے میں زندگی میں نہ جانے کون سی بات آخری ہوگی نہ جانے کون سی رات آخری ہوگی ملتے جلتے باتیں کرتے رہو دوستوں ایک دوسرے سے نہ جانے کون سی ملاقات آخری ہوگی۔

عائشہ اے بی...... جھنڈو سندھ

ادھار

کوفہ کے ایک بازار میں قصائی آواز لگا رہا تھا کہ تازہ گوشت ہے لے لو، وہاں سے حضرت علیؓ کا گزر ہوا تو اس قصائی نے حضرت علیؓ کو بھی کہا کہ اچھا گوشت ہے آپ بھی لے جائیں۔

حضرت علیؓ نے فرمایا آج میری جیب اجازت نہیں دے رہی، قصائی نے کہا میں آپ کو ادھار دے سکتا ہوں۔

اس پر حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ یہ ادھار میں اپنے پیٹ سے ہی کیوں نہ کرلوں۔

یہ سن کر وہ قصائی خاموش ہوگیا۔

عبدالجبار رومی انصاری...... چوبھنگ

دوست

یہ دوست بھی عجیب ہوتے ہیں دینے پہ آئیں تو جان دے دیں لینے پر آئیں تو ہنسی تک چھین لیتے ہیں کہنے پر آئیں تو دل کے تمام خانوں کے راز تک کہہ دیں چھپانے پر آئیں تو یہ تک نہ بتائیں کہ خفا کیوں ہیں ناراض ہونے پر آئیں تو سانس تک نہ لینے دیں منانے پر آئیں تو اپنی سانسوں کو وار دیں۔ بس دوست زندگی میں نہیں ملا کرتے بلکہ زندگی دوستوں میں ملا کرتی اللہ ہمارے سب دوستوں کو سلامت رکھے آمین۔

پرنس افضل شاہین۔ بہاول نگر

ڈریکولا

وہ مرچکا تھا اور اسے دفنا بھی دیا گیا تھا مگر ہر رات وہ اپنے تابوت کو کھول کر نکلتا تھا اور بستی میں جا کر کسی زندہ انسان کو نشانہ بناتا تھا اس کی گردن میں دانت گاڑھ کر اس کا خون پیتا تھا اور پھر اپنے تابوت میں واپس آجاتا تھا اس کا شکار بھی دنیا والوں مرچکا تھا مگر اپنے تابوت میں پہنچ کر وہ بھی زندہ ہوجاتا تھا اور رات کا انتظار کرتا تھا تاکہ اپنی پیاس خون سے بجھا سکے۔

نسل انسانی کی طرح زندہ مردے ویمپائر نامی مخلوق کے اس باوا آدم کا نام ڈریکولا ہے۔

ڈریکولا کا نام کس نے نہیں سنا یہ افسانوی کردار جب سے تخلیق ہوا ہے تب سے یہ ایک ماورائی کردار بن چکا ہے دنیا کے افسانوی ادب میں ویمپائر کا نیا تصور اسی سے وابستہ ہے اسی کردار کو تراشنے والے کا نام تھا اسٹوکر برام، برام اسٹوکر اپنی ہیبت ناک کہانیوں اور ناولوں کے لیے پوری دنیا میں مشہور ہے ڈریکولا اس کا شاہکار ناول سمجھا جاتا ہے۔ اس کردار پر بے شمار فلمیں بن چکی ہیں کاؤنٹ ڈریکولا کے کردار کو جس طرح برام اسٹوکر نے اپنی کتاب میں پینٹ کیا ہے اس نے اسے حقیقی بنا دیا اس نے جب یہ کردار تراشا تھا تو اسے بالکل پتا نہ تھا کہ یہ کردار خود اسی پر چھا جائے گا آج برام اسٹوکر سے لوگ اتنا واقف نہیں جتنا وہ کاؤنٹ ڈریکولا کے بارے میں جانتے ہیں۔

ایم حسن نظامی...... قبولہ شریف

اقوال زریں

- دنیا کا کوئی شخص جذبات کے راستے سچائی تک پہنچ سکتا۔
- بے اطمینانی سب سے بڑا دکھ ہے اور اطمینان سب سے بڑا سکھ۔
- اکثر مصائب جو امیروں کو پیش ہوئے ہیں غریب ان سے محفوظ رہتے ہیں۔
- دنیا کا سب سے بڑا اور بہترین زیور آپ کی اپنی شرافت ہے۔
- دنیا کا سب سے بہترین مددگار آپ کا اپنا ہاتھ

ہے۔

- دنیا کا سب سے بہترین تاج آپ کا اپنا پختہ ارادہ ہے۔
- کوئی بات کہنے سے پہلے اچھی طرح سوچ لو کہ تم وہی کچھ کہہ رہے ہو نا جو تم کہنا چاہتے ہو۔
- کم بولنا اور کم کھانا صحت کے لیے مفید ہے۔
- پست ہمتی انسان کے تمام احساسات کو مردہ کر دیتی ہے۔

ریاض بٹ...... حسن ابدال

محبت جھوٹ ہے

کوئی کسی کو بغیر غرض کے یاد نہیں کرتا، میں نہیں مانتا کہ کوئی کسی کے بغیر بے چین ہوتا ہے آج کہ اس ظالم دور میں لوگوں کو اپنی ذات سے ہی فرصت نہیں ملتی ہر کوئی اپنا کام نکال کر سائڈ پر ہو جاتا ہے محبت و اخوت تو بس اب کتابی باتیں لگتی ہیں نا تو کوئی کسی کے لیے مرتا ہے اور نا ہی کوئی کسی کے لیے جیتا ہے اگر تم سچ پوچھو تو محبت جھوٹ ہے افسانوں کا حقیقی زندگی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

خواجہ امیر حمزہ۔ مچن آباد

بکھرے موتی

- لوگوں کو اتنی جلدی معاف کر دیا کرو جتنی جلدی تم اللہ سے معافی کی امید رکھتے ہو۔
- روٹھنے والے کو اتنا بھی نہیں روٹھنا چاہیے کہ منانے والا خود بھی روٹھ جائے۔
- ناراضگی لفظوں میں ہونی چاہیے دل میں نہیں
- غم کسی بھی طرح کا ہو ہر انسان کے آنسو ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔
- غصے کے تیز لوگ اکثر دل کے صاف [illegible]
- سجدے کی خوب صورتی یہ ہے کہ ہم فرش پر سرگوشی کرتے ہیں اور وہ عرش پر سنی جاتی ہے۔
- نفسیاتی درد جسمانی درد سے زیادہ شدید ہوتا ہے اور زبان سے لگایا ہوا زخم کلہاڑی کے زخم سے بھی زیادہ درد ناک۔

محمد احمد رضا انصاری۔ کوٹ ادو

مرد

حضرت علیؓ نے فرمایا مرد تین قسم کے ہوتے ہیں۔

پہلا مرد وہ ہے کہ جب اسے کوئی کام پیش آتا ہے تو خود خرچ کر کے فیصلہ کرتا ہے اور ہر کام کو اس کی جگہ پر رکھتا ہے۔

دوسرا مرد وہ ہے جو سمجھدار نہیں اس کی اپنی کوئی رائے بھی نہیں لیکن جب اسے کوئی کام پیش آتا ہے تو وہ سمجھدار اور رائے والے لوگوں کے پاس جا کر مشورہ کرتا ہے ان کے مشورے پر عمل کرتا ہے۔

تیسرا مرد وہ ہے جو حیران و پریشان ہے، اسے صحیح اور غلط کا پتا نہیں چلتا اور یوں ہی ہلاک ہو جاتا ہے کیونکہ اپنی سمجھ پوری نہیں ہوتی اور سمجھدار مشورہ دینے والے کی مانتا نہیں۔

انتخاب عبداللہ توفیق۔ حیدرآباد

رضا

جو لوگ رضائے الٰہی میں راضی رہتے ہیں ان کو زندگی میں کوئی پریشانی نہیں آتی بندے کو ہر حال میں اپنے مالک کی رضا میں خوش رہنا چاہیے انسان کو قناعت پسند ہونا چاہیے دنیاوی خواہشات انسان کے ایمان کو کمزور بنا دیتی ہے انسان کی بھلائی صرف اور حرف عاجزی میں ہی ہے عاجز بندہ اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے جتنا بہتر اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے لیے بہتر سوچتے ہیں بندہ کبھی بھی نہیں سوچ سکتا انسانی عقل صرف حد نظر تک ہی سوچ سکتی ہے اور ویسے بھی جو انسان اپنے مالک کی رضا میں راضی رہتا ہے اس کی دنیا اور آخرت دونوں میں کامیابی ملتی ہے یہ کون نہیں جانتا کہ کامیابی صرف اللہ تعالیٰ کی پاک ذات ہی دیتی ہے مالک کی رضا تو اپنی دنیاوی خواہشات کو سلب کرنے میں ہی ہے۔

ثناء اللہ سنی۔ رحیم یار خان

پہلے اور اب

کراچی

پہلے یہ ماہی گیروں کی ایک بستی تھی کلاچو نامی بلوچ کے نام پر اس کا نام کلاچی پڑ گیا۔ پھر آہستہ آہستہ کراچی [illegible] اسے شہر کی حیثیت دی گئی [illegible] تک یہ پاکستان کا دارالحکومت رہا۔

حیدرآباد

اس کا پرانا نام نیرون کوٹ تھا۔

کلہوڑوں نے اسے حضرت علی کے نام سے منسوب کر کے اس کا نام حیدرآباد رکھ دیا۔ اس کی بنیاد غلام کلہوڑا [illegible] انگریزوں نے شہر پر قبضہ کر لیا، اسے [illegible] میں ضلع کا درجہ ملا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

پشاور

پیشہ ور لوگوں کی نسبت سے اس کا نام پشاور پڑ گیا ایک اور روایت کے مطابق محمود غزنوی نے اسے یہ نام دیا۔

اردو صفحہ سے ماخوذ

انتخاب عمیمہ ظہیر... کراچی

دسمبر

اے دسمبر
کاش
اس بار آتے ہوئے
تم میرے محبوب کو بھی
لے آئے

عائشہ نور آشا۔ شادیوال گجرات

پیار کیا ہے؟

پیار وہ ہے جب میری ماں پیشانی پر بوسہ دیتی ہے۔

جب میں دیر سے گھر آتا ہوں تو بابا میرا انتظار کر رہے ہوتے ہیں۔

جب میری بہن کام کرتے ہوئے کہتی ہے جب میری شادی ہو جائے گی تو کون کرے گا تمہارے یہ کام۔

جب میرا بڑا بھائی کہتا ہے تجھے یہ شرٹ پسند ہے چل رکھ لے میں اور خرید لوں گا۔

جب میرا دوست کہتا ہے ٹینشن نہ لے یار میں ہوں نا تیرے ساتھ۔

صدیقہ خان۔ آزاد کشمیر

کچھ باتیں یاد رکھنے کی

خاموشی درخت ہے جس پر کڑوا پھل نہیں لگتا۔

: ایسی دیمک ہے جو انسان کو اندر اور باہر سے ختم کرتی ہے۔

: ایسی بوٹی ہے جس کی لذت کڑوی مگر تاثیر شہد سے زیادہ میٹھی ہے۔

: ایسا ننھا پودا ہے جو محنت کے بغیر نہیں لگتا۔

خوش اخلاقی خوشبو ہے جو میلوں دور سے محسوس ہو جاتی ہے۔

: ایسی گندگی ہے جو قلب کو سیاہ کر دیتی ہے۔

: ایسا ساتھی ہے جو ہمیشہ حق کی راہ دیکھتا ہے۔

: ایسا عمل ہے جو تقدیر کو مات دے سکتا ہے۔

: ایسا توبہ دروازہ ہے جو موت کی ہچکی تک کھلا رہے گا۔

شگفتہ خان... بھلوال

ملعون عورتیں

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ اس امت کے آخر میں ایسے لوگ ہوں گے جن کی عورتیں لباس پہننے کے باوجود برہنہ ہوں گی۔ ہائے افسوس کہ آج یہ آنکھوں سے نظر آ رہا ہے اس لیے کہ وہ لباس اتنا باریک ہے کہ جسم اس میں سے صاف نظر آ رہا ہے یا وہ لباس اتنا چھوٹا ہے کہ پورے اعضا چھپتے نہیں یا اس قدر چست لباس ہے کہ سارے اعضا نمایاں ہوتے ہیں۔

ان کے سروں پر اونٹوں کے کوہان جیسے بال ہوں گے ان پر لعنت کرو کیونکہ وہ ملعون ہیں۔

ثوبیہ کومل... چکوال

خوب صورت بات

روز صبح اسکارف لینے سے پہلے میری آنکھوں کے سامنے ان تمام حسین عورتوں کے دلکش سراپے گردش کرتے ہیں جو ٹی وی پہ میں نے کبھی دیکھی ہوئی ہیں اور میرا دل کرتا ہے کہ میں بھی ان کا راستہ چن لوں، مگر پھر مجھے وہ آخری عدالت یاد آ جاتی ہے، تب میں سوچتی ہوں کہ اس دن میں اللہ کو کیا جواب دوں گی؟ میں ترازو کے ایک پلڑے اپنا وہ سراپا ڈالتی ہوں جس میں، میں خود کو اچھی لگتی ہوں اور دوسرے میں وہ جس میں، میں اللہ تعالیٰ کو اچھی لگتی ہوں۔ میری پسند کا پلڑا ابھی نہیں جھکتا۔ اللہ کی پسند کا پلڑا ابھی نہیں اٹھتا۔ تم نے پوچھا تھا کہ میں اسکارف کیوں لیتی ہوں؟ سو میں یہ اس لیے کرتی ہوں کیونکہ میں اللہ کو ایسے اچھی لگتی ہوں۔"

نمرہ احمد کے ناول جنت کے پتے سے اقتباس

انتخاب: آبروِ نبیلہ اقبال......راولپنڈی

○

خوشبوئے سخن

نوشین اقبال نوشی

مایوس مت ہونا

کبھی مایوس مت ہونا
اندھیرا کتنا گہرا ہو
سحر کی راہ میں حائل
کبھی بھی ہو نہیں سکتا
سویرا ہو کے رہتا ہے
کبھی مایوس مت ہونا
امیدوں کے سمندر میں
تلاطم آتے رہتے ہیں
سفینے ڈوبتے بھی ہیں
سفر لیکن نہیں رکتا
مسافر ٹوٹ جاتے ہیں
مگر ماتجھی نہیں تھکتا
سفر طے ہو کے رہتا ہے
کبھی مایوس مت ہونا
خدا حاضر ہے ناظر بھی
خدا ظاہر ہے منظر بھی
وہی ہے حال سے واقف
وہی سینوں کے اندر بھی
مصیبت کے اندھیروں میں
کبھی تم مانگ کر دیکھو
تمہاری آنکھ کے آنسو
یوں ہی ڈھلنے نہیں دے گا
تمہاری آس کی گاگر
کبھی گرنے نہیں دے گا
ہوا کتنی مخالف ہو
تمہیں مڑنے نہیں دے گا
کبھی مایوس مت ہونا
وہاں انصاف کی چکی
ذرا دھیرے سے چلتی ہے
مگر چکی کے پاٹوں میں
بہت باریک پستا ہے
تمہارے ایک کا بدلہ
وہاں ستر سے زیادہ ہے
نیت تلتی ہے پلڑوں میں
عمل ناپے نہیں جاتے
وہاں جو ہاتھ اٹھتے ہیں
کبھی خالی نہیں آتے
ذرا سی دیر لگتی ہے
مگر وہ دے کے رہتا ہے
جب اس کے رحم کا ساگر
چھلک کے جوش کھاتا ہے
قہر ڈھاتا ہوا سورج
یکا یک کانپ جاتا ہے
ہوا اٹھتی ہے لہرا کر
گھٹا سجدے میں گرتی ہے
جہاں دھرتی ترستی ہے
وہیں رحمت برستی ہے
ترستے ریگ زاروں پر
ابر بہہ کے ہی رہتا ہے
نظر وہ اٹھ کے رہتی ہے
کرم ہو کے ہی رہتا ہے
امیدوں کا چمکتا دن
امر ہو کر ہی رہتا ہے
کبھی مایوس مت ہونا

شکیل احمد...... منڈی بہاؤالدین

غزل

بتاؤ کون کہتا ہے محبت بس کہانی ہے
محبت تو صحیفہ ہے محبت آسمانی ہے
محبت کو خدارا تم کبھی بھی جھوٹ نہ سمجھو
محبت معجزہ ہے معجزوں کی ترجمانی ہے
محبت پھول کی خوشبو، محبت تتلیوں کا رنگ
محبت پربتوں کی جھیل کا شفاف پانی ہے

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

محبت اک ستارہ ہے وفا کا استعارہ ہے
محبت سیپ کا موتی بحر کی بیکرانی ہے
زمیں والے بتاؤ کس طرح سمجھیں محبت کو
محبت تو زمیں پر آسمانوں کی نشانی ہے
محبت روشنی ہے، رنگ ہے، خوشبو ہے، نغمہ ہے
محبت اڑتا پنچھی ہے، محبت بہتا پانی ہے
محبت ماؤں کا آنچل، محبت باپ کی شفقت
محبت ہر جگہ، ہر پل، خدا کا نقش ثانی ہے
محبت بہن کی الفت، محبت بھائی کی چاہت
محبت کھیلتا بچہ ہے
محبت حق کا کلمہ ہے محبت چاشنی من کی
محبت روح کا مرہم دلوں کی حکمرانی ہے
محبت تو ازل سے ہے، محبت تا ابد ہوگی
محبت تو آفاقی ہے زمانی نہ مکانی ہے
فنا ہو جائے گی دنیا فنا ہو جائیں گے ہم تم
فقط باقی محبت ہے، محبت جاودانی ہے

فریحہ چوہدری...... سرگودھا

غزل

رکھے فرق دوست نہ دشمن میں ایسے یار کی کیا ضرورت ہے
ڈس لینا سانپ کی فطرت ہے اعتبار کی کیا ضرورت ہے
ہر سو رقصاں ہے وحشت سی، ہر گام مقتل گاہ یارو
جاں دے کے گر مجرم رہے، انکار کی کیا ضرورت ہے
بے عدل دستور زمانے کا ہر آنکھ یہاں تماشائی ہے
جہاں انصاف گونگا بہرہ ہو دربار کی کیا ضرورت ہے
نہ یہاں کوئی چشم زلیخاں سی، نہ ہم کوئی مصر کے یوسف ہیں
جب دام نہ پھوٹی کوڑی ہو، خریدار کی کیا ضرورت ہے
اس شہر میں بچے مفلس کے بھوک سے لپٹ کے سوتے ہیں
جب منزل کا گماں نہیں سالار کی کیا ضرورت ہے
قانون بھی ہو ناپید جہاں اور کوئی نہ پوچھے. مجرم کو
رہبر ہی رہزن بن جائیں پہرے دار کی کیا ضرورت ہے
ہر شب جلتی ہوئی آنکھوں میں تری یاد کے دیے بجھتے ہیں
ہمیں ہجر کا ذوق جو بخشا ہے اقرار کی کیا ضرورت ہے
چھید ہوں جس دم کشتی میں گرداب بکھیرے تختوں کو
جب عامر کشتی ڈوب چکی تو پتوار کی کیا ضرورت ہے

عامر زمان عامر...... بورے والا

شہرِ تمنا

اک شہرِ تمنا ہو
جہاں پھولوں کا بسیرا ہو
کانٹوں کی چبھن زخموں کی رفوگر ہو
سورج کی تپش ہر گھر کے لئے شبنم ہو
جہاں چاند کی کرنیں
ہر دل کے لئے روشن ہوں
اک ایسا شہرِ تمنا ہو
سب موسم اللہ کی عنایت ہوں
جہاں مقدر کا ستارہ
ہر اک کے لیے چمکتا ہو
اک ایسا شہرِ تمنا ہو
اک ایسا شہر تمنا ہو

ریحانہ سعیدہ...... لاہور

غزل

مجاہد نظر آتا ہے سالار نظر آتا ہے
میرا جرنیل راحیل شاہکار نظر آتا ہے
اسلاف کی خوبیوں کا لگتا ہے وہ امین
اپنے آباء • کے نکھرے ہوئے افکار نظر آتا ہے
ان سیاسی ٹٹوؤں سے اس کا نہیں واسطہ دور تک
جس رخ سے بھی دیکھوں صاحب کردار نظر آتا ہے
وطن عزیز کے افق پہ ہیں مایوسیوں کی گھٹائیں
ان مایوسیوں میں وہ امید کے آثار نظر آتا ہے
چھایا رہتا ہے جو ہر دم دشمن کے قلب پہ
ہزاروں بھیدوں میں چھپا وہ اسرار نظر آتا ہے
رکھے ہیں اس نے قوم کے زخموں پہ مرہم
وہ قوم کا حقیقت میں غمخوار نظر آتا ہے
دیکھتا ہوں فاروق جو کارنامے سپہ سالار کے
میرا جرنیل توسیع کا حقدار نظر آتا ہے

عمر فاروق ارشد...... فورٹ عباس

غزل

مانگا تھا میں نے جسے دعاؤں میں
ملا پھر مجھے وہ میری اداؤں میں

ساتھ نبھانا کہاں ضروری سمجھا تم نے
سنائی دے وہ مجھے بھولی بسری صداؤں میں
نقش بنا اس کا دل کے افق پہ
بسیرا ہو جیسے اس کا ان فضاؤں میں
بات بنتے ہی مسکرا اٹھے تن میرا
لو بات چل پڑی اس کی کہکشاؤں میں
تحریر اپنی ہو لکھوں نام تیرا عنبرین
یاد آنے لگا پھر وہ مجھے وفاؤں میں

عنبرین اختر...... لاہور

غزل

زندگی کی کج ادائی دیکھ کر
میں تعاقب موت کا کرتا رہا
تیری چاہت میں سبھی غم سہہ لیے
قرض یہ ہنس کر ادا کرتا رہا
قوت گفتار گو محبوس تھی
ذکر پھر بھی آپ کا کرتا رہا
زیست کا غم آپ کا غم اپنا غم
سب غموں کو ایک جا کرتا رہا
اس فریب و مکر کی دنیا میں، میں
حق پرستی کی خطا کرتا رہا

دستگیر شہزاد...... ٹوبہ ٹیک سنگھ

تم

تم تو
مجھ کو یوں لگتے ہو
شب کو جیسے
دور افق پہ
تاروں کی اک بھیڑ میں
چاند ہو نکلا
بالکل تنہا اور
اکیلا

سباس گل...... رحیم یار خان

غزل

نگری نگری لوگ یہاں ویران ہوئے
عشق میں میری جان بہت نقصان ہوئے
خود غرضی کو اوڑھ لیا ہے چہروں پہ
دیکھ لیا ہے پتھر بھی بھگوان ہوئے
مار دیا ہے بیٹے نے اک ممتا کو
کیسے کیسے لوگ یہاں انسان ہوئے
وہ میری دہلیز پہ آیا برسوں بعد
ہم اس کو یوں دیکھ کے سب حیران ہوئے
اس کے لوٹ کر جانے پہ احساس ہوا
میرے شہر کے دروازے سنسان ہوئے
خون سے غزلیں سینچ رہی ہوں چپکے سے
ایسے کیسے یہ آخر دیوان ہوئے

فریدہ فری...... لاہور

غزل

بازار دکھوں کے بے پناہ ہیں
وفا کی نگری میں سن لو جاناں
بہت ہے مشکل پھر بھی لیکن
دامن اپنا بچا کے چلنا
ملے گی قدموں سے
ہر قدم پہ نارسائی
نارسائی سے قدموں کو بچا کے چلنا
پامال ہوتی ہیں وفائیں
عہد بھی دم توڑتے ہیں
عہد عمر بھر کا کرنے والے
دو قدم پہ چھوڑتے ہیں
یہاں ہیں ہر سمت
مقبرے وفا کے
قلب کو ضبط کا کفن پہنا کر
غسل اشکوں سے دلا کر
تیار رکھنا جانے جاناں
کہ نجانے کس گھڑی ہیں
وفا کی ہوا جائے وفات جاناں
چلن زمانے کا یہ ہو گیا ہے
وقار ہے گی خاک کے نیچے
خاک کے اوپر بے وقار ہیں گے

حمیرا قریشی...... حیدر آباد، سندھ

غزل

دیوار خستہ حال ہے اور در دل اداس ہے
جب سے کوئی گیا ہے میرا گھر اداس ہے
اک بار وہ مجھے ملا تھا بے رخی کے ساتھ
اس دن سے دل کا شہر برابر اداس ہے
دیکھی ہے اس کی آنکھ میں پہلی دفعہ نمی
یوں لگ رہا ہے جیسے سمندر اداس ہے
یوں چاند چپ کھڑا ہے سر دشت آسماں
جیسے زمین پر کوئی بے گھر اداس ہے
تیرے جانے سے وہ چاہتیں وہ راحتیں
بکھرا ہوا ہے مے کدہ خم و ساغر اداس ہے

عائشہ اعوان...... رحیم یار خان

غزل

نرم ہاتھوں کو اٹھائے ان کے لیے دعائیں مانگی
ہر لمحہ دل سے ان کے لیے وفائیں مانگی
گزرتے شباب کی اٹکھیلیاں بھی عجیب ہوتی ہیں
جب بھی سامنے ہوں تو ان کی ادائیں مانگی
گھنے بادل ہوں رم جھم ہو اور ٹھنڈی ہوا
آنکھوں کو تراوٹ ملے ایسی گھٹائیں مانگی
دل بہل جائے یونہی موسم کی روانی
کیا کہوں میں ان کے لیے کیسی فضائیں مانگی
وہ خفا ہوئے بھی تو اک بے خطا غلطی پر
پھر بھی اپنے حصے کی خطائیں مانگی
دیر کتنی ہی لگی مجھے ظالم کہنے میں رومی
میں نے پھر بھی نہ ان کے لیے بد دعائیں مانگی

عبدالجبار رومی انصاری...... لاہور

غزل

معطل نہیں تو روانی بھی نہیں
دائم نہیں محبت تو فانی بھی نہیں
عجب دوراہا سفر میں ہوں
منزل کھونی بھی نہیں تو پانی بھی نہیں
اس سے بچھڑنے کا خدشہ کیونکر ہو
یقین نہیں اگر تو بدگمانی بھی نہیں
وہ اس تناسب سے گویا ہوا
بات ٹالی بھی نہیں بات مانی بھی نہیں
ایسے آشیانے کی باسی ہوں
جسے راہ جانی نہیں تو آنی بھی نہیں

انیلہ مرتضی...... ڈسکہ

غزل

اس شوخ کی جو مجھ پہ عنایت نہیں رہی
وابستہ مجھ سے کوئی مصیبت نہیں رہی
اپنوں نے وہ سلوک کیا ہے کہ اب مجھے
اغیار سے بھی کوئی شکایت نہیں رہی
مکروفریب، بغض و عداوت ہے ہر طرف
دنیا میں کیا کہیں بھی محبت نہیں رہی
واقف ہوا ہوں جب سے میں خود اپنے آپ سے
ہمدردیوں کی مجھ کو ضرورت نہیں رہی
بارِ غمِ جدائی نے یہ حال کردیا
اب اور غم اٹھانے کی ہمت نہیں رہی
دنیائے رنگ و بو میں مجھے جانِ آرزو
تیرے سوا کسی کی بھی چاہت نہیں رہی
اس نے نگاہِ مست سے دیکھا تھا ایک بار
جام و سبو سے پھر مجھے رغبت نہیں رہی
مجبور کردیا ہے غمِ روزگار نے
چاہت میں اب وہ پہلی سی شدت نہیں رہی
یاسر مداوا درد کا ہوتا بھی کس طرح
مجھ کو غمِ زمانہ سے فرصت نہیں رہی

غلام مجتبیٰ یاسر ہاشمی...... حیدرآباد

✹

ڈیول

زرین قمر

سمیر احمد فاروقی کوئی عام نوجوان نہیں تھا وہ کم عمری ہی سے ذہین پڑھنے کی خداداد صلاحیت لے کر پیدا ہوا تھا۔ خطرے کا احساس اسے وقت سے پہلے ہو جاتا تھا لیکن اس کی سترہویں سالگرہ پر اسے احساس ہوا کہ وہ کتنا مختلف ہے پھر ایک حادثے نے اسے احساس دلایا کہ اسے اپنی خداداد صلاحیت کو بڑھانے کی ضرورت ہے ورنہ اس کا جینا ناممکن ہوگا۔ چنانچہ اس نے اپنی صلاحیتوں کو بڑھانا شروع کر دیا اور سپر ہیرو بن گیا لیکن کوئی نادیدہ قوت تھی جو اسے مارنا چاہتی تھی۔

اس کہانی کے نام، کردار، جگہیں اور واقعات رائٹر کے ذہن کا تخیل ہیں اور کسی سے ان کی مماثلت صرف اتفاقیہ ہوگی۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

Downloaded From paksociety.com

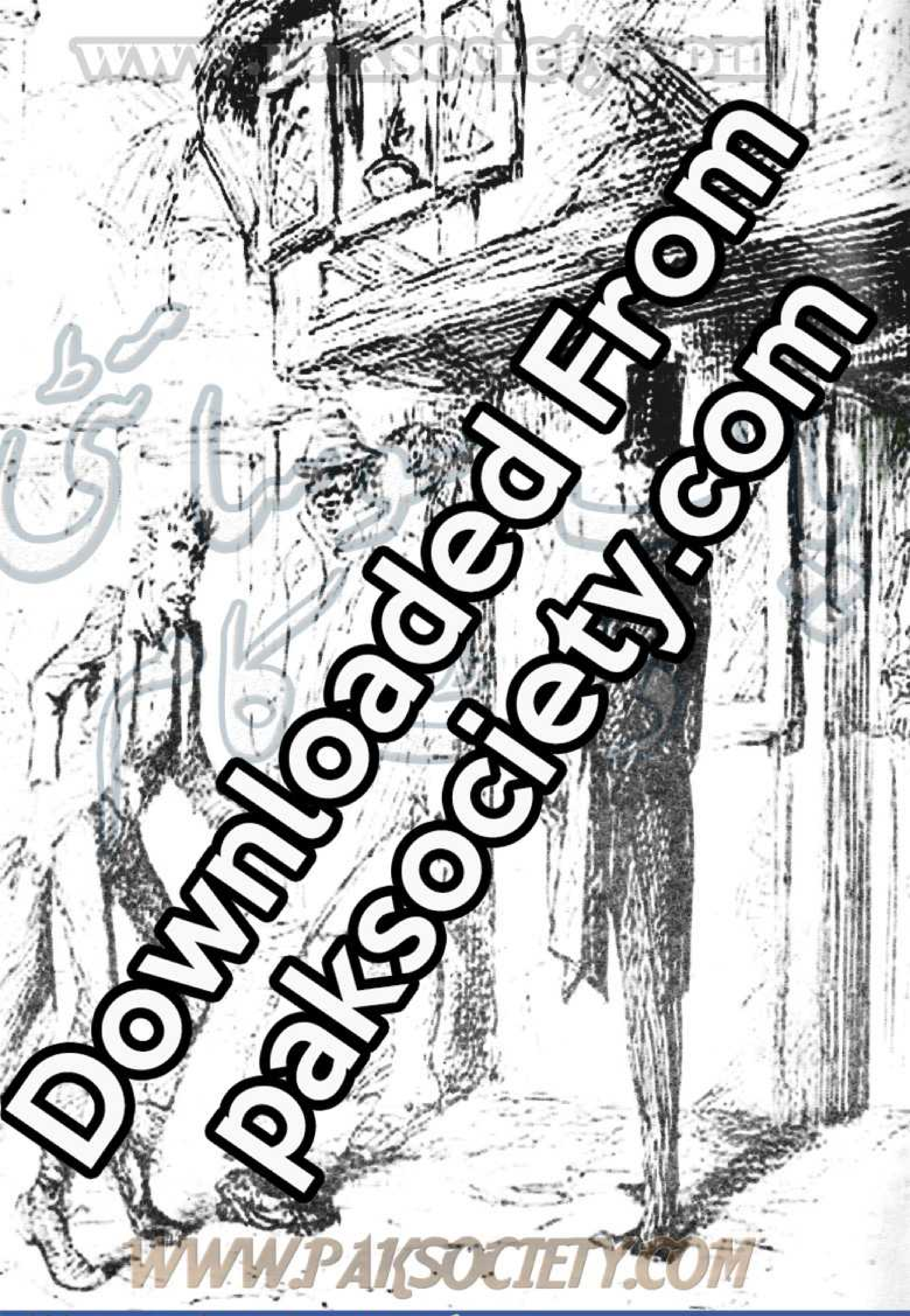

Downloaded From

"بیٹھو! تم سے کچھ باتیں کرنا ہیں۔" خلیل کامران نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"سمیر! تمہارے اندر دوسروں کا ذہن پڑھنے کی صلاحیت موجود ہے یہ بات تمہارے والد نے مجھے بتائی تھی جب تم دوسروں کے ذہن پڑھتے ہو تو تمہیں کیسا لگتا ہے؟"

"بس دوسرے شخص کے خیالات میرے ذہن میں آجاتے ہیں...... خود بخود...... اور وہ ہمیشہ درست ہوتے ہیں۔" سمیر نے جواب دیا۔

"اس کے علاوہ کوئی غیر معمولی بات؟"

"مجھے آنے والے خطرات کا پہلے سے اندازہ ہوجاتا ہے...... میری چھٹی حس مجھے بتادیتی ہے کہ کچھ ہونے والا ہے جیسے کہ اس روز میرے ساتھ ہوا تھا۔ جب میں گھر کے قریب جنگل میں اپنی کتاب لینے کے لیے نہیں جارہا تھا اور مجھے خوف محسوس ہورہا تھا کہ کچھ ہوجائے گا۔ میرے والد زبردستی مجھے وہاں لے گئے تھے اور پھر واقعی وہ ناخوش گوار واقعہ پیش آگیا تھا۔"

"سمیر! ویسے تو میں ٹیلی پیتھی کا علم سیکھنے والوں کو باقاعدہ تربیت دینے کے لیے ان کی کلاس لیتا ہوں لیکن تمہارا معاملہ مختلف ہے۔ دوسرے لوگ اس کے قاعدے قانون سیکھ کر اس کی مشقیں کرتے ہیں لیکن تمہیں اللہ کی طرف سے یہ خداداد صلاحیت ملی ہوئی ہے بس اسے نکھارنے کی ضرورت ہے تمہارے لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں تمہیں سب سے الگ رکھوں اور اگر کچھ بتانا ہو تو سب سے الگ ہی بتاؤں۔ تم اپنے خواب اپنے خیالات کے بارے میں جب چاہو مجھ سے مشورہ کرسکتے ہو۔"

"ٹھیک ہے۔" سمیر نے کہا۔

"دیکھو سمیر یوں سمجھ لو کہ ہماری ذہنی صلاحیتوں کا باقاعدہ ایک کشادہ نیٹ ورک ہے جو ساری سوچیں جمع کرتا ہے اور ان جمع شدہ سوچوں کو تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ کہیں بھیجا جاسکتا ہے یہ بہت مضبوط ہوتی ہیں بالکل حقیقت کی طرح یہ عمل ایسا ہی ہوتا ہے جیسے کیمرے سے کسی چیز کا عکس کھینچا جائے اور وہ ایک کیمیائی عمل سے گزر کر تصویر کی شکل اختیار کرلے اس طرح جو سوچیں ہم جمع کرتے ہیں وہ بھی ذہن کے گوشوں سے گزر کر ایک مکمل حقیقت میں تبدیل ہوسکتی ہیں اور اس کی طاقت اور حقیقت اس بات پر منحصر ہوتی ہے کہ جوان کو کنٹرول کررہا ہے وہ کتنا مضبوط ہے۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں اس تجربے سے دوچار ہوتا رہتا ہوں۔" سمیر نے کہا پھر زیادہ دیر سمیر وہاں نہیں رکا تھا اور اپنے کمرے میں آگیا تھا اسے بار بار رات نظر آنے والا خواب یاد آرہا تھا اور اس نے کسی سے اس کا تذکرہ نہیں کیا تھا وہ حیران تھا کہ اسے وہ خواب کیوں نظر آرہا تھا کیا اس کی والدہ اس سے کچھ کہنا چاہتی ہیں، اسے اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعے کے بارے میں بتانا چاہتی ہیں یا یہ محض اس کے ذہن کا اختراع تھی۔

دوسرے روز وہ نہ چاہنے کے باوجود پھر زرتاشے کے گھر پہنچ گیا تھا زرتاشے کی ماں نے بہت خوش دلی سے اس کا استقبال کیا تھا پھر وہاں اس کی ملاقات ایک ادھیڑ عمر شخص سے بھی ہوئی تھی جس کا تعارف زرتاشے کی والدہ نے سمیر سے کروایا تھا۔

"یہ صمصام گل ہیں اس بستی کے اہم لوگوں میں ان کا شمار ہوتا ہے میرے شوہر امتیاز خان کے بہت اچھے دوست اور پارٹنر ہیں۔" زرتاشے کی ماں نے کہا۔

"آپ سے مل کر خوشی ہوئی مجھے سمیر کہتے ہیں اور میں ڈریم سینٹر میں رہتا ہوں جہاں اپنی تعلیم مکمل کررہا ہوں۔"

"بہت خوب!" صمصام گل نے کہا۔ وہ زرتاشے کے قریب ہی بیٹھا تھا اور سمیر نے محسوس کیا تھا کہ زرتاشے کو اس کا اس طرح بیٹھنا پسند نہیں آرہا تھا پھر وہ اپنی جگہ پر کھڑی ہوگئی تھی۔

"کہاں جارہی ہو؟" صمصام گل نے بے چینی سے پوچھا۔

"میں ذرا باہر جارہی ہوں کچھ کام ہے۔" زرتاشے نے کہا اور گھر سے نکل گئی سمیر بھی اس کے پیچھے باہر آگیا تھا۔ اس نے زرتاشے کے ذہن کو پڑھنے کی کوشش کی وہ خاصی پریشان تھی اس کی سوچیں منتشر تھیں۔

"کیا بات ہے زرتاشے؟" اس نے قریب جاتے ہوئے پوچھا۔

"یوں لگتا ہے کہ جیسے تم اس شخص کو پسند نہیں کرتی؟"

"ہاں! میں اسے پسند نہیں کرتی۔" زرتاشے نے کہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔

”میں……میں بہت دن سے ماں کو سمجھا رہی ہوں کہ اسے گھر میں نہ بلایا کریں لیکن وہ میری بات سنتی نہیں۔ انہیں پتہ نہیں اس شخص میں کیا خوبی نظر آتی ہے۔“ زرتاشے غصے میں تھی۔

”اگر تم اسے پسند نہیں کرتیں تو اپنے والد سے بات کرو۔ وہ یقیناً تمہاری بات سمجھیں گے۔ اور تمہاری مدد کریں گے۔“ سمیر نے مشورہ دیا۔

”انہیں ہر بات کا علم ہے لیکن وہ خاموش ہیں۔“ زرتاشے کے لہجے میں مایوسی تھی۔

”تم کیا چاہتی ہو؟“ سمیر نے نہ چاہتے ہوئے بھی پوچھا نہ جانے کیوں اسے اس معصوم لڑکی سے ہمدردی محسوس ہو رہی تھی وہ اس کی مدد کرنا چاہتا تھا لیکن وہ اس فیملی کے بارے میں کسی قسم کی معلومات نہیں رکھتا تھا۔

”میں اپنی زندگی جینا چاہتی ہوں۔“ زرتاشے نے کہا۔

”تم یہاں خوش نہیں ہو؟“ سمیر نے اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”اتنا پرفضا مقام، سرسبز وادیاں، برف سے ڈھکی پہاڑیوں کی چوٹیاں اتنی خوب صورت جگہ تمہارا گھر ہے تمہیں پتہ ہے ہمارے جیسے لوگ تو ایسی جگہوں میں رہنے کے خواب ہی دیکھتے ہیں۔“ سمیر نے کہا تو زرتاشے اسے حیرت سے دیکھنے لگی۔

”کیا تم بھی یہی خواہش رکھتے ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں!…… یہ بہت اچھی جگہ ہے۔“

”تم یہاں کے نہیں، وہ اس لیے یہ بات کہہ رہے ہو۔ دراصل کتنا بھی اچھا ماحول ہو لیکن طویل عرصے وہاں رہنے سے انسان اُکتا جاتا ہے اور وہاں سے فرار چاہتا ہے۔“ زرتاشے نے کہا لیکن سمیر محسوس کر رہا تھا کہ زرتاشے جو کچھ کہہ رہی ہے صرف وہی وجہ نہیں ہے اور بھی کچھ ہے جو وہ سمیر سے چھپا رہی ہے۔

”تم پریشان مت ہو زرتاشے میں تمہارے والدین سے بات کروں گا۔“ سمیر نے کہا۔

”نہیں میں تمہیں اس کی اجازت نہیں دے سکتی وہ تو تمہیں جانتے بھی نہیں ہیں ممکن ہے ہمارے گھریلو معاملے میں انہیں تمہاری مداخلت پسند نہ آئے۔“

”ٹھیک ہے تمہاری مرضی۔“ سمیر نے کہا وہ حیران تھا کہ زرتاشے پریشان ہونے کے باوجود کیوں نہیں چاہتی کہ کوئی اس کے والدین سے اس سلسلے میں بات کرے۔

”اچھا! میں چلتا ہوں……کافی دیر ہوگئی ہے۔“ سمیر نے کہا۔ زرتاشے نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

سمیر واپس ڈریم سینٹر کی طرف روانہ ہوگیا تھا وہ چھوٹی چھوٹی پگڈنڈیوں پر لگی جھاڑیوں کے درمیان راستہ بناتا آگے بڑھ رہا تھا۔ اونچے اونچے درختوں کے گھنے پتوں سے سورج کی روشنی چھن چھن کر نیچے آ رہی تھی جس نے ماحول کو پوری طرح تاریک ہونے سے بچایا ہوا تھا دن کے وقت بھی درختوں کی گھنی چھاؤں کی وجہ سے نیچے کا منظر کافی دھندلا تھا جہاں سورج کی روشنی پڑ رہی تھی۔ وہاں جھٹ پٹے کا سماں تھا۔

چلتے چلتے سمیر کو احساس ہوا کہ جیسے وہ وہاں اکیلا نہیں ہے کوئی اور بھی ہے اس کے اردگرد موجود ہے پھر کہیں دور سے سوکھے پتوں کے چرمرانے کی آواز سنائی دی اور اسے یقین ہوگیا کہ اس کے علاوہ بھی وہاں کوئی ہے وہ تیزی سے قدم بڑھانے لگا لیکن دوسرے ہی لمحے ڈھیلا ڈھالا چوغہ پہنے ایک نقاب پوش نے اس پر حملہ کردیا تھا اچانک حملے سے وہ لڑکھڑا گیا لیکن گرنے سے پہلے اس نے ایک درخت کا سہارا لے لیا تھا۔ نقاب پوش نے پھر اس پر چھلانگ لگائی تھی لیکن اس بار سمیر ہوشیاری سے ایک سمت جھک گیا تھا اور اس کی چھلانگ سے بچ کر نکل گیا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ نقاب پوش سنبھل کر دوبارہ حملہ آور ہوتا سمیر نے اسے دبوچ لیا۔ اس شخص نے سمیر کی گرفت سے نکلنے کے لیے اس کے پیٹ پر ایک کک ماری تھی اور سمیر پیٹ پکڑ کر دوہرا ہوگیا وہ شخص اس کی گرفت سے نکل کر تیزی سے بھاگتا ہوا دائیں جانب درختوں میں گم ہوگیا تھا۔ سمیر بھی تیزی سے اس کی طرف لپکا تھا۔ چند قدم آگے جانے پر وہ شخص نظر آیا تھا وہ تیزی سے بھاگ رہا تھا اور درختوں اور جھاڑیوں کی آڑ میں رہ کر بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن اب سمیر اپنی آنکھوں، کانوں کے ساتھ ساتھ اپنے ذہنوں کی صلاحیتوں سے بھی کام لے رہا تھا جب وہ اس کی نظروں سے اوجھل ہوتا تو اس کے کان اس کی آہٹ محسوس کرتے اور جب اس کی آہٹیں بھی سنائی نہ دیتیں تو سمیر کو اپنے ذہن کے گوشوں میں اس کے دل کی دھڑکنیں

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

پاک سوسائٹی پر مُوجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد
نمرہ احمد
فرحت اشتیاق
قُدسیہ بانو
نگہت سیما
نگہت عبداللّٰہ
رضیہ بٹ
رفعت سراج
صائمہ اکرام
سعدیہ عابد
عفت سحر طاہر
تنزیلہ ریاض
فائزہ افتخار
سباس گُل
رُخسانہ نگار عدنان
اُمِ مریم
عُشنا کوثر سردار
نبیلہ عزیز
فائزہ افتخار
نبیلہ ابر راجہ
آمنہ ریاض
عنیزہ سید
اقراء صغیر احمد
نایاب جیلانی
اشفاق احمد
نسیم حجازی
عنایت اللّٰہ التمش
ہاشم ندیم
مُمتاز مُفتی
مُستنصر حُسین
علیم الحق
ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دستر خوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com

اوراس کی سانس سنائی دیتیں اور وہ اسی سمت دوڑ لگا دیتا۔

بھاگتے بھاگتے وہ جنگل سے نکل کر میدان میں آ گیا تھا۔ میدان چھوٹا سا تھا اس کے فوراً بعد پہاڑ شروع ہو گئے تھے۔ اسی لمحے سمیر نے رک کر اندازہ لگایا کہ اسے کس سمت جانا چاہیے۔ اس کا ذہن اس کی رہنمائی کر رہا تھا اس نے اس راستے سے ذراہٹ کر دوسری سمت دوڑنا شروع کر دیا جس پر وہ اب تک دوڑ رہا تھا پھر وہ سامنے آنے والی پہاڑیوں میں داخل ہو گیا تھا۔ جو ایک دوسرے کے ساتھ ملی ہوئی تھیں جن کے درمیان میں تنگ راستے تھے۔ جو ناہموار تھے اچانک قریب ہی کہیں ایک پتھر لڑھک کر نیچے کی جانب گرا اور سمیر چھپتا ہوا اس سمت بڑھا۔ نقاب پوش سامنے ہی ایک دراڑ سے اوپر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سمیر نے پیچھے سے چھلانگ لگا کر اسے دبوچ لیا اور اس بار پھر وہ اس کا وزن سہار نہیں سکا تھا اور اس کو ساتھ لیے ہوئے زمین پر گر گیا تھا۔

نقاب پوش پھر اٹھا اور بھاگا تھا لیکن سمیر نے اپنی ٹانگ اس کی ٹانگ میں اڑا دی تھی اور وہ گر گیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے سمیر اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا تھا۔ اس نے نقاب پوش کے دونوں ہاتھ بھی اپنے پیروں کے نیچے دبا لیے تھے اور نقاب پوش اس کی گرفت سے نہیں نکل سکا تھا۔

”کون ہو!......کون ہو تم؟“ سمیر نے غرا کر پوچھا لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سمیر نے اس کے چہرے سے نقاب کھینچ لیا وہ بیس سال کا نوجوان تھا سرخ و سفید رنگت اور توانا جسم کا مالک گھنے سیاہ بال اس کے ماتھے پر بکھر گئے تھے۔

”کیا چاہتے ہو؟......تم کون ہو؟“ سمیر نے پوچھا لیکن اس بار اسے کوئی جواب نہیں ملا تھا لیکن نوجوان کی طرف سے مزاحمت ختم ہو گئی تھی۔ سمیر نے گریبان سے پکڑ کر سیدھا کر کے بٹھا دیا اور خود اس کے ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر بیٹھ گیا۔

”مجھے کیوں مارنا چاہتے تھے؟“ اس کی آواز میں غصہ تھا۔

”میں تمہیں مارنا نہیں چاہتا تھا۔“ اس نوجوان نے جلدی سے کہا وہ سمیر سے خاصا مرعوب نظر آ رہا تھا۔

”پھر؟......پھر مجھ پر حملہ کرنے کی وجہ؟“ سمیر نے اسی لہجے میں پوچھا۔

”تم زرتاشے کے گھر کیوں جاتے ہو؟“ اس نوجوان نے کہا سمیر کو اس کے سوال پر حیرت ہوئی اس نے بھی اس نوجوان کو کبھی زرتاشے کے گھر یا اس کے قریب نہیں دیکھا تھا۔

”تم کون ہو......؟ زرتاشے سے تمہارا کیا تعلق ہے۔“ سمیر نے پوچھا۔

”مم......میں......اسے چاہتا ہوں۔“ نوجوان نے کہا اور سمیر حیران رہ گیا۔ زرتاشے نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی تھی جس سے یہ اندازہ ہو کہ وہ کسی کو چاہتی ہے وہ تو بس یہاں کے ماحول سے اکتا گئی تھی اور یہاں سے دور جانا چاہتی تھی جس کے لیے اس کے والدین اس کی مدد نہیں کر رہے تھے۔

”میں قریبی بستی میں رہتا ہوں ......میرا نام گلفراز خان ہے۔“

”تم زرتاشے کو کیسے جانتے ہو؟“

”میرا کبھی کبھی ادھر سے گزر ہوتا ہے تو اسے اکثر ندی کے قریب، کبھی پہاڑیوں کی طرف جاتے ہوئے اور کبھی گھاس کے میدانوں میں بھیڑ بکریوں کے ساتھ کھیلتے دیکھتا ہو۔ میں اسے پسند کرتا ہوں۔“ گلفراز نے کہا اور سمیر اس کے ہاتھ چھوڑ کر اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔

”کیا زرتاشے یہ بات جانتی ہے؟“ سمیر نے پوچھا۔ اس نے اتنی دیر میں گلفراز کے ذہن کو پڑھ لیا تھا اور یہ جان گیا تھا کہ گلفراز سچ بول رہا ہے۔

”وہ مجھے تو جانتی ہے کیوں کہ راہ میں ملتے ہوئے ہم ایک دوسرے کو سلام کرتے ہیں خیریت پوچھتے ہیں لیکن وہ یہ نہیں جانتی کہ میں اسے پسند کرتا ہوں۔“

”کیا کبھی اس کے والدین سے ملے ہو؟“ سمیر نے پوچھا۔

”صرف والدہ سے ملا ہوں وہ بہت لالچی عورت ہے۔“ گلفراز نے کہا اور سمیر کو ایک بار پھر حیرت ہوئی۔ کیونکہ اس نے زرتاشے کی ماں میں ابھی تک ایسی کوئی بات محسوس نہیں کی تھی۔

”یہ بات تم کیسے کہہ سکتے ہو؟“

”یہ ایک لمبی کہانی ہے پھر کبھی بتاؤں گا......تم یہ بتاؤ

کہ تم کون ہو...... مقامی تو نہیں ہو...... یہاں کیا کررہے ہو اور زرتاشے سے قریب ہونے کی کوشش کیوں کررہے ہو؟'' گلفراز نے پوچھا۔

''یہ تم نے صحیح کہا کہ میں مقامی نہیں ہوں یہاں ڈریم سینٹر میں رہتا ہوں اور اپنی تعلیم مکمل کررہا ہوں لیکن یہ تم نے غلط کہا کہ میں زرتاشے سے قریب ہونے کی کوشش کررہا ہوں ایسا نہیں ہے۔''

''پھر تم بار بار اس کے گھر کیوں جاتے ہو؟''

''دراصل میں اس علاقے میں نیا ہوں اور یہاں کسی کو نہیں جانتا۔ اتفاقاً میری ملاقات زرتاشے سے ہوئی تو اس کی والدہ نے مجھے گھر میں بلالیا اور یوں میرا آنا جانا شروع ہوگیا۔''

''اس عورت سے بچ کر رہنا...... وہ بہت چالاک ہے۔'' گلفراز نے کہا۔

''کون عورت؟''

''زرتاشے کی ماں! اس نے زرتاشے کا جینا بھی حرام کیا ہوا ہے۔'' گلفراز نے غصے سے کہا۔

''کیا کہہ رہے ہو؟ یہ بات غلط ہے وہ تو زرتاشے کا بہت خیال رکھتی ہے۔'' سمیر نے کہا۔

''ہاں ایسا لگتا ہے کہ وہ اس کا خیال رکھتی ہے لیکن دراصل وہ اس کی سخت نگرانی کرتی ہے۔''

''نگرانی؟ کیوں؟''

''یہ ایک راز ہے میں تم پر بھروسہ نہیں کرسکتا تو تمہیں کیسے بتاؤں۔'' گلفراز نے کہا۔

''بھروسہ نہ کرنے کی وجہ؟''

''سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ تم اجنبی ہو اور میں تمہارے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔''

''ٹھیک ہے مت بتاؤ۔'' سمیر نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''جب تم محسوس کرو کہ تمہیں میری مدد کی ضرورت ہے تو بتادینا۔''

''مجھے تمہاری مدد کی ضرورت بھلا کیوں ہوگی؟''

''یہ تو وقت بتائے گا اگر تم واقعی زرتاشے کے سچے عاشق ہو اور اسے حاصل کرنا چاہتے ہو اور تمہارے کہنے کے مطابق وہ کسی مشکل میں ہے تو کیا تم اسے اکیلے اس مشکل سے نکال سکتے ہو؟'' سمیر نے کہا اور گلفراز لاجواب ہوگیا۔

''ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' گلفراز نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''چلو دوست! ایک دوسرے پر اعتماد ہونے تک ہم انتظار کریں گے۔'' سمیر نے دوستانہ مصافحے کے لیے گلفراز کی طرف اپنا دائیاں ہاتھ بڑھایا جسے گلفراز نے گرم جوشی سے پکڑ لیا تھا۔

''ٹھیک ہے ممکن ہے مستقبل میں ہم ایک دوسرے کے بہترین دوست ثابت ہوں یا حریف؟'' گلفراز نے کہا۔

''اس کا فیصلہ وقت کرے گا۔'' سمیر نے جواب دیا پھر وہ باتیں کرتے ہوئے پہاڑیوں سے نیچے آگئے تھے اور جنگل شروع ہونے سے پہلے گلفراز اس سے جدا ہوگیا تھا۔

''وہ راستہ میری بستی کو جاتا ہے...... یہاں سے تمہاری اور میری راہیں جدا ہیں۔'' گلفراز نے کہا۔

''لیکن مستقبل میں شاید ہمیں کچھ وقت ساتھ ہی گزارنا ہو میری چھٹی حس کہتی ہے۔'' سمیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

پھر وہ اپنی اپنی راہوں پر چل پڑے تھے کچھ دور جانے کے بعد گلفراز نیچے اترتے ہوئے سمیر کی نظروں سے اوجھل ہوگیا تھا۔

سمیر جب ڈریم سینٹر پہنچا تو ناصر محمود اس کا منتظر تھا۔

''سمیر تم کہاں چلے جاتے ہو؟ خلیل کامران تمہارے بارے میں پوچھ رہے تھے۔'' ناصر محمود نے کہا۔

''میں صبح ناشتہ کرکے ٹہلنے باہر چلا گیا تھا یہاں کا علاقہ بہت پرفضا ہے، بہت لطف آتا ہے۔'' سمیر نے ہنستے ہوئے کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے مجھے بھی ساتھ لے چلتے۔'' ناصر محمود نے کہا۔

''دراصل خلیل کامران کا خیال ہے کہ تمہیں تنہا باہر نہیں جانا چاہیے کیونکہ ان کے خیال میں شاید تم محفوظ نہیں ہو۔''

''میں ان کا بہت شکر گزار ہوں ناصر صاحب لیکن یوں ڈر ڈر کر میں کب تک زندگی گزار سکتا ہوں۔ یہاں آنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ میں اس قابل ہوجاؤں کہ خطرات کا

خود مقابلہ کرسکوں اب تک ڈرڈر کر زندگی گزاری تو کیا حاصل ہوا۔"

"تمہارا کہنا بھی درست ہے لیکن اگر تم اپنے ساتھ مجھے ہی لے جاؤ تو اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔"

"چلو ٹھیک ہے آئندہ خیال رکھوں گا۔" سمیر نے بات کو مختصر کرنے کے لیے کہا۔

"خلیل کامران میرے بارے میں کیا پوچھ رہے تھے؟"

"تمہاری آنٹی سارہ کا فون آیا تھا ان کے پاس شاید اسی سلسلے میں کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔"

"اچھا اس وقت وہ کہاں ہیں؟"

"ابھی تو کچھ مہمان آئے ہوئے ہیں ان سے مل رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے پھر دوپہر کے کھانے پر بات ہوگی۔" سمیر نے کہا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا کمرے میں جاکر اس نے دروازہ بند کرلیا تھا اور بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کرلی تھیں وہ زرتاشے کے ذہن میں جانا چاہتا تھا تاکہ جان سکے کہ اس کی پریشانی کا راز کیا ہے پھر اسے زرتاشے کے ذہن میں جانے میں کوئی پریشانی نہیں ہوئی تھی وہ خوفزدہ تھی اور کسی بات پر اپنی ماں سے الجھ رہی تھی۔

"میں کسی قیمت پر بھی صمصام گل سے شادی نہیں کرسکتی۔" زرتاشے رو رو کر کہہ رہی تھی۔

"تمہیں یہ کرنا ہوگا۔ زرتاشے تمہیں پتہ ہے کہ صمصام تمہارے والد کا کاروباری پارٹنر ہے اور میں یہ نہیں چاہتی کہ ہماری کانوں سے حاصل ہونے والی آدھی دولت ہمارے ہاتھوں سے نکل جائے۔" زرتاشے کی ماں نے کہا پھر وہ وہاں سے چلی گئی تھی اور زرتاشے بے تحاشا رو رہی تھی وہ سوچ رہی تھی کہ اگر آج اس کی ماں زندہ ہوتی تو شاید اس کے ساتھ یہ سب نہ ہوتا۔ جب سمیر کو یہ پتہ چلا کہ زرتاشے کی ماں دراصل اس کی سگی ماں نہیں ہے تو وہ حیران رہ گیا کیونکہ اس کے رویے سے سمیر کو کوئی ایسی بات محسوس نہیں ہوئی تھی جس سے اسے اندازہ ہو کہ وہ زرتاشے کی سگی ماں نہیں ہے۔

زرتاشے کے ذہن میں پہلی بار جانے پر سمیر کو پتہ چلا کہ زرتاشے بھی اس کی طرح خاص صلاحیت رکھتی ہے اور زرتاشے کی ماں اسے اپنے مقصد کے لیے استعمال کرتی ہے سمیر نے ذہن میں موجود رہتے ہوئے زرتاشے کی اس بارے میں مزید سوچنے پر مجبور کیا اور اس پر کئی راز کھلتے چلے گئے زرتاشے کی ماں اسے صمصام کے لیے ایک معمول کی طرح استعمال کرتی تھی اور صمصام اس کے ذریعے اپنی بیوی کی روح سے رابطہ کرتا تھا ایسا مہینے میں ایک دو بار ضرور ہوتا تھا اور زرتاشے اس کو پسند نہیں کرتی تھی لیکن اس کی ماں ہر بار اسے ٹرانس میں لاکر ایسا کرنے پر مجبور کردیتی تھی۔

اچانک سمیر کو خیال آیا کہ گلفراز بھی کسی ایسی ہی بات کا اظہار کرنا چاہتا تھا لیکن چھپا گیا تھا اس نے زرتاشے کی ماں کے بارے میں اسے خبردار کیا تھا پھر سمیر نے زرتاشے کو مزید ٹٹولا وہ جاننا چاہتا تھا کہ کیا وہ کسی اور کو چاہتی ہے جو صمصام سے شادی کرنے کو تیار نہیں ہے اس نے جیسے ہی زرتاشے کے محبوب کے بارے میں خیال اس کے ذہن میں ڈالا اسے اپنی ہی صورت نظر آئی وہ حیران رہ گیا کیا ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ زرتاشے صرف چند ملاقاتوں میں اسے پسند کرنے لگی ہو مگر کبھی اس نے اس کا اظہار تو نہیں کیا تھا اور پھر ابھی وہ کم عمر تھا پھر اچانک زرتاشے کی ماں دوبارہ اندر آگئی تھی لیکن اب وہ زرتاشے سے مخاطب نہیں تھی سمیر زرتاشے کے ذہن سے نکل آیا تھا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ زرتاشے کی ماں صمصام میں اتنی دلچسپی صرف دولت کی وجہ سے رکھتی ہے کہ اس کی زرتاشے سے شادی کرواکر اس کی دولت بھی اپنے شوہر کی دولت کے ساتھ شامل کرنے یا کوئی اور وجہ بھی ہوسکتی ہے پھر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ باری باری اس کی کہانی کے ہر کردار کے ذہن کو پڑھے گا اور اسے اندازہ ہوجائے گا کہ زرتاشے کے ساتھ کیا کھیل کھیلا جارہا ہے۔ اس نے دل ہی دل میں اس کی مدد کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

شام کو اس کی ملاقات خلیل کامران سے ہوئی تھی اس وقت ان کے کمرے میں ناصر محمود اور ان کے دو اور ساتھی توقیر جان اور صابر حسین بھی موجود تھے اور وہ بھی ان کی آرگنائزیشن کا حصہ تھے۔

"میں نے تمہیں اس وقت اس لیے بلایا ہے سمیر کہ،

لوگ تمہارا ایک چھوٹا سا امتحان لینا چاہتے ہیں تاکہ اندازہ کر سکیں کہ تمہارے والدین نے تمہارے بارے میں جو کچھ بتایا تھا وہ درست ہے یا نہیں اگر درست ہے تو کس حد تک۔" خلیل کامران نے اس کے کرسی پر بیٹھنے کے بعد کہا۔

"کس قسم کا امتحان؟"

"تمہاری ذہنی صلاحیتوں کے بارے میں جن سے تمہارا دشمن خوفزدہ ہے اور تمہیں مارنا چاہتا ہے۔"

"ٹھیک ہے ویسے تو کسی نے اب تک میرا ایسا کوئی امتحان نہیں لیا لیکن میں کوشش کروں گا۔"

"میں چاہتا ہوں پہلے تم سے یہاں موجود لوگوں کا تعارف کروا دوں۔" خلیل کامران نے کہا۔

"نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے جب امتحان دینا ہی ٹھہرا تو آپ کچھ نہ بتائیں میں آپ کو خود بتاؤں گا لیکن میری ایک درخواست ہے کہ میرے لیے اپنے ذہنوں کو آزاد چھوڑ دیں اپنی توجہ صرف میری طرف رکھیں اور کسی اور چیز کے بارے میں مت سوچیں صرف اپنے بارے میں سوچیں میں بتا دوں گا کہ آپ میں سے کون کیا ہے۔" سمیر نے کہا۔

"ٹھیک ہے...... ہمیں منظور ہے۔" خلیل کامران نے اپنے ساتھیوں کی رضامندی دیکھتے ہوئے کہا ان سب نے باری باری اثبات میں سر ہلا کر رضامندی کا اظہار کر دیا تھا۔

"میں سب سے پہلے آپ سے شروع کرتا ہوں۔" سمیر نے خلیل کامران سے کہا۔

"مجھ سے؟ لیکن میرے بارے میں تو تم جانتے ہو کہ میں کون ہوں۔" خلیل کامران نے ہنستے ہوئے کہا۔

"جی اور وہ بھی جانتا ہوں جو آپ نے مجھے نہیں بتایا۔"

"مثلاً کیا؟"

"مثلاً یہ کہ آپ کی پہلی بیوی کینسر کا شکار ہو کر مر گئی تھی اس کی موت کے دو سال بعد آپ نے دوسری شادی کر لی تھی پہلی بیوی سے آپ کے دو بچے ہیں جو اس وقت ملک سے باہر تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور دوسری بیوی سے آپ کی کوئی اولاد نہیں ہے۔" سمیر نے کہا۔ خلیل کامران کا منہ حیرت سے کھل گیا تھا اس نے اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں کبھی کسی سے کوئی بات نہیں کی تھی۔

"اور میں یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ آپ اس وقت کیا سوچ رہے ہیں؟" سمیر نے اپنی آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔ کمرے میں موجود افراد حیرت سے ایک دوسرے کی شکلیں دیکھ رہے تھے چند لمحوں بعد سمیر نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔

"آپ کو میری صلاحیت پر یقین کے ساتھ ساتھ حیرت بھی ہے اور آپ سوچ رہے ہیں کہ میری صلاحیتوں سے کس طرح بھرپور فائدہ اٹھایا سکتا ہے۔" سمیر نے کہا۔

"حیرت انگیز تم بالکل درست کہہ رہے ہو سمیر۔" خلیل کامران نے کہا۔ اس کے بعد سمیر ناصر محمود کی طرف مڑ گیا۔

"اپنا ذہن آزاد چھوڑ دیں ناصر صاحب میں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔" سمیر نے مسکراتے ہوئے کہا کیونکہ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ ناصر محمود کوشش کر رہا تھا کہ اسے اپنی سوچوں سے دور رکھے۔ سمیر نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔

"مزاحمت مت کریں پلیز۔" سمیر نے پھر کہا اور چند لمحوں بعد پرسکون ہو گیا۔

"میرے ذہن میں اب تک کچھ نہیں تھا لیکن میں اب سو فیصدی یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ آپ پر میری چوبیس گھنٹے نگرانی کی ڈیوٹی لگائی گئی ہے اور آپ میری پل پل کی حرکت سے واقف ہیں اس کے علاوہ ایک اہم بات آپ کے بارے میں بتاتا چلوں کہ آپ کے دل میں شدید خواہش ہے کہ آپ بہت جلد ایک بڑے اور اہم عہدے پر فائز ہو جائیں۔" سمیر نے کہا اور ناصر محمود نے اس کی طرف یوں دیکھا جیسے اس کے دل کی چوری پکڑی گئی ہو۔

"کیا میں اس عہدے اور ادارے کا نام بھی بتاؤں؟" سمیر نے پوچھا۔

"نہیں اس کی ضرورت نہیں لیکن اپنی پروفیشنل لائف میں آگے سے آگے بڑھنے کا حق تو سب کا ہے۔" ناصر محمود نے کہا۔

"لیکن عہدے اور ادارے کا نام بتانے میں کیا ہرج ہے؟" خلیل کامران نے کہا۔

"میں جس کا ذہن پڑھتا ہوں اس کی معلومات

میرے پاس ایک امانت یا راز ہوتی ہے میں انہیں اس شخص کی اجازت کے بغیر افشا نہیں کر سکتا یا پھر کچھ غیر معمولی صورتوں میں جب میں ایسا کرنے پر مجبور کر دیا جاؤں۔" سمیر نے کہا پھر وہ اپنے دائیں جانب بیٹھے توقیر جان کی طرف مڑ گیا تھا جس کی عمر پچپن سال کے قریب رہی ہوگی سمیر نے پھر آنکھیں بند کر لی تھیں۔

"آپ اپنے پیشے کے لحاظ سے سوفٹ ویئر انجینئر ہیں اپنے کام سے مخلص ہیں لیکن آپ کے دل میں جوان رہنے کی شدید خواہش موجود ہے۔" سمیر نے کچھ دیر بعد آنکھیں کھولتے ہوئے کہا۔

"یہ غلط ہے میرا مطلب ہے پیشے کے بارے میں تو تم نے ٹھیک کہا لیکن یہ جوان رہنے والی بات اس سے مجھے اختلاف ہے۔" توقیر جان نے کہا اس کے چہرے پر خفگی کے آثار نظر آ رہے تھے اور دوسرے لوگ بھی سمیر کی طرف غیر یقینی انداز میں دیکھ رہے تھے۔

"اگر آپ کو میری بات کا یقین نہیں ہے تو ان کی دائیں جیب میں دیکھیں اس میں ایک معجون موجود ہے جو اسی مقصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور یہ استعمال کرتے ہیں۔" سمیر نے کہا اور توقیر جان کا دایاں ہاتھ بے ساختہ اپنی قمیص کی دائیں جیب کی طرف اٹھ گیا۔

"توقیر یار ذرا دکھاؤ کیا واقعی یہ صحیح کہہ رہا ہے۔" خلیل کامران نے کہا اور توقیر جان میں اپنے ہیڈ کا حکم ٹالنے کی جرات نہیں تھی اس نے با دل ناخواستہ اپنی جیب سے معجون کی شیشی نکال کر میز پر رکھ دی جس پر لکھا تھا معجون شباب۔"

"ہاہاہا...... جوان رہنے کی خواہش تو ہر ڈھلتی عمر والے کے دل میں موجود ہو سکتی ہے لیکن جیب سے معجون برآمد ہونے پر حیرت ہے واقعی سمیر کمال ہے۔" خلیل کامران نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اب آپ کی باری ہے۔" سمیر نے صابر حسین کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔

"اجازت ہے؟" سمیر نے پوچھا تو صابر حسین نے اثبات میں سر ہلایا اور سمیر نے آنکھیں بند کر لیں۔

"آپ کو تقریباً چار سال پہلے چھ ماہ کی جیل ہوئی تھی جو آپ کے کسی عزیز نے ہی آپ کو کروائی تھی۔" سمیر نے کہا اور صابر کے چہرے پر حیرت کے آثار نظر آئے۔

"اور بعد میں آپ کو اس ادارے میں ملازمت بھی اسی عزیز نے دلوائی۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔"

"یہ کیسے ممکن ہے کہ جو شخص آپ کو جیل کروائے وہی پھر آپ کو ملازمت بھی دلوائے؟" خلیل کامران نے کہا۔

"دراصل وہ جیل ایک جھوٹے کیس میں دلوائی گئی تھی میں نے اس کے خلاف بیان نہیں دیا اور معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا جب باہر آیا تو میرا وہ عزیز بہت شرمندہ تھا اور کسی بھی طرح اپنے اس جرم کا خمیازہ ادا کرنا چاہتا تھا اس جیل کی وجہ سے میری ملازمت چلی گئی تھی چنانچہ اس نے دوبارہ سے ملازمت دلوانے میں میری مدد کی تھی۔" صابر حسین نے بتایا۔

"ٹھیک ہے اب آپ لوگ جا سکتے ہیں میں اکیلے میں سمیر سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔" خلیل کامران نے کہا۔ اس کے بعد سب لوگ باہر چلے گئے تھے اور کمرے میں خلیل کامران کے ساتھ صرف سمیر رہ گیا تھا۔

"سمیر میں نے جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا لیکن یاد رکھو اپنی ان صلاحیتوں کو بھی قدرت کے قانون کے خلاف استعمال نہ ہونے دینا...... جو صلاحیتیں تمہیں خدا نے دی ہیں انہیں انسانیت کی بھلائی کے لیے استعمال کرنا تمہارے نیک ارادوں میں ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ میں کچھ مشقوں کی ذریعے ان صلاحیتوں کو مزید جلا دینے کی کوشش کروں گا اس کے لیے تمہیں میرے ساتھ کچھ میٹنگز کرنا ہوں گی جن کا وقت میں تمہیں بعد میں بتا دوں گا۔"

"اس کے علاوہ تمہیں یہ بھی بتانا تھا کہ تمہاری آنٹی سارہ کا فون آیا تھا وہ تمہاری خیریت کے بارے میں پوچھ رہی تھیں انہیں فون کر لینا۔" خلیل کامران نے کہا اس کے بعد سمیر ان کے کمرے سے نکل گیا تھا۔ اپنے کمرے میں جاتے ہوئے سمیر جب نیم روشن راہ داری سے گزر رہا تھا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی سیاہ سایہ سا اس کے قریب سے تیزی سے گزر گیا ہے اس نے پلٹ کر دیکھا لیکن پوری راہ داری میں کوئی موجود نہیں تھا اس نے اپنے کمرے میں جا کر دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔

"کب تک بچو گے سمیر...... ! میں تمہارے ساتھ ساتھ

ہوں اور موقع ملتے ہی تمہیں ختم کروں گا۔“ سمیر کو اپنے ذہن کے گوشے میں وہی خوفزدہ کردینے والی سرگوشی سنائی دی جو شاپنگ سینٹر میں سنائی دی تھی اور سیاہ پوش اجنبی اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔

”اوہ خدایا...... کہیں وہ میرا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک نہ آ گیا ہو۔“ سمیر نے سوچا۔

”ہاہاہا پیچھا...... میں تم سے جدا ہی کب ہوا تھا...... میں تو موقع کی تلاش میں ہوں جو ہر بار میرے ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ بھول گئے قہوہ خانے کی رات تم مجھے چور سمجھ رہے تھے؟ ہاہاہا قہوہ خانے والے پہنچ گئے تو تم بچ گئے۔“

”تم میرا کچھ نہیں کرسکتے میں تمہیں مار ڈالوں گا۔“ سمیر نے کہا وہ بستر پر بیٹھ گیا تھا اور اسی وقت اس کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی تھی اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا تھا اور اس نے اٹھ کر کمرے کے دروازے میں بنے سوراخ سے باہر جھانکا تھا باہر ناصر محمود کھڑا تھا۔ سمیر نے دروازہ کھول دیا تھا اور ناصر محمود تیزی سے اندر آ گیا تھا اندر آنے کے بعد اس نے کمرے کا دروازہ پھر بند کردیا تھا۔

”کیا بات ہے اس وقت اتنی عجلت میں کیوں آئے ہو؟“ سمیر نے پوچھا۔

”بیٹھو! مجھے تم سے بات کرنا ہے۔“ ناصر محمود نے اسے بیڈ پر بٹھاتے ہوئے کہا اور خود سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

”کیا بات ہے؟“ سمیر نے پوچھا۔

”تم نے میرے بارے میں جو بات کی وہ درست تھی لیکن میں جس عہدے پر ہوں اس عہدے پر ہونے والے کسی بھی شخص کے بارے میں یہ سوچا جاسکتا ہے جو تم نے میرے بارے میں بتایا اس میں ایسی کیا خاص بات تھی؟“

”اگر خاص بات نہیں تھی تو تم نے مجھے عہدے اور ادارے کا نام لینے سے کیوں روکا؟“ سمیر نے پوچھا۔

”میں نہیں چاہتا کہ خلیل کامران میرے بارے میں شکوک وشبہات میں مبتلا ہو اگر ایسا ہوا تو وہ مجھے اس عہدے سے بھی ہٹا دے گا۔“ ناصر محمود نے کہا۔

”تو پھر اپنے دل کی خواہشوں پر قابو رکھو خلیل کامران کے لیے تمہارا وفادار ہونا بہت ضروری ہے۔“

”میں جانتا ہوں لیکن میں اسے کوئی نقصان پہنچانا نہیں چاہتا۔“

”میں جانتا ہوں لیکن دل تو پاگل ہوتا ہے وہ کسی وقت بھی بہک سکتا ہے دماغ سے سوچا کرو اور دماغ ہی سے فیصلہ کیا کرو اگر وفاداری سے کام کرو گے تو خلیل کامران کے بعد تم ہی ہو۔“ سمیر نے کہا۔

”یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟“

”میں نے تمہیں اس کے کمرے میں اس کی کرسی پر بیٹھے دیکھا ہے یہ بات اپنے تک ہی رکھنا۔“ سمیر نے کہا۔

”کیا؟ واقعی؟“ ناصر محمود کے لہجے میں حیرت تھی۔

”ہاں!...... تم اس کے نائب بھی اور دست راست بھی...... اور وفادار بھی بس لالچ کے چکر میں اپنے قدم لڑکھڑانے مت دینا ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔“ سمیر نے کہا۔

”اوہ ٹھیک ہے۔“ ناصر محمود نے کہا پھر وہ کافی دیر تک سمیر کے ساتھ بیٹھا اس سے باتیں کرتا رہا تھا۔

”اچھا تمہیں بہت شکوہ ہے اس لیے تمہیں بتارہا ہوں کہ صبح ناشتے کے بعد میں چہل قدمی کے لیے جاؤں گا تم بھی میرے ساتھ چلنا چاہو تو چل سکتے ہو۔“ سمیر نے کہا۔

”ٹھیک ہے میں بھی فجر کی نماز کے بعد ناشتے سے فارغ ہوجاتا ہوں دونوں ساتھ ہی چلیں گے تم ناشتہ کرکے نماز کے بعد نیچے ہال میں آ جانا۔“ سمیر نے اس بات پر اثبات میں گردن ہلا دی تھی اور پھر ناصر محمود رخصت ہوگیا تھا۔

رات کافی دیر تک سمیر جاگتا رہا تھا پھر اسے نیند آ گئی تھی گہری نیند ہونے سے پہلے آج پھر اس کی مرحوم والدہ اس کے تصور میں آئی تھیں انہوں نے سفید لباس پہنا ہوا تھا وہ اس پر جھکی ہوئی تھیں شاید سوتے میں اس کے بالوں میں پیار سے ہاتھ پھیر رہی تھیں۔

پھر اچانک کہیں دور سے کوئی آواز آئی تھی جیسے کہیں فائر ہوا ہو وہ اس سے دور ہوگئی تھیں اور باہر کی طرف بھاگی تھیں وہ بھاگتی ہوئی جنگل کی طرف جارہی تھیں۔ سمیر سب کچھ یوں دیکھ رہا تھا جیسے وہ کیمرے کی آنکھ ہو اور اس کے سامنے کوئی منظر چل رہا ہو وہ بھاگتی ہوئی جنگل میں داخل ہوگئی تھیں جہاں اس کے والد ایک سیاہ لبادے میں ملبوس

شخص سے لڑ رہے تھے وہ زخمی تھے پھر اس سائے نے پیچھے مڑ کر اس کی والدہ پر فائر کیا تھا اور وہ نیچے گر گئی تھیں پھر وہ سایہ بھاگتا ہوا جنگل میں گم ہو گیا تھا سمیر کچھ دور تک اس کے پیچھے بھاگا تھا لیکن وہ غائب ہو چکا تھا پھر آہستہ آہستہ سمیر پر غنودگی چھاتی چلی گئی تھی اور وہ گہری نیند میں چلا گیا تھا۔

صبح فجر کے وقت اس کی آنکھ کھلی تھی تو وہ وضو کر کے نماز پڑھنے کھڑا ہو گیا تھا اور نماز سے فارغ ہو کر نیچے ہال میں آ گیا تھا جہاں کھانے کی میز پر ناصر محمد اس کا منتظر تھا ناصر کا رویہ اب کافی دوستانہ ہو گیا تھا اور وہ سمیر کی صلاحیتوں کا معترف نظر آ رہا تھا۔

”میں بھی ابھی آیا ہو بس ناشتہ آنے ہی والا ہے میں نے کچن میں کہہ دیا ہے۔“ ناصر نے کہا کچھ ہی دیر میں ملازم ناشتے کی ٹرے کے ساتھ پہنچ گیا تھا اور میز پر ناشتہ لگا دیا تھا۔

”میرا خیال ہے سمیر ہماری دوستی بہترین رہے گی۔“ ناصر محمود نے کہا۔

”ہاں کیوں نہیں جب ہمیں ساتھ رہنا ہے ساتھ کام کرنا ہے تو دوستی تو بہت ضروری ہے۔“ سمیر نے کہا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر وہ دونوں ڈریم سینٹر سے نکل گئے تھے۔

”یہ مقام بہت پر فضا ہے۔“ ناصر محمود نے کہا۔

”یہاں اپنے شروع کے دنوں میں، میں بھی روز چہل قدمی کے لیے آتا تھا لیکن پھر آہستہ آہستہ کاہل ہو گیا اب ناشتے سے فارغ ہو کر اپنے کاموں میں لگ جاتا ہوں۔“

”کون سے کام؟“

”وہی یہاں موجود لوگوں کا ریکارڈ ترتیب دینا۔ ان کے کام چیک کرنا ان کی رپورٹیں بنا کر جمع کرواتا جو ہر ہفتے خلیل کامران چیک کرتے ہیں اور فائلوں پر دستخط کرتے ہیں۔“

”ہاں! میں نے نوٹ کیا ہے یہاں ہر شخص اپنا کام بہت محنت اور باقاعدگی سے کرتا ہے اور انہیں یہاں ہر قسم کی سہولتیں میسر ہیں۔“ سمیر نے کہا۔

”ہاں! دراصل یہاں رہنے والے اس جگہ کو اپنا گھر سمجھتے ہیں وہ یہاں سے روز نہیں آتے جاتے بلکہ کئی کئی سال کے کنٹریکٹ پر ہوتے ہیں ایک بار آ جاتے ہیں تو اپنے ذمہ لیا ہوا پروجیکٹ مکمل کر کے ہی جاتے ہیں۔“ ناصر نے کہا۔

”یہ اچھی بات ہے اسی لیے تو کام میں ان کی لگن بے مثال ہے۔“ سمیر نے کہا وہ آہستہ آہستہ چہل قدمی کے انداز میں چل رہے تھے اور باتیں کرتے جا رہے تھے اچانک ان کے عقب سے تیز سرسراہٹ کی آواز آئی تھی سمیر نے پلٹ کر دیکھا تھا ایک سیاہ ہیولا سا درختوں کے درمیان اڑتا ہوا ان کے بائیں جانب سے تیزی سے گزرا تھا رفتار ایسی ہی تھی جیسے پستول سے گولی نکلی ہوئی ناصر محمود نے بھی اسے دیکھا تھا سمیر تو فوراً چوکنا ہو گیا تھا وہ سیاہ ہیولا فضا ہی میں پلٹا تھا اور دوبارہ بڑی سرعت سے سمیر کے اتنے قریب سے گزرا تھا کہ اس کی تیز ہوا سمیر کو اپنے گالوں پر محسوس ہوئی تھی اس لمحے ناصر محمود نے اس ہیولے پر چھلانگ لگا کر اسے دبوچنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ اس کی گرفت میں نہیں آ سکا تھا۔ ہیولا پھر ایک درخت کا چکر کاٹنے کے بعد سمیر کی طرف لپکا تھا اس بار سمیر نے محسوس کیا تھا جیسے اس کے ہاتھ میں کوئی چمکدار چیز ہو لیکن درختوں کے جھٹپٹے ماحول میں اس ہیولے کے خدوخال دیکھنے سے قاصر تھا بس یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے سیاہ چادر اوڑھ رکھی ہے اس کا چہرہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

سمیر درختوں کے درمیان کراس بنانے والے انداز میں بھاگ رہا تھا اور ناصر محمود ہیولے کا تعاقب کر رہا تھا ایک بار پھر تیز سرسراہٹ کی آواز کے ساتھ ہیولا سمیر کے بہت قریب سے گزرا تھا اور اسے اپنے دائیں بازو پر تیز چبھن کا احساس ہوا تھا شاید ہیولے نے اس پر خنجر کا وار کیا تھا۔ ناصر محمود نے اس عرصے میں کئی بار اس ہیولے کو گرفت میں لینے کی کوشش کی تھی لیکن اس کی تیزی پھرتی اور برق رفتاری کی وجہ سے اسے گرفت میں نہیں لے سکا تھا وہ ہیولا زمین پر پاؤں ہی نہیں رکھ رہا تھا بس ایک درخت سے دوسرے درخت اور دوسرے سے تیسرے درخت کی طرف جا رہا تھا وہ جب چاہتا تھا فضا ہی میں پلٹ کر سمت بدل لیتا تھا ناصر محمود کو اپنا آپ بچلا نا ممکن نظر آ رہا تھا اور اس نے دیکھ لیا تھا کہ اس ہیولے نے سمیر کو زخمی کر دیا تھا سمیر بھاگتا ہوا جنگل کے بیرونی سرے تک آ گیا

تھا جہاں سے کٹیلی پہاڑیاں شروع ہوگئی تھیں بھاگتے بھاگتے سامنے سے پہاڑی ختم ہوگئی تھی اور نیچے گہری کھائی تھی جہاں اور بھی نیچے سنگلاخ چٹانیں منہ اٹھائے کھڑی تھیں سمیر کے لیے اب آگے جانے کا راستہ نہیں تھا۔

ہیولے نے اس کی طرف آخری چھلانگ لگائی تھی خنجر کی نوک سیدھی سمیر کے دل کی طرف اٹھی ہوئی تھی سمیر کو موت سامنے نظر آرہی تھی اس نے آنکھیں بند کرلی تھیں اور پھر وہ ہیولا اتنا قریب آگیا کہ سمیر کو اپنے چہرے پر اس کی ہوا کی تپش محسوس ہوئی اور سمیر فوراً ہی دائیں جانب جھک کر زمین پر لیٹ گیا اور وہ ہیولا اپنے ہی زور میں نیچے کھائی میں گرتا چلا گیا یہ سب سمیر نے اتنی پھرتی سے کیا تھا کہ ہیولے کو فضا میں سنبھلنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا اور جب تک وہ اس صورت حال کو سمجھتا دیر ہوچکی تھی۔ سمیر اپنی جگہ سے اٹھا اس نے نیچے جھانک کر دیکھا وہ جو بھی کوئی تھا نیچے اوندھے منہ پڑا تھا ناصر بھی دوڑتا ہوا سمیر کے پیچھے آگیا تھا اور وہ بھی نیچے جھانک رہا تھا۔

"آؤ نیچے چل کر دیکھتے ہیں کون ہے؟" ناصر نے کہا۔

"ہاں چلو۔" سمیر بھی اس کے ساتھ قدم ملاتا ہوا پہاڑی سے نیچے اترنے لگا۔ پھر وہ اونچی نیچی ڈھلان پر قدم جماتے نیچے آئے تھے وہ ہیولا سیکڑوں فٹ کی بلندی سے نیچے گرا تھا اور بے حس وحرکت تھا ناصر کا اندازہ تھا کہ وہ مرچکا ہوگا وہ دونوں اس کے قریب پہنچے تھے سمیر چند قدم دور ہی رک گیا تھا اور ناصر نے آگے بڑھ کر اس کو سیدھا کیا تھا وہ نہایت خوبصورت ایک نوجوان لڑکی تھی اس کے سنہرے بال بکھرے ہوئے تھے سر پھٹ چکا تھا ناصر نے چیک کیا وہ مرچکی تھی۔

"اس کو جانتے ہو یہ کون ہے؟" ناصر محمود نے سمیر سے پوچھا۔

"نہیں میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔" سمیر نے کہا۔

"لیکن اس نے تو ہم پر خنجر سے وار بھی کیا ہے دیکھو تم زخمی ہو تمہارے بازو سے خون بہہ رہا ہے۔" ناصر محمود نے اس کا دایاں بازو پکڑتے ہوئے کہا تب سمیر کی توجہ بھی اس طرف ہوئی اس کے ہاتھ سے خون کی ایک لکیر نکل کر اس کی آستین بھگوتی ہوئی نیچے گر رہی تھی آستین بھی زخم کی جگہ سے پھٹ چکی تھی ناصر محمود نے جلدی سے اپنی جیب سے رومال نکال کر سمیر کے بازو پر زخم کی جگہ پر باندھ دیا تھا اور اسے واپس چلنے کا مشورہ دیا تھا۔

"لیکن یہ پتہ کیے بغیر ہم کیسے جاسکتے ہیں کہ یہ کون ہے؟" سمیر نے کہا۔

"ابھی تمہارے ہاتھ کی پٹی ہونا ضروری ہے زخم شاید گہرا ہے جو اتنی تیزی سے خون بہہ رہا ہے۔" ناصر محمود نے کہا اور واپسی کے لیے مڑ گیا سمیر بھی اس کے پیچھے چل پڑا تھا لیکن چند قدم اٹھانے کے بعد ہی لڑکھڑا کر گر گیا تھا ناصر نے پلٹ کر دیکھا تو لپک کر اسے سنبھالا سمیر بے ہوش ہوچکا تھا۔

سمیر کی آنکھ کھلی تو وہ ڈریم سینٹر میں اپنے کمرے میں تھا اور اس کے بازو پر پٹی بندھی ہوئی تھی وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا تو اس کے کمرے میں موجود ناصر لپک کر اس کے قریب آگیا۔

"لیٹے رہو سمیر...... تمہارے ڈرپ لگی ہے ہل جائے گی۔" ناصر نے اسے آگاہ کیا اور سمیر کی نظر اپنے دوسرے ہاتھ پر پڑی جہاں ڈرپ کی سوئی اس کی کلائی میں لگی تھی اور ڈرپ ایک اسٹینڈ میں اس کے سرہانے لگی تھی۔ ناصر نے اسے دوبارہ لٹا دیا۔

"تمہیں پتہ ہے تمہیں جس خنجر سے وار کرکے زخمی کیا گیا وہ زہریلا تھا جائے واردات سے وہ خنجر مل گیا ہے اور ہمارے پاس لیبارٹری میں ہے اس کی نوک پر لگایا گیا زہر بہت خطرناک تھا اس کی وجہ سے تم بے ہوش ہوگئے تھے حالانکہ وار بہت گہرا نہیں تھا لیکن اگر کچھ دیر اور تمہیں طبی امداد نہ ملتی تو شاید تم دنیا سے رخصت ہی ہوجاتے۔" ناصر محمود نے بتایا۔

"اور وہ حملہ آور لڑکی؟" سمیر نے پوچھا۔

"حملہ آور لڑکی نہیں حملہ آور دوشیزہ...... وہ نہایت خوبصورت تھی۔" ناصر محمود نے کہا۔

"خوبصورت تھی؟ کیا مطلب۔" سمیر نے پوچھا۔

"جب ہماری ٹیم جائے حادثہ پر پہنچی جسے خلیل کامران نے لاش لینے وہاں بھیجا تھا تو لاش غائب تھی۔"

"کیا؟ لاش کیسے غائب ہوسکتی ہے...... تم نے چیک کیا تھا وہ مرچکی تھی؟" سمیر نے حیرت سے کہا۔

"ہاں! اس پر مجھے بھی حیرت ہے...... لیکن تمہارا ایسا

کون سا دشمن ہو سکتا ہے جس نے تم پر یہ حملہ کروایا ہو؟“ ناصر محمود نے پوچھا۔

”صرف اور صرف ایک شخص جو پہلے بھی مجھے مارنے کی کوشش کر چکا ہے لیکن کامیاب نہیں ہو سکا۔“ سمیر نے کہا۔

”وہ کون ہے؟“ ناصر محمود نے اس سے پوچھا۔

”کیا خلیل کامران نے تمہیں میرے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟“ سمیر نے پوچھا ساتھ ہی اس نے ناصر کا ذہن بھی پڑھا تھا وہ واقعی سمیر کے دشمن کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔

”نہیں صرف اتنا جانتا ہوں کہ مجھے ہر پل تمہاری حفاظت کرنا ہے اور کوئی تمہیں مارنا چاہتا ہے لیکن وہ کون ہے اور کیوں مارنا چاہتا ہے اس بارے میں مجھے کچھ نہیں بتایا گیا۔“ ناصر محمود نے کہا۔

”تو پھر ابھی اس پر پردہ ہی رہنے دو کیونکہ میں بھی زیادہ نہیں جانتا۔“ سمیر نے جواب دیا وہ ابھی ناصر سے کھل کر اس بارے میں بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”ٹھیک ہے لیکن اگر مجھے تمہاری حفاظت کرنا ہے تو میرا تمہارے دشمن کے بارے میں تمام تفصیل جاننا بہت ضروری ہے جب تم مناسب سمجھو مجھے آگاہ ضرور کرنا۔“ ناصر محمود نے کہا۔

پھر کئی روز سمیر کو ڈریم سینٹر سے نکلنے کی اجازت نہیں ملی تھی اس کے بازو کے زخم کی دیکھ بھال بہت احتیاط سے کی جا رہی تھی اور اس کے کئی ٹیسٹ بھی کئے گئے تھے یہ جاننے کے لیے کہ زخم یا جسم میں زہریلے اثرات رہ تو نہیں گئے دسویں روز اس کا زخم خاصا بھر گیا تھا اور اسے آستینوں والی شرٹ پہننے کی اجازت مل گئی تھی۔

”سمیر! ایک بات پوچھوں؟“ ناصر محمود نے اس کی حالت بہتر ہونے کے بعد ایک روز اس سے پوچھا وہ اس وقت ڈریم سینٹر کے ایک حصے میں بیٹھے تھے جہاں خوبصورت درختوں کے بیچ میں ایک باغ لگا ہوا تھا اور سنگ مرمر کی بینچیں لگی تھیں پھول اپنی بہار دکھا رہے تھے اور سمیر اس ماحول سے اپنے اندر خوشگوار تبدیلی محسوس کر رہا تھا۔

”کیا بات؟ میرا خیال ہے اب تک تم میرے بارے میں تقریباً سب کچھ ہی جان چکے ہو۔“ سمیر نے ہنستے ہوئے کہا۔

”ہاں لیکن یہ زرتاشے والی کہانی کیا ہے؟“ ناصر محمود نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”کچھ نہیں کوئی خاص کہانی نہیں۔“ سمیر نے اپنا چہرہ دوسری طرف کرتے ہوئے کہا وہ نہیں چاہتا تھا کہ ناصر محمود اس کے چہرے کے تاثرات پڑھے۔

”تمہیں پتہ ہے جب تم بے ہوش تھے تو بار بار زرتاشے کا نام لے رہے تھے اور میں اس ڈریم سینٹر میں نیا نہیں ہوں میں بھی اس کے اطراف میں رہنے والے لوگوں سے کسی حد تک واقف ہوں جہاں تک میرا علم ہے زرتاشے یہاں سے کچھ فاصلے پر ایک چھوٹے سے گھر میں اپنی والدہ اور والد کے ساتھ رہتی ہے نوجوان ہے اور بہت خوبصورت بھی اسے دیکھ کر کوئی اس کے چہرے سے نظریں نہیں ہٹا سکتا وہ بہت کم بات کرتی ہے اور زیادہ تر اداس رہتی ہے۔ میں نے اسے بہت بار ندی کے کنارے اداس بیٹھے دیکھا ہے وہ اکیلی ہی ہوتی ہے یا کبھی کبھی اس کے مویشی اس کے گرد جمع ہوتے ہیں۔ جس روز تم میرے ساتھ گھوڑے پر یہاں آئے تھے تب بھی وہ وہیں بیٹھی ہوئی تھی تم وہاں کچھ دیر کے لیے رک گئے تھے میں تمہارے پیچھے چند قدم کے فاصلے پر تھا میں نے تمہاری آنکھوں میں اس کے لیے پسندیدگی دیکھی تھی اچانک اس کی ماں اسے بلاتی ہوئی وہاں آ گئی تھی اور ہم آگے روانہ ہو گئے تھے۔

”بڑی زبردست آبزرویشن ہے تمہاری۔“ ہنستے ہوئے سمیر نے کہا۔

”لیکن جیسا تم سوچ رہے ہو ویسا نہیں ہے میں اس سے متاثر ضرور ہوں لیکن جس انداز میں تم سوچ رہے ہو ایسا نہیں ہے۔“

”تو پھر...... پھر کیسا ہے؟“

”زرتاشے کے بارے میں جتنا میں جانتا ہوں وہ بہت مظلوم ہے ابھی مجھے پوری معلومات نہیں لیکن امید ہے جلد ہی اس کے بارے میں مجھے سب کچھ پتہ چل جائے گا اور اس کی مدد کرنا چاہتا ہوں اس کے لیے اگر مجھے تمہاری مدد لینی پڑی تو میں تمہیں ضرور بتاؤں گا۔“ سمیر نے کہا۔

”آخر کچھ تو پتہ چلے کہ اس پر کیا ظلم ہوا ہے؟“

''بس یوں سمجھو کہ کوئی غیر نہیں بلکہ اس کی ماں ہی اس کی پریشانی کا سبب ہے۔''

''اوہ اللہ رحم کرے تو تم بے ہوشی میں اس کا نام کیوں بار بار لے رہے تھے؟''

''میں صرف نام نہیں لے رہا تھا میں اس کے ذہن میں تھا اس سے باتیں کر رہا تھا اس کے بارے میں اس سے ہی بہت کچھ جاننا چاہتا تھا۔''

''ہوں میری دعا ہے کہ تم کامیاب ہو جاؤ شاید کسی مشن کے لیے یہ تمہاری پہلی کامیابی ہوگی۔'' ناصر نے کہا۔

''میں اسے مشن تو نہیں سمجھتا بس اس کی تھوڑی سی مدد کرنا چاہتا ہوں لیکن تمام حقائق جاننے کے بعد۔''

''ٹھیک ہے میری مدد کی ضرورت ہو تو ضرور بتانا۔'' ناصر محمود نے کہا۔

چند روز بعد جب سمیر زرتاشے کے گھر پہنچا تھا تو اس کی ماں زرتاشے سے ضد کر رہی تھی کہ وہ کچھ سامان اپنے والد کو دے آئے جو اوپر پہاڑیوں میں کانوں میں کام کروا رہے ہیں۔

''ماں تم لے جاؤ یہ سامان میرا دل نہیں چاہ رہا ہے جانے کو۔'' زرتاشے نے ناگواری سے کہا۔

''زرتاشے تمہیں کیا ہوتا جا رہا ہے تم ہر کام کے لیے بحث کرتی ہو؟''

''بس کہہ دیا نا میرا دل نہیں چاہ رہا۔'' زرتاشے نے پھر اپنا جواب دہرا دیا اسی وقت سمیر گھر میں داخل ہوا زرتاشے کی ماں کا موڈ اسے دیکھتے ہی تبدیل ہو گیا تھا۔

''ارے زرتاشے بیٹا کئی روز سے تمہارے ابو نے تمہیں دیکھا بھی نہیں۔ چلی جاؤ گی تو وہ بھی تمہیں دیکھ لیں گے تمہیں پتہ ہے نہ کہ اگر وہ تمہیں چند دن نہ دیکھیں تو انہیں چین نہیں آتا۔'' اس کی ماں نے اپنے چہرے پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا۔

''کیا ہو گیا؟ آپ زرتاشے کو کہاں جانے کے لیے کہہ رہی ہیں؟'' سمیر نے پوچھا۔

''اوپر کانوں میں اس کے والد کو کچھ سامان چاہیے میں کہہ رہی ہوں کہ انہیں دے آئے۔''

''ہاں ٹھیک تو ہے زرتاشے تم دے آؤ سامان اپنے والد کو۔ چلو میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں اس بہانے میں بھی تمہارے والد کی زمرد کی کانیں دیکھ لوں گا۔'' سمیر نے کہا۔

''اچھا چلیں ٹھیک ہے۔'' زرتاشے نے کہا اور فوراً ہی جانے کے لیے کھڑی ہو گئی تھی اس کی ماں نے ایک بیگ اس کے حوالے کیا تھا۔

''یہ لو احتیاط سے لے جانا اس میں سامان کے ساتھ ساتھ کچھ کھانا بھی ہے...... وہ لوگ خود ہی وہاں پکاتے رہتے ہیں آج میرے ہاتھ کا کھانا کھا لیں گے۔''

''لائیں یہ میں پکڑ لیتا ہوں۔'' سمیر نے بیگ لے کر اپنے کاندھے پر ڈالتے ہوئے کہا زرتاشے ہمیشہ کی طرح اپنا مقامی لباس پہنے ہوئے تھی جو اس پر بہت سجتا تھا وہ جلدی سے سمیر کے ساتھ جانے کے لیے کھڑی ہو گئی زرتاشے کی ماں حیران تھی کہ اچانک زرتاشے کا ارادہ کیسے بدل گیا تھا۔

گھر سے کچھ دور آنے کے بعد پہاڑی سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ زرتاشے اور سمیر دونوں گھوڑوں پر سوار تھے یہاں کے لوگ پہاڑیوں میں سفر کے لیے پیدل یا گھوڑوں پر سفر کرتے تھے کانوں تک پہنچنے کا راستہ خاصا لمبا تھا چنانچہ زرتاشے نے اپنے دو بہترین گھوڑوں کا انتخاب کیا تھا۔

''زرتاشے! تمہاری والدہ تمہاری سگی ماں نہیں ہیں نا؟'' سمیر نے پوچھا تو زرتاشے نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''کک کیا؟ تمہیں کس نے بتایا؟'' بے ساختہ زرتاشے کے منہ سے نکلا۔

''مجھے پتہ ہے۔'' سمیر نے جواب دیا۔

''وہ چاہتی ہے کہ تم صمصام گل سے شادی کر لو جو تمہارے والد کا پارٹنر ہے۔'' سمیر نے اسے مزید حیرت زدہ کیا۔

''کیا تمہیں یہ سب کیسے پتہ ہے؟''

''میں جانتا ہوں کہ تم تنہا ہو تمہارے والدین تمہاری مدد نہیں کریں گے تمہیں ان کے ساتھ اسی طرح زندگی گزارنا ہوگی جس طرح ابھی گزار رہی ہو اور اس زندگی کو تم پسند نہیں کرتیں۔''

''میں جاننا چاہتی ہوں کہ تمہیں یہ باتیں کیسے پتہ چلیں؟'' زرتاشے نے اپنا گھوڑا ایک جگہ پر روک دیا اور کود

کر گھوڑے سے نیچے اتر گئی سمیر نے بھی اس کی تقلید کی تھی۔

"میں نے تمہیں ایسی کوئی بات نہیں بتائی۔" زرتاشے نے ایک پہاڑی کے نیچے سایہ دار حصے میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ سمیر بھی اس کے قریب بیٹھ گیا تھا۔

"زرتاشے میں تمہارے ذہن میں گیا تھا تمہاری حقیقت جاننے کے لیے میں یہ صلاحیت رکھتا ہوں کہ کسی کو بتائے بغیر اس کے بارے میں تمام معلومات اس سے ہی حاصل کر لیتا ہوں۔"

"جھوٹ ہے۔" زرتاشے نے کہا۔

"میں یقین نہیں کرتی۔"

"اچھا میری طرف دیکھو۔" اس نے کہا اور زرتاشے اسے دیکھنے لگی اس کے ہونٹ بند تھے اور آنکھیں بھی' چند لمحوں بعد اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔

"بتاؤ تمہیں کیا محسوس ہوا؟"

"تم نے کہا کہ میری ماں اکثر مجھے اپنا معمول بناتی ہے۔"

"لیکن میں تو بولا نہیں۔"

"ہاں لیکن میں نے اپنے ذہن میں ان الفاظ کو محسوس کیا۔"

"بس یوں سمجھ لو کہ یہ اور اس کے علاوہ کئی صلاحیتیں مجھ میں ہیں...... میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں تمہاری ماں کے خیالات بدل سکتا ہوں...... صمصام کو مجبور کر سکتا ہوں کہ وہ تمہارا پیچھا چھوڑ دے۔"

"ٹھیک ہے سمیر پھر تم مجھے اس عذاب سے نجات دلواؤ۔"

"یہ میرے لیے ایک معمولی بات ہو گی بس تمہارا تعاون چاہیے۔" سمیر نے کہا۔

"میرا تعاون کیا مطلب؟"

"جب بھی تمہاری والدہ تمہیں ٹرانس میں لا کر اپنا معمول بنانا چاہیں تم آنکھیں بند کر کے میرا تصور کرنا اور اپنی سوچوں میں مجھے پیغام بھیجنا میں سب سنبھال لوں گا۔" سمیر نے کہا۔

"ٹھیک ہے میں کوشش کروں گی۔" زرتاشے نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"چلو! ہمیں دیر ہو رہی ہے والد میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔" زرتاشے نے گھوڑے پر سوار ہوتے ہوئے کہا اور سمیر بھی اس کی تقلید میں گھوڑے پر سوار ہوا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ گیا تھا۔

وہاں سے آدھے گھنٹے کی مسافت طے کرنے کے بعد وہ کانوں کے علاقے میں داخل ہو گئے تھے۔

"وہ دیکھو...... وہ سامنے جو غار سا ہے وہاں میرے والد رہتے ہیں اپنے کارکنوں کے ساتھ اور وہیں اندر کی طرف ہماری زمرد کی کان ہے۔" زرتاشے نے کہا۔ چند ہی لمحوں بعد وہ کان میں داخل ہو گئے تھے۔

"ابو...... میں آپ کا سامان لے آئی ہوں۔" زرتاشے نے غار میں ایک بینچ پر بیٹھے ادھیڑ عمر شخص سے کہا اور سمیر سمجھ گیا کہ وہی چوہدری امتیاز خان ہے جو ان کانوں کا مالک بھی ہے۔ زرتاشے کی بات کا جواب دینے کے بجائے چوہدری امتیاز خان نے سوالیہ نظروں سے سمیر کی طرف دیکھا۔

"ابو! یہ سمیر ہے' سمیر احمد فاروقی...... یہ یہاں ڈریم سینٹر میں اپنی تعلیم مکمل کرنے آیا ہے۔ آپ کی زمرد کی کانیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اس لیے میں ساتھ لے آئی۔" زرتاشے نے اس کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"ہوں...... اچھا تو تم لائی ہو۔" چوہدری امتیاز خان نے پوچھا۔

"ماں نے آپ کے لیے کھانا بھیجا ہے اور آپ کا کچھ سامان ہے۔" زرتاشے نے کہا۔

"ٹھیک ہے اندر کچن میں چلی جاؤ اور کھانا گرم کر کے لے آؤ۔ پھر ہمیں چائے بھی بنا دینا۔ وہ صمصام بھی آیا ہوا ہے۔ اندر کانوں میں ہے پھر ہم چاروں کھانا کھائیں گے میں اسے بلوا لیتا ہوں۔"

"جی ٹھیک ہے۔" زرتاشے نے کہا اور بیگ اٹھا کر کچن میں چلی گئی۔

"آؤ سمیر!...... میں تمہیں کانیں دکھاتا ہوں۔" چوہدری امتیاز خان نے اٹھتے ہوئے کہا پھر اس نے سمیر کو پہننے کے لیے ایک سیفٹی جیکٹ اور ہیلمٹ دیا تھا۔

"احتیاطاً یہ پہن لو...... یہ یہاں کا قاعدہ ہے جسے ہر کسی کو ماننا پڑتا ہے۔"

"جی ٹھیک ہے۔" سمیر نے کہا پھر اس نے پہلے سیفٹی

جیکٹ پہن لی تھی اور ہیلمٹ بھی سر پر رکھ لیا تھا۔

کانیں بہت اندر تک چلی گئی تھیں جن میں سفر کرنے کے لیے باقاعدہ پٹڑی بچھی ہوئی تھی۔ جن پر ٹرالیاں چلتی تھی وہ دونوں ایک ٹرالی میں سوار ہو گئے تھے اور ایک ماتحت نے دیوار میں لگے بورڈ کا بٹن دبا دیا تھا اور ٹرالی حرکت میں آ گئی تھی۔ کان کی کچھ دیواروں میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بلب لگے ہوئے تھے جن سے کان میں روشنی ہو رہی تھی۔ کافی اندر جانے کے بعد سمیر کو دیواروں میں لگے سبز پتھر کثرت سے نظر آنے لگے تھے۔ کان کے اندرونی حصے سے ٹرالیاں ایسے سبز اور سیاہ پتھروں سے بھری ہوئی باہر کی طرف جا رہی تھیں کان میں کام کرنے والوں نے سمیر کی طرح زرد رنگ کی جیکٹیں' ہیلمٹ اور دستانے پہنے ہوئے تھے۔

''یہ تو بہت بڑی اور پرانی کان ہے۔'' سمیر نے چوہدری امتیاز خان سے کہا۔

''ہاں! یہ ہمارے آباؤ اجداد کے زمانے سے چلی آ رہی ہے اور ان کی پیداوار میں کوئی کمی نہیں آئی۔'' چوہدری امتیاز خان کے لہجے میں تمکنت اور غرور صاف محسوس کیا جا سکتا تھا۔ سمیر فوراً اس کے ذہن میں پہنچ گیا اور اس پر یہ بھید کھلا کہ چوہدری نثار بھی اپنی بیوی کی طرح یہی چاہتا ہے کہ زرتاشے صمصام گل سے شادی کر لے اور کانوں کی آدھی دولت جس کا مالک صمصام ہے وہ بھی اسے مل جائے۔ جب کہ زرتاشے سمجھتی تھی کہ صرف اس کی ماں ہی یہ خواب دیکھ رہی ہے۔

سمیر کو امتیاز کے دماغ میں گھس بیٹھنے سے ایک اور فائدہ بھی ہوا اسے پتہ چل گیا کہ آج رات اس کا ارادہ نیچے وادی میں اپنے گھر جانے کا ہے جہاں وہ صمصام کی موجودگی میں زرتاشے کو مجبور کرے گا کہ وہ صمصام سے شادی کر لے اور آج رات اس مسئلے کی آخری رات ہو گی۔ سمیر نے اپنے طور پر فیصلہ کیا کہ وہ بے خبر نہیں رہے گا اور زرتاشے کے معاملے کو آج رات ہی نمٹا دے گا یہ اس کے لیے کوئی بڑی بات نہیں تھی وہ موقع واردات پر موجود لوگوں کے دماغوں میں پہنچ کر ان کے فیصلے بھی تبدیل کروا سکتا تھا اور زرتاشے کے دل کا حال بھی جان سکتا تھا کہ وہ کس کو چاہتی ہے اس نے اب تک زرتاشے کے ذہن میں پہنچ کر یہ جاننے کی کوشش خود ہی نہیں کی تھی۔

امتیاز خان زمرد سے بھری ٹرالیوں کو کان سے باہر جاتے ہوئے بڑے فخر سے دیکھ رہا تھا اور اس ساری دولت کو اپنا اور صرف اپنا ہی تصور کر رہا تھا۔ سمیر خاموشی سے اس کے ذہن سے نکل آیا۔ اب تک وہ یہ بھی جان گیا تھا کہ امتیاز خان اس جگہ سمیر کی موجودگی پسند نہیں کر رہا تھا۔

''اس کان سے اندازاً کتنی رقم کا زمرد نکلتا ہو گا؟'' سمیر نے پوچھا۔

''اس کے بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا کبھی کم اور کبھی زیادہ اور کبھی کچھ بھی نہیں۔ زمین کے راز زمین ہی جانتی ہے۔ کبھی کبھی کھدائی میں اسی کان سے کروڑوں کا مال ملتا ہے اور کبھی کھدائی کی لاگت بھی نہیں نکلتی۔'' امتیاز خان نے بتایا لیکن سمیر کو اندازہ تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اسے کان سے ہمیشہ ہی فائدہ حاصل ہوا تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ اپنی بیٹی کی زندگی بھی داؤ پر لگانے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ اور ایک نوجوان' خوب صورت لڑکی کی شادی زبردستی ایک ادھیڑ عمر شخص سے کروانے پر تلا ہوا تھا۔

کچھ دیر بعد دونوں واپس غار کے بیرونی حصے میں آ گئے تھے جہاں زرتاشے نے کھانا گرم کر کے میز پر لگا دیا تھا اور صمصام بھی وہاں موجود تھا جسے دیکھ کر سمیر حیران ہوا تھا۔

''آپ نے کہا تھا کہ یہ کان کے اندرونی حصے میں ہیں لیکن میں نے تو انہیں باہر آتے نہیں دیکھا۔'' سمیر نے امتیاز خان سے کہا۔

''اس کان کے کئی دروازے ہیں سمیر...... یہ بہت بڑی کان ہے اور یہ دروازے ان پہاڑیوں میں مختلف جگہوں پر کھلتے ہیں۔'' امتیاز نے ہنستے ہوئے کہا۔

''آؤ تم کھانا کھاؤ۔'' انہوں نے میز پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''آؤ زرتاشے تم بھی آ جاؤ۔'' صمصام نے زرتاشے سے کہا جو ایک کونے میں پریشان سی کھڑی تھی۔

''نہیں! یہ چائے بنائے گی۔'' امتیاز نے جلدی سے کہا اور زرتاشے واپس کچن کی طرف چلی گئی۔

اسی رات سمیر ڈریم سینٹر سے ناصر محمود کے ساتھ نکلا تھا اس نے زرتاشے کے بارے میں اسے سب کچھ بتا دیا تھا

اور یہ بھی بتایا تھا کہ وہ آج رات زرتاشے کے قصے کو انجام تک پہنچانا چاہتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس نے ناصر محمود کو ہدایت کی تھی کہ وہ اس کے کام میں مداخلت نہیں کرے گا...... جب وہ زرتاشے کے گھر کے باہر پہنچے تو اندر سے انہیں باتوں کی آوازیں آتی سنائی دیں۔

سمیر نے ناصر کو ہوشیار رہنے کا اشارہ کیا اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے اور کوئی آواز پیدا نہ کرنے کی ہدایت کرتے ہوئے دبے قدموں مکان میں باہر کھلنے والی کھڑکی کے نیچے پہنچ گیا وہ نیچے بیٹھ گیا تھا یہ کھڑکی مکان کے پچھلے حصے میں تھی اور اس وقت کھلی ہوئی تھی۔ اس سے ہی اندر موجود لوگوں کی آوازیں باہر آ رہی تھیں۔ ناصر محمود بھی سمیر کے قریب ہی دبک گیا تھا۔

"زرتاشے...... چلو لیٹ جاؤ!" زرتاشے کی ماں کی آواز سنائی دی۔

"نن...... نہیں...... میں یہ نہیں کر سکتی۔" زرتاشے کی سہمی ہوئی آواز آئی۔

"تم جانتی ہو...... تمہیں یہ کرنا ہے اور تم پہلے بھی کرتی رہی ہو۔" اس کے والد کی آواز آئی۔

"نہیں! ابو مجھے یہ سب پسند نہیں...... مجھے مجبور مت کریں۔" زرتاشے روہانسی آواز میں بولی۔

"زرتاشہ ضد مت کرو...... اور لیٹ جاؤ...... تم جانتی ہو کہ صمصام کی مردہ بیوی سے رابطے کا تم واحد ذریعہ ہو۔"

"میں نہیں کر سکتی...... آخر ہر بار مجھے کیوں مجبور کیا جاتا ہے۔" زرتاشے نے کہا۔

"میں اس کا معقول معاوضہ دیتا ہوں اور آج بھی دونگا۔" صمصام کی آواز سنائی دی۔

"خدا تمہیں غارت کرے...... تم کیوں میرے پیچھے پڑ گئے ہو۔" زرتاشے نے چیخ کر کہا اور وہ ڈھٹائی سے ہنسنے لگا پھر زرتاشے کی ماں نے اسے زبردستی لیٹنے پر مجبور کر دیا تھا اور اس پر تنویمی عمل کرنے لگی تھی۔ اس عمل کا اثر ہوتے ہی زرتاشے کی آواز آنا بند ہو گئی تھی اور خاموشی چھا گئی تھی۔

"زلیخا!...... آؤ ہمارے سوال کے جواب دو...... زلیخا...... تمہارا شوہر تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔" زرتاشے کی ماں صمصام کی بیوی کو بلا رہی تھی جس کے لیے زرتاشے کے جسم کو معمول بنا لیا گیا تھا۔ سمیر چاہتا تو اسی وقت ان کا سارا کھیل بگاڑ سکتا تھا لیکن وہ بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ زرتاشے کی ماں اس کے ساتھ کیا کرتی ہے اور اس میں کتنی پراسرار صلاحیتیں ہیں۔

"کیا بات ہے...... مجھے کیوں بلایا ہے۔" اچانک ایک بھرائی ہوئی مدھم آواز سنائی دی۔ وہ یقیناً صمصام کی بیوی کی تھی کیونکہ وہ آواز کمرے میں اس سے پہلے نہیں سنائی دی تھی۔

"تمہارا شوہر تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہے۔" زرتاشے کی ماں نے کہا۔

"بولو...... کیا بات ہے صمصام؟"

"میں تم سے محبت کرتا ہوں پیاری بیوی...... لیکن تمہارے بغیر بہت اکیلا ہو گیا ہوں...... میں زرتاشے سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"ہاہاہا...... بہت اچھے۔" بھرائی ہوئی آواز نے کہا۔

"تو کر لو شادی مجھ سے کیوں پوچھتے ہو۔"

"اس لیے کہ میں جانتا ہوں کہ تم میرے ارد گرد موجود رہتی ہو تم زرتاشے کو تنگ کرو گی تمہیں شاید میرا شادی کرنا پسند نہ آئے۔" صمصام کی آواز آئی۔

"وہ تو ہے...... لالچی انسان...... تو نے میری کانوں پر قبضہ کرنے کے لیے مجھے مار دیا اور اب تو زرتاشے کو حاصل کر کے اس کے باپ کی کانوں پر قبضہ کرنا چاہتا ہے...... ہاہاہا۔" بھرائی ہوئی آواز پھر سنائی دی۔

"یہ غلط ہے...... تم کیا کہہ رہی ہو؟" صمصام نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں...... میں تمہیں کبھی بھی اس کی اجازت نہیں دوں گی...... میں تم سے اپنی موت کا انتقام لوں گی۔" بھرائی ہوئی آواز میں کہا گیا پھر دوسرے ہی لمحے صمصام نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا تھا۔ اور کمرے میں چکر کاٹنے لگا تھا پھر وہ بھاگتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا تھا اس کے پیچھے امتیاز اور اس کی بیوی بھی باہر آ گئے تھے سمیر اور ناصر محمود ابھی تک گھر کے پیچھے چھپے ہوئے تھے انہیں کسی نے نہیں دیکھا تھا کیونکہ امتیاز اور اس کی بیوی صمصام کے پیچھے بھاگتے ہوئے گھر سے کافی دور چلے گئے تھے۔ سمیر نے ناصر کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور خود دبے قدموں گھر

میں داخل ہو گیا تھا پھر وہ اس کمرے میں پہنچا تھا جہاں زرتاشے ایک پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی اس نے اسے جگایا تھا اور اسے اپنے گھر دیکھ کر وہ حیران رہ گئی تھی۔

"تم! اس وقت یہاں؟" اس نے حیرت سے کہا۔

"ہاں! میں جب تمہارے ساتھ کانوں پر گیا تھا تو میں نے تمہارے والد کا ذہن پڑھ لیا تھا وہ آج رات ہونے والی اس میٹنگ کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں اس موقع پر تمہیں اس مصیبت سے آزاد کروا دوں گا لیکن میں نے تم سے اس کا تذکرہ نہیں کیا تھا کہ کہیں تمہارے منہ سے کسی کے سامنے کوئی بات نکل نہ جائے اور وہ لوگ ہوشیار نہ ہو جائیں۔" سمیر نے کہا۔

"ہاں! وہ سب کہاں ہیں...... میری ماں مجھ پر تنویمی عمل کر رہی تھی...... وہ میرے ذریعے پہلے بھی کئی بار صمصام کی بیوی زلیخا سے بات کر چکی ہے۔" زرتاشے نے بتایا۔

"میں جانتا ہوں' میں نے تمہیں اس مصیبت سے آزادی دلوادی ہے۔" سمیر نے کہا۔

"وہ کیسے؟"

"جب تمہاری ماں تم پر تنویمی عمل کر رہی تھی تو میں نے زلیخا سے رابطہ قائم ہونے کے لیے تمہارے ذہن کو بند کر دیا تھا اور خود تمہارے ذہن میں آ گیا تھا اور پھر زلیخا بن کر میں نے ان لوگوں سے باتیں کرتا رہا اور میں نے تمہارے والدین کو یقین دلا دیا کہ جیسے وہ صمصام کی آدھی دولت پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں تم سے اس کی شادی کروا کر۔ اسی طرح صمصام بھی تم سے اس لیے شادی کرنا چاہتا ہے کہ وہ تمہارے والد کی دولت بھی ہتھیانا چاہتا ہے اور پھر میں صمصام کے دماغ میں گھس گیا اب وہ پاگلوں کی طرح حرکتیں کر رہا ہے وہ بھاگتا ہوا پہاڑی ڈھلانوں کی طرف چلا گیا ہے جہاں وہ نیچے کھائی میں چھلانگ لگا دے گا اور اس کا قصہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔ میں ابھی اس کے ذہن پر قابض ہوں۔"

"اوہ سمیر! تم پہلے میری زندگی میں کیوں نہیں آ گئے...... میں نے اتنے عرصے پریشانی اٹھائی۔" زرتاشے نے کہا وہ اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھ رہی تھی۔

"تمہاری زندگی میں تمہارے خوابوں کا کوئی شہزادہ آئے گا تم خوش گوار زندگی گزارو گی۔" سمیر نے کہا۔

"میں تم سے صبح ملوں گا ندی کے کنارے جہاں ہم پہلے ملے تھے۔" سمیر نے کہا۔

"نہیں تم مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتے میرے ماں باپ واپس آئیں گے تو پھر میرے ساتھ تشدد کریں گے۔"

"میں نے تمہیں بتایا ہے نا! اب تمہارے ساتھ ایسا نہیں ہو گا...... ابھی کچھ ہی دیر میں تمہیں اس کا ثبوت مل جائے گا۔" سمیر نے کہا۔

"اب میں چلتا ہوں انشاء اللہ صبح ملاقات ہو گی۔" سمیر نے کہا اور فوراً کمرے سے نکل گیا اسے اندازہ ہو گیا تھ کہ زرتاشے کے والدین واپسی کے لیے مڑ گئے تھے اور کسی بھی لمحے اپنے گھر پہنچنے والے تھے وہ ان کی آمد سے پہلے ہی وہاں سے روانہ ہو جانا چاہتا تھا۔ باہر آ کر اس نے ناصر کو ساتھ لیا تھا اور جنگل میں اسی سمت روانہ ہو گیا تھا جہاں سے صمصام بھاگتا ہوا گیا تھا لیکن اس کا راستہ مختلف تھا۔ پہاڑیوں والا راستہ اس نے اختیار نہیں کیا تھا کیونکہ اس راستے سے زرتاشے کے والدین واپس آ رہے تھے جو نہایت گھبرائے ہوئے خوف زدہ تھے۔

"آخر اچانک کیا ہوا کچھ سمجھ میں نہیں آیا؟" امتیاز نے اپنی بیوی سے کہا جو تیز تیز قدم بڑھا رہی تھی۔

"میں نے زرتاشے کو مکمل تنویمی عمل کے ذریعے قابو میں کر لیا تھا اس کی بیوی کی روح بھی آ گئی تھی دونوں میں باتیں شروع ہو گئی تھیں پھر اچانک کیا ہوا کچھ سمجھ میں نہیں آیا...... صمصام بالکل پاگل ہو گیا تھا۔" زرتاشے کی ماں نے کہا۔

"مجھے تو لگتا ہے اس کی بیوی نے اسے دھمکی دی تھی کہ وہ اس سے انتقام لے گی کہیں وہ ہی اس کے ذہن میں نا گھس گئی ہو اور اسے پاگل کر دیا ہو۔" امتیاز نے کہا۔

"ہاں ایسا ہی لگتا ہے...... مجھے خوف آ رہا ہے اس نے کتنی اونچی پہاڑی سے نیچے کھائی میں چھلانگ لگا دی کوئی بھی باہوش و حواس ایسا نہیں کر سکتا وہ اپنے آپے میں نہیں تھا۔" زرتاشے کی ماں نے کہا۔

"اس کی بیوی کی روح کہیں ہمیں انتقام کا نشانہ نہ بنائے ہم بھی تو صمصام کی سازش میں شریک تھے اور وہ ہماری بیٹی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔" امتیاز نے کہا۔

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
ایڈ فری لنکس
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety
پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1
پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بُک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

i. Open Paksociety Page.
ii.Click Liked.
iii.Select Get Notifications.
iv.Select See First.

All Done

Liked
Message
Get Notifications
Add to Interest Lists...
Unlike
IN YOUR NEWS FEED
See First
See new posts at the top of News Feed
Default
See posts as usual
Unfollow

http://paksociety.com

”ہاں! لیکن ہمیں تو یہ بات پتہ نہیں تھی کہ اس نے اپنی بیوی کو دولت کے لیے قتل کر دیا تھا ہمیں تو یہی معلوم تھا کہ وہ کسی پہاڑی سے پاؤں پھسل کر نیچے گری تھی اور ہلاک ہوگئی تھی صمصام نے بھی تو کتنے برس تک اس کے مرنے کا سوگ منایا تھا۔“ زرتاشے کی ماں نے کہا۔

”ہاں! میں نے بھی کبھی یہ نہ سوچا تھا کہ صمصام اپنی بیوی کو قتل بھی کر سکتا ہے۔“

”چلو چلو جلدی کرو...... زرتاشے اکیلی ہے...... ہم نے دوسروں کے چکر میں اپنی بیٹی کو نظر انداز کر دیا تھا اور پھر وقتی طور پر دولت کے لالچ میں اندھے ہوگئے تھے۔“ زرتاشے کی ماں نے کہا اور امتیاز تیز تیز قدموں سے اس کا ساتھ دینے لگا۔

اس رات سمیر نے ناصر محمود کے ساتھ مل کر صمصام کی لاش کو ٹھکانے لگا دیا تھا۔ ناصر محمود حیران تھا کہ وہ سمیر کی صلاحیت کا چشم دید گواہ تھا۔ اس نے کتنی مہارت سے ذرا سی دیر میں دشمن کو ڈھیر کر دیا تھا لیکن ناصر نے اس وقت سمیر سے کوئی بات نہیں کی تھی وہ لاش کو ٹھکانے لگوانے کے بعد اس کے ساتھ ڈریم سینٹر واپس آ گیا تھا۔

”صبح مجھے زرتاشے سے ملنے جانا ہے میرے ساتھ نہیں جاؤ گے۔“ سمیر نے اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے ناصر سے کہا۔

”لیکن سمیر! تمہاری جان کو خطرہ ہو سکتا ہے بھول گئے اس سیاہ سائے کو جس نے چند روز پہلے ہی تمہیں زخمی کیا ہے اور پھر وہ غائب بھی ہو گیا وہ تمہیں پھر نقصان پہنچا سکتا ہے۔“

”پریشان مت ہونا مجھے زیر کرنا اتنا آسان نہیں ہے تم نے دیکھ لیا نہ کہ میں نے اسے کیسے پہاڑی سے نیچے گرا دیا تھا۔“ سمیر نے کہا۔

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن مجھے خلیل کامران کی ہدایت ہے کہ......“

”میں جانتا ہوں...... لیکن میں اس بار اکیلا ہی جانا چاہتا ہوں کیونکہ زرتاشے سے کچھ ایسی باتیں کرنا ہیں جو شاید وہ تمہارے سامنے کرنا پسند نہ کرے۔“ سمیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اچھا ٹھیک ہے۔“ ناصر نے اور اپنے کمرے کی طرف چلا گیا سمیر بھی اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔

بستر پر لیٹ کر زرتاشے کے ذہن میں پہنچ گیا تھا وہ بستر پر لیٹی بے چینی سے کروٹیں بدل رہی تھی۔

”تم ابھی تک جاگ رہی ہو؟“ سمیر نے پوچھا

”اوہ سمیر! تم کتنے اچھے ہو...... میرے ذہن میں تمہارا خیال نکلتا ہی نہیں۔“ زرتاشے نے خواب ناک آواز میں کہا۔

”ایسا اس لیے ہے کہ میں نے تمہیں ایک مصیبت سے نجات دلائی ہے۔“ سمیر نے کہا۔

”نہیں ایسی بات نہیں۔“

”تو پھر کیا بات ہے؟“ سمیر نے پوچھا۔

”مجھے اب اندازہ ہوا کہ میں پہلے دن سے تمہیں پسند کرتی ہوں۔“

”پسند کرنے اور محبت کرنے میں بہت فرق ہے۔“ سمیر نے کہا۔

”کیا؟“

”یہ تمہیں صبح پتہ چلے گا تمہیں معلوم ہے یہاں ایک تم سے والہانہ محبت کرنے والا بھی ہے۔“ سمیر نے بتایا تو وہ حیران رہ گئی۔

”کیا...... یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں نے تو کبھی کسی کو اپنے آس پاس نہیں دیکھا۔“

”وہ تمہارے آس پاس ہی ہے...... میں نے تو کبھی کسی کو اپنے آس پاس نہیں دیکھا۔“

”وہ تمہارے آس پاس ہی ہے...... اتنا قریب کہ تمہارے ساتھ ہونے والی ہر بات اسے پتا ہوتی ہے وہ تمہارے لیے پریشان ہوتا ہے...... سوچتا ہے...... تم پر نظر رکھتا ہے...... تمہاری حفاظت کرتا ہے۔“

”کیا بولے جا رہے ہو...... مجھے یقین نہیں ...... میں کسی ایسے شخص کو نہیں جانتی۔“ زرتاشے نے کہا۔

”میں جانتا ہوں وہ کوئی شخص نہیں ایک خوب صورت، خوبرو، توانا جوان ہے تمہاری اور اس کی جوڑی لاجواب ہوگی۔“ سمیر نے کہا۔

”ایسا مت کہو سمیر...... میں تو تمہیں......“

”نہیں زرتاشے ...... تمہارے لیے وہی نوجوان مناسب ہے اور میں ابھی آزاد رہنا چاہتا ہوں میرا شادی کا

کوئی ارادہ نہیں اور تمہارے والدین تمہاری شادی جلدی کریں گے کیونکہ ان کی کوئی اولاد اور نہیں جوان کی دولت کی حفاظت کرسکے انہیں ایک بہادر اور وفادار گھر داماد چاہیئے جو آگے چل کر تمہارے والد کے کاروبار کو سنبھال سکے۔" سمیر نے کہا۔

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"خدا کو دیکھا نہیں لیکن عقل سے تو پہچانا ہے اپنے حالات کا جائزہ لو سب تمہاری سمجھ میں آ جائے گا۔"

"لیکن میرے والدین کسی اجنبی کے لیے کیسے راضی ہو جائیں گے۔"

"یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔" سمیر نے کہا۔

"کیا مطلب؟ اب تم کیا کرنے والے ہو؟" زرتاشے نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ تمہیں کل صبح پتہ چل جائے تا۔ تم ندی پر آنا مت بھولنا میرے ساتھ وہ نوجوان بھی ہوگا۔" سمیر نے کہا اور پھر وہ زرتاشے کے ذہن سے نکل کر گلفراز کے ذہن میں پہنچ گیا۔

"گلفراز کیا جاگ رہے ہو؟" سمیر کو پتہ تھا کہ وہ جاگ رہا ہے لیکن اس نے گلفراز کو اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لیے اس سے پوچھا تھا۔

"ہاں...... تم...... سمیر......؟" گلفراز نے کہا۔

"ہاں! میں...... سمیر جو تمہیں پہاڑیوں پر ملا تھا اور تم نے اس پر حملہ کر دیا تھا۔" سمیر نے اسے یاد دلایا۔

"ہاں مجھے یاد ہے میں تمہیں زرتاشے کا محبوب سمجھ بیٹھا تھا۔"

"جو کہ تم ہو۔"

"ہاں! لیکن وہ تو میرے دل کی کیفیت سے بے خبر ہے...... آج بھی تم وہاں تھے...... کیا کر رہے تھے؟"

"تمہارا کام کر رہا تھا۔"

"کیا مطلب؟"

"تمہارے راستے کے پتھر صمصام کو ہٹانا تھا اور تمہارے بارے میں بتانا تھا کہ تم اس کے سچے عاشق ہو۔"

"اوہ! کیا تم نے اسے بتا دیا کہ میں کہاں رہتا ہوں؟"

"نہیں یہ تم اسے خود بتانا...... میں نے صرف تمہاری دیوانگی کے بارے میں اسے بتایا ہے وہ بہت حیران ہو رہی تھی۔"

"اوہ! کیا اسے یقین آ گیا؟"

"یہ تو صبح پتہ چلے گا۔"

"کیا مطلب؟"

"صبح تمہیں اس ندی کے پاس پہنچنا ہے جہاں تم اسے اکثر دیکھتے ہو میں بھی وہیں پہنچ جاؤں گا وہ ہمیں وہیں ملے گی ٹھیک صبح سات بجے وہاں پہنچنا میں تمہیں وہیں ملوں گا اور جب زرتاشے آئے گی تو میں تمہارا تعارف کرواؤں گا۔" سمیر نے کہا۔

"مگر تم میرے ذہن میں کیسے آئے؟ یہ میرا پہلا تجربہ ہے کہیں...... یہ میرا وہم ہی نہ ہو۔"

"یہ تمہارا وہم نہیں ہے اس کا اندازہ تمہیں صبح ہو جائے گا۔" سمیر نے کہا۔

"اچھا اب سو جاؤ رات بہت ہو گئی ہے اور صبح جلدی اٹھ کر تمہیں بتائی ہوئی جگہ پر پہنچنا ہے۔" سمیر نے کہا اور اس کے ذہن سے نکل گیا۔

کچھ دیر بعد وہ بھی سو گیا تھا ڈریم سینٹر میں مکمل خاموشی کا راج تھا بس لیبارٹریز میں کچھ سائنس دان اور انجینئرز جاگ رہے تھے جو کچھ نئے تجربات میں مصروف تھے اور ناصر محمود اپنے ہیڈ کے کمرے میں انہیں سمیر کی آج کی مصروفیات کے بارے میں بتا رہا تھا جسے وہ بہت دلچسپی اور توجہ سے سن رہے تھے اور ان کے چہرے پر خوشی کے آثار تھے۔

اگلی صبح سمیر ساڑھے چھ بجے کے قریب ہی ڈریم سینٹر سے نکل گیا تھا وہ صبح کی پرلطف فضا سے لطف اندوز ہوتا اور قدرت کے حسن کو دیکھتا ندی تک پہنچ گیا تھا اور پھر وہیں ٹہلنے لگا تھا کچھ دیر بعد اسے دور سے گلفراز اپنی جانب آتا دکھائی دیا تھا۔ اس کے چہرے پر خوشی اور حیرت کے آثار تھے۔

"میں حیران ہوں کہ کیا یہ سب کچھ سچ بھی ہو سکتا ہے؟ مجھے تو یوں لگ رہا ہے جیسے میں کوئی خوب صورت خواب دیکھ رہا ہوں۔" گلفراز نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"یہ سب حقیقت ہے گلزار۔"

"رات تمہارا میرے ذہن میں آنا...... مجھ سے باتیں

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

کرنا...... مجھے زرتاشہ کے بارے میں بتانا۔" گلفراز حیران تھا۔

"کیا اب تمہیں یقین آ گیا کہ میں تمہارے راستے کا پتھر نہیں تھا۔" سمیر نے کہا۔

"ہاں! مجھے یقین ہے اگر ایسا ہوتا تو تم مجھے یہاں نہ بلاتے۔" گلزار نے کہا۔

"جو تمہاری راہ کا پتھر تھا میں نے اسے ہٹا دیا۔" سمیر نے کہا۔

"کل امتیاز خان کا پارٹنر صمصام گل اپنے انجام کو پہنچ گیا ہے زرتاشے اس کے چنگل سے آزاد ہو چکی ہے اور تمہارے بارے میں میں نے اسے بتا دیا ہے کہ تم اس کے سچے عاشق ہو اب اس کے دل میں جگہ بنانا تمہارا کام ہے اور تمہارا امتحان بھی۔" سمیر نے کہا۔

"مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم ایسی صلاحیتوں کے مالک ہو ورنہ میں پہلی ہی ملاقات میں تم سے دشمنی مول نہ لیتا۔" گلفراز نے کہا۔

"ارے دوست! محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔" سمیر نے کہا تب ہی اسے سامنے سے زرتاشے آتی نظر آئی۔

"یہ لو...... تمہاری محبت آ پہنچی۔" اس نے گلفراز سے کہا تو گلفراز نے پلٹ کر دیکھا وہ زرتاشے کو اپنے سامنے دیکھ کر حیران رہ گیا تھا وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ سمیر اتنی جلدی اسے اس کی محبت سے ملوا دے گا اور اس کے راستے کی تمام رکاوٹیں دور کر دے گا جن کو دور کرنے کی طاقت خود اس میں نہیں تھی۔

"میں ٹھیک وقت پر آئی ہوں نا؟" زرتاشے نے قریب آ کر سمیر سے پوچھا۔

"ہاں زرتاشے! تم ٹھیک وقت پر آئی ہو...... یہ گلفراز ہے تمہارا سچا اور نادیدہ عاشق۔"

"نادیدہ؟" گلفراز نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں! نادیدہ ہی کہا جائے گا نا جب تم دونوں نے ایک دوسرے کو اب تک نہیں دیکھا تھا۔" سمیر نے ہنستے ہوئے کہا۔

"زرتاشے! میں نے اسی گلفراز کے بارے میں تمہیں بتایا تھا اور اب یہ بھی بتا دو کہ تمہاے ان عاشق صاحب نے غلط فہمی کا شکار ہو کر مجھ پر حملہ بھی کر دیا تھا۔"

"کیا؟...... کیسی غلط فہمی؟" زرتاشے نے پہلے گلفراز کو اور پھر سمیر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"بھئی جب میری ان سے پہلی ملاقات ہوئی تو میں تمہارے گھر سے واپس آ رہا تھا۔ یہ کئی روز سے مجھ پر نظر رکھے ہوئے تھا اور سمجھ رہے تھے کہ میں تمہارے چکر میں تمہارے گھر جاتا ہوں چنانچہ انہوں نے میری لاعلمی میں راستے میں مجھ پر حملہ کر دیا تھا۔ یہ باقاعدہ نقاب پہنے ہوئے تھے تا کہ انہیں پہچانا نہ جا سکے لیکن نقاب اتارنے پر یہ میرے لیے اجنبی ہی تھے کیونکہ میں ان سے پہلے کبھی نہیں ملا تھا۔"

"اوہ! تم نے ان پر حملہ کیا؟" زرتاشے نے حیرت سے گلفراز کو دیکھتے ہوئے کہا جس کے چہرے پر شرمندگی تھی۔

"میرا مقصد تمہیں شرمندہ کرنا نہیں گلفراز بلکہ زرتاشے کو یہ بتانا ہے کہ یہ تمہارا سچا عاشق ہے اور تمہارے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔" سمیر نے کہا۔

"لیکن زرتاشے تمہارا یقین کیوں کرے گی؟" گلفراز نے کہا۔

"میں اس لیے یقین کروں گی کہ گلفراز کہ سمیر نے مجھے بہت بڑی مصیبت سے نجات دلائی ہے میں سمیر سے اپنی چاہت کا اظہار کر رہی تھی کہ اس نے مجھے روک دیا اور تمہارے بارے میں بتایا اس نے کہا کہ یہ مجھے نہیں چاہتا بلکہ میرے سچے عاشق تم ہو اور سمیر ہی نے مجھے تم سے ملوانے کا انتظام کیا ہے چنانچہ مجھے سمیر پر بھروسہ ہے۔" زرتاشے نے کہا گلفراز حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"اور اب میرا مشورہ ہے کہ تم دونوں وقت ضائع کیے بغیر اپنے والدین کو ایک دوسرے سے ملوا دو اس سے پہلے کہ کوئی اور صمصام گل تمہارے درمیان آ جائے۔" سمیر نے ہنستے ہوئے کہا۔

"زرتاشے!...... زرتاشے!۔" دور سے زرتاشے کی ماں کی آواز سنائی دی اور سمیر ہنس پڑا۔

"لو! تمہاری امی تمہیں ڈھونڈتی ہوئی آ گئی ہے۔" اس نے کہا۔

"میری امی کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے اور رات

سے ان کا رویہ بہت بدل گیا ہے وہ سمجھتی ہے کہ صہبام ایک پاگل دیوانہ شخص تھا اور قدرت نے بال بال مجھے اس سے بچالیا ہے۔'' زرتاشے نے کہا۔

''ارے سمیر! اتنی صبح صبح یہاں کیسے؟ اور یہ کون نوجوان ہے؟'' زرتاشے کی ماں نے پوچھا۔

''میں تو چہل قدمی کے لیے نکلا تھا اور یہ گلفراز ہے اسی وادی میں آگے رہتا ہے یہ بھی اکثر یہاں آتا ہے میرا دوست بن گیا ہے۔'' سمیر نے گلفراز کا تعارف کروایا۔

''آؤ..... آجاؤ ناشتہ تیار ہے تم لوگ بھی ناشتہ کرلو..... میں زرتاشے کو اسی لیے ڈھونڈنے آئی تھی کہ اس کا ناشتہ ٹھنڈا ہورہا ہے۔''

''میں تو ناشتہ نہیں کروں گا کر کے آیا ہوں۔'' سمیر نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''تو پھر قہوہ پی لینا۔'' زرتاشے کی ماں نے کہا۔

''اچھا چلیں ٹھیک ہے۔'' سمیر نے کہا پھر وہ گلفراز اور زرتاشے کے ساتھ اس کی ماں کے پیچھے چل پڑا تھا۔

ناشتے کے دوران زرتاشے کی ماں گلفراز سے اس کے بارے میں پوچھتی رہی تھی کیونکہ سمیر نے اس کے ذہن میں یہ خیال ڈال دیا تھا کہ گلفراز زرتاشہ کے لیے بالکل مناسب ہے۔ اسے ہاتھ سے نکلنے نہیں دینا چاہیئے۔ پھر باتوں باتوں میں زرتاشے کی ماں نے گلفراز سے اپنے والدین کو لانے کی بات بھی کی تھی۔

''گلفراز تم اچھے لڑکے ہو میں تمہارے والدین سے ملنا چاہتی ہوں۔''

''جی! میں کسی روز انہیں آپ سے ملوانے لے آؤں گا۔'' گلفراز نے کہا۔

''جی! میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ میرے والدین اگر یہاں آئیں گے تو زرتاشے کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟'' گلفراز نے دبی زبان سے کہا اور زرتاشے کی ماں اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

''بھلا مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔'' زرتاشے نے اپنی ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ سمیر سمجھ گیا تھا کہ زرتاشے کو یہ رشتہ پسند ہے تبھی وہ شرما کر وہاں سے ہٹ گئی ہے۔ سمیر فوراً زرتاشے کے ذہن میں پہنچ گیا۔

''میں تمہاری مشکور ہوں سمیر تم نے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے۔'' زرتاشے نے سمیر کو اپنے ذہن میں محسوس کر کے کہا۔ اس کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو تھے۔

''میں نے وہی کیا جو ایک رحم دل انسان کو کرنا چاہیئے مجھے تمہارے بارے میں جان کر دکھ ہوا تھا اور میں تمہاری مدد کرسکتا تھا چنانچہ یہ میرا فرض بن گیا تھا۔ اچھا اب اجازت دو مجھے بہت ضروری کام ہے میں پھر حاضر ہوں گا۔'' سمیر نے کہا اور اس کے ذہن سے نکل گیا پھر وہ ناشتے کی ٹیبل سے بھی اٹھ گیا تھا اور گلفراز اور زرتاشے کی ماں سے رخصت لے کر واپس ڈریم سینٹر کی طرف روانہ ہوگیا تھا۔

سمیر جیسے ہی ڈریم سینٹر پہنچا تھا ناصر محمود اسے گیٹ کے قریب ہی مل گیا تھا انداز سے ظاہر ہورہا تھا کہ وہ اس کا انتظار کررہا ہو۔

''مبارک ہو سمیر! تم نے دو محبت کرنے والوں کو آخر کار ملوادیا۔'' ناصر محمود نے تعریفی انداز میں کہا۔

''اچھا! تو تم مجھ پر نظر رکھی ہوئے تھے؟'' سمیر نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ہاں! دوستوں کے لیے یہ تو کرنا پڑتا ہے۔ جب کہ معلوم ہے کہ دشمن تمہاری بھی تاک میں لگا ہوا ہے۔'' ناصر محمود نے کہا۔

''تم میری زیادہ فکر مت کرو..... میں اپنی حفاظت کرسکتا ہوں۔'' سمیر نے کہا۔

''میں دیکھ رہا ہوں سمیر جب سے تم یہاں آئے ہو تم میں خوداعتمادی بڑھتی جارہی ہے۔'' ناصر محمود نے کہا۔

''اور یہ اچھی بات ہے پہلے تم اپنی صلاحیتوں کو زیادہ استعمال نہیں کرتے تھے شاید ڈرتے تھے لیکن اب تم ان سے بھرپور فائدہ لے رہے ہو۔''

''اور انشاءاللہ مستقبل میں میں ان صلاحیتوں کو اور بھی مثبت اور بڑے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔'' سمیر نے جواب دیا۔

''میں تمہارا انتظار اسی لیے کررہا تھا کہ خلیل کامران اپنے آفس میں تم سے ملنا چاہتے ہیں۔'' ناصر نے کہا۔ پھر وہ اس کے ساتھ خلیل کامران کے آفس میں آ گیا تھا۔

''بیٹھو سمیر اور ناصر..... مجھے کچھ اہم بات کرنا ہے۔''

خلیل کامران نے کہا۔

"سمیر! تم سے تو مجھے یہ کہنا ہے کہ اب تمہیں یہاں آئے ہوئے کافی دن ہو گئے ہیں تم میں اعتماد بھی بڑھ گیا ہے...... میں چاہتا ہوں کہ زرتاشے کا مسئلہ حل ہو جانے کے بعد تم اپنی مصروفیات کچھ بدل لو۔"

خلیل کامران کی اس بات پر سمیر کے چہرے پر حیرت کے آثار نظر آئے اور وہ ناصر کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا جیسے پوچھ رہا ہو کہ زرتاشے کے بارے میں خلیل کامران کو کس نے بتایا۔

"اسے اس طرح مت دیکھو...... اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا...... تم کیا سمجھتے ہو...... میں اتنے بڑے تحقیقاتی ادارے کا سربراہ ہوتے ہوئے کچھ نہیں جانتا؟ مجھے یہاں کام کرنے والے ایک ایک شخص کے بارے میں پوری معلومات رہتی ہیں۔ یہ معلومات بعض اوقات میرے کارکن مجھے بتاتے ہیں لیکن زیادہ تر میں خود اپنی ذہنی صلاحیتوں سے ان کے بارے میں باخبر رہتا ہوں۔ اب زرتاشے کا معاملہ انجام کو پہنچ گیا ہے چنانچہ میں تمہیں ایک اہم ذمہ داری سونپنا چاہتا ہوں۔"

"جی! پہلے تو یہ بات ذہن میں بٹھا لو کہ اس ادارے میں آنے اور جانے کے لیے ہر کوئی آزاد نہیں ہے یہاں رہنے والے لوگ جب تک میں چاہوں اپنی مرضی سے آ اور جا سکتے ہیں اور جب میں نہ چاہوں تو اس کی حدود سے باہر تقریباً دو دو میل تک کوئی نہیں جا سکتا ہے اور نہ ان حدود کو پار کر کے کوئی ادارے میں داخل ہو سکتا ہے اس کی چوبیس گھنٹے نگرانی کی جاتی ہے تم بھی اب تک آزادی سے آتے اور جاتے رہے ہو تو میری مرضی سے ہی ایسا کرتے رہے ہو۔" خلیل کامران نے کہا۔ سمیر نے ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

"میں تمہیں جو کام دینے جا رہا ہوں ناصر محمود تمہارے ساتھ رہے گا تم دونوں کی حیثیت برابر کی ہو گی اب تمہاری کارکردگی بتائے گی کہ تم میں سے بہتر کون ہے؟" اس بات پر دونوں نے چونک کر خلیل کامران کی طرف دیکھا تھا۔

"ہاں! مجھے امید ہے اس نئی گتھی کو سلجھانے کے لیے تم دونوں اپنی اپنی ذہنی اور جسمانی صلاحیتیں بھرپور طریقے سے استعمال کرو گے اور کامیابی حاصل کرو گے تم انفرادی طور پر بھی کام کر سکتے ہو اور ایک دوسرے کی مدد کے ساتھ بھی جیسے تمہیں پسند ہو۔" خلیل کامران نے کہا۔

"ہم وہ کام جاننا چاہتے ہیں؟" سمیر نے کہا۔

"ہم کا مطلب تم دونوں۔ یا صرف تم؟"

"میں بھی اس کے لیے تیار ہوں۔" ناصر نے کہا۔

"ٹھیک ہے...... تمہیں اس معاملے کی فائل کل دے دی جائے گی اور کل ہی میں اس بارے میں تمہیں آگاہ کروں گا اور چاہوں گا کہ کل ہی تم اپنے مشن پر روانہ ہو جاؤ۔"

"ٹھیک ہے۔" دونوں نے ایک ساتھ کہا سمیر کوشش کر رہا تھا خلیل کامران کا ذہن پڑھ کر کچھ اندازہ لگا سکے کہ کام کی نوعیت کیا ہے۔

"تمہیں اس بارے میں کل تفصیل پتہ لگ جائے گی سمیر ابھی کوشش فضول ہے میں بھی گرگ باراں دیدہ ہوں۔ میرے ذہن سے کچھ نہیں نکال سکو گے۔" خلیل کامران نے ہنستے ہوئے کہا اور سمیر کھسیانی ہنسی ہنس پڑا۔

"اب تم دونوں جاؤ باقی بات کل ہو گی۔" خلیل کامران نے کہا تو وہ دونوں اس کمرے سے نکل کر باہر آ گئے تھے اور آنے والے دن کے بارے میں سوچ رہے تھے کہ انہیں کس مشن پر بھیجا جانے والا تھا۔ اس پر ان کے ذہنوں میں بس ایک سوالیہ نشان بنا ہوا تھا۔

اس رات سمیر کی والدہ تیسری بار اس کے خواب میں آئیں وہ بہت اداس نظر آ رہی تھی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ بار بار سمیر کو اپنے پاس بلا رہی تھیں۔

"میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں جس روز آپ کا قتل ہوا میرے لیے سالگرہ کا گفٹ کون لایا تھا؟" سمیر نے پوچھا تو والدہ کے چہرے پر اداس سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"وہی سیاہ پوش اجنبی جو تمہیں مارنا چاہتا تھا اس روز وہ حلیہ بدل کر آیا تھا مہمان بن کر لیکن پھر......" وہ خاموش ہو گئیں اور سمیر کو دوبارہ اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا سمیر ان کے پیچھے چل دیا وہ جنگل کے اس حصے میں آ گئے تھے جہاں ایک بار پہلے بھی اس سیاہ پوش اجنبی نے سمیر پر حملہ کیا تھا لیکن اس بار سمیر نے عجیب منظر دیکھا اس کے والد زمین پر بے جان پڑے تھے اور کچھ فاصلے پر اس کی والدہ بھی بے

حس و حرکت پڑی تھیں اس نے پلٹ کر اپنی والدہ کے اس ہیولے کی طرف دیکھا جس کا تعاقب کرتا ہوا وہ وہاں تک آیا تھا لیکن وہ ہیولا آہستہ آہستہ ہوا میں تحلیل ہو رہا تھا اور سمیر کو یہ راز پتہ چل گیا تھا کہ اس کے والدین کا قاتل وہی سیاہ پوش اجنبی تھا۔

......☆☆☆......

جان ساؤتھ کے ایک چھوٹے سے قحبہ خانے میں بیٹھا سمیر مشروب کی چسکیاں لے رہا تھا لیکن اس کی نظریں مسلسل اس سیاہ فام شخص کا جائزہ لے رہی تھیں جو اپنے دو ساتھیوں سے باتیں کر رہا تھا۔ لیکن اس کی پوری توجہ اپنے قریب زمین پر رکھے ہوئے براؤن بیگ پر تھیں۔ یوں لگ رہا تھا کہ اس میں کوئی اہم چیز ہے۔ جس کی وجہ سے وہ بیگ اس سیاہ فام کا مرکز نگاہ ہے۔ پھر سمیر اس سیاہ فام سے نظریں ملتے ہی اس کے دماغ میں پہنچ گیا تھا اور یہ جان کر اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے کہ وہ شخص کچھ ہی دیر بعد اس براؤن بیگ کی مدد سے لندن میں ایک دھماکا کرنے والا تھا اور اس سلسلے میں اپنے دوستوں سے باتیں کر رہا تھا۔

اس سیاہ فام کا نام مائیکل تھا اس کے دوست اسے اس نام سے پکار رہے تھے۔ مائیکل کے دماغ میں موجود ہونے کے باعث سمیر اس کی ساری گفتگو سن رہا تھا۔

”بڈی یہ بیگ اب تمہاری ذمہ داری ہے۔“ مائیکل کے سامنے بیٹھے شخص نے اس سے کہا۔

”میرا کام اسے تم تک پہنچانا تھا میں نے اپنا کام کر دیا میں بگ باس کو بتا دوں گا آگے تمہارا کام شروع ہوتا ہے پتہ ہے نا تمہیں اپنا کام کیسے کرنا ہے؟“

”ہاں...... جانتا ہوں دوست کسی کو مجھ پر شک نہیں ہونا چاہئے میں یہ بیگ ریلوے ٹریک پر رکھ دوں گا اور شام چار بجے کی ٹرین جب اس پر سے گزرے گی تو میں اسے ریموٹ سے اڑا دوں گا۔“ مائیکل نے طریقہ کار بیان کرتے ہوئے کہا۔

”بس ٹھیک ہے ابھی صبح کے گیارہ بجے ہیں شام چار بجے کی بی بی سی نیوز میں جان ساؤتھ کے علاقے میں شام چار بجے کی ٹرین تباہ ہو جانا چاہئے۔“ اس شخص نے کہا اور اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

مائیکل اسی طرح بیٹھا ہوا اپنا کھانا ختم کر رہا تھا لیکن اس کا دماغ بار بار اسی منصوبے کے بارے میں سوچ رہا تھا سمیر نے کئی بار اس کا دماغ ٹٹولنے کی کوشش کی کہ اس ٹرین کو کیوں اڑایا جا رہا ہے لیکن مائیکل اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا اس کا پلان تو یہ تھا کہ یہاں سے فارغ ہو کر وہ اسی علاقے میں واقع اپنے فلیٹ جاتا اور کچھ دیر آرام کرنے کے بعد پھر اپنے کام کو نمٹانے کے لیے نکلتا سمیر نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اس کا تعاقب کرے گا وہ اس کے دماغ سے نکل آیا اسے حیرت تھی کہ لندن میں بھی ایسے لوگ موجود تھے جو یہاں کے سکون کو برباد کرنا چاہتے تھے اور یہاں جگہ جگہ دھماکے کر رہے تھے اس لیے کئی بار ایسی خبریں پڑھی تھیں وہ یہاں آیا بھی اسی سلسلے میں تھا لیکن ابھی مطلوبہ شخص سے نہیں ملا تھا اس نے سوچا اپنے طور پر بھی اس راز تک پہنچنے کی کوشش کرنا چاہئے۔

کچھ دیر بعد مائیکل اپنی سیٹ سے اٹھا تھا اس نے اپنے قریب رکھا براؤن بیگ اٹھایا تھا اور کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا تھا چند لمحے کاؤنٹر کلرک سے باتیں کرنے اور اپنا بل ادا کرنے کے بعد وہ قحبہ خانے سے نکل گیا تھا اور سمیر بھی نہایت احتیاط سے اس کے پیچھے وہاں سے نکلا تھا وہ شخص باہر کھڑی سیاہ رنگ کی کار میں بیٹھ رہا تھا سمیر نے بھی قریب کھڑی اپنی بائیک اسٹارٹ کی تھی اور پھر اس سیاہ کار کے پیچھے روانہ ہو گیا تھا لیکن تعاقب کے دوران اس نے کار سے اپنا فاصلہ کافی رکھا تھا کار کے اور اس کے درمیان دو ایک دوسری گاڑیاں بھی موجود تھیں۔ اسی طرح مائیکل کو اس پر شک نہیں ہو سکتا تھا پھر سیاہ کار ایک پانچ منزلہ بلڈنگ کے سامنے رک گئی تھی اور مائیکل براؤن بیگ کے ساتھ اس سے باہر نکلا تھا اور بلڈنگ میں داخل ہو گیا تھا۔

سمیر ایک بار پھر اس کے دماغ میں موجود تھا مائیکل نے دوسری منزل پر جا کر اپنے کمرے کا دروازہ کھولا تھا جس پر 205 نمبر کی پلیٹ لگی تھی اور اندر داخل ہو گیا تھا اندر جا کر اس نے بیگ ایک سائیڈ میں رکھا تھا اور بیڈ پر بیٹھ گیا تھا۔

اس کی ذہنی کیفیت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ یہ کام نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن مجبور تھا وہ اس وقت اپنی بیوی مارتھا کے بارے میں سوچ رہا تھا جس سے وہ بہت محبت کرتا تھا اس کی ایک سال پہلے ہی شادی ہوئی تھی لیکن ابھی کوئی

اولاد نہیں تھی اس کی بیوی بگ باس کے قبضے میں تھی اور اسے جان سے مارنے کی دھمکی دے کر بگ باس اس سے یہ کام کرواتا تھا وہ اب تک دو کامیاب دھماکے کر چکا تھا جن میں بہت سے لوگوں کی جانیں جاچکی تھیں وہ اس عمل پر شرمندہ بھی تھا لیکن وہ مجبور تھا اگر وہ ایسا نہ کرتا تو اس کی بیوی کو جان سے مار دیا جاتا وہ کسی بھی طرح اس مصیبت سے نکلنا چاہتا تھا کیونکہ ہر بار اس سے بگ باس جھوٹے وعدے کرتا تھا کہ اس بار کام کی کامیابی پر اس کی بیوی کو آزاد کردے گا لیکن ہر بار ہنس کر ٹال جاتا اور کہتا کہ اگلی بار میں تمہیں ایک بڑی رقم بھی دوں گا اور تمہاری بیوی کو بھی چھوڑ دوں گا لیکن پھر مکر جاتا تھا۔ سمیر کو مائیکل سے ہمدردی محسوس ہونے لگی حالانکہ کچھ دیر پہلے وہ اس سے نفرت محسوس کررہا تھا لیکن اب اس کی مجبوری جان لینے کے بعد سمیر نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ اس دھماکے کو بھی نہیں ہونے دے گا اور مائیکل کی مدد کرے گا تاکہ اس کی بیوی کو آزاد کرواسکے یہ کام سمیر کے لیے بہت آسان تھا وہ خود کو روپوش رکھتے ہوئے یہ بہت خوبی سے کرسکتا تھا اور دھماکے کروانے والوں کے لیے ایک سوالیہ نشان بھی چھوڑنا چاہتا تھا۔

کچھ دیر بعد مائیکل اٹھ کر غسل خانے میں نہانے چلا گیا اس نے فلیٹ کا دروازہ لاک نہیں کیا تھا۔ سمیر اس کے ذہن سے نکل گیا اور اپنی بائیک سے اتر کر اس بلڈنگ میں داخل ہوگیا اس نے کاؤنٹر پر جاکر کلرک کو 205 نمبر کمرے میں جانے کی اطلاع دی تھی اور رجسٹر میں اپنا نام جانسن لکھوایا تھا پھر وہ لفٹ کے ذریعے اوپر چلا گیا تھا اس نے کاؤنٹر کلرک کو یہ بھی بتایا تھا کہ وہ مائیکل کا دوست ہے اور اس سے ملنے آیا ہے وہ چاہتا تھا کہ بعد میں اگر تحقیقات ہو تو مائیکل کی جان بچ جائے۔

اس نے آہستہ سے بغیر آواز کیے کمرے کا دروازہ کھولا تھا اور اندر داخل ہوگیا تھا پھر اس نے سائیڈ میں رکھا ہوا براؤن بیگ اٹھایا تھا اور اسی خاموشی سے کمرے سے نکل گیا تھا لیکن واپسی کے لیے اس نے دوسری لفٹ کا انتخاب کیا تھا جو بلڈنگ کے ہال میں کھلنے کے بجائے بلڈنگ کے عقب میں کھلتی تھی وہ بلڈنگ کے پچھلے دروازے سے باہر آیا تھا اور تیزی سے اپنی بائیک پر آ کر بیٹھ گیا تھا پھر اس نے بائیک تیزی سے آگے بڑھا دی تھی وہ جلد از جلد اس بیگ سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا پھر اس نے ایک سنسان جگہ دیکھ کر سڑک کے کنارے بائیک روک دی تھی اور بیگ اٹھا کر سڑک کے کنارے لگے درختوں میں غائب ہوگیا تھا۔

کچھ دور جانے کے بعد وہ جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھ گیا تھا اور اس نے احتیاط سے بیگ کھولا تھا اس بیگ میں بم موجود تھا لیکن ابھی اس کا ٹائمر سیٹ نہیں کیا گیا تھا ریموٹ بھی ساتھ ہی رکھا تھا سمیر نے آنکھیں بند کرکے ایک گہری اور پرسکون سانس لی کیونکہ ابھی بم خطرناک نہیں تھا اگر اس کا ٹائمر سیٹ کیا جاچکا ہوتا تب بھی سمیر اسے ناکارہ کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا اسے ڈریم سینٹر میں کئی طرح کی ٹریننگ دی گئی تھی جس سے وہ بہت سے ایسے کام کرنے کے قابل ہوچکا تھا اس نے بیگ کو بند کیا اور پھر بائیک پر آ بیٹھا اب اس کا رخ اس علاقے کے دریا کی طرف تھا۔ تقریباً آدھا گھنٹے میں وہ وہاں پہنچ گیا تھا۔

دریا پل کے نیچے بہت نیچے تھا اور تیزی سے بہہ رہا تھا سمیر پل پر موجود تھا اور ریلنگ کے ساتھ لگا نیچے بہتے دریا کا جائزہ لے رہا تھا پل سے تھوڑی تھوڑی دیر میں کوئی گاڑی گزر جاتی تھی اور سمیر کو ایسے لمحے کا انتظار تھا جس وقت چند لمحوں کے لیے پل خالی ہو اور وہ کسی کی نظر میں آئے بغیر وہ بیگ نیچے دریا میں ڈال دے پھر جلد ہی اسے موقع مل گیا تھا اور اس نے بیگ سے جان چھڑالی تھی۔ اب اسے مائیکل کی فکر تھی لیکن وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ دھماکا نہ ہونے کی صورت میں مائیکل سے کون رابطہ کرتا ہے اور اسے کہاں لے جایا جاتا ہے سمیر کا کام اس کے بعد شروع ہونا تھا۔

بیگ سے جان چھڑانے کے بعد سمیر واپس اپنے فلیٹ میں آ گیا تھا۔ آج ناصر اس کے ساتھ موجود نہیں تھا وہ بھی اس کے ساتھ ہی لندن آیا تھا لیکن آج کچھ شاپنگ کرنے بازار گیا ہوا تھا سمیر نے فیصلہ کیا کہ ابھی وہ مائیکل والے واقعہ کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتائے گا۔ اس نے کچھ دیر بعد پھر مائیکل کے ذہن میں جھانک کر دیکھا وہ مطمئن تھا اسے ابھی تک بیگ کے غائب ہونے کا علم نہیں تھا وہ فریش ہونے کے بعد سونے کے لیے لیٹ گیا تھا سمیر اس کے ذہن سے واپس نکل گیا اسے اندازہ تھا کہ مائیکل سو کر

اٹھے گا اور باہر جانے کے لیے بیگ ڈھونڈے گا تب اسے اس کی گمشدگی کا پتہ چلے گا۔ ابھی شام کے چار بجنے میں دو گھنٹے تھے سمیر بھی آرام کرنے کے لیے لیٹ گیا۔

ٹھیک چار بجے وہ اٹھا تھا اور لباس تبدیل کرکے باہر آ گیا تھا پھر بائیک پر بیٹھ کر مائیکل کے فلیٹ کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔ فلیٹ کے سامنے موجود ایک ریستوان میں اس نے بیٹھنے کا فیصلہ کیا تا کہ اس بلڈنگ پر نظر رکھ سکے اسے یقین تھا کہ دھماکا نہ ہونے کی صورت میں بگ باس کے آدمی مائیکل سے ضرور رابطہ کریں گے اور اس موقع پر بھی اسے مائیکل کی مدد کرنا تھی اس نے بیٹھنے کے لیے ایک ایسی سیٹ کا انتخاب کیا تھا جس کے سامنے ایک بڑی کھڑکی موجود تھی اور وہاں سے بلڈنگ کا صدر دروازہ صاف نظر آ رہا تھا اس نے اپنے لیے چائے اور اسنیکس کا آرڈر دیا تھا اور اطمینان سے بیٹھ گیا تھا اس کی نظریں کھڑکی سے باہر مائیکل کی بلڈنگ کا جائزہ لے رہی تھیں۔

ٹھیک ساڑھے چار بجے ایک سیاہ کار بلڈنگ کے سامنے آ کر کھڑی ہوئی تھی اور اس میں سے دو لحیم شحیم سیاہ فام برآمد ہوئے جنہوں نے سفید کوٹ پتلون پہنے ہوئے تھے اور آنکھوں پر سیاہ چشمے لگائے ہوئے تھے انہوں نے بڑی احتیاط سے اطراف کا جائزہ لیا اور بلڈنگ میں داخل ہو گئے سمیر بھی اپنی جگہ سے اٹھا تھا اور بلڈنگ کی طرف بڑھ گیا تھا اس بار اسے معلوم تھا کہ اسے سمیر کے کمرے میں کس راستے سے جانا ہے اس نے عقبی راستہ اختیار کیا تھا جب وہ دوسری منزل پر پہنچا تو مائیکل کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اندر سے تیز تیز باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں پھر دروازہ بند ہو گیا تھا۔ سمیر ایک دیوار کی اوٹ میں چھپ کر کھڑا ہو گیا اور مائیکل کے ذہن میں پہنچ گیا۔

”بتاؤ وہ بم کہاں ہے تم نے ہمارا کام کیوں نہیں کیا؟“ آنے والوں میں سے ایک نے غرانے والے انداز سے کہا۔

”میں سچ کہہ رہا ہوں جارج میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ بم کا بیگ غائب ہو گیا تھا۔ میں نے بہت ڈھونڈا نہیں ملا۔“ مائیکل نے بے چارگی سے کہا اس کا سیدھا گال سوجا ہوا تھا اور منہ سے خون کی پتلی سی لکیر بہہ کر نیچے ٹھوڑی تک آ گئی تھی جارج کے جارحانہ انداز سے لگ رہا تھا کہ اس نے ہی مائیکل کو مارا تھا دوسرا ساتھی دروازے کے قریب ہی کھڑا تھا۔

”تم بکواس کر رہے ہو بیگ میں خود تمہارے ہاتھ میں دے کر گیا تھا کہاں غائب ہو سکتا ہے؟“ جارج نے پھر غصے سے کہا وہ بار بار اپنی مٹھیاں بھینچ رہا تھا سمیر کے دماغ میں شرارت کی سوجھی اور اس نے مائیکل کے منہ سے مائیکل ہی کی آواز سے ایک جملہ ادا کر دیا۔

”تم سب حرام خور ہو جو بگ باس کے اشاروں پر چلتے ہو میں یہ نہیں کر سکتا۔“ مائیکل کے منہ سے یہ جملہ ادا ہونے پر مائیکل کو بھی حیرت تھی جارج غصے سے پاگل ہو گیا تھا۔ وہ مائیکل کو ٹکر مارنے کے ارادے سے دو قدم پیچھے ہٹا پھر تیزی سے اس کی طرف چھلانگ لگائی اور سمیر نے مائیکل کو پھرتی سے ایک سمت ہٹنے پر مجبور کر دیا جارج کا سر سیدھا دیوار میں جا کر لگا تھا اور ضرب اتنی شدید تھی کہ وہ تڑپ کر رہ گیا تھا وہ فوراً ہی پلٹا تھا۔

”تیری اتنی ہمت؟“ اس نے غصے سے کہا۔

”ضرور تیرے پیچھے کوئی ہے ورنہ......“ ابھی جارج اپنی بات پوری نہیں کر پایا تھا کہ دروازے کے قریب کھڑے اس کے ساتھی نے اپنی جیب سے سائیلنسر لگا پستول نکال کر اپنے ہی ساتھی پر گولی چلا دی تھی گولی ٹھیک اس کی کھوپڑی میں لگی تھی اور وہ ڈھیر ہو گیا تھا مائیکل حیرت سے منہ کھولے یہ منظر دیکھ رہا تھا کیونکہ سمیر اب اس کے دماغ سے نکل کر جارج کے ساتھی کے دماغ میں پہنچ چکا تھا اور پستول سے فائر بھی اس نے ہی کروایا تھا۔

”یہ تم نے کیا کیا؟“ مائیکل نے سامنے کھڑے شخص سے کہا۔

”تم نے جارج کو مار ڈالا۔ ہم دہری مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔“

”میں کچھ نہیں جانتا ہم تمہیں یہاں بگ باس کے پاس لے جانے آئے تھے یہ فضول باتوں میں وقت ضائع کر رہا تھا چلو...... سیدھی طرح میرے ساتھ چلو ورنہ تمہیں بھی ڈھیر کر دوں گا۔“ سامنے کھڑے شخص نے مائیکل سے کہا جو یہ سب کچھ سمیر کی ہدایات پر کر رہا تھا جو اس کے دماغ میں موجود تھا وہ چاہتا تھا کہ اس کے ذریعے بگ باس تک پہنچ جائے اور مائیکل کی بیوی ماریتا کو رہائی دلوا دے۔

چند ہی لمحوں بعد مائیکل کمرے سے باہر نکلا تھا اور دوسرا شخص پستول اپنے کوٹ کی جیب میں رکھے لیکن مائیکل کو نشانے پر رکھے ہوئے تھا۔ مائیکل خاموشی سے آگے آگے چل رہا تھا پھر وہ دونوں لفٹ میں سوار ہوگئے تھے اور سمیر زینے اترتا ہوا نیچے آیا تھا۔ اس نے دونوں کے ذہن کو آزاد چھوڑ دیا تھا اور اپنی بائیک پر بیٹھ کر ان کی سیاہ کار کا تعاقب شروع کر دیا تھا جس میں بیٹھ کر مائیکل اور اجنبی شخص روانہ ہوئے تھے اس وقت کار مائیکل ڈرائیو کر رہا تھا اور اجنبی پستول لیے برابر کی سیٹ پر موجود تھا ساتھ ہی ساتھ وہ اسے ہدایات بھی دیتا جا رہا تھا۔

”دیکھو تمہارا اور میرا کوئی جھگڑا نہیں ہے تم مجھے چھوڑ دو...... مجھے جانے دو...... ورنہ بگ باس مجھے اور مارتھا کو جان سے مار دے گا۔“ مائیکل ایک بار پھر گڑگڑایا۔

”مجھے تمہاری کوئی پروا نہیں...... تمہیں باس تک پہنچانا میری ذمہ داری ہے۔“ اجنبی نے کہا دونوں باتوں میں اتنے منہمک تھے کہ انہیں ذرا بھی شک نہیں ہوا تھا کہ کوئی ان کا تعاقب کر رہا ہے۔ یہ سفر تقریباً آدھا گھنٹہ جاری رہا تھا اور پھر سیاہ کار ایک بڑے قحبہ خانے کے سامنے رک گئی تھی مائیکل اور اجنبی شخص کار سے اتر کر اس قحبہ خانے میں داخل ہوگئے تھے سمیر نے بھی چند لمحوں کا وقفہ دے کر ان کی تقلید کی تھی قحبہ خانے میں رنگ برنگی لائٹوں کا راج تھا جو ہر طرف گھوم رہی تھیں میوزک کا شور تھا اور وہاں موجود جوڑے محو رقص تھے مائیکل اس اجنبی کے ساتھ ان کے درمیانی راستہ بناتا آگے بڑھ رہا تھا پھر وہ ایک بند دروازے کے سامنے جا کر رک گئے تھے اجنبی شخص نے مخصوص انداز میں دستک دی تھی تو چند لمحے بعد دروازہ کھلا تھا۔

"Three sparow" اجنبی نے دروازہ کھولنے والے کو کوڈ بتایا اور وہ پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے اجنبی اور مائیکل کو اندر جانے کا راستہ دے دیا تھا اور اتنی دیر میں سمیر ہال میں موجود ایک ٹیبل پر بیٹھ گیا تھا اور مائیکل کے ذہن میں پہنچ گیا تھا۔

جس کمرے میں وہ داخل ہوئے تھے وہاں سرخ رنگ کی روشنی ہو رہی تھی کمرے میں چاروں طرف صوفے لگے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک پر بگ باس براجمان تھا وہ تندرست جسم کا مالک ایک سیاہ فام شخص تھا چہرے پر کرختگی کے آثار تھے اور آنکھوں میں عیاری چمک رہی تھی اس کے دونوں جانب حسین و جمیل لڑکیاں موجود تھیں جو اپنی اداؤں سے اسے لبھا رہی تھیں۔ مائیکل کو سامنے دیکھ کر بگ باس کے ہاتھ کے اشارے سے لڑکیوں کو وہاں سے جانے کے لیے کہا تھا اور خود سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا۔

”تمہیں جو کام دیا گیا تھا تم نے وہ کیوں نہیں کیا؟ تمہیں اس کی سزا معلوم ہے؟“ بگ باس نے کہا۔

”میرا کوئی قصور نہیں ہے بیگ کھو گیا تھا۔“ مائیکل نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

”کیا......؟ تم اتنے بے پروا کب سے ہوگئے۔ اس کی حفاظت تو تمہیں جان سے زیادہ کرنی تھی۔“

”میں اسے اپنے ساتھ فلیٹ لے گیا تھا لیکن وہاں سے وہ غائب ہو گیا بس میں غسل کرنے باتھ روم میں گیا تھا واپس آیا تو وہ غائب تھا۔“

”اوہ! تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ تم نے کتنا بڑا نقصان کیا ہے...... جارج کہاں ہے؟“ اس نے مائیکل کے ساتھ کھڑے شخص سے پوچھا۔

”اسے میں نے مار دیا۔“ اجنبی نے کہا۔

”کیا......؟ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ یہ تو ہمارے پلان کا حصہ نہیں تھا۔ تم نے اسے کیوں مارا؟ وہ میرا وفادار تھا۔“ بگ باس دھاڑا۔

”وہ بلاوجہ اس سے لڑائی میں الجھ گیا تھا اور وقت خراب کر رہا تھا۔“

”مائیکل تم تو اب بھول جاؤ کہ کبھی اپنی بیوی سے مل بھی سکو گے۔“ بگ باس نے کہا اور اس کے ساتھ کھڑے اپنے ساتھی کو گولی مار دی وہ لڑکھڑا کر نیچے گر گیا تھا پھر اس نے کمرے میں موجود دوسرے شخص کو وہاں سے لاش اٹھانے کا اشارہ کیا تھا۔ مائیکل خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔

”اب تم بھی میری قید میں رہو گے میں تم پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔“ بگ باس نے کہا۔

”خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو...... بیگ کے کھونے میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ میں کئی بار تمہارا کام کر چکا ہوں

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

اب مجھے میری بیوی کا پتہ بتادو؟" مائیکل نے کہا۔

"ہاہاہا...... تمہاری بیوی...... وہ تمہاری بلڈنگ میں سیکنڈ فلور پر ہی تمہاری ناک کے نیچے تھی اور تمہارے فرشتوں کو بھی پتہ نہیں چلا۔" بگ باس نے اس کا تمسخر اڑاتے ہوئے کہا اور اسی لمحے سمیر مائیکل کے ذہن سے نکل کر بگ باس کے ذہن میں پہنچ گیا اور اس کے منہ سے سچائی باہر آنے لگی۔ مائیکل حیرت سے بگ باس کو دیکھ رہا تھا۔

"وہ تمہارے کمرے والی برابر کی راہ داری میں کمرہ 201 میں ہے لیکن وہ کمرہ لاک رہتا ہے اور مارتھا مسلسل بے ہوش رہتی ہے اسے بے ہوشی کی دوا ایک خاص مقدار میں دی جاتی ہے اور یہ کام میرا خاص آدمی کرتا ہے۔" بگ باس نے کہا۔ مائیکل اور اس کمرے میں موجود بگ باس کے دو آدمی حیران تھے کہ بگ باس کو اچانک کیسے مائیکل کو اس کی بیوی کا پتہ بتا رہا ہے پھر ان پر مزید حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے جب بگ باس نے مائیکل سے وہاں سے جانے کو کہا۔

"جاؤ تم نے سنا نہیں دفع ہو جاؤ تم میرے کسی کام کے نہیں ہو۔" بگ باس نے کہا اور مائیکل موقع غنیمت جان کر کمرے سے تیزی سے نکل گیا وہ سید ھا قحبہ خانے سے باہر آیا تھا جہاں سمیر بائیک کے ساتھ موجود تھا۔

"بیٹھ جاؤ...... جلدی کرو...... اس سے پہلے کے تمہارے پیچھے کوئی آئے۔" سمیر نے مائیکل سے کہا اور مائیکل حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ آج اس پر بار بار حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے پہلے بیگ غائب ہوا پھر بگ باس نے اپنی فطرت کے برخلاف اس کی جان چھوڑ دی اور اب یہ اجنبی زبردستی اس کی مدد کرنے کو تیار تھا۔

"تم کون ہو؟" مائیکل نے پوچھا۔

"یہ ان باتوں کا وقت نہیں ہے تم فوراً بائیک پر بیٹھ جاؤ تمہارے پیچھے آ ہی رہے ہوں گے۔" سمیر نے کہا تو مائیکل بائیک پر اس کے پیچھے بیٹھ گیا اور سمیر نے بائیک سرپٹ دوڑا دی۔ صرف دس منٹ میں ہی وہ مائیکل کے فلیٹ میں تھے۔

"تم کون ہو؟" مائیکل نے پوچھا۔

"تمہیں اپنی بیوی کو آزاد کروانا ہے؟ تمہارے پاس صرف بیس منٹ ہیں۔" سمیر نے کہا تو مائیکل چونکا۔

"ہاں! اس نے کہا تھا وہ اسی بلڈنگ میں کمرہ نمبر 201 میں ہے۔"

"چلو!" سمیر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا پھر دس منٹ کے اندر انہوں نے کمرہ نمبر 201 کا تالا کھول لیا تھا۔ مائیکل اپنی بیوی مارتھا کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا لیکن اس پر غنودگی طاری تھی اور وہ چل نہیں سکتی تھی۔

"تم اسے سہارا دے کر نیچے لاؤ۔ میں کوئی ٹیکسی روکتا ہوں۔ یہ تم سوچ لو کہ تمہیں کہاں جانا ہے۔" سمیر نے کہا۔

پھر یہ کام چند ہی لمحوں میں ہو گیا تھا۔ مائیکل سہارا دے کر مارتھا کو نیچے لایا تھا اور سمیر نے ایک ٹیکسی روک کر انہیں ٹیکسی میں بیٹھا دیا تھا۔

"تمہارے کمرے میں کوئی قیمتی چیز تو نہیں رہ گئی؟" سمیر نے پوچھا۔

"مجھے کسی چیز کی پروا نہیں میری مارتھا مجھے مل گئی ہے اب مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔" مائیکل نے کہا۔

"بس اب تم نکلو وہ آ ہی رہے ہوں گے۔" سمیر نے کہا اور مائیکل کی ٹیکسی آگے بڑھ گئی۔ مائیکل ہی نے ٹیکسی ڈرائیور کو بتا دیا تھا کہ اسے کہاں جانا ہے۔ سمیر نے اس کی مدد کر دی تھی لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ مائیکل اب کہاں گیا ہوگا اور وہ زندگی میں کبھی اس سے مل بھی سکے گا یا نہیں۔

ٹیکسی کے وہاں سے روانہ ہوتے ہی وہی سیاہ کار وہاں آ پہنچی تھی۔ جس میں کچھ دیر پہلے مائیکل کو بگ باس کے پاس لے جایا گیا تھا اس میں دو آدمی اتر کر تیزی سے بلڈنگ میں داخل ہوئے تھے سمیر اطمینان سے اپنی بائیک کے قریب کھڑا ہو کر ان کا جائزہ لے رہا تھا پھر وہ یہ دیکھنے کے لیے بائیک پر ہی بیٹھ گیا تھا کہ ان کا ردعمل کیا ہوتا ہے۔

وہ دونوں چند ہی لمحوں میں باہر آئے تھے اور اطراف کا جائزہ لے رہے تھے پھر ان میں سے ایک سڑک کے دوسری طرف واقع ریسٹورانٹ میں چلا گیا تھا شاید یہ چیک کرنے کے لیے کہ مائیکل اور اس کی بیوی وہاں تو نہیں چھپ گئے وہ یہ تو جان گئے تھے کہ ان کے باس نے مائیکل کو اس کی بیوی کا پتہ بتا کر غلطی کی تھی اور وہ اس کا کمرہ کھلا دیکھ کر سمجھ گئے ہوں گے کہ مائیکل اسے آزاد کروا کر لے گیا ہے لیکن اب انہیں مائیکل کو ڈھونڈنا تھا۔ بگ باس یقیناً غصے

سے پاگل ہو رہا ہوگا اور حیران بھی کہ میں نے مائیکل کو نا صرف آزاد چھوڑ دیا تھا بلکہ اسے اس کی بیوی کا پتہ بھی بتا دیا تھا اب یہ مائیکل کی بے وقوفی ہی ہوتی جو وہ اتنے اچھے موقع سے فائدہ نہیں اٹھاتا۔

سیاہ کار سے اترنے والا دوسرا شخص آہستہ آہستہ سمیر کے پاس آ گیا تھا اور اسے نیچے سے اوپر تک غور سے دیکھ رہا تھا۔

”کیا بات ہے بھائی کیا دیکھ رہے ہو؟“ سمیر نے پوچھا۔

”تم نے اس بلڈنگ سے کسی کو باہر نکلتے ہوئے دیکھا ہے؟“ اس شخص نے پوچھا۔

”کئی لوگ اندر باہر آ اور جا رہے ہیں تم کس کا پوچھ رہے ہو؟“ سمیر نے پوچھا۔

”ایک آدمی اور عورت۔“ اس شخص نے کہا اور سمیر جواب دینے کے بجائے مائیکل کا حلیہ بتانے لگا۔

”نہیں ایسا کوئی آدمی میں نے نہیں دیکھا میں تو ابھی آیا ہوں ریسٹورانٹ میں کھانا کھانے۔“ سمیر نے کہا اور بائیک سے اتر کر چابیاں لہراتا سڑک پار کر کے ریسٹورانٹ میں داخل ہو گیا جہاں کار سے اترنے والا شخص کاؤنٹر کلرک سے کچھ گفتگو کر رہا تھا۔ سمیر مسکراتا ہوا ایک ٹیبل پر بیٹھ گیا۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں شخص نا امید ہو کر واپس چلے گئے تھے اور سمیر کو ایک انجانی خوشی کا احساس ہو رہا تھا کہ اس نے آج ایک کمزور اور مظلوم شخص کی مدد کی تھی اور اسے ایک گناہ کرنے سے بچا لیا تھا۔ اس کے علاوہ بم کے دھماکے میں جو لوگ ہلاک یا زخمی ہوتے وہ بھی محفوظ رہے تھے۔

* * *

سمیر اور ناصر محمود کو لندن آئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا اور وہ وہاں دسمبر کے مہینے کی شدید سردی اور بارشوں سے لطف اٹھا رہے تھے لندن پہنچنے کے بعد انہوں نے جان ساؤتھ کنگشن کے چھوٹے سے قصبے تک پہنچنے کا سفر ٹرین پر کیا تھا جس نے چار گھنٹے میں انہیں اس قصبے میں پہنچایا تھا جہاں ایک چھوٹے سے ہوٹل میں ان کا قیام تھا انہوں نے اپنا زیادہ وقت لندن کے عجائب گھر دیکھنے میں گزرا تھا انہیں یہاں کیرین سے ملنا تھا جو ایک بہت مشہور اور امیر رائٹر کی سیکرٹری تھی۔ ڈریم سینٹر سے انہیں اسی رائٹر سے ملنے بھیجا گیا تھا جو ایک اہم مشن پر کام کر رہا تھا۔

سمیر کو لندن میں سائنس میوزیم بہت پسند آیا تھا جہاں سائنسی ایجادات کے بہترین نمونے رکھے تھے۔ لندن میں ان کی سرگرمیاں خاصی محدود تھیں کیونکہ دسمبر کے مہینے میں موسم بہت جلد ہوادار اور بارش والا ہو جاتا تھا اور پھر سردی کے چھوٹے دنوں کی وجہ سے سورج صبح آٹھ بجے طلوع ہو کر چار بجے شام کو غروب ہو جاتا تھا لیکن جلدی شام ہونے کی وجہ سے لندن کی سڑکیں اور بازار خوب روشن ہو جاتے تھے جہاں کرسمس سے متعلق سجاوٹ کا سامان اور تحفے تحائف موجود ہوتے اور ملکی اور غیر ملکی لوگوں کا ہجوم ہوتا جو خریداری میں مصروف ہوتے تھے۔ سمیر کو سب سے پرسکون جگہ وہاں کے ریسٹورنٹ ہی لگتے تھے۔

اس وقت بھی وہ جان ساؤتھ کنگشن کے ایک چھوٹے سے ریسٹورنٹ میں ناصر محمود کے ساتھ بیٹھا تھا کچھ ہی دیر میں کیرین وہاں پہنچنے والی تھی۔

”ہمیں یہاں آئے ہوئے ایک ہفتہ ہو گیا ہے لیکن بوریت کا احساس بالکل بھی نہیں ہوا۔“ ناصر نے اپنے کپ میں چائے انڈیلتے ہوئے کہا جو کچھ ہی دیر پہلے ویٹر نے وہاں لا کر رکھی تھی۔

”ہاں! اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے زیادہ وقت یہاں گھومنے پھرنے میں صرف کیا ہے۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو۔“ ناصر نے کہا پھر دوسرے کپ میں سمیر کے لیے بھی چائے انڈیل دی تھی اور اسی وقت کیرین ریسٹورینٹ میں داخل ہوئی تھی اور کاؤنٹر کلرک سے کچھ پوچھا تھا جس نے اس میز کی طرف اشارہ کیا تھا جہاں سمیر اور ناصر بیٹھے تھے۔

”میرا خیال ہے کیرین پہنچ گئی ہے۔“ ناصر نے سمیر سے کہا جو چائے کی چسکیاں لے رہا تھا۔ دوسرے ہی لمحے کیرین ان کی میز کے قریب کھڑی تھی۔

”کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟“ اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”میں کیرین ہوں۔“ ساتھ ہی اپنا مختصر سا تعارف کروایا۔

”ہاں ہاں ضرور! میں سمیر اور یہ ناصر محمود۔“ سمیر نے

اپنا تعارف کروایا۔

''ہم آپ ہی کے منتظر تھے۔''

''میں جانتی ہوں...... دراصل کام کی وجہ سے مصروفیت زیادہ تھی اس لیے آپ کو ایک ہفتہ انتظار کرنا پڑا میں کل ہی جان ساؤتھ کنکشن سے واپس آئی ہوں اور آج کی ہماری یہ ملاقات تو پہلے ہی طے ہو چکی تھی۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہاں تم ہمیں sir fargus makannan سے ملواؤ گی یہ بات پہلے ہی طے ہے۔'' ناصر محمود نے کہا۔

''جی! اس سے پہلے میں اپنا اطمینان کرنا چاہوں گی۔'' کیرین نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' سمیر نے جواب دیا۔

''میں آپ لوگوں سے اپنے اطمینان کے لیے چند سوالات کروں گی۔'' کیرین نے کہا تو سمیر اور ناصر نے اثبات میں سر ہلایا لیکن پھر جیسے ہی کیرین نے بولنے کے لیے منہ کھولا تھا وہ ساکت سی بیٹھی رہ گئی تھی سمیر اس کے دماغ کے اندر پہنچ چکا تھا۔ اس نے کیرین کے دماغ میں موجود وہ سارے سوالات پڑھ لیے تھے جو وہ ان دونوں سے کرنے والی تھی۔ زیادہ سوالات ان کے بائیو ڈیٹا (جو پہلے سے کیرین کے پاس موجود تھا) اور ان کی صلاحیتوں کے بارے میں تھے سوالات۔ پڑھ لینے کے بعد سمیر نے کیرین کے دماغ کو آزاد چھوڑ دیا تھا اور وہ چونک سی گئی تھی۔

''ہاں! میں کیا کہہ رہی تھی؟'' اس نے پوچھا۔

''آپ ہم سے کچھ سوالات کرنے والی تھیں۔'' سمیر نے کہا۔

''ہاں تو آپ تیار ہیں ان کے جوابات دینے کے لیے؟'' کیرین نے پوچھا۔

''بالکل تیار ہیں لیکن کیا یہ اچھا ہو اگر آپ سوالات کرنے میں وقت ضائع نہ کریں اور ہم سے براہ راست جوابات سن لیں۔'' سمیر نے کہا تو کیرین حیرت سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

''آپ جوابات سن لیں...... پھر بھی اگر کوئی بات رہ جائے تو پوچھ لیجیے گا۔'' سمیر نے کہا اور پھر کیرین کے سوالات کا انتظار کیے بغیر وہ شروع ہو گیا تھا اس نے اپنے تعارف کے ساتھ ساتھ ناصر محمود کا تعارف بھی کروایا تھا۔ اس کے پوائنٹس کیرین اپنے پاس موجود دستاویز سے ملاتی جا رہی تھی اس کے چہرے پر حیرت تھی پھر اس نے ناصر محمود کی غیر معمولی صلاحیتوں کا ذکر کیا تھا وہ خاموش ہو گیا تھا۔

''آپ کچھ اپنی صلاحیتوں کے بارے میں بتائیں گے؟'' کیرین نے پوچھا جسے حیرت تھی کہ اس کے ذہن میں موجود تمام سوالات کے جوابات سمیر نے بھرپور طریقے سے دیے تھے۔

''میری صلاحیتوں کے بارے میں کہنا قبل از وقت ہوگا ایک نمونہ تو آپ دیکھ چکی ہیں میں نے آپ کے ذہن میں موجود تمام سوالات کے جوابات دے دیے ہیں اور اب آپ کے ذہن میں کوئی اور سوال نہیں ہے۔'' سمیر نے بڑے اعتماد سے کہا۔

''ہاں! لیکن آپ کو یہ کیسے پتہ چلا کہ میں آپ سے کیا سوالات کرنے والی ہوں؟''

''یہی میری خاص صلاحیتوں میں سے ایک صلاحیت ہے۔'' سمیر نے جواب دیا۔

''میں اپنے سامنے موجود شخص کا ذہن پڑھ لیتا ہوں۔'' سمیر نے کہا۔

''حیرت انگیز۔'' کیرین نے کہا اس کے چہرے پر بے یقینی کے آثار نظر آ رہے تھے۔

''ایسی اور بہت سی صلاحیتیں آپ پر مستقبل میں آشکار ہوتی رہیں گی۔'' سمیر نے مسکرا کر کہا۔

''میرا خیال ہے کہ کل ہم ''میک'' سے ملنے اسکاٹ لینڈ روانہ ہو جائیں گے جہاں وہ اپنے عالیشان قلعے میں ہمارا استقبال کرے گا۔'' کیرین نے کہا۔

''میک؟'' ناصر محمود نے سوالیہ انداز میں کہا۔

''ہاں! سر فرگس میکینن کو ہم سب ''میک'' کہتے ہیں وہ اس نام سے پکارا جانا پسند کرتا ہے۔'' کیرین نے کہا تو ناصر نے اثبات میں سر ہلایا۔

''رات تو ہونے والی ہے کیا ہم ساتھ کھانا کھا سکتے ہیں؟'' سمیر نے کیرین سے پوچھا۔

''ہاں! کیوں نہیں...... میرا خیال ہے اس میں کوئی

مضائقہ نہیں ہے۔" کیرین نے چند لمحے سوچنے کے بعد جواب دیا تھا اور سمیر مسکرا دیا تھا اور پھر اس نے ویٹر کو اشارہ کر کے بلایا تھا جو ان کے کھانے کا آرڈر نوٹ کر کے لے گیا تھا۔ وہ پھر باتوں میں مصروف ہو گئے تھے اب باری کیرین کی تھی اور وہ اپنے بارے میں ناصر اور سمیر کو بتا رہی تھی۔

"میرے والد بچپن میں ہی فوت ہو گئے تھے پھر میری والدہ نے مجھے پالا پوسا اور تعلیم دلوائی۔ گریجویشن کے بعد ہی میں نے "میک" کی ملازمت اختیار کر لی تھی اور تقریباً دو سال سے اس کی خدمات انجام دے رہی ہوں۔" کیرین نے کہا۔

"میک کیسا آدمی ہے؟" ناصر نے پوچھا۔

"وہ بہت ملن سار، دوسروں کی عزت کرنے والا اور ہمدرد انسان ہے۔ باقی تم اس سے ملنے کے بعد خود ہی جان جاؤ گے۔" کیرین نے کہا۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد طے پایا تھا کہ وہ دونوں کیرین کو اس کی رہائش گاہ تک چھوڑ کر واپس ریسٹورنٹ آ جائیں گے جہاں ان کا قیام تھا لیکن پھر ناصر نے ساتھ جانے سے معذرت کر لی تھی اور سمیر ہی کیرین کو چھوڑنے اس کے ساتھ گیا تھا جہاں گھر پہنچنے کے بعد کیرین نے اندر آنے کی دعوت دی تھی اور وہ اس کی دعوت پر اس کے گھر میں داخل ہو گیا تھا جہاں اس کی ملاقات کیرین کی والدہ سے ہوئی تھی جو ستر سال کی مضبوط اعصاب والی خاتون تھیں وہ سمیر سے مل کر بہت خوش ہوئی تھیں۔ کیرین نے اسے چائے کی دعوت دے ڈالی تھی جسے سمیر نے قبول کر لیا تھا۔

"آؤ میرے ساتھ کچن میں آ جاؤ۔" کیرین نے کہا تو سمیر اس کے ساتھ اس کے کچن میں چلا گیا تھا۔

"تمہیں سیاست سے کوئی دلچسپی ہے؟" کیرین نے پوچھا۔

"کچھ خاص نہیں۔" سمیر نے جواب دیا۔

"کیوں تم نے یہ کیوں پوچھا؟"

"یونہی! دراصل آج کل تمہارے ملک کے حالات بہتر نہیں اس پر تم کیا کر سکتے ہو؟"

"میرے ملک کے حالات خدا کا شکر ہے کہ ٹھیک ہیں ہمیں کوئی مسئلہ نہیں۔" سمیر نے جواب دیا۔

"نہیں میرا مطلب ہے کہ جگہ جگہ دہشت گردی ہو رہی ہے، دہشت گردوں کے خلاف ضرب غضب چل رہا ہے...... یہ سب کیا ہے؟" کیرین نے پوچھا۔

"کچھ تو ہوتا ہے اور کچھ بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے۔" سمیر نے کہا۔

"لیکن بڑھا چڑھا کر کون پیش کرتا ہے؟" کیرین نے فوراً دوسرا سوال کیا تو سمیر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اسے اپنے ملک کے حالات پر کیرین کے ایسے چبھتے ہوئے سوالات پسند نہیں آئے تھے۔

"کیرین! کیا ہم کسی اور موضوع پر بات نہیں کر سکتے؟" سمیر نے ناگواری سے کہا تو کیرین خاموش ہو گئی پھر چائے بنا کر وہ ڈرائنگ روم میں آ گئی تھی سمیر بھی اس کے ساتھ ہی تھا۔

"میرے سوالات کرنے کا مقصد تمہیں پریشان کرنا یا ناراض کرنا نہیں تھا سمیر۔" کیرین نے وضاحت کی۔

"دراصل اب تو ساری دنیا میں ہی یہ موضوع عام ہو چکا ہے۔"

"ہاں تم ٹھیک کہتی ہو لیکن اس پر پھر کبھی بات کریں گے۔" سمیر نے اپنا چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے کہا اور ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

"کیرین...... تم نے بہت سے قلم کاروں کے ساتھ کام کیا ہوگا میک کی نگرانی میں؟" سمیر نے پوچھا۔

"ہاں! میک ایک بہت بڑا پبلشر بھی ہے اور میں نے بہت سے لوگوں کے ساتھ اس کی نگرانی میں کام کیا ہے۔"

"تو تم نے بعض اوقات ایسے مسودات بھی دیکھے ہوں گے جو بہت اہم نوعیت کے ہوتے ہوں؟"

"ہاں! ایسا اکثر ہوتا ہے جب کوئی قلم کار کسی نئی کتاب پر کام کر رہا ہوتا ہے کسی نئے آئیڈیے پر تو ہم اکثر اس کو راز میں رکھتے ہیں بلکہ بعض اوقات میں اپنے لندن والے آفس کو بھی اس بارے میں نہیں بتاتی کیونکہ جب کوئی نئی کتاب لکھی جا رہی ہوتی ہے تو بہت سے موڑ آتے ہیں جن میں کچھ بے کار ہوتے ہیں کچھ کارآمد اور بہت زیادہ تراش خراش کے بعد کوئی معیاری کتاب سامنے آتی ہے۔" کیرین نے تفصیل سے بتایا۔

''اگر میں تمہیں کچھ بتاؤں؟ یا دکھاؤں؟ تو تم اسے راز رکھ سکوں گی؟ کسی کو بتاؤ گی تو نہیں؟''

''ہاں بالکل...... تم مجھ پر اعتماد کر سکتے ہو۔'' کیرین نے کہا لیکن وہ سوچ رہی تھی کہ بھلا ایسی کیا بات ہے جو سمیر اسے بتانا چاہتا ہے اور راز بھی رکھنا چاہتا ہے۔

''اپنی کرسی میرے قریب لے آؤ۔'' سمیر نے کہا اور کیرین اپنی کرسی بالکل اس کے سامنے لے آئی اب وہ دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے۔

''بس! اب میں چاہتا ہوں تم اپنی کرسی پر پرسکون بیٹھی رہو اور میری طرف دیکھو اور اپنے ذہن کو ہر قسم کی سوچ سے آزاد کردو میری طرف سے پریشان مت ہو میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا میں صرف چند منٹ لوں گا اگر تمہیں کچھ غنودگی محسوس ہو تو پریشان مت ہونا۔''

''اگر کچھ گڑبڑ ہوگئی تو کیا ہوگا؟'' کیرین نے کہا۔

''مجھ پر بھروسہ کرو کچھ غلط نہیں ہوگا۔'' سمیر نے کہا اور کیرین نے اثبات میں سر ہلا دیا اسے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ سمیر کیا کرنے والا تھا لیکن اسے تجربے سے گزرے بغیر وہ کچھ جان بھی نہیں سکتی تھی۔

وہ اپنی کرسی میں ٹیک لگا کر سکون سے بیٹھ گئی اور اس نے سمیر کی طرف دیکھنا شروع کردیا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی کشش تھی کچھ ہی دیر بعد کیرین پر غنودگی چھانے لگی اور وہ سوچنے لگی کہ کیا سمیر اسے ہپناٹائز کر رہا ہے وہ اپنی آنکھیں بند نہیں کرنا چاہتی تھی اس نے بڑی مشکل سے آنکھیں کھلی رکھی تھی پھر اچانک ہی سمیر اس کی نظروں سے اوجھل ہوگیا کمرے میں موجود دوسری چیزیں بھی غائب ہوگئیں اب اس کے سامنے بہت سی کتابیں تھیں جو ہاتھ سے لکھی ہوئی تھیں وہ کرسی سے کھڑی ہوگئی اور کمرے کی کھڑکی سے باہر جھانکا جہاں ایک ریلوے اسٹیشن کا منظر نظر آ رہا تھا ایک ٹرین آ کر رکی تھی۔

جس میں سے دو خواتین اتری تھیں جنہوں نے پرانے فیشن کے کپڑے پہنے ہوئے تھے کیرین کھلی ہوئی آنکھوں سے جیسے خواب دیکھ رہی تھی وہ خود اس منظر کا حصہ بن گئی تھی۔ اس نے ایک عورت کو مخاطب کرنے کی کوشش کی لیکن یوں لگا جیسے اس عورت نے اس کی آواز سنی ہی نہ ہو یا وہ وہاں کیرین کی موجودگی سے آگاہ ہی نہ ہو۔ کیرین نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور انہیں ہاتھوں سے ملنے لگی پھر اس نے اپنے اطراف کا جائزہ لیا اب وہ منظر غائب ہو چکا تھا سمیر اس کے سامنے موجود تھا۔

''کیا خیال ہے؟'' سمیر نے پوچھا۔

''کیا مطلب؟ کیا تم نے مجھے ہپناٹائز کردیا تھا؟'' کیرین نے پوچھا۔

''کسی حد تک تم یہ کہہ سکتی ہو لیکن دراصل یہ کھلی آنکھوں سے خواب دیکھنا کہلاتا ہے۔''

''اوہ تم یہ بھی کر سکتے ہو؟''

''ہاں! اس کیفیت میں جانے والا شخص اپنے ہی ماضی کی یادوں کو جاگتی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔''

''بہت خوب! میرا خیال ہے میک تم سے مل کر بہت خوش ہوگا اسے ایسے لوگوں سے ملنے کا بہت شوق ہے جو کچھ خداداد صلاحیتیں رکھتے ہیں۔''

''میں میک کے بارے میں مزید جاننا چاہتا ہوں تاکہ اس سے ملوں تو اس کی شخصیت میرے لیے اجنبی نہ ہو۔'' سمیر نے کہا۔

''ضرور! اتفاق سے میرے پاس اس وقت اس کی ایک کتاب کا مسودہ موجود ہے وہ اپنے ہی بارے میں لکھ رہا ہے اس سے تمہیں بہت معلومات مل جائیں گی تم وہ اپنے ساتھ لے جاؤ پھر کل تو ہم ساتھ ہی اسکاٹ لینڈ کے لیے روانہ ہوں گے تم مجھے کل واپس کردینا۔'' کیرین نے کہا اور اپنی الماری سے نکال کر ایک فائل اسے پکڑا دی۔

''ٹھیک ہے' یہ بہت اچھا ہوگیا...... میں تمہیں کل یہ مسودہ واپس کردوں گا۔'' سمیر نے کہا پھر وہ کیرین سے رخصت ہوکر واپسی کے لیے روانہ ہوگیا تھا۔

ریسٹورنٹ پہنچنے کے بعد ناصر نے اس سے کیرین کے بارے میں کوئی استفسار نہیں کیا تھا سمیر نے کل کی روانگی کے بارے میں تفصیلات بتائی تھیں اور سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلا گیا تھا پھر سونے سے پہلے اس نے میک کا مسودہ بھی پڑھا تھا اور اس پر میک کی شخصیت کے بہت پہلو آشکار ہوگئے تھے۔

میک حال میں آرمی سے ریٹائر ہوا تھا اور اسکاٹ لینڈ کے مغربی کنارے پر فورٹ ولیم کے قریب ایک قلعے میں رہتا تھا۔ اس نے آرمی میں انٹیلی جنس کے شعبے میں کام کیا

تھا بہت سے ملکوں کے دورے کیے تھے وہ اسپینی' پرتگالی' روسی' انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو بھی مہارت سے بول سکتا تھا۔ اس نے دوسرے ملکوں کی ملٹری کے ساتھ بھی کام کیا تھا اور ریٹائر ہونے کے بعد اسے سیکورٹی سروس میں لے لیا گیا تھا۔ جو سیکورٹی M-15 کے نام سے جانی جاتی تھی۔ یہ ایک اندرونی سیکورٹی سروس تھی اور یونائیٹڈ کنگ ڈم کے اندر سیکورٹی کو یقینی بناتی تھی اس کا مقصد ایسی قوتوں کو اپنے ملک میں تحفظ دینا تھا جو سیاسی اور معاشی طور پر ملک کو نقصان پہنچانا چاہتی ہوں۔

سمیر کو میک کے بارے میں اس مسودے سے کافی معلومات ملی تھیں اور جو سوال اس کے ذہن میں رہ گئے تھے انہیں اس نے میک سے ملاقات کے وقت تک کے لیے اٹھا رکھا تھا۔ دوسرے روز وہ ناصر اور کیرین کے ساتھ اسکاٹ لینڈ کے لیے روانہ ہو گیا تھا انہوں نے یہ سفر ٹرین سے کیا تھا اور اسٹیشن پر میک خود اپنی عالی شان کار میں انہیں لینے آیا تھا۔

"تم کیسی ہو کیرین سفر کیسا رہا؟" میک نے کیرین سے پوچھا۔

"بہت اچھا!" کیرین نے جواب دیا۔

"یہ سمیر اور ناصر ہیں جو پاکستان سے آئے ہیں۔" کیرین نے ان کا تعارف کروایا۔

"میں تم دونوں کو خوش آمدید کہتا ہوں۔" میک نے خوش دلی سے کہا۔ پھر اس نے سمیر اور ناصر کی مدد سے ان کے سوٹ کیس اپنی کار میں رکھوائے تھے کیرین اگلی سیٹ پر اس کے ساتھ بیٹھی تھی اور سمیر ناصر کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا اور میک نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی تھی۔

"کیرین نے بتایا کہ تم دونوں جان ساؤتھ کنگشن میں ٹھہرے ہوئے تھے۔" میک نے پوچھا۔

"ہاں! وہ اچھی جگہ ہے۔" سمیر نے کہا۔ پھر راستے میں وہ ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے تھے۔ کچھ ہی دیر میں وہ میک کے قلعے میں پہنچ گئے تھے جسے بڑے قرینے سے سجایا گیا تھا ہر چیز قرینے سے سجی ہوئی تھی۔

"آؤ میں تم لوگوں کو تمہارے کمرے دکھا دوں۔" میک نے کہا۔

"تم لوگ فریش ہو جاؤ تو میں گریٹ روم میں تمہارا انتظار کروں گا جہاں ہم ڈنر کریں گے اور چائے پئیں گے۔" میک نے کہا وہ انہیں اوپری منزل میں لے گیا تھا اور باری باری سب کو ان کے کمرے دکھائے تھے۔

ٹھیک آدھا گھنٹے بعد وہ لوگ گریٹ روم' میں جمع ہو گئے تھے کمرے کی دیواروں پر نامور فوجیوں کی تصویریں لگی تھیں اور جگہ جگہ شکار کیے گئے جانوروں کے سر آویزاں تھے کمرے کی مغربی دیوار میں ایک آتش دان موجود تھا جس میں آگ روشن تھی اور کمرے کے درمیان میں صوفے ارینج کیے گئے تھے جن کے بیچ میں ایک ٹیبل تھی ایک ریوالور کے ساتھ کئی شیلف رکھے تھے جن میں بہت سی کتابیں ترتیب سے سجی ہوئی تھیں اور ایک دیوار کے ساتھ بڑی سی ڈائننگ ٹیبل رکھی تھی جس کے گرد چار کرسیاں رکھی تھیں۔

"یہ سب کتنا اچھا لگ رہا ہے۔" کیرین نے کہا۔

"ہاں! یہ یہاں کے مالک کے ذوق کی عکاسی کرتا ہے۔" سمیر نے جواب دیا۔

"تم نے دیکھا میک کتنا دوست نواز ہے۔" کیرین نے سمیر سے کہا۔ ناصر کتابوں کے شیلف میں کتابوں کا جائزہ لے رہا تھا اس وقت میک کمرے میں داخل ہوا۔

"میرا خیال ہے آپ لوگ پہلے کوئی مشروب لینا پسند کریں گے۔" اس نے پوچھا۔

"کیوں نہیں ضرور!" کیرین نے کہا۔

"اسی لمحے ایک ملازم ایک ٹرالی میں مختلف قسم کے مشروبات رکھے کمرے میں داخل ہوا۔

"ویسے تو بہترین قسم کا روسٹ تیار ہے لیکن کیوں نہ ہم لوگ مشروبات لینے کے دوران کچھ خوش گپیاں کر لیں بعد میں کھانا تناول کریں گے؟" میک نے کہا۔

"ہاں یہ آئیڈیا اچھا ہے۔" ناصر محمود نے کہا اور ایک صوفے پر بیٹھ گیا اس کی تقلید میں سمیر بھی اس کے برابر بیٹھ گیا تھا پھر ملازم نے سب کی پسند کے مطابق انہیں مشروبات پیش کیے تھے۔

"مجھے تم سے کتاب کے بارے میں بات کرنا ہے کیرین۔ لیکن یہ ہم کل بھی تو کر سکتے ہیں سمیر کے بارے میں سب جاننا چاہتا ہوں۔" میک نے کہا جس پر سمیر اور

ناصر نے اپنے بارے میں مختصری معلومات دیں خود میک نے بھی اپنے بارے میں بتایا۔ اس کے بعد ڈنر کا آغاز ہوگیا تھا۔ میک نے روسٹ بیف کے ساتھ ساتھ ویجی ٹیبل بھی رکھی تھی سب نے اپنی پلیٹوں میں کھانا لے لیا تھا اور باتوں کے دوران کھانا کھا رہے تھے کھانے کے بعد کیرین نے خوشی کا اظہار کیا تھا۔

"بہت اچھا کھانا تھا۔" کیرین نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"سمیر! میں کل صبح ناشتے سے پہلے واک پر جاؤں گا تو تم میرے ساتھ چلنا مجھے تم سے کچھ باتیں کرنا ہیں۔" میک نے کیرین کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" سمیر نے جواب دیا پھر وہ لوگ اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے تھے۔ دوسری صبح سمیر اپنی عادت کے مطابق جلدی اٹھ گیا تھا اور فریش ہونے کے بعد گریٹ روم میں پہنچ گیا تھا جہاں میک اس کا منتظر تھا اس نے ٹریک سوٹ پہنا ہوا تھا۔

"میں سمجھ رہا تھا کہ تمہارا انتظار کرنا پڑے گا۔" میک نے کہا۔

"میں بھی صبح جلدی اٹھنے کا عادی ہوں اور جاگنے کے بعد بستر پر لیٹا نہیں جاتا۔" سمیر نے ہنستے ہوئے کہا۔

"چلو...... باقی باتیں پھر کریں گے۔" میک نے کہا اور سمیر کے ساتھ قلعے کے صدر دروازے کی سڑک کے کنارے کنارے گھنے درخت لگے ہوئے تھے جو آگے چل کر گھنے ہوگئے تھے پھر بھاگتے بھاگتے میک ایک جگہ رک گیا اور سائڈ میں لگی لکڑی کی بینچ پر بیٹھ گیا۔

"آؤ سمیر! کل سے تم سے کوئی بات نہیں ہوسکی ہے اب کام کی بات کرلیں۔" میک نے کہا تو سمیر اس کے قریب بیٹھ گیا۔

"میں جانتا ہوں کہ تمہارے اندر کیا غیر معمولی صلاحیتیں ہیں مجھے کامران خلیل کی کہی ہوئی باتوں پر پورا بھروسہ ہے اور اگر اس نے تمہیں میرے پاس بھیجا ہے تو کئی لوگوں میں سے منتخب کرکے بھیجا ہوگا۔ اس نے مجھے تمہارے اور ناصر کے بارے میں انفارم کردیا تھا۔"

"میں کام کی نوعیت جاننا چاہتا ہوں؟" سمیر نے کہا۔

"بات دراصل یہ ہے سمیر میں برطانیہ کے مستقبل کے بارے میں فکر مند ہوں...... میرا مطلب ہے کہ میں اسکاٹ لینڈ کے اس قلعے میں پرسکون اور تنہا زندگی گزار رہا ہوں اور ریاست کے معاملات سے بہت دور ہوں لیکن میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ برطانیہ میں ہمارا طرز زندگی بدلتا جارہا ہے اور یہ تبدیلی اچھی تبدیلی نہیں ہے ایسا لگتا ہے کہ ہمیں اپنے معاملات پر کنٹرول نہیں رہا ہے۔" میک نے کہا۔

"یہ کیسے کہا جاسکتا ہے؟" سمیر نے پوچھا۔

"شاید میں ریٹائر ہونے کے بعد شکی مزاج ہوگیا ہوں اور ہر بات پر فکر کرنے لگتا ہوں۔" میک نے کہا۔

"نہیں...... ایسا نہیں ہے...... آپ اپنے ملک سے محبت کرتے ہو اور اس کی بہتری کے لیے سوچتے ہو اس میں کوئی حرج نہیں ہے آپ کا مسئلہ شاید یہ ہے کہ آپ خود کو اکیلے اس قابل نہیں سمجھتے کہ اس سلسلے میں کچھ کرسکو۔"

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو...... ایسا ہی ہے اور میں تقریباً ناامید ہوچکا ہوں۔" میک نے کہا۔

سمیر اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے اس کی بات مکمل ہونے کا انتظار کررہا ہو۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ میک کے دماغ میں کیا چل رہا تھا وہ چاہتا تھا کہ میک خود ہی ساری بات بتادے۔

"کیا تم ایک ایسی تنظیم کا حصہ بننا پسند کروگے جس نے اس ملک کے حالات بدلنے کا ارادہ کرلیا ہے۔" میک نے کہا۔

"کیسی تنظیم؟"

"تم نے میرے بارے میں کیرین سے ایک مسودہ لے کر پڑھا تھا میرے بارے میں جاننے کے لیے وہ مجھے بتارہی تھی۔"

"ہاں! میں نے سفر کے دوران پڑھا تھا۔"

"تو پھر تمہیں میرے آرمی تعلق، ڈپلومیٹک سروس اور انٹیلی جنس سروس کے بارے میں تو پتہ چل ہی گیا ہوگا۔"

"ہاں! میں جانتا ہوں۔ ایک دل چسپ کہانی ہے لیکن اس مسودے کو پڑھنے سے مجھے محسوس ہوا جیسے آپ کی ریٹائرمنٹ سے کوئی ناگوار یاد وابستہ ہے؟"

"بہت خوب! حالانکہ میں نے کہیں بھی کھل کر اس کا ذکر نہیں کیا لیکن پھر بھی تم نے محسوس کرلیا...... بہت

خوب۔" میک نے تعریفی انداز میں کہا۔

"میرا زیادہ تر وقت MIS میں گزرا مجھے اپنے ملک کی خدمت پر ناز ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ میں ایک اچھا کام کر رہا ہوں لیکن اب جب ہم انجام کی طرف جا رہے ہیں تو چیزوں میں تبدیلی آتی جا رہی ہے۔" میک اتنا کہہ کر کچھ دیر کے لیے رک کر سمیر کو دیکھنے لگا لیکن سمیر نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

"کچھ دنوں سے میں محسوس کر رہا ہوں کہ ایک نمایاں تبدیلی آ رہی ہے۔ جس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گورنمنٹ سیاسی دباؤ ڈال رہی ہے اور MIS کو پرائیویٹ آرمی کے طور پر استعمال کرنا چاہتی ہے اس سلسلے میں کچھ قوانین کا بھی خیال نہیں کیا جا رہا اور منسٹرز اور سیاست دانوں کے لیے حالات کو ناساز بنایا جا رہا ہے اور اسٹیبلشمنٹ کو سپورٹ کیا جا رہا ہے۔"

"اسٹیبلشمنٹ" سے آپ کی کیا مراد ہے؟"

"طاقت کا سرچشمہ وہ لوگ جو ملک کو طاقت فراہم کرتے ہیں۔ وہ لوگ جو اہم فیصلے کرتے ہیں۔"

"لیکن یہ ایک جمہوری ملک ہے۔"

"مجھے یقین نہیں ہے کہ یہ ملک کبھی بھی خالصتاً ڈیموکریٹک رہا ہے اور خاص طور پر چند سالوں سے تو بالکل بھی نہیں۔"

"تمہیں پتہ ہے ایک چوتھائی سے زیادہ لوگوں نے ایک سیاسی جماعت کو ووٹ دیئے ہیں۔ جواب گورنمنٹ بنا رہی ہے۔" میک نے کہا۔

"اس میں ایسے لوگ شامل ہیں جو ہماری زندگیوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔"

"وہ کون لوگ ہیں؟"

"وہ لوگ جن کے پاس کافی پیسہ ہے اور وہ اثر اندازی کا خرچ برداشت کر سکتے ہیں۔ فنانس سے تعلق رکھنے والے لوگ' بینکرز' بزنس مین' میڈیا جس کے بڑے حصے کو پیسے ہی کے ذریعے کنٹرول کیا جاتا ہے۔ کافی رقم باہر سے آتی ہے۔"

"میں تم سے اتفاق کرتا ہوں...... لیکن آپ کی طرح کھل کر بات نہیں کرنا چاہتا...... آپ نے ایک تنظیم کا ذکر کیا تھا جو تبدیلی لانے کے لیے کام کر رہی ہے؟" سمیر نے پوچھا۔

"میں اسی طرف آ رہا ہوں۔" میک نے کہا۔

"میں سمجھتا ہوں کہ MIS میں کچھ تبدیلیاں آ رہی ہیں اور اس کا ایک حصہ اس کے مقاصد کے خلاف کام کر رہا ہے۔ اس لیے ہم نے MIS Black Operation کا نام دیا ہے۔"

"وہ کیا کام کر رہا ہے؟"

"وہ طاقت چند لوگوں کے ہاتھ میں رکھنا چاہتے ہیں اور انہیں اس سے بھی کوئی سروکار نہیں کہ ان کی وجہ سے گورنمنٹ بدنام ہو رہی ہے۔"

"وہ کس طرح کام کرتے ہیں؟"

"وہ لوگوں کو اغوا کر لیتے ہیں اور بعض کیسوں میں تو انہوں نے غیر ملکیوں کو غائب کر کے کہہ دیا ہے کہ وہ غیر ملکی جاسوس ہیں جو ہمارے ملک کے خلاف کام کر رہے تھے اور انہیں ان کی حکومتوں نے بھیجا تھا۔ اس سے ہمارے تعلقات دوسرے ملکوں سے خراب ہو رہے ہیں۔" میک نے وضاحت کی۔

"گندی سیاست۔" سمیر بڑبڑایا۔

"کیا آپ بھی ایسے آپریشن میں شامل ہیں؟" سمیر نے پوچھا۔

"نہیں جب مجھے احساس ہوا کہ یہ غلط کام ہو رہا ہے تو میں نے اپنی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ بعد میں یہ راز افشاں کردوں گا کہ یہاں کیسا گندہ کھیل کھیلا جا رہا ہے لیکن پھر جب میں نے ان لوگوں کا انجام دیکھا جنہوں نے اس راز کو کھولنے کی کوشش کی تھی تو اپنا ارادہ بدل دیا اور ملازمت چھوڑنے کے بعد اب میں باہر رہ کر اس کی بہتری کے لیے کام کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیا اب تک آپ نے کچھ کیا؟"

"نہیں، لیکن جو کچھ ہو رہا ہے اس پر میں نے نگاہ رکھی ہوئی ہے میرے کچھ جاننے والے ہیں جو مجھے معلومات فراہم کرتے ہیں اور میرے ہم خیال ہیں۔"

"کیا آپ اب بھی اپنے ملازمت کے دنوں کے دوستوں سے رابطے میں ہو؟"

"ہاں...... کچھ لوگوں سے، لیکن ہم احتیاط کرتے ہیں اور چھپ کر ملتے ہیں کیونکہ اگر کسی کو شک ہو گیا تو ان کی

ملازمت ختم ہو سکتی ہے، ہم پبلک مقامات پر کسی ریسٹورنٹ میں ملتے ہیں یا سفر کرتے ہوئے مسافروں کی طرح ٹرین، بس اسٹاپ پر۔“

”MIS کی بلیک آپریشن برانچ کس طرح کام کرتی ہے؟“

”ان کے بہت سے ذرائع ہیں MIS میں بھی اور باہر بھی۔“

”باہر سے آپ کی مراد کیا ہے؟“

”ایسے لوگ جو کسی نہ کسی کام کے ماہر ہوتے ہیں اور پیسے دے کر کچھ بھی کر سکتے ہیں۔“

”یہ بڑی حیرت کی بات ہے کہ آپ پیسے دے کر اتنے لوگوں کو اپنے گرد جمع کر لو اور ان سے کام بھی کرواؤ۔“

”آرمی یہ کام کافی عرصے سے کر رہی ہے وہ کسی بھی سیدھے سادے انسان کو سڑک سے اٹھا لیتے ہیں اور چند ہی مہینوں میں اسے ایک کلنگ مشین بنا دیتی تھی...... اس میں صرف ٹریننگ اور نفسیاتی سوچ بدلنا ہوتی ہے۔ MIS بلیک آپریشن یہی کام کر رہی ہے وہ دہشت گرد پیدا کر رہی ہے ان سے کام کروا رہی ہے اور دوسرے ممالک پر الزام لگا رہی ہے۔“ میک نے کھل کر کہا۔

”کیا اصل Official MIS کو اس کا علم ہے؟“

”شاید، لیکن وہ اسے کچھ رقم دیتے ہیں اخراجات کے لیے لیکن اس کے کاموں میں مداخلت نہیں کرتے اور بلیک آپریشن کو تمام آپریشن contract level پر دیئے جاتے ہیں۔“

”مجھے حیرت ہو رہی ہے کہ انہیں پیسہ کیوں فراہم کیا جاتا ہے؟“ سمیر نے کہا۔

”یہ ان کی official funding کا حصہ ہے انہیں additional activities کے لیے فنڈ دیا جاتا ہے۔“

”لیکن اس پر ایک سوالیہ نشان ہے؟“ سمیر نے کہا۔

”اسے مختلف شکلوں میں دیا جاتا...... امدادی سامان، پیسہ، عطیات۔“

”عطیات؟“

”ہاں! یہاں بہت سے لوگ ہیں جو ایک تنظیم کو سپورٹ کرنا پسند کرتے ہیں جو اسٹیبلشمنٹ کی power کو بڑھاتی ہو۔“

”کیا آپ کوئی مثال بتا سکتے ہیں MIS بلیک آپریشن کے کام کی؟“

”ہاں تم نے GCHQ کے بارے میں سنا ہے؟“ میک نے پوچھا۔

”ہاں govt. communication head quarters“ سمیر نے جواب دیا۔

”دراصل وہ سیکورٹی سروس کا تیسرا ہاتھ ہے ان کا کام معلومات کمیونیکیشن کے ذریعے جمع کی جائے۔ وہ اپنے کام کے لیے زیادہ تر ریڈیو استعمال کرتے ہیں لیکن آج کل انٹرنیٹ اور فون بھی استعمال ہوتے ہیں۔ پچھلے دنوں ماسکو میں ایک ٹرانسلیٹر برطانوی ایمبسی میں کام کرتا تھا جو KCB کے معاملات کو رد کرتا تھا وہ اپنا کام ختم کر کے یہاں آیا تو اسے envestigation کے لیے گرفتار کر لیا گیا۔“

”مجھے یاد نہیں کہ میں نے اخبارات میں اس بارے میں کچھ پڑھا ہو؟“ سمیر نے کہا۔

”نہیں...... سیکورٹی سروس نے اسے خفیہ رکھا تھا...... اس شخص نے انہیں بہت سے راز دیئے۔“

”پھر...... پھر کیا ہوا؟“

”پھر ایک روز وہ جیل میں مردہ پایا گیا اسے دل کا دورہ پڑ گیا تھا۔“

”کیا اس غیر قانونی کام کا آپ کے پاس کوئی ثبوت ہے۔ جو ذمہ داروں کو دکھایا جا سکے؟“

”یہی تو مسئلہ ہے...... ایسے آپریشن میں کوئی ثبوت نہیں چھوڑ کر جاتا۔ وہ سب نشانات مٹا دیتے ہیں۔“

”اگر آپ کچھ کرنا چاہو؟“

”ناممکن! اگر ان کو مجھ پر ذرا سا بھی شبہ ہو گیا تو وہ میرا کام تمام کر دیں گے۔“

”میرا خیال ہے میں آپ کی بات سمجھ سکتا ہوں۔“ سمیر نے کہا۔

”میں اس ظلم کے خلاف لڑنا چاہتا ہوں اور مظلوم لوگوں کی مدد کرنا چاہتا ہوں لیکن خود کو بھی محفوظ رکھنا چاہتا ہوں میرے کچھ ہم خیال بھی میرے ساتھ ہیں ان میں ایک شخصیت ایسی بھی ہے کہ اگر وہ چاہے تو ان میں سے

http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

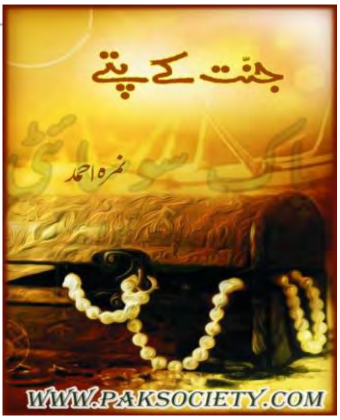
جنّت کے پتے
نمرہ احمد
WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
مصحف
نمرہ احمد
www.Paksociety.com

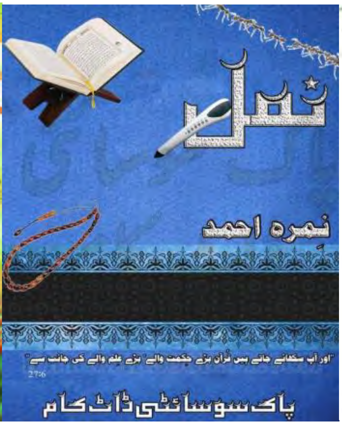
نمل
نمرہ احمد
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

آبِ حیات
عُمیرہ احمد
WWW.PAKSOCIETY.COM

ہم سفر
فرحت اشتیاق
http://www.paksociety.com

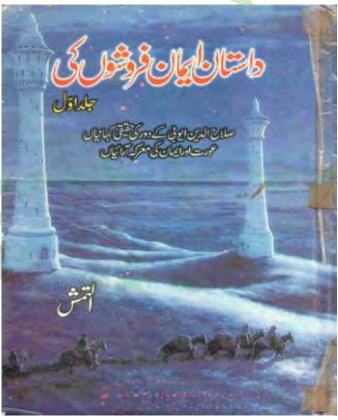
داستان ایمان فروشوں کی
جلد اول
التمش

بن روئے آنسو
فرحت اشتیاق
www.paksociety.com

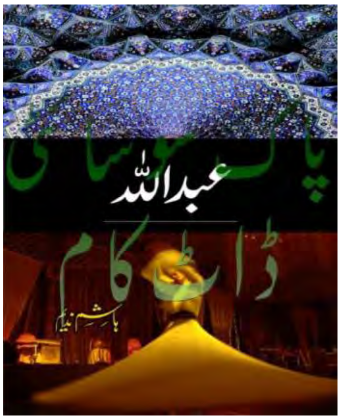
عبداللہ
ہاشم ندیم

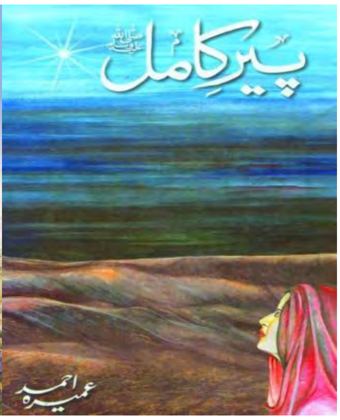
پیرِ کامل
عمیرہ احمد

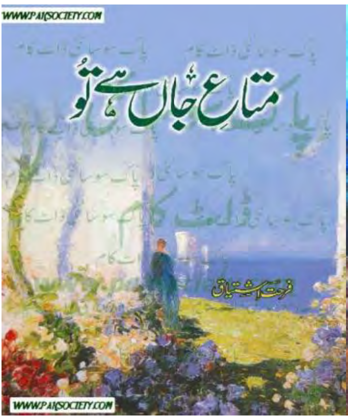
WWW.PAKSOCIETY.COM
متاعِ جاں ہے تو
فرحت اشتیاق
WWW.PAKSOCIETY.COM

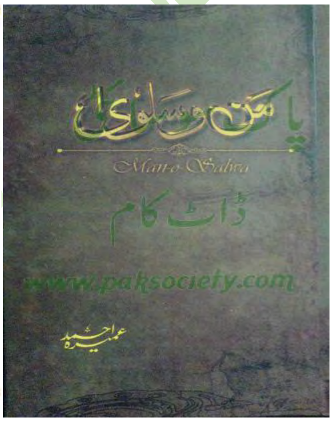
من و سلویٰ
Man-o-Salwa
www.paksociety.com
عمیرہ احمد

جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو
فرحت اشتیاق
WWW.PAKSOCIETY.COM

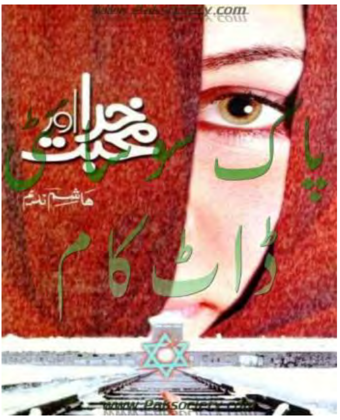
خدا اور محبت
ہاشم ندیم

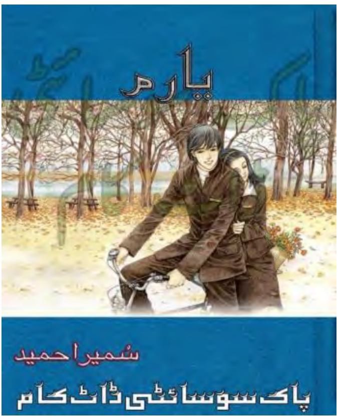
بارش
شمیرا حمید
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

ٹوٹا ہوا تارہ
سمیرا شریف طور
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

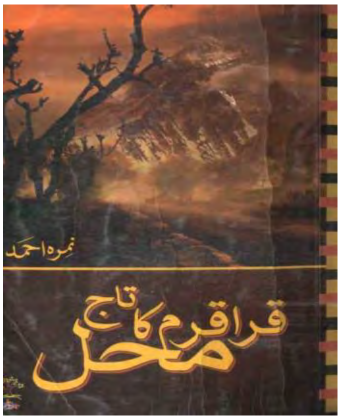
نمرہ احمد
قراقرم کا تاج محل

بہترین عہدے داروں کو ملازمت سے نکال دے۔"

"وزیراعظم کو بھی؟"

"ہاں!" میک نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیا کوئی شاہی خاندان کا فرد ہے؟"

"وزیراعظم کو کن عہدہ سے برخاست کرسکتا ہے؟" میک پھر مسکرایا اور سمیر نے حیرت سے سیٹی بجائی۔

"گویا آپ نے اس سسٹم سے لڑنے کا فیصلہ کرلیا ہے؟" سمیر نے کہا۔

"ہاں...... اور تمہاری مدد کے ساتھ...... میرا خیال ہے کہ ہمارا کام بہت آسان ہوجائے گا۔"

"ہوں...... سمیر نے بامعنی ہنکارا ابھرا۔

"ہم اسے آپریشن چیک میٹ کہیں گے۔" میک نے کہا۔

"ہمارا کام ہوگا کہ ایسے لوگوں کو پہچانیں اور ان کے منصوبے ناکام بنائیں اور ان سے دور رہ کر یہ کام کریں اور ان سے زیادہ ذہانت اور طاقت کا مظاہرہ کریں۔

"میرا خیال ہے کہ تمہاری خداداد صلاحیتیں ہمارے بہت کام آسکتی ہیں تم ہمیں MIS بلیک آپریشن کے رازوں سے آگاہ کرسکتے ہو میں تمہاری صلاحیتوں سے واقف ہوں مجھے کامران خلیل نے تمہارے بارے میں سب کچھ بتادیا تھا۔"

"مجھے آپ کی مدد کرکے خوشی ہوگی اور کوشش کروں گا کہ آپ کو مایوس نہ کروں۔"

"تم اور سوچ لو آج رات کھانے پر مجھے قطعی فیصلہ بتادینا۔" میک نے کہا۔

"ٹھیک ہے...... یہ ہمارے لیے ایک بڑا چیلنج ہوگا۔" سمیر نے کہا۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں واپس قلعے میں پہنچ گئے تھے جہاں کیرین ان کی منتظر تھی پھر ان تینوں نے ناشتہ کیا تھا۔ ناصر ابھی تک سو رہا تھا۔

"تم لوگوں کی چہل قدمی کیسی رہی؟" کیرین نے پوچھا۔

"بہت بہترین...... موسم بہت خوش گوار تھا میں نے بہت انجوائے کیا۔" سمیر نے کہا۔

میں نے میک کی باتوں کو بھی پسند کیا...... وہ بہت اچھا کام کررہا ہے۔" سمیر نے کہا۔

"تو کیا تم ہمارے ساتھ کام کروگے؟"

"میں سوچ رہا ہوں ابھی۔" سمیر نے جواب دیا۔

"تو تم ابھی سوچ رہے ہو؟ کہ تم مجھے اس کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گے؟"

"میرا خیال ہے کہ اگر میک مناسب سمجھے گا تو تمہیں خود بتادے گا۔" سمیر نے جواب دیا اور میک نے گردن گھما کر ان کی طرف دیکھا۔

"وہ چاہتا ہے کہ میں گورنمنٹ کے سیاہ پہلوؤں کو اجاگر کرنے میں اس کی مدد کروں۔" سمیر نے مزید کہا۔

"یہ خطرناک نہیں ہوگا؟" کیرین نے پوچھا۔ اس وقت ناصر بھی ہال میں داخل ہوگیا وہ سمیر کے قریب ہی ایک صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ میک مجھے سامنے رکھ کر کام کرنے پر مجبور نہیں کرے گا۔" سمیر نے میک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور میک نے اثبات میں سر ہلایا۔ ناصر سوالیہ نظروں سے سمیر کی طرف دیکھا جیسے معاملہ جاننا چاہتا ہو۔

"میں چاہتا ہوں کہ یہ اپنی ذہنی صلاحیتیں میرے لیے معلومات اکٹھی کرنے میں استعمال کرے۔" میک نے کہا۔

"تمہارا کیا خیال ہے؟" اس نے کیرین سے پوچھا۔

"بڑا دلچسپ خیال ہے؟" کیرین نے کہا۔

"اس طرح مجھے بھی ایک بامقصد کام کرنے کا موقع ملے گا اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ راستہ ہمیں کہاں تک لے جائے گا۔" سمیر نے کہا۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ)